فقہ حنفی کے مطابق

طہارت اور نماز کے مسائل

(قرآن وحدیث کی روشنی میں)

تألیف

مولانا مفتی محمد مکرم محی الدین حسامی قاسمی

استاذ حدیث وفقہ جامعہ اسلامیہ دار العلوم حیدر آباد

شعبۂ نشر واشاعت جامعہ اسلامیہ دار العلوم حیدر آباد

نام کتاب : فقہ حنفی کے مطابق طہارت اور نماز کے مسائل
(قرآن وحدیث کی روشنی میں)

موءلف : مولانا مفتی محمد مکرم محی الدین حسامی قاسمی
اُستاذِ حدیث وفقہ جامعہ اسلامیہ دارالعلوم، حیدرآباد
فون: 9704095041

زیر سرپرستی : مولانا محمد رحیم الدین انصاری صاحب (ناظم جامعہ)

زیر نگرانی : مولانا مفتی محمد جمال الدین صاحب قاسمی (صدر مفتی جامعہ)

باہتمام : عالیجناب محمد حبیب الدین صاحب (سابق پروفیسر، جامعہ ملک عبدالعزیز، جدّہ)

سنِ اشاعت : ۱۴۳۲ھ م ۲۰۱۱ء

دوسرا ایڈیشن : ۱۴۳۴ھ م ۲۰۱۳ء

تعدادِ صفحات : ۵۷۹

تعدادِ اشاعت : ۱۰۰۰

کمپیوٹر کتابات : مولانا غیاث الدین ومولانا فیاض الدین صاحبان

قیمت : 300/-

ناشر : جامعہ اسلامیہ دارالعلوم حیدرآباد

ملنے کے پتے

(۱) جامعہ اسلامیہ دارالعلوم حیدرآباد، شیورام پلّی، فون: 24016479-040

(۲) مفتی محمد مکرم محی الدین حسامی قاسمی، مغل پورہ، فون: 9704095041

(۳) مکتبہ سنابل، مغل پورہ، حیدرآباد، فون: 9347024207

(۴) ہدیٰ بک ڈسٹری بیوٹرس، پرانی حویلی، حیدرآباد، فون: 24514892-040

فہرست مضامین

کتاب الطھارۃ

کتاب الصلوۃ

عرضِ ناشر

تقریباً ایک سال پہلے جامعہ اسلامیہ دار العلوم حیدرآباد سے ایک مفید کتاب ''طہارت اور نماز کے مسائل - قرآن وحدیث کی روشنی میں'' شائع ہوئی تھی، کتاب علمی وعوامی دونوں حلقوں میں پسند کی گئی اور بہت جلد اس کا ایڈیشن ختم ہوگیا، اِدھر چند دنوں سے اس کی طبع ثانی کے تقاضے مختلف جانب سے آنے لگے، جامعہ نے کتاب کی افادیت کے پیش نظر اس کی طبع ثانی کا فیصلہ کیا، اس سلسلہ میں جامعہ اپنے تمام معاونین خاص کر جناب حبیب الدین صاحب حال مقیم امریکہ کا ممنون ہے کہ ان کی خصوصی دلچسپی کتاب کی اشاعت کے معاملہ میں شامل حال رہی۔

اللہ کی ذات سے توقع ہے کہ کتاب کا یہ دوسرا ایڈیشن جو معمولی ترمیم کے ساتھ شائع ہو رہا ہے، طبع اول کی طرح مقبول ہوگا۔ ربنا تقبل منا إنک أنت السمیع العلیم

۲۶ر محرم الحرام ۱۴۳۴ھ — محمد رحیم الدین انصاری

۱۱ر ڈسمبر ۲۰۱۲ء

پیش لفظ

(محترم جناب محمد رحیم الدین انصاری صاحب، ناظم دار العلوم حیدر آباد)

بنیادی طور پر احکام شریعت کے دو حصے ہیں، ایک اصولی، دوسرے فروعی۔

اصولی احکام وہ کہلاتے ہیں جن کا تعلق عقائد و ایمانیات سے ہوتا ہے جیسے باری تعالیٰ کی ذات وصفات کے مسائل، قضاء وقدر کے مباحث، معجزات وکرامات کے وقوع کا معاملہ، قیامت کے دن وزن اعمال اور جنت میں دیدارِ خداوندی کے مسائل

فروعی احکام: وہ کہلاتے ہیں جن کا تعلق بالعموم عمل سے ہوا کرتا ہے، جیسے وضو ونماز اور روزہ وغیرہ کے مسائل، معاشرت ومعاملت سے متعلقہ مسائل۔

اصولی احکام میں جو جماعت، منہاج شریعت کے موافق ہوتی ہیں، اسے اہل سنت والجماعت کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے اور جو فرقے، سنت نبی علیہ السلام اور طریقۂ صحابہ سے ہٹے ہوئے ہیں، انہیں مبتدعین یا اہل بدعت کہا جاتا ہے۔

حضرت عبداللہ بن عمر ﷺ سے روایت ہے کہ: اللہ کے رسول ﷺ نے ارشاد فرمایا:

"بنی اسرائیل بہتر فرقوں میں بٹی تھی اور میری امت تہتر فرقوں میں بٹے گی، سوائے ایک کے سب جہنمی ہوں گے۔ صحابہ نے عرض کیا: وہ ایک خوش نصیب جماعت کونسی ہے؟ ارشاد فرمایا: وہ جماعت جو میرے اور میرے صحابہ کے طریقہ پر ہو" (ترمذی بحوالہ مشکوۃ: ۳۰، باب الاعتصام بالکتاب والسنۃ)

فروعی احکام میں جس قدر ائمہ نے بھی حق کی جستجو کے لئے اجتہاد او استنباط سے کام لیا ہے، سب اہل حق کہلاتے ہیں، علامہ سیوطیؒ فرماتے ہیں: ''ان ائمہ کے مسالک ایسے ہی برحق ہیں، جیسے انبیاء سابقہ کی شریعتیں'' (ادب الاختلاف: ۳۰) وجہ اس کی ظاہر ہے وہ یہ کہ ائمہ کے مسالک بالفاظِ دیگر صاحب شریعت علیہ السلام سے ثابت شدہ طریقوں ہی کا دوسرا نام ہے اور اللہ کے رسول ﷺ کے تمام طریقوں کا برحق ہونا ایمان ہے۔

یہ اختلافات ایسے ہیں جنہیں خود سرکار دو عالم ﷺ نے سند قبولیت عطا فرمائی ہے اور صحابہ کرام نے سنجیدگی واحترام کے ماحول میں اس کو برتا بھی ہے۔

غزوۂ بنوقریظہ سے موقع پر نبی کریم ﷺ نے اپنے اصحاب سے فرمایا تھا کہ ہرگز تم میں سے کوئی بنوقریظہ کے علاوہ کہیں نماز عصر نہ پڑھے، راستہ میں عصر کا وقت ہو گیا تو صحابہ کرام کی دو جماعتیں ہوگئیں، ایک جماعت کا کہنا تھا کہ نبی ﷺ کے ارشاد گرامی کا مقصد جلد از جلد بنوقریظہ پہنچنے کا حکم کرنا ہے، یہ منشا نہیں کہ نماز کا وقت ختم ہونے کے اندیشہ کے باوجود، راستہ میں نماز نہ پڑھی جائے، غرض اس جماعت نے راستہ ہی میں نماز عصر پڑھ لی، دوسری جماعت کا خیال تھا کہ فرمان نبوی کا منشا بنوقریظہ ہی میں پہنچ کر نماز پڑھنے کا حکم کرنا ہے، چاہے نماز قضا ہو جائے، چنانچہ اس جماعت نے بنوقریظہ پہنچ کر نماز پڑھی، نبی ﷺ کو اس کی اطلاع ہوئی تو آپ ﷺ نے کسی جماعت کی بھی تردید نہیں فرمائی۔ (بخاری: ۹۴۶، فتح الباری: ۷/۴۰۹)

ایک سفر میں دو صحابی چل رہے تھے، نماز کا وقت ہو گیا، پانی دستیاب نہ تھا، دونوں نے تیمّم کر کے نماز پڑھی، بعدازاں پانی مل گیا تو ایک صحابی نے تو پہلی نماز پر اکتفا کیا، مگر دوسرے صحابی نے وضو کر کے اپنی نماز دہرالی، پھر نبی ﷺ نے پہلے والے صحابی رضی اللہ عنہ سے فرمایا: تم نے سنت کے مطابق کام کیا ہے اور دوسرے صحابی رضی اللہ عنہ سے فرمایا: تم کو دو اجر ملے۔ (ابوداؤد: ۳۳۸)

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کے سامنے کسی نے کہا کہ معاویہ رضی اللہ عنہ تو وتر کی ایک ہی رکعت پڑھا کرتے ہیں، حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ نے جواب میں فرمایا کہ: انہوں نے ٹھیک ہی کیا

ہے، وہ فقیہ آدمی ہیں۔ (بخاری:۳۷۶۴، ۳۷۶۵)

پھر یہ اختلافات اس وقت اور بھی غیر اہم ہو کر رہ جاتے ہیں، جب یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ان اختلافات کا تعلق فروعی احکام کے بھی فروعات سے ہے، مثال کے طور پر ائمہ اربعہ کے درمیان نماز کے مسائل میں اختلاف پایا جاتا ہے تو اس میں نہیں کہ کوئی امام فجر کی دو رکعت کا قائل ہے تو کوئی تین یا چار کا، یا کوئی قیام ورکوع وسجود کو ضروری کہتا ہو تو کوئی اس کے برخلاف کہتا ہو، بلکہ زیادہ تر اختلاف جزوی اور زائد بر ضرورت مسائل میں ہوتا ہے اور وہ بھی بہتر اور کم بہتر کا، جائز اور ناجائز کا نہیں، چنانچہ ایک امام کہتا ہے کہ نماز میں سینہ پر ہاتھ باندھنے کے مقابلے میں ناف کے نیچے ہاتھ باندھنا بہتر ہے، تاہم وہ یہ نہیں کہتا کہ اگر سینہ پر کوئی ہاتھ باندھ کر نماز پڑھے تو اس کی نماز نہیں ہوئی، یا کوئی امام جو نماز میں رفع یدین کو بہتر خیال کرتا ہو، وہ یہ نہیں کہتا کہ رفع یدین کے بغیر نماز نہیں ہوتی، امام شافعیؒ کے یہاں نمازِ فجر میں قنوت پڑھنا مسنون ہے تاہم خود ان کے بارے میں مشہور ہے کہ جب وہ امام ابوحنیفہؒ کی قبر مبارک کی زیارت کے لئے تشریف لائے اور قریب میں نمازِ فجر ادا کی تو اس میں صاحبِ قبر کے علمی واجتہادی مقام کا لحاظ کرتے ہوئے قنوت نہیں پڑھی۔ (فتح الملہم :۱/۲۳۷)

واقعہ یہ ہے کہ اس قسم کے جزوی وفروعی اختلافات، امت کے حق میں رحمت اور وسعت کا باعث ہیں، چنانچہ حدیث شریف میں ہے: میری امت کا اختلاف رحمت ہے، (بیہقی، طبرانی، دیلمی، بحوالہ ترجمان السنۃ:۱/۷۹) اس کی شرح میں قاسم بن محمد فرماتے ہیں کہ: اللہ تعالیٰ نے آنحضرت ﷺ کے صحابہ کے عملی اختلاف میں ہمارا بڑا فائدہ رکھا ہے کہ اب اگر کوئی شخص ان میں کسی کے مطابق عمل کرے (مجتہد ہو تو اپنے اجتہاد کی روشنی میں اور مجتہد نہ ہو تو امام کی اتباع کرکے) تو اس کے لئے گنجائش نکل آتی ہے۔ (ترجمان السنۃ:۱/۷۹)

یہاں ایک غلط فہمی کا ازالہ ضروری ہے کہ بعض حضرات اس سے یہ سمجھ لیتے ہیں کہ اب انہیں مختلف اقوال میں سے اپنی خواہش کے مطابق کسی بھی قول یا رائے کو اختیار کر لینے کی آزادی

حاصل ہوگئی ہے، حالانکہ یہ سوچ بنیادی طور پر ''اختلاف أمتي رحمة '' کی روح کے مخالف ومتصادم ہے، کیوں کہ اختلاف کا رحمت ہونا، صرف اس وقت برقرار رہتا ہے جب تک کہ اختلاف خواہش پرستی اور لادینیت کی طرف لے جانے والے نہ ہوں۔

اور یہ مشاہدہ ہے کہ اقوالِ مختلفہ کے انتخاب میں من چاہی آزادی، آدمی کو خواہش پرستی اور لادینیت کی طرف دھکیل دیتی ہے، اس لئے ''اختلاف أمتي رحمة '' سے یہ مزعومہ نتیجہ نکالنا باطل اور بے بنیاد ہے۔

قاضی اسماعیل فرماتے ہیں کہ:

''اختلافات کے رحمت ہونے کا مطلب یہ نہیں کہ صحابہ کے مختلف افعال میں ہر شخص کو بے دلیل اپنی مرضی کے مطابق انتخاب کا حق حاصل ہوگیا ہے'' (الموافقات: ۱۲/۴)

حافظ ابن حزمؒ فرماتے ہیں:

''اس پر اجماع ہے کہ شرعی حجت کے بغیر صرف مذاہب کی رخصتوں پر عمل کرنا ناجائز بلکہ فسق ہے'' (الموافقات: ۱۳۴/۴)

موجودہ زمانے میں اختلافات ائمہ کی حیثیت ونوعیت نہ سمجھنے اور معین امام کی تقلید کے ضروری ہونے کی حکمتوں ومصلحتوں کو نہ سمجھنے کی وجہ سے، اس معاملہ میں بعض گوشوں سے افراط وتفریط کا مظاہرہ ہورہا ہے، احناف کی نماز وطہارت کے بارے میں بھی عام خیال کیا جاتا ہے کہ وہ گویا اساطیر الاولین کا مصداق ہیں، قرآن واحادیث کے دلائل، ان کی پشت پر موجود نہیں؛ حالانکہ علمی اعتبار سے یہ ایک ایسی غلطی ہے کہ اس کی تردید یا جواب دہی کی سعی بھی فضول معلوم ہوتی ہے، تاہم چوں کہ سادہ لوح حنفی عوام پر اس کا منفی اثر یہ پڑ رہا تھا کہ اپنے مسلک کے تئیں شکوک وشبہات پیدا ہورہے تھے؛ اس لئے اس قسم کی غلط بیانیوں اور غلط فہمیوں کا ازالہ ضروری ہوگیا تھا۔

جامعہ کے ایک بہی خواہ جناب حبیب الدین صاحب حال مقیم امریکہ کی شدید خواہش تھی

کہ اردو زبان میں عام فہم اسلوب کے ساتھ ایسا کام منظر عام پر آجائے تو وقت کی ایک اہم ضرورت کی تکمیل ہو، موصوف خود بھی فقہی مسائل پر اچھی نظر رکھتے ہیں اور دینی خدمت کے جذبہ سے سرشار بھی ہیں، سرزمین امریکہ میں آپ مسلکِ احناف کے مطابق فقہی دروس بھی دیتے ہیں اور قرآن وحدیث کے دلائل پیش کر کے سامعین کی تشفی کرتے ہیں۔

موصوف کی مخلصانہ خواہش کو مدنظر رکھتے ہوئے میں نے ہمارے جامعہ کے صدر مفتی حضرت مفتی محمد جمال الدین صاحب قاسمی مدظلہ کو یہ کام حوالے کیا، انہوں نے اپنی نگرانی میں جامعہ کے ایک استاذ مفتی محمد مکرم محی الدین - جوان کے شاگرد اور جامعہ ہی کے شعبہ افتاء کے فارغ ہیں - سے یہ کام عمدہ طریقہ پر تکمیل کروایا، جس کو جامعہ شائع کروا رہا ہے، اس سے قبل بھی جامعہ سے مختلف علمی وتحقیقی کتب ورسائل شائع ہوکر عوام وخواص میں مقبول ہوچکے ہیں، بالخصوص ہر سال شعبہ افتاء سے شائع ہونے والے تحقیقی مقالے ملک بھر کے اہل علم سے داد وتحسین حاصل کرتے ہیں، ''امام ابوحنیفہؒ اور علم حدیث'' - ''فقہ اسلامی - مصادر وماخذ'' یہ دو کتابیں ایسی ہیں جن سے زیر بحث موضوع پر خاص روشنی پڑتی ہے اور فقہ کے تعلق سے پائی جانے والی غلط فہمیوں کے ازالہ میں معاون ثابت ہوتی ہیں۔

مجھے امید ہے کہ یہ کتاب بھی بارگاہ خداوندی میں مقبول ہوگی اور عوام وخواص کے یہاں باریاب ہوگی، وما ذلك على الله بعزيز ۔

یکم ربیع الثانی ۱۴۳۲ھ

۷/مارچ ۲۰۱۱ء

محمد رحیم الدین انصاری

مقدمہ

اسلامی علوم میں فقہ ایک ایسا جامع علم ہے، جس نے اسلام کے بنیادی سرچشمے قرآن وحدیث دونوں کو اپنے دامن میں سمیٹ لیا ہے؛ کیوں کہ فقہ کی عمارت انہی دونوں بنیادوں پر قائم ہوتی ہے، قرآن وحدیث کے بغیر فقہ کا وجود ہی نہیں ہوسکتا، فقہ انسان کی عملی زندگی اور اس کے روزمرہ معاملات کا دستور العمل ہے، یہ قرآن وحدیث کے احکام کی درجہ بندی کرتی ہے اور ان احکام پر عمل کے لیے تیار نمونے فراہم کرتی ہے، فقہ ہی سے حق وناحق کی پہچان اور صحیح وغلط کی تمیز آتی ہے اور اس کے ذریعہ معلوم ہوتا ہے کہ کون سا عمل اللہ کے نزدیک مقبول ہے اور کس قسم کی محنتیں اس کے نزدیک اکارت چلی جائیں گی، فقہ میں ہمہ گیریت بھی ہے اور جامعیت بھی، یہ ہر دور میں رہنمائی کرنے اور ہر نوع کے مسائل حل کرنے کی بھرپور اہلیت رکھتی ہے اور اس سے یہ تحریک بھی ملتی ہے کہ موجودہ اور آنے والے زمانوں میں بھی انسانی سماج کے مسائل کا اطمینان بخش حل فقہ کے ذریعہ نکالا جاسکتا ہے؛ اس لیے اس سے ہم مسلمانوں اور ہماری نئی نسل کو تفصیلی واقفیت رکھنے کی ضرورت ہے۔

فقہ —— لغوی واصطلاحی معنی

فقہ کے لغوی معنی کسی بات کو جاننے اور سمجھنے کے ہیں، قرآن مجید میں کم سے کم دو موقعوں پر یہ لفظ اس معنی میں استعمال ہوا ہے(۱) اس مناسبت سے احکامِ شرعیہ کے علم کو بھی فقہ سے تعبیر کیا گیا، ابتداءً اشریعت کے تمام احکام کے جاننے کو فقہ کہا جاتا تھا؛ خواہ عقائد

(۱) النساء:۷۸، ھود:۹۱

ہوں یا اخلاق اور عبادات ہوں یا معاملات، قرآن وحدیث میں بھی اس معنی کے لحاظ سے اس لفظ کا ذکر کیا گیا ہے، اللہ تعالی نے ارشاد فرمایا:

﴿وَمَا كَانَ الْمُؤْمِنُونَ لِيَنفِرُوا كَآفَّةً فَلَوْلَا نَفَرَ مِن كُلِّ فِرْقَةٍ مِّنْهُمْ طَآئِفَةٌ لِّيَتَفَقَّهُوا فِي الدِّيْنِ وَلِيُنذِرُوا قَوْمَهُمْ إِذَا رَجَعُوا إِلَيْهِمْ لَعَلَّهُمْ يَحْذَرُونَ﴾ (۱)

''اہل ایمان کے لیے یہ مناسب نہیں کہ سبھی کوچ کر جائیں، تو کیوں نہ ان میں سے ایک گروہ نے کوچ کیا؛ تا کہ دین میں تفقہ حاصل کریں؛ تا کہ وہ بچ جائیں''

حضرت معاویہ ؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

'' من يرد الله بِهِ خيرا يفقِهه فِي الدِينِ'' (۲)

''اللہ تعالی جس کے حق میں بہتری چاہتے ہیں، اس کو دین کا تفقہ عطا فرماتے ہیں''

امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے مفہوم میں اسی وسعت کے لحاظ سے ان الفاظ میں فقہ کی تعریف کی ہے:

'' هو معرِفة النفسِ مالها وما عليها '' (۳)

''انسان کا اپنے حقوق وفرائض کو جاننا فقہ ہے''

اس تعریف میں اسی لحاظ سے شریعت کے تمام احکام کو فقہ کے دائرہ میں شامل کیا گیا ہے؛ اسی لیے امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے عقائد پر جو کتاب تالیف فرمائی ہے یا ان کی طرف منسوب کی گئی ہے اس کا نام ''الفقہ الاکبر'' ہے؛ بلکہ اسی نام سے عقائد پر ایک کتاب امام

(۱) التوبة :۱۲۲

(۲) بخاري، باب من يرد الله به خيرا يفقه في الدين ، حدیث نمبر:۶۹

(۳) التوضيح:۱/۱۶،الأصل ما يبتنى عليه غيره .

شافعی رحمۃ اللہ علیہ کی طرف بھی منسوب ہے؛ لیکن دستیاب نہیں ہے، بعد میں عقائد کی توضیح اور اخلاقی تربیت نے مستقل فنون کی حیثیت حاصل کرلی؛ چنانچہ عقائد سے متعلق احکام ''علم کلام'' کہلایا اور اخلاق سے متعلق مباحث کو ''تصوف'' کا نام دیا گیا، ان دونوں فنون کے ماہرین کو بھی مستقل حیثیت حاصل ہوگئی اور انہیں متکلمین اور صوفیا کا لقب دیا گیا، اس طرح اب فقہ میں عملی احکام باقی رہ گئے، جو محض اخلاقی حیثیت کے حامل نہیں بلکہ قانونی حیثیت رکھتے ہیں اور اس لحاظ سے فقہ کی تعریف ان الفاظ میں کی گئی:

" معرفة الأحكامِ الشرعِيةِ العملِيةِ مِن أدِلتِها التفصِيلية بالاستدلال " (۱)

''فقہ عملی شرعی احکام کو ان کے تفصیلی دلائل سے استدلال کے ذریعہ جاننے کا نام ہے''

اس تعریف میں جو عملی شرعی احکام کی قید ہے اس کے ذریعہ علم کلام اور تصوف کو نکالنا مقصود ہے؛ کیوں کہ اعتقادی اور قلبی احکام دماغ اور ضمیر سے ہوتے ہیں، اعضاو جوارح کے عمل سے ان کا تعلق نہیں ہوتا، عملی احکام میں عبادات بھی شامل ہیں اور معاملات بھی اور تفصیلی دلائل کا مطلب یہ ہے کہ یہ مسئلہ کس دلیل شرعی پر مبنی ہے، کتاب اللہ پر، سنت رسول پر، اجماع پر، یا قیاس وغیرہ پر، اسی طرح حکم اور دلیل کے درمیان ارتباط کو جاننا بھی فقہ میں شامل ہے اور تعریف میں جو استدلال کا ذکر ہے اس سے مراد اجتھاد اور غور وفکر ہے۔

تعریف کا حاصل یہ ہوا کہ مجتہد کا علم ہی اصل میں فقہ ہے، مقلدین کو اگر احکام اور ان کے دلائل کا علم ہو تو یہ فقہ نہیں ہے؛ اسی لیے متقدمین مجتہد ہی کو فقیہ کہا کرتے تھے، بعد کے ادوار میں مقلدین جو مسائل اور ان کے دلائل کا علم رکھتے ان کو بھی فقیہ کہا جانے لگا اور آج کل یہی تعبیر و مراد مروج ہے، اس لیے قاضی محبّ اللہ بہاری رحمۃ اللہ علیہ نے ''الاستدلال''

(۱) التلویح: ۱/۱۸

کی قید حذف کردی ہے اور فقہ کی تعریف اس طرح کی ہے:

" العِلم بِالأحكامِ الشرعِيةِ عن أدِلتِها التفصِيلِيةِ " (۱)

''تفصیلی دلائل سے شرعی احکام کو جاننے کا نام فقہ ہے''

''شرعی احکام'' سے مکلّف کے افعال پر شریعت کی جانب سے جو حکم اور صفت مرتب ہوتی ہے وہ مراد ہے، جیسے کسی عمل کا فرض، واجب، مستحب یا مباح یا اسی طرح حرام ومکروہ ہونا، اس تفصیل کی روشنی میں فقہ کی تعریف اس طرح کی جاسکتی ہے:

''شرعی حکم جاننے کو فقہ اور جاننے والے کو فقیہ کہتے ہیں''۔

فقہ کا موضوع

فقہ کا موضوع عاقل وبالغ کا فعل ہے؛ کیوں کہ فقہاء اس سے بحث کرتے ہیں کہ عاقل بالغ پر کون سا فعل فرض ہے، کیا واجب ہے، کیا مستحب ہے اور ان کے لیے کیا کیا چیزیں مباح ہیں، اسی طرح کون سے کام ان کے لیے درست اور صحیح ہیں اور کون سا فعل ان کے لیے نادرست ہے، کون سا حرام اور کون سا مکروہ، اس سے یہ واضح ہوجاتا ہے کہ نابالغ، پاگل اور مخبوط الحواس کا فعل علم فقہ کا موضوع نہیں ہے، باقی بچہ اور پاگل پر کسی ضائع شدہ چیز کا جو ضمان (تاوان) آتا ہے، یا ان کی بیویوں کا ان پر جو نان ونفقہ (اخراجات) ضروری ہوتا ہے تو ان کی ادائیگی کے مخاطب فقہ میں ان کے ولی ہوتے ہیں، خود یہ نہیں ہوتے؛ لہٰذا ان سے متعلق جو مسائل ہوتے ہیں وہ تو بیان کردیئے جاتے ہیں؛ تاکہ ولی ان مسائل پر ان کے تعلق سے عمل کریں، جیسے کوئی جانور کسی کی کوئی چیز نقصان کردے تو ان کے ضمان کے مخاطب ان کے مالک ہوتے ہیں اور جہاں تک بچوں کو نماز پڑھنے کا حکم دیا جاتا ہے تو اس کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ یہ ابتدائے عمر سے ہی فرائض کے عادی بن جائیں؛ تاکہ آگے چل کر یہ ان کے لیے بوجھ محسوس نہ ہو، مگر نماز پڑھانے کی ذمہ داری تو بہر حال ولی پر ہی ہوتی ہے۔

---

(۱) فواتح الرحموت بشرح مسلم الثبوت: ۱۲/۱، ۱۳

فقہ کی غرض وغایت

سعادتِ دارین کا حصول اور شرعی احکام کے مطابق عمل کرنے کی قدرت کا حاصل ہونا فقہ کی غرض وغایت ہے، واقعہ ہے کہ انسان اس علم کی بدولت جہالت کی پستی سے نکل کر علم کی بلندی پر آجاتا ہے اور صحیح عمل، صحیح علم کے بغیر مشکل ہے، جب انسان کو صحیح علم حاصل ہوجاتا ہے تو اس پر عمل کرکے دنیاوآخرت دونوں جگہ کامیابی سے ہم کنار ہوجاتا ہے۔

فقہ کا دائرہ کار

فقہ کی تعریف، موضوع اور اس کی غرض وغایت پر غور کیا جائے تو اس کا دائرہ کار بھی واضح انداز سے سامنے آجاتا ہے، فقہ دراصل انسان کی پوری زندگی کا احاطہ کرتی ہے اور درج ذیل شعبہائے حیات کی بابت اس فن کے ذریعہ رہنمائی ملتی ہے۔

عبادات

یعنی وہ احکام جو خدا اور بندہ کے براہ راست تعلق پر مبنی ہیں، نماز، روزہ، حج، زکوۃ، قربانی، اعتکاف اور نذر عبادات میں شامل ہیں اور عبادات سے متعلق احکام خالصتاً اللہ تعالیٰ کی ہدایت ورہنمائی پر موقوف ہیں؛ اگر شریعت کی رہنمائی نہ ہوتی تو انسان اپنی عقل سے اس کو دریافت نہیں کرپاتا۔

عائلی قوانین

یعنی دوآدمیوں کے درمیان غیر مالی بنیاد پر تعلقات سے متعلق احکام، اس میں نکاح وطلاق، فسخ وتفریق، عدت وثبوت نسب، نفقہ وحضانت، ولایت، میراث، وصیت وغیرہ کے احکام آجاتے ہیں، قدیم فقہا اس کے لیے مناکحات کا لفظ استعمال کرتے تھے، موجودہ دور میں اس کو عربی زبان میں احوال شخصیہ اور اردو زبان میں عائلی قانون اور انگریزی میں پرسنل لا کہا جاتا ہے۔

معاملات

یعنی دواشخاص کے درمیان مالی معاہدہ پر مبنی تعلقات، اس میں خرید وفروخت، شرکت، رہن وکفالت، ھبہ، عاریت، اجارہ وغیرہ کے احکام شامل ہیں، آج کل اسے اردو میں تجارتی قوانین سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

مرافعات

مرافعات سے مراد عدالتی قوانین ہیں، یعنی قاضی کا تقرر، شہادت ووکالت کے احکام، مقدمات کوثابت کرنے کا طریقہ وغیرہ۔

دستوری قانون

یعنی وہ قوانین جو حکومت اور ملک کے شہریوں کے درمیان حقوق وفرائض کو متعین کرتے ہیں۔

عقوبات

جرم وسزا سے متعلق قوانین، اس میں شرعی حدود، قتل وجنایت کی سزا اور جن جرائم کے بارے میں کوئی سزا متعین نہیں کی گئی ہے ان کی بابت سزا کا تعین، جسے فقہ کی اصطلاح میں تعزیر کہتے ہیں، شامل ہیں۔

بین ملکی قانون

یعنی دوملکوں اور دوقوموں کے درمیان تعلقات ومعاہدات اور حقوق وفرائض سے متعلق قوانین، ان کو فقہا اسلام سیر سے تعبیر کرتے ہیں، قانون کی دنیا میں اس موضوع پر سب سے پہلی کتاب امام محمد کی کتاب السیر ہے، مستشرقین کو بھی اس حقیقت کا اعتراف ہے۔

اس تفصیل سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ فقہ اسلامی کا دائرہ کس قدر وسیع ہے اور کس طرح اس نے زندگی کے تمام شعبوں کو اپنے اندر سمولیا ہے، یہی وجہ ہے کہ عہدِ نبوی سے لے

کر خلافتِ عثمانیہ کے ختم ہونے تک فقہ اسلامی نے ایشیاء، افریقہ اور یوروپ کے قابلِ لحاظ حصہ پر فرمانروائی کی ہے؛ اگر فقہ اسلامی میں ہمہ جہت رہنمائی کی صلاحیت نہیں ہوتی تو ہرگز وہ یہ مقام حاصل نہیں کر پاتی۔

فقہ کی اہمیت

مذکورہ تفصیلات سے فقہ کی اہمیت کا بخوبی علم ہو جاتا ہے، اس کے علاوہ خود اللہ تعالی نے دین میں تفقہ حاصل کرنے کی ترغیب دی ہے: (۱) حضور ﷺ کا ارشاد مبارک ہے کہ اللہ تعالی جس کے ساتھ خیر کا ارادہ کرتا ہے اسے تفقہ سے سرفراز کرتا ہے، (۲) حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ نے اس حدیث کے ذیل میں لکھا ہے کہ اس سے تمام لوگوں پر علما کی فضیلت اور تمام علوم سے تفقہ فی الدین کا افضل ہونا ظاہر ہوتا ہے، (۳) نیز آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

"فقيه واحِد أشد على الشيطانِ مِن ألفِ عابِد" (۴)

''ایک فقیہ شیطان پر ہزار عابدوں سے بھاری ہوتا ہے''

کیوں کہ عابد کی عبادت بلا بصیرت ہوتی ہے، اس لیے شیطان کو اسے گمراہی کے گڑھے میں ڈھکیلنا اور شکوک وشبہات کے جال میں پھانسنا بہت آسان ہوتا ہے؛ جب کہ فقیہ اس کی سازشوں اور چالوں سے واقف ہوتا ہے اور وہ اس کے دامِ فریب میں عام طور پر نہیں آتا ہے، صاحب الاشباہ والنظائر نے فقہ کی عظمت کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھا ہے:

''الفقه اشرف العلوم قدرا واعظمها أجرا وأتمها عائدة واعمها فائدة وأعلاها مرتبة يملا العيون نورا والقلوب

---

(۱) التوبہ:۱۵

(۲) بخاری، باب من يرد الله به خيرا يفقهه في الدين ، حدیث نمبر۶۹

(۳) فتح الباری ، باب من يرد الله به خيرا يفقهه في الدين ، حدیث نمبر:۶۹

(۴) ابن ماجه، باب فضلِ العلماءِ والحثِ على طلبِ العِلم، حدیث نمبر:۲۱۸

سرورا والصدور انشراحا " (۱)

"علم فقہ تمام علوم میں قدر ومنزلت کے اعتبار سے بڑھا ہوا ہے اور اجر کے اعتبار سے بھی اس کا مرتبہ اونچا ہے، علم فقہ اپنے مقام ورتبہ کے اعتبار سے بھی بہت بلند ہے اور وہ آنکھوں کو نور اور جلا بخشتا ہے، دل کو سکون اور فرحت بخشتا ہے اور اس سے شرح صدر حاصل ہوتا ہے"

اور صاحب درمختار نے علم فقہ کی عظمت کا یوں تذکرہ کیا ہے:

" وخير علوم علم فقه ؛لأنه يكون إلى العلوم توسلا ؛ فإن فقيها واحدا متورعا على ألف ذى زهد تفضل واعتلى تفقه ، فإن الفقه أفضل قائد إلى البر والتقوى واعدل قاصد وكن مستفيدا كل يوم زيادة من الفقه واسبح في بحور الفوائد " (۲)

"تمام علوم میں قدر ومنزلت اور مقام ورتبہ کے اعتبار سے سب سے بہتر علم فقہ ہے؛ اس لیے کہ علم فقہ تمام علوم تک پہونچنے کا وسیلہ اور ذریعہ ہے، اسی وجہ سے ایک متقی فقیہ ہزار عابدوں پر بھاری ہوتا ہے، علم فقہ کو حاصل کرنا چاہیے؛ اس لیے کہ علم فقہ نیکی اور تقوی کی طرف رہنمائی کرتا ہے اور ہر دن علم فقہ سے مستفید ہوتے رہنا چاہیے، اس کے سمندر میں غوطہ زنی کرنا چاہیے"

فقہاء کی اہمیت

اس لیے سلف صالحین کے یہاں حفظِ حدیث کے مقابلہ تفقہ یعنی فہمِ حدیث کی

(۱) مقدمه الأشباه والنظائر:۱/۲۰

(۲) مقدمه درمختار:۱/۶

اہمیت زیادہ تھی اور وہ فقہا کے مرتبہ شناس تھے، امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ ایک حدیث کے ذیل میں لکھتے ہیں:

"وکذلک قال الفقهاء وهم أعلم بمعانی الحدِيثِ" (۱)

"فقہا نے یہی کہا ہے اور وہ معانی حدیث سے زیادہ واقف ہیں"

امام اعمش رحمۃ اللہ علیہ جیسے محدث نے ایک موقع پر فرمایا کہ اے جماعت فقہاء! تم طبیب ہو اور ہم محض عطار: "یا معشر الفقهاءِ أنتم الأطباء ونحن الصيادلة" (۲) اس لیے محدثین فقیہ راویوں کی روایت کو قابلِ ترجیح سمجھتے تھے، امام اعمش کہتے تھے کہ جس حدیث کو فقہاء نقل کرتے ہوں وہ اس سے بہتر ہے، جس کے راوی صرف محدث ہوں:

"حدِيث يتداولها الفقهاء خير من حدِيث يتداوله الشيوخ" (۳)

اسی لیے حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ کہا کرتے تھے کہ حلال وحرام کا علم فقہاء سے حاصل کرنا چاہئے: "فإن علم الحلال والحرام إنما يتلقى من الفقهاء" (۴)، علامہ ابنِ تیمیہ جو فقہ وحدیث دونوں کے رمز شناس ہیں، امام احمد سے نقل کرتے ہیں: " حدیث میں تفقہ میرے نزدیک حفظِ حدیث سے زیادہ محبوب ہے" (۵)، اور علی بن مدینی فرماتے ہیں کہ:

"متون احادیث میں تفقہ پیدا کرنا اور راویوں کے احوال کو جاننا سب سے اشرف علم ہے" (۶)

---

(۱) ترمذی، باب ما جاء في غسل الميت ، حدیث نمبر:۹۱۱

(۲) الفقيه والمتفقه :۲/۳۹۰، حدیث نمبر:۷۸۹

(۳) مقدمة تدريب الراوی :۱/۷

(۴) فتح الباری، باب انزل القرآن على سبعة أحرف ، حدیث نمبر:۴۶۰۸

(۵) منهاج السنة:۷/۲۳۴

(۶) حوالہ سابق

اس لیے حضرت شاہ ولی اللہ فرماتے ہیں کہ:

''قرآن وحدیث کے بعد اسلام کا مدار فقہ پر ہے''(۱)

فقہ کے مصادر

چوں کہ اسلامی نقطہ نظر سے قانون کا اصل سرچشمہ اللہ تعالی کی ذاتِ پاک ہے، اس لیے تمام قوانین کا رشتہ بہر حال اللہ تعالی ہی سے ہے؛ البتہ بعض احکام کی نسبت صراحتا اللہ اوراس کے رسول ﷺ کی طرف ہے اور بعض احکام قرآن وحدیث سے ثابت ہونے والے اصول وقواعد کی روشنی میں اہلِ علم نے استنباط کیے ہیں، ان کی بھی بالواسطہ اللہ تعالیٰ کی طرف نسبت کی جاسکتی ہے، فرق یہ ہے کہ پہلا ذریعہ معصوم ہے؛ اگر قرآن وحدیث سے اس کا ثبوت یقینی ہوتو اس میں غلطی کا احتمال نہیں اور دوسرا ذریعہ معصوم نہیں؛ کیوں کہ اس میں انسانی اجتہاد کو دخل ہے اور انسان کی سوچ غلط بھی ہوسکتی ہے، اس طرح فقہ اسلامی کے مصادر کو دو حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے: نصوص اور اجتہاد کے دوسرے مسائل۔

منصوص مصادر

فقہ اسلامی کے منصوص مصادر چار ہیں: کتاب اللہ، سنت رسول اللہ، شرائع ماقبل اور جن مسائل میں اجتھاد کی گنجائش نہ ہو ان میں صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین کے آثار۔

کتاب اللہ

کتاب اللہ سے مراد قرآن مجید ہے، جو بے کم وکاست محفوظ ہے اور قیامت تک رہے گا، قرآن مجید میں فقہی احکام سے متعلق آیات کی تعداد لوگوں نے دو ڈھائی سو سے لے کر پانچ سو تک لکھی ہے، پانچ سو کی تعداد اس لحاظ سے ہوسکتی ہے کہ قرآن سے ثابت ہونے والے صریح احکام کے علاوہ اصولی احکام کو بھی شامل کرلیا جائے، ملاجیون نے تفسیرات احمدیہ میں اسی اصول پر آیات کا انتخاب کیا ہے، جن کی تعداد ۴۶۲ رہے، نواب صدیق حسن

(۱) قرة العينين ،ص:۱۷۱

خان صاحب مرحوم نے بھی نیل المرام میں آیات احکام کے استیعاب کی کوشش کی ہے، جن کی تعداد ۲۸۴ رہوتی ہے، قرآن میں آیات احکام عبادات سے متعلق بھی ہیں اور معاملات سے بھی، نیز دیگر شعبہ حیات سے بھی، شیخ عبدالوہاب خلاف نے عبادات کے علاوہ دوسرے مسائل سے متعلق آیات کی تعداد اس طرح لکھی ہے:

عائلی قوانین	(۷۰)	قانون شہریت	(۷۰)	احکام جرم وسزا	(۳۰۱)
عدالتی قوانین	(۱۳)	دستوری قوانین	(۱۰)	اقتصادی قوانین	(۱۰)
قومی وبین قومی قوانین	(۲۵)(۱)				

فقہی احکام کی اہمیت اور عملی زندگی سے اس کے تعلق کی وجہ سے بہت سے اہل علم نے آیات احکام کی تفسیر کا اہتمام کیا ہے، ان میں اہم کتابیں اس طرح ہیں:

- احکام القرآن: امام ابوبکر جصاص رازی متوفی: ۳۷۰ھ
- احکام القرآن: ابوبکر احمد بیہقی متوفی: ۴۵۸ھ یہ دراصل امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کی افادات ہیں جس کو علامہ بیہقی نے یکجا اور مرتب کیا ہے۔
- احکام القرآن: ابوبکر محمد بن عربی متوفی: ۵۴۳ھ
- تفسیرات احمدیہ: ملا احمد جیون متوفی: ۱۱۳۰ھ
- نیل المرام من تفسیر آیات الاحکام: نواب صدیق حسن خان متوفی: ۱۳۰۷ھ
- احکام القرآن: مولانا ظفر احمد عثمانی، مولانا ادریس کاندھلوی اور مفتی شفیع صاحب عثمانی کی مشترکہ کوششوں سے مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے زیر نگرانی مرتب ہوا ہے، جو اپنے

(۱) علم اصول الفقه للخلاف، ص:۳۲-۳۳، الدليل الأول القرآن

موضوع پر بہت مفصل اور جامع مجموعہ ہے۔

- روائع البیان فی تفسیر آیات الاحکام من القرآن: شیخ محمد علی صابونی
- تفسیر آیات الاحکام: محمد علی السائس، عبداللطیف السبکی، محمد ابراہیم محمد کرشون

ان کے علاوہ علامہ ابوعبداللہ محمد قرطبی متوفی: ۶۷۰ھ کی الجامع لاحکام القرآن اور مولانا قاضی ثناءاللہ پانی پتی متوفی: ۱۲۲۵ھ کی التفسیر المظہر ی اگرچہ پورے قرآن کی تفسیر ہے؛ لیکن اس پر فقہی رنگ غالب ہے اور قرآن کے فقہی احکام پر بہت شرح وبسط کے ساتھ گفتگو کی گئی ہے۔

سنت رسول

احکامِ شرعیہ کا دوسرا ماخذ سنت رسول ہے، سنت رسول سے مراد رسول اللہ ﷺ کے ارشادات، آپ ﷺ کا عمل نیز وہ قول وفعل ہے جو آپ کے سامنے آیا ہو اور آپ نے اس پر نکیر نہیں فرمائی ہو، سنت کے حجت ہونے پر امت کا اجماع واتفاق ہے؛ کیوں کہ قرآن مجید میں کثرت سے مستقل طور پر اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کا حکم دیا گیا ہے، فرمایا گیا کہ رسول کی اطاعت دراصل اللہ کی اطاعت ہے: ﴿مَنۡ يُّطِعِ الرَّسُوۡلَ فَقَدۡ اَطَاعَ اللّٰهَ﴾ (۱) نیز اللہ تعالی کا واضح ارشاد ہے:

﴿وَمَا آتَاكُمُ الرَّسُولُ فَخُذُوهُ وَمَا نَهَاكُمْ عَنْهُ فَانتَهُوا﴾ (۲)

"رسول جو کچھ لائے اسے قبول کرو اور جس سے منع کردے اس سے رک جاؤ"

نیز سنت رسول اصل میں قرآن مجید کی تفسیر وتوضیح ہے؛ اسی لیے امام شافعی رحمۃ اللہ

(۱) النساء: ۸۰

(۲) الحشر: ۷

علیہ نے فرمایا: حضور ﷺ کی سنتیں تین طرح کی ہیں، یا تو قرآن میں جو حکم ہے وہی سنت رسول میں بھی ہے، یا قرآن میں کوئی حکم مجمل ہے اور سنت نے اس کو واضح کر دیا ہے، یا قرآن مجید اس سلسلہ میں خاموش ہے اور سنت کے ذریعہ اس صورت کا حکم معلوم ہوتا ہے۔(۱)

لیکن غور کیا جائے تو یہ صورت بھی قرآن مجید کے بتائے ہوئے اصولوں کے دائرہ میں آتی ہے، گویا قرآن نے ایک اصول بیان کر دیا اور سنت کے ذریعہ اس کی تطبیق اور عملی صورتگری سامنے آ گئی؛ اس لیے امام اوزاعی نے فرمایا کہ بیان وضاحت اور فہم مراد کے اعتبار سے قرآن کو حدیث کی حاجت زیادہ ہے، بمقابلہ اس حاجت کے جو حدیث کو قرآن کی ہے:

" الکتاب أحوج إلی السنة من السنة إلی الکتاب " (۲)

حقیقت یہ ہے کہ فقہی اعتبار سے احادیث کی بڑی اہمیت ہے، قرآن مجید ایک دستوری کتاب ہے، جس میں اصولی احکام دیئے گئے ہیں اور دین کے حدودِ اربعہ کو متعین کرنے کی کوشش کی گئی ہے، حدیث کے ذریعہ ان قرآنی احکام کی عملی تصویر سامنے آ جاتی ہے اور اس طرح اہل ہوس کے لیے قرآن کے معنوں میں الٹ پھیر، تحریف اور من چاہی تاویل کا دروازہ بند ہو جاتا ہے، جہاں حفاظ اور قاریوں کے ذریعہ الفاظِ قرآن کی حفاظت کا غیبی انتظام ہوا ہے، وہیں معنوی تحریف اور آمیزش سے حفاظت کا سروسامان حدیث کے ذریعہ انجام پایا ہے، اس طرح احادیث قرآن مجید کی معنوی حفاظت کا ذریعہ ہیں۔

جو احادیث احکامِ فقہیہ سے متعلق ہیں ان کی تعداد تقریباً سات آٹھ ہزار ہے، کتبِ احادیث میں چوں کہ مختلف سندوں سے آنے والی روایتوں کو مختلف حدیث شمار کر لیا جاتا ہے؛ اس لیے ان کی تعداد زیادہ معلوم ہوتی ہے؛ لیکن مکررات کو چھوڑ کر اصل مضمون

---

(۱) الرسالہ:۹۱-۹۲،باب ماابان اللہ لخلقه من فرضه علی رسوله اتباع ما أوحی إلیه

(۲) شرح السنة للحسن بربهاری:۱/۳۵،رقم:۴۹

اور متن کے اعتبار سے احادیثِ احکام کی تعداد سات آٹھ ہزار سے زیادہ نہ ہوگی، جن مصنفینِ نے ایسی حدیثوں کے جمع کرنے کا اہتمام کیا ہے ان میں ہمارے علم کے مطابق مولانا ظفر احمد عثمانی رحمۃ اللہ علیہ کی کتاب ''اعلاء السنن'' سب سے زیادہ جامع ہے، انہوں نے مولانا تھانوی کی سرپرستی میں یہ کام انجام دیا اور احادیث احکام کو بہت ہی خوش اسلوبی کے ساتھ ایک جگہ جمع کر دیا ہے، اس میں احادیث وآثار کی مجموعی تعداد چھ ہزار ایک سو بائیس (۶۱۲۲) ہے؛ جبکہ دوسری کتابیں جو اس موضوع پر ہیں، ان میں اس سے بہت کم تعداد ہیں ﴿وَفَوْقَ كُلِّ ذِي عِلْمٍ عَلِيمٌ﴾۔

احادیثِ احکام سے متعلق کتابیں دو طرح کی ہیں: ایک وہ جس میں مختلف مضامین کی احادیث ہیں؛ لیکن احادیثِ احکام کی بھی ایک بڑی تعداد اس میں شامل ہے، چاہے اس کی ترتیب فقہی ہو یا نہ ہو، فقہی ترتیب پر جو کتابیں ہوں ان کو سنن کہا جاتا ہے؛ ایسی کتابیں جو سنن نہیں ہیں؛ لیکن ان میں احکام سے متعلق حدیثیں بکثرت ہیں وہ بہت ہیں؛ لیکن ان میں مشہور اور اہم کتابیں یہ ہیں:

❁ بخاری شریف	:	امام محمد بن اسماعیل	متوفی: ۲۵۶ھ
❁ مسند ابوداود	:	طیالسی امام سلیمان بن داود طیالسی	متوفی: ۲۰۴ھ
❁ مسلم شریف	:	امام مسلم بن حجاج نیشاپوری	متوفی: ۲۶۱ھ
❁ المعجم الکبیر	:	امام ابوقاسم سلیمان بن احمد طبرانی	متوفی: ۳۶۰ھ
❁ صحیح ابن خزیمہ	:	امام محمد بن اسحاق بن خزیمہ	متوفی: ۳۱۱ھ
❁ المعجم الاوسط	:	امام ابوقاسم سلیمان بن احمد طبرانی	متوفی: ۳۶۰ھ
❁ مسند امام احمد بن حنبل	:	امام احمد بن محمد بن حنبل	متوفی: ۲۴۱ھ
❁ المعجم الصغیر	:	امام ابوقاسم سلیمان بن احمد طبرانی	متوفی: ۳۶۰ھ
❁ مسند بزار	:	امام ابوبکر احمد بن عمرو بن بزار	متوفی: ۲۹۲ھ

- مستدرک حاکم : امام ابوعبداللہ حاکم نیشاپوری متوفی: ۴۰۵ھ

جو کتب احادیث فقہی ترتیب پر جمع کی گئی ہیں، ان میں سے اہم کتابیں یہ ہیں:

- موطا امام مالک : امام مالک بن انس متوفی: ۱۷۹ھ
- موطا امام محمد : امام محمد بن حسن شیبانی متوفی: ۱۸۹ھ
- کتاب الآثار : امام یعقوب ابو یوسف متوفی: ۱۸۲ھ
- کتاب الآثار : امام محمد بن حسن شیبانی متوفی: ۱۸۹ھ
- مصنف ابن ابی شیبہ : ابوبکر عبداللہ بن محمد ابی شیبہ کوفی متوفی: ۲۳۵ھ
- مصنف عبدالرزاق : ابوبکر عبدالرزاق صنعانی متوفی: ۲۱۱ھ
- سنن ترمذی : امام محمد بن عیسیٰ بن سورہ ترمذی متوفی: ۲۷۹ھ
- سنن ابوداود : ابوداود سلیمان بجستانی متوفی: ۲۷۵ھ
- سنن نسائی : ابوعبدالرحمٰن احمد بن علی نسائی متوفی: ۳۱۵ھ
- سنن دارمی : امام عبداللہ بن عبدالرحمٰن دارمی متوفی: ۲۵۵ھ
- سنن ابن ماجہ : امام محمد بن زید بن ماجہ قزوینی متوفی: ۲۷۳ھ
- سنن دارقطنی : علی بن عمر دارقطنی متوفی: ۳۸۵ھ
- سنن بیہقی : حافظ ابوبکر احمد بن حسین بیہقی متوفی: ۴۵۸ھ

کچھ کتابیں وہ ہیں جن کے مصنفین نے کتب احادیث کی روایات کو جمع کرنے کی کوشش کی ہے اور ان میں احادیث احکام کا بہت بڑا حصہ آ گیا ہے؛ اس سلسلہ میں درج ذیل کتابیں خاص طور سے قابل ذکر ہیں:

- **جامع الأصول من أحاديث الرسول**: یہ کتاب علامہ ابن اثیر کی ہے، جس میں بخاری، مسلم، ترمذی، ابوداود، نسائی اور موطا امام مالک کی احادیث کو جمع کیا گیا ہے۔
- **مجمع الزوائد ومنبع الفوائد**: یہ حافظ علی بن ابی بکر ہیثمی کی تالیف ہے، جس

میں انہوں نے مسند احمد، مسند ابویعلی موصلی، مسند بزار اور طبرانی کی تینوں معاجم کی ان زائد احادیث کو جمع کیا ہے جو صحاح ستہ میں موجود نہیں ہیں اور ضعیف احادیث کے درجہ اور مقام کو واضح کرنے کی بھی کوشش کی گئی ہے، اس طرح اس میں احادیث کا ایک بہت بڑا ذخیرہ جمع ہو گیا ہے۔

- **الجامع الصغیر من احادیث البشیر النذیر**: یہ علامہ جلال الدین سیوطی رحمۃ اللہ علیہ کی تالیف ہے، جس میں انہوں نے (۱۰۱۳۱) حدیثیں سند کو حذف کر کے حروفِ تہجی کی ترتیب سے جمع کی ہیں اور ہر حدیث پر حدیث کے درجہ کی طرف رمزیہ الفاظ کے ذریعہ اشارہ بھی کیا ہے، پھر جو حدیثیں اس میں باقی رہ گئیں ان کو الفتح الکبیر کے نام سے جمع فرمایا، البتہ اس میں درجہ کی طرف اشارہ نہیں کیا گیا ہے، واقعہ ہے کہ ہر طرح کی حدیثوں کا یہ بہت بڑا ذخیرہ ہے؛ پھر اس کی بنیاد پر علامہ سیوطی رحمۃ اللہ علیہ نے الجامع الکبیر مرتب کی، جس میں قولی احادیث کی ترتیب حروفِ تہجی پر ہے اور فعلی احادیث کی ترتیب صحابہ کے نام پر ہے۔
- **جمع الفوائد من جامع الاصول ومجمع الزوائد**: یہ محمد بن سلیمان مغربی کی تالیف ہے، جنہوں نے علامہ ابن اثیر کی جامع الاصول اور علامہ ہیثمی کی مجمع الزوائد کی احادیث کو جمع کرنے کے علاوہ سنن ابن ماجہ اور سنن دارمی کی ان زائد احادیث کو بھی شامل کرلیا ہے جو صحاح ستہ میں موجود نہیں ہیں، اس کتاب میں حدیث کی چودہ اہم کتابوں کی احادیث یکجا ہو گئی ہیں اور اس طرح یہ کتاب احادیثِ نبوی کا عظیم انسائیکلوپیڈیا بن گئی ہے۔
- **کنز العمال فی سنن الأقوال والأفعال**: یہ علامہ علاء الدین علی متقی ہندی کی تالیف ہے، آپ رحمۃ اللہ علیہ نے پورے ذخیرہ احادیث کو موضوعات کی ترتیب پر مرتب فرمایا ہے، یہ کتاب اس وقت احادیث کا سب سے بڑا ذخیرہ ہے جو ۲۶۶۲۴/احادیث

وآثار پر مشتمل ہے۔

بعد کے اہلِ علم نے کتب احادیث سے سند کو حذف کر کے صرف احادیث احکام کو جمع کرنے کی سعی کی ہے، اس سلسلے میں درج ذیل کتب اہم ہیں:

- الاحکام : عبدالغنی مقدسی
- عمدالاحکام من سیدالانام : عبدالغنی مقدسی
- الالمام لاحادیث الاحکام : ابن دقیق العید
- المنتقی فی الاحکام : عبدالسلام بن عبداللہ بن تیمیہ حرانی
- بلوغ المرام من ادلۃ الاحکام : حافظ ابن حجر عسقلانی
- آثار السنن : علامہ ظہیر احسن شوق نیموی
- اعلاء السنن : مولانا ظفر احمد عثمانی رحمۃ اللہ علیہ

اس کے علاوہ احادیث احکام کا بہت بڑا حصہ ان کتابوں میں بھی آ گیا ہے جن میں کسی فقہی کتاب کی مرویات کی تخریج کی گئی ہے، اس سلسلہ میں یہ کتابیں نہایت اہم اور احادیث احکام سے متعلق فنی مباحث کی جامع ہیں: نصب الرایہ لاحادیث الھدایہ، الدرایہ فی تخریج احادیث الہدایہ، التلخیص الحبیر، البدرالمنیر فی تخریج الاحادیث والآثار الواقع فی الشرح الکبیر۔

احادیث احکام کے سلسلے میں دو اور خدمتیں قابل ذکر ہیں: ایک وہ جو مسند احمد بن حنبل پر کی گئی ہے، مسند احمد بن حنبل ۲۷۶۴۴ر احادیث پر مشتمل ہے، جو زیادہ تر صحیح اور حسن کے درجہ کی ہیں؛ مگر چونکہ اس کی ترتیب صحابہ کے ناموں پر ہے، اس لیے اس سے احادیثِ احکام کا نکالنا بہت دشوار کام تھا، علامہ احمد بن عبدالرحمٰن البنا نے الفتح الربانی کے نام سے اس کتاب کی مرویات کو فقہی ترتیب پر جمع کیا ہے اور اس کی نہایت عمدہ اور بصیرت افروز شرح بھی کی ہے، اس خدمت نے اہلِ علم کے لیے مسند احمد سے استفادہ کو آسان کر دیا ہے،

حدیث کی اہم خدمات میں ایک صحیح ابن حبان بھی ہے، جو کتبِ حدیث کی عام ترتیب سے مختلف ہے، اس لیے اس سے استفادہ دشوار تھا؛ چنانچہ کمال یوسف الحوت نے الاحسان بترتیب صحیح ابن حبان کے نام سے موضوع وار احادیث کو مرتب کیا ہے اور اس طرح فقہی موضوعات پر بھی اس کتاب سے استفادہ آسان ہوگیا ہے۔

یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ احکامِ شرعیہ میں عبادات اور حدود کا غالب ترین حصہ احادیث ہی پر مبنی ہے، اس لیے فقہ اسلامی کے مصادر میں حدیث کو خاص اہمیت حاصل ہے اور اس سلسلہ میں محدثین نے جو سعی بے پایاں کی ہے، مذاہب کی تاریخ میں اس کی مثال نہیں ملتی، فجزاھم اللہ خیر الجزا۔

آثارِ صحابہ

رسول اللہ ﷺ سے اس دین کو براہ راست حضرات صحابہ نے حاصل کیا ہے اور انہی کے واسطہ سے یہ دین پوری امت تک پہنچا ہے، صحابہ سب کے سب عادل، معتبر، خداترس اور مخلص تھے؛ لہٰذا ان کے اقوال اور آرا کی خاص اہمیت ہے، بعض مسائل تو ایسے ہیں جن میں رائے اور اجتھاد کی گنجائش ہے اور بعض مسائل وہ ہیں جسے کوئی شخص اپنے اجتھاد سے اخذ نہیں کرسکتا؛ بلکہ لازماً ان کی بنیاد قرآن وحدیث ہی پر ہوگی، اس دوسرے قسم کے مسائل میں صحابہ کی رائے احناف ومالکیہ کے نزدیک حجت اور دلیل ہے؛ اس لیے کہ ان کی رائے حضور ﷺ سے سنی ہوئی کسی بات پر ہی مبنی ہوگی، گویا یہ بھی حدیث ہی کے درجہ میں ہے، آثار صحابہ کے نقل کرنے کا زیادہ اہتمام مصنف ابن ابی شیبہ اور مصنف عبدالرزاق میں کیا گیا ہے اور موجودہ دور میں اس سلسلہ کی بہت قابلِ قدر خدمت، ابوعبداللہ سید بن کسروری نے کی ہے کہ انہوں نے اپنے علم ودانست کے مطابق تمام آثار صحابہ کو موسوعہ آثار الصحابہ کے نام سے تین جلدوں میں جمع کردیا ہے، جس میں آثار ہیں، آثار صحابہ حدیث ہی میں داخل ہیں۔

شرائع ماقبل

تمام پیغمبروں کے ذریعہ اللہ تعالی نے جو دین بھیجا ہے وہ ایک ہی دین ہے،

اعتقادی اور اخلاقی احکام میں ان کے درمیان کوئی فرق نہیں پایا جاتا ہے؛ اس لیے کہ اس کا سرچشمہ ایک ہی ذات ہے اور اگر عقیدہ واخلاق کی ہدایت میں کوئی فرق پایا جاتا ہو تو یقینی طور پر یہ انسانی تحریفات اور آمیزش کا نتیجہ ہے؛ البتہ عملی زندگی کے احکام جو فقہ کا اصل موضوع ہے، مختلف شریعتوں میں مختلف رہے ہیں؛ کیونکہ انسانی تمدن کے مرحلہ بہ مرحلہ ارتقا کا تقاضہ یہی تھا، پہلی قسم کے احکام کے بارے میں اللہ تعالی کا ارشاد ہے:

﴿شَرَعَ لَكُمْ مِّنَ الدِّيْنِ مَا وَصّٰى بِهٖ نُوْحًا وَّالَّذِيْٓ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ وَمَا وَصَّيْنَا بِهٖٓ اِبْرٰهِيْمَ وَمُوْسٰى وَعِيْسٰٓى اَنْ اَقِيْمُوا الدِّيْنَ وَلَا تَتَفَرَّقُوْا فِيْهِ﴾ (۱)

''اللہ تعالی نے تم لوگوں کے واسطے وہی دین مقرر کیا جس کا اس نے نوح (علیہ السلام) کو حکم دیا تھا اور جس کو ہم نے آپ کے پاس وحی کے ذریعہ سے بھیجا ہے اور جس کا ہم نے ابراہیم وموسی (علیہما السلام) کو (مع ان سب کے اتباع کے) حکم دیا تھا (اور ان کی امم کو یہ کہا تھا) کہ اس دین کو قائم رکھنا اور اس میں تفرقہ نہ ڈالنا۔

اور دوسری قسم کے احکام کے بارے میں ارشاد ہے:

﴿لِكُلٍّ جَعَلْنَا مِنْكُمْ شِرْعَةً وَّمِنْهَاجًا﴾ (۲)

''تم میں سے ہر ایک کے لیے ہم نے ایک (خاص) شریعت اور راہ رکھی ہے''

اس پس منظر میں سوال پیدا ہوتا ہے کہ گذشتہ شریعتوں کے احکام کی کیا حیثیت ہوگی، اس سلسلہ میں اہل علم نے جو گفتگو کی ہے اس کا خلاصہ یہ ہے کہ پچھلی کتابوں میں جو احکام آئے ہیں وہ چار طرح کے ہیں، اول وہ احکام جن کا قرآن وحدیث میں کوئی ذکر نہیں

(۱) الشوری :۱۳

(۲) المائدۃ :۴۸

ہے، بالاتفاق اس امت میں وہ احکام قابل عمل نہیں ہیں، دوسرے وہ احکام جن کا قرآن وحدیث میں ذکر آیا ہے اور یہ بات بھی واضح کردی گئی ہے کہ یہ حکم سابقہ امت کے لیے تھا، اس امت میں یہ حکم باقی نہیں بلکہ منسوخ ہو چکا ہے، اس کے بارے میں بھی کوئی اختلاف نہیں کہ امت محمدیہ میں اس حکم پر عمل نہیں کیا جائے گا، تیسرے وہ احکام ہیں جو قرآن وحدیث میں وارد ہوئے ہیں اور یہ بھی بتادیا گیا کہ یہ احکام اس امت کے لیے بھی ہیں، بالاتفاق اس شریعت میں بھی ان احکام پر عمل کیا جائے گا، چوتھے وہ احکام ہیں جن کو قرآن وحدیث نے پچھلی قوموں کی نسبت سے بیان کیا ہے؛ لیکن اس بات کی وضاحت نہیں کی گئی ہے کہ اس امت کے لیے یہ حکم باقی ہے یا نہیں؟ اس سلسلہ میں دو نظریہ ہیں، ایک تو یہ ہے کہ اس امت کے لیے بھی یہ حکم باقی ہے، احناف اسی کے قائل ہیں اور دوسرا نظریہ یہ ہے کہ اس امت کے لیے یہ حکم باقی نہیں (۱) لیکن یہ اختلاف عملی اعتبار سے زیادہ اہم نہیں ہے؛ کیونکہ عملاً شاید ہی کسی مسئلہ میں اس کی وجہ سے اختلاف رہا ہو، شرائع ماقبل جو منسوخ نہیں ہوئی ہیں وہ کتاب اللہ میں داخل ہیں۔

غیر منصوص مصادر

غیر منصوص مصادر اور بھی متعدد ہیں، جن کی تفصیل ذیل میں پیش کی جارہی ہے:

اجماع

جن شرعی دلائل کا ماخذ انسانی اجتہاد ہے ان میں سب سے قوی اجماع ہے اجماع سے مراد کسی رائے پر رسول اللہ ﷺ کی وفات کے بعد امت کے مجتہدین کا متفق ہوجانا؛ کیوں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ یہ امت کسی غلط بات پر متفق نہیں ہوسکتی؛ گویا امت کے افراد کے انفرادی اجتہاد میں تو خطا کا احتمال ہے؛ لیکن اجتماعی حیثیت میں وہ معصوم ہیں اور کسی غلط بات پر متفق نہیں ہوسکتے۔

---

(۱) الاحکام للآمدی:۱/۴۰۹،فیما ظن أنه دلیل صحیح ولیس کذلك .

اجماعی احکام میں کچھ تو وہ ہیں جن کی بنیاد احادیث پر ہے، یعنی ایک حکم خبر واحد سے ثابت ہوا اور بعد کو تمام فقہا اس پر متفق ہو گئے، اس طرح اس مسئلہ پر اجماع منعقد ہو گیا اور اجماع کی وجہ سے اس حکم نے قطعی اور یقینی حکم کا درجہ حاصل کر لیا اور کچھ احکام وہ ہیں جن کی بنیاد قیاس و مصلحت پر ہے اور اس میں اجتہاد اور ایک سے زیادہ نقطہ نظر کی گنجائش ہے، اس طرح کے احکام میں زیادہ تر اجماع کا انعقاد عہدِ صحابہ میں ہوا ہے؛ کیوں کہ اس عہد میں تمام مجتہدین کی آرا سے واقف ہونا آسان تھا، خاص کر سیدنا عمر فاروق ﷛ کو اللہ تعالیٰ نے اجتماعی غور و فکر اور شورائی اجتہاد کا خاص ذوق عطا فرمایا تھا، اس لیے ان کے عہد میں نسبتاً زیادہ اجماع منعقد ہوئے۔

اجماعی احکام پر اہم تالیف علامہ ابن منذر متوفی: ۳۱۸ھ کی کتاب الاجماع ہے، جس میں اجماعی مسائل کا ذکر آیا ہے، اس سلسلہ میں ایک اہم خدمت اس دور میں سعدی ابوحبیب نے کی ہے اور موسوعۃ الاجماع کے نام سے تمام اجماعی احکام کا احاطہ کرنے کی سعی کی ہے، اس کتاب میں اجماعی مسائل ذکر کئے گئے ہیں، یہ کتابیں ان معترضین کی تردید کرتی ہیں جن کے نزدیک اجماع کی کوئی اہمیت نہیں ہے اور وہ کہتے ہیں کہ عملاً اجماعی مسائل کا وجود نہیں۔

قیاس

غیر منصوص مصادر میں سے ایک قیاس بھی ہے، قیاس کے اصل معنی ایک چیز کو دوسری چیز کے برابر کرنے کے ہیں، کسی مسئلہ کے سلسلے میں قرآن وحدیث کی صراحت موجود نہ ہو؛ لیکن قرآن وحدیث میں اس سے ملتا جلتا کوئی مسئلہ موجود ہو اور اس مسئلہ میں اللہ اور رسول کے حکم کی جو وجہ ہو سکتی ہو وہ اس مسئلہ میں بھی موجود ہو؛ چنانچہ یہاں بھی وہی حکم لگا دیا جائے، اس کو قیاس کہتے ہیں، غور کیا جائے تو قیاس قرآن وحدیث کے مقابلہ میں دی جانے والی رائے نہیں ہے؛ بلکہ قیاس کے ذریعہ قرآن وحدیث کے حکم کے دائرہ کو وسیع کیا جاتا ہے۔

جن مسائل کی بابت نص موجود نہ ہوان میں قیاس پر عمل کیا جائے گا، یہ بات تقریبا متفق علیہ ہے، شرعی دلیلوں میں قیاس کو چوتھے درجہ پر رکھا گیا ہے؛ لیکن حدیث وقیاس یہ دونوں ایسے مصادر ہیں جن سے بیشتر فقہی احکام متعلق ہیں اور معاملات کے احکام کی بنیاد تو بڑی حد تک قیاس ہی پر ہے؛ اس لحاظ سے یہ نہایت اہم ماخذ ہے۔

دوسرے دلائل

ان دونوں کے علاوہ کچھ اور غیر منصوص مصادر ہیں جن سے وقتا فوقتا فقہ میں مدد لی جاتی ہے، مثلا:

استحسان

نص، اجماع، ضرورت و مصلحت، عرف وعادت اور غیر ظاہر لیکن نسبتا قوی قیاس کے مقابلہ میں ظاہری قیاس کو چھوڑ دینے کا نام استحسان ہے۔

مصالح مرسلہ

کتاب وسنت میں جن مصلحتوں کے معتبر ہونے کی صراحت ہے اور نہ نامعتبر ہونے کی، ان کو مصالح مرسلہ کہتے ہیں؛ اگر یہ شریعت کے مزاج اور عمومی ہدایات سے ہم آہنگ ہوں تو معتبر ہے۔

استصحاب

گذشتہ زمانہ میں کسی امر کے ثابت ہونے کی وجہ سے موجودہ یا آئندہ میں بھی اس کو موجود ہی مانا جائے تو اس کو اصطلاح میں استصحاب کہتے ہیں۔

عرف

لوگ زندگی کے امور اور معاملات میں جس قول، فعل یا ترک فعل کے عادی ہوگئے ہوں ان کو عرف وعادت کہتے ہیں، عرف کا بدلے ہوئے حالات کے پس منظر میں احکام کی

تبدیلی سے گہرا تعلق ہے۔

ذریعہ

ذریعہ کے معنی وسیلہ کے ہیں؛ لہٰذا اگر کوئی امر کسی واجب یا مستحب کا ذریعہ بنتا ہوتو وہ ذریعہ مطلوب ہوگا اوراس کو فتح ذریعہ کہتے ہیں اور حرام ومکروہ کا ذریعہ بنتا ہوتو وہ مذموم ہوگا، اس کو سدِ ذریعہ کہتے ہیں، پھر جو جس درجہ کا ذریعہ ہوگا اس نسبت سے اس کا حکم ہوگا۔

فقہ کی تدوین

ہر علم وفن کی تدوین اوراس کے ارتقا بتدریج پایہ کمال کو پہونچتا ہے، فقہ اسلامی پر بھی تدوین کے کئی مراحل گذر چکے ہیں۔

تدوین کا پہلا دوراوراس کی خصوصیات

آپ ﷺ کی رسالت ونبوت سن ۶۱۰ ء سے شروع ہوتی ہے اوروفات سن ۱۰ ھ مطابق سن ۶۳۲ ء میں ہوئی، اس دور میں فقہ کا سرچشمہ قرآن تھا، آپ ﷺ کے ارشادات اورآپ ﷺ کی مکی ومدنی زندگی کے حالات وواقعات قرآن کریم کی تشریح کی حیثیت رکھتے تھے، الغرض دورِ نبوت میں فقہ کا تمام تر مدار وحی پر تھا، چاہے وحی متلو قرآن کریم ہو یا غیر متلو احادیث مبارکہ۔(۱)

آپ ﷺ کے دور میں موجودہ زمانہ کی طرح فقہ مدون نہیں ہوا تھا، جس طرح بعد میں فقہا کرام نے ہر مسئلہ کی تحقیق وتفتیش کرکے اس کے ارکان وشرائط اور آداب وسنن کی وضاحت کردی، یہ تحدید زمانہ نبوت میں نہیں ملتی ہے، آپ ﷺ سے جو عمل جس طور پر صادر ہوتا، صحابہ کرام بعینہ بغیر کمی وبیشی کے اپنا لیتے، مثال کے طور پر آپ ﷺ کو جس طرح وضو کرتے اور نماز پڑھتے دیکھا صحابہ نے اسے اپنا لیا، انہوں نے اس بات کی تحقیق وجستجو نہیں کی کہ وضو میں کتنے ارکان اور کیا کیا ہیں؟ نماز میں کون فرض ہے؟ کون واجب اور کون سنت ہے؟(۱)

---

(۱) مقدمہ درمختار:۶/۱

(۲) تاریخ الفقہ الاسلامی، ص:۴۱

آپ ﷺ نے اپنے دور میں قرآن کریم کے علاوہ دیگر چیزوں کو لکھنے سے منع فرمادیا تھا(۱) حتی کہ احادیثِ مبارکہ کو تحریر کرنے سے بھی روک دیا تھا؛ تاکہ قرآن کریم کا غیر قرآن سے اختلاط نہ ہوجائے اور سابقہ امتوں کی طرح آسمانی کتابوں کا صلحا اور علما کے اقوال سے اختلاط ہوکر ان کی روحانیت اور اعجازی شان فنا نہ ہوجائے اور نہ محرف ہوجائے؛ چونکہ دورِ نبوت میں کاغذات اور پریس وغیرہ کی موجودہ سہولت نہ تھی؛ بلکہ ہڈیوں چمڑوں اور پتوں کو تحریر کے کام میں لاتے تھے؛ اس لیے قوی اندیشہ تھا کہ قرآن غیر قرآن سے خلط ملط ہوکر ضائع نہ ہوجائے؛ اگرچہ انفرادی طور پر جمع قرآن کے علاوہ جمع حدیث کے تعلق سے بھی کام ہوا۔(۲)

آپ کی ممانعت کی وجہ سے حدیث وفقہ کی باضابطہ تدوین کا آغاز آپ ﷺ کے دور میں نہ ہوسکا۔

تدوین کا دوسرا دور اور اس کی خصوصیات

یہ خلفاِ راشدین اور کبارِ صحابہ کرام کا دور ہے، نبی کریم ﷺ کی وفات کے بعد سن ۱۱ھ سے خلفا راشدین اور دیگر کبار صحابہ کا دور شروع ہوتا ہے اور یہ دور سن ۴۰ھ میں اختتام کو پہونچتا ہے، آپ ﷺ کی وفات کے بعد فتوحات اسلامی کا لامتناہی سلسلہ شروع ہوا، بالخصوص حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے دور خلافت میں تو ہر روز کوئی نہ کوئی علاقہ مملکتِ اسلامیہ میں داخل ہوتا تھا، صحابہ کرام رضی اللہ عنہم "بلغوا عني ولو آية "(۳) کے تحت اسلام کا پیغام پہونچانے کے لیے چہاردانگِ عالم میں پھیل گئے جس کی وجہ سے مسلمانوں کا دوسری اقوام سے اختلاط بڑھتا گیا، بعض عجمی اقوام دامن اسلام میں آئیں اور نئے نئے مسائل وواقعات درپیش ہونے لگے،

---

(۱) حجة الله البالغه:۱/۲۹۷،باب أسباب اختلاف الصحابة والتابعين .
(۲) مسلم ، باب تحريم مكة وصيدها وخلاها ،حدیث نمبر:۲۴۱۴
(۳) بخاری ، باب ما ذكر عن بني اسرائيل ،حدیث نمبر:۳۲۰۲

صحابہ کرام کو ان حوادث اور واقعات کا حکم شرعی معلوم کرنے اور جاننے کی فکر لاحق ہوئی؛ چنانچہ خلفا راشدین اور کبارِ صحابہ جو فتوی دینے کی اہلیت رکھتے تھے، قرآن وحدیث کی طرف رجوع ہوئے اور قرآن وحدیث کے قواعد وجزئیات کو سامنے رکھ کر احکام شرعی بیان کرنا شروع کیا، جو حکم قرآن وحدیث میں مذکور نہ ہوتا تو آپس میں مشورہ کرتے اور اجتہاد واستنباط سے کام لیتے، اس شورائی اور اجتماعی اجتہاد کے ذریعہ بہت سے مسائل حل ہوئے۔(۱)

فقہاء صحابہ

علامہ ابن خلدون نے تحریر کیا ہے کہ صحابہ سب کے سب، صاحب فتوی نہ تھے اور نہ ہی ان سب سے دین کا علم حاصل کیا جاتا تھا؛ بلکہ دین کے خصوصی معلمین حاملین قرآن تھے، جو قرآن کے ناسخ ومنسوخ، متشابہ ومحکم اور اس کے سارے دلائل سے پوری طرح واقف تھے؛ انھوں نے یا تو نبی اکرم ﷺ سے براہِ راست تعلیم وتربیت حاصل کی تھی یا ان جلیل القدر صحابہ سے اکتساب فیض کیا تھا جنہوں نے براہِ راست نبی اکرم ﷺ سے فیض پایا تھا، ان حضرات کو اس زمانہ میں قراء کہا جاتا تھا، صحابہ کرام ﷡ میں ایک سوتیس افراد فقہ وفتاوی کی رونق تھے، جن میں مرد بھی تھے اور عورتیں بھی، (۲) ان میں سے سات صحابہ کرام اپنی فقہی خدمات اور کثرت فتاوی کی وجہ سے مکثرین کہلاتے ہیں؛ کیوں کہ ان حضرات کے فتاوی کثرت سے منقول ہیں، ان کے اسما گرامی یہ ہیں:

○ حضرت عمر بن خطاب ﷛ ○ حضرت علی بن طالب ﷛ ○ حضرت عبداللہ بن مسعود ﷛ ○ ام المومنین حضرت عائشہؓ ○ حضرت زید بن ثابت ﷛ ○ حضرت عبداللہ بن عباس ﷛ ○ حضرت عبداللہ بن عمر ﷛۔(۳)

---

(۱) كنز العمال :۶۲۹/۵، باب حد الزنا، حدیث نمبر:۱۳۴۷۷

(۲) مقدمة ابن خلدون :۲۲۵/۱، الفصل السابع علم الفقه وما يتبعه من الفرائض

(۳) إعلام الموقعين :۱۲/۱، المكثرون من الفتيا .

جو صحابہ فقہ وفتاوی میں متوسط تھے ان کی تعداد تیرہ تھی:

○ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ ○ حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا ○ حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ ○ حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ ○ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ ○ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ ○ حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ ○ حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ ○ حضرت ابوموسی اشعری رضی اللہ عنہ ○ حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ ○ حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ ○ حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ ○ حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ۔

ان حضرات کے علاوہ جو صحابہ ہیں، انہیں مقلین کہا جاتا ہے، یعنی ان حضرات سے صرف ایک یا دو فتاوی منقول ہیں۔(۱)

تدوین کا تیسرا دور اور اس کی خصوصیات

یہ دور پہلی صدی کے نصف آخر سے چوتھی صدی کے نصف اول تک ہے، اس دور کی چند خصوصیات درج ذیل ہیں:

(الف) اس دور میں داخلی سیاسی کشمکش میں شدت پیدا ہوگئی، شیعہ اور خوارج کے گروہ مضبوط ہوئے جن کی بنیاد عہد عثمانی اور عہد علوی ہی میں پڑ چکی تھی، انہوں نے باہم تکفیر وتفسیق کا بازار گرم کر رکھا تھا دوسری طرف مملکت اسلامیہ کا دائرہ چین کی سرحدوں سے اندلس تک پھیل گیا، صحابہ اس عہد میں فتوحات کے ساتھ دوسرے ممالک میں پھیلتے چلے گئے۔(۲)

(ب) یہ دور چونکہ زمانہ نبوت سے قریب تھا، جس کی وجہ سے اس دور کے لوگوں میں دینی مزاج راسخ اور پختہ تھا، وہ ہر بات کے لیے سند کے طلب گار ہوتے تھے، اس لیے کہ بعض فرقوں نے احادیث گھڑنا اور آپ کی طرف منسوب کرنا شروع کردیا؛

---

(۱) حوالہ سابق

(۲) مقدمة ابن خلدون :۲۵۶/۱،الفصل السابع علم الفقه وما يتبعه من الفرائض

چنانچہ اسی دور میں وضع حدیث کا سلسلہ بھی شروع ہوا۔

(ج) اس دور میں سب سے بڑا کام تدوین حدیث کا ہوا اور اس دور میں حدیث کے مشہور ائمہ کرام کی قیادت کو جمہور نے تسلیم کیا، اسی دور میں حضرت عمر بن عبدالعزیز کو اندیشہ ہوا کہ کہیں یہ احادیث کا ذخیرہ اور صحابہ کرام کے فتاوی اور اقوال ضائع نہ ہو جائیں، ادھر قرآن کا غیر قرآن سے اختلاط کا خوف بھی نہ تھا؛ کیونکہ قرآن کریم سینوں اور اوراق میں محفوظ ہو چکا تھا، حفاظ کرام ہزاروں کی تعداد میں پائے جاتے تھے، کوئی ایسا گھر نہ تھا جہاں قرآن کریم کا نسخہ موجود نہ ہو؛ لہٰذا حضرت عمر بن عبدالعزیز نے تدوین حدیث کی طرف توجہ فرمائی اور حاملین علوم حدیث کو اس کی تدوین کا حکم دیا؛ چنانچہ آپ کے حکم پر ابنِ شہاب زہری نے اسلامی تاریخ میں سب سے پہلے یہ کام انجام دیا۔(۱)

(د) اس عہد کی ایک خصوصیت یہ تھی کہ صحابہ چونکہ مختلف علاقوں میں پھیل گئے اس لیے ہر علاقہ کے فقہی مسالک پر ان کا اثر ہوا؛ چنانچہ حضرت عبداللہ بن عباس مکہ میں رہے تو امام شافعی کی فقہ پر ان کے گہرے اثرات پڑے اور آپ نے زیادہ تر انہی کی روایات پر اپنی فقہ کی بنیاد رکھی، کوفہ میں حضرت عبداللہ بن مسعود قیام پذیر تھے اور آپ کے علوم کے حامل حضرت ابراہیم نخعی تھے تو امام ابوحنیفہ کی فقہ کا غالب ترین حصہ انہی سے ماخوذ ہے، اسی طرح جن علاقوں میں صحابہ پہونچے وہاں ان کا منہج فکر زیادہ مشہور رہا۔

(ھ) یہ دور سابقہ ادوار سے اس اعتبار سے بھی امتیازی حیثیت رکھتا ہے کہ اس دور میں فقہی نقطۂ نگاہ سے علماء دو گروہ میں منقسم ہو گئے اور دو مدرسہ فکر وجود میں آئے، ایک حجاز، وہاں کے فقہاء اہل حجاز اور اصحاب حدیث سے مشہور ہوئے، دوسرا عراق میں

(۱) تاریخ الفقہ الاسلامی، ص:۸۳

اور یہاں کے فقہا اہل عراق اور اصحاب الرائے سے مشہور ہوئے۔(۱)

دونوں مدرسوں کا نہج اور طرزِ تعلیم کسی قدر مختلف اور جداگانہ تھا، مدرسہ حجاز کی بنیاد کتاب وسنت کے ظاہر اور الفاظ پر تھی اور یہاں کے علما رائے اور قیاس سے حتی الامکان اجتناب کرتے، مدرسہ عراق کے علما اور اساتذہ نصوص کے الفاظ کے ساتھ معانی میں بھی غواصی کرتے، شریعت کے اصل منشا کو پیش نظر رکھتے اور روایت ودرایت کو ساتھ لیکر چلتے۔(۲)

(و) اس دور میں باب وار فقہی احکام کی ترتیب کے مطابق جمع حدیث کا آغاز ہوا؛ چنانچہ بہت سے آئمہ نے احادیث کو فقہی ترتیب کے مطابق ایک مکمل کتابی اور فنی صورت میں مرتب کیا، مدینہ میں امام مالک نے، کوفہ میں امام ابوحنیفہ اور سفیان ثوری نے، بصرہ میں حماد بن سلمہ اور شام میں عبدالرحمٰن بن اوزاعی نے، مکہ میں عبدالعزیز ابن جریج نے اور خراسان میں عبداللہ بن مبارک نے احادیث کی تدوین شروع کی۔(۳)

پھر اسی دور کے اواخر میں احادیث کے بڑے بڑے مجموعے صحیح اور مستند طریقہ سے مرتب ہوئے، بعض میں صرف احادیث صحیحہ کے جمع کرنے کا التزام کیا گیا اور ضعیف وغیر مستند احادیث کو اس میں جگہ دینے سے اجتناب کیا گیا اور اس سلسلہ کی مشہور کتابوں میں صحاحِ ستہ خصوصیت کے ساتھ قابلِ ذکر ہیں، جسے امت نے صحیح ترین مجموعہ تسلیم کیا ہے اور وہ یہ ہیں: ◆ بخاری ◆ مسلم ◆ ابوداود ◆ ترمذی ◆ ابن ماجہ ◆ نسائی۔

پھر اس دور میں صحیح اور غیر صحیح مستند، قوی اور ضعیف حدیث کے درمیان امتیاز

---

(۱) مقدمة ابن خلدون :۲۲۷/۱،الفصل السابع علم الفقه وما يتبعه من الفرائض

(۲) مقدمه الموسوعة الفقهية:۲۷/۱

(۳) مقدمه الموسوعة الفقهية:۲۸/۱

کے لیے فن اسماء رجال مرتب ہوا اور اس فن پر بڑی بڑی کتابوں کی تصنیف ہوئی۔(۱)

(ز) اس عہد میں قواعد فقہ اور فن اصول فقہ کا بھی وجود ہوا اور اس کی باقاعدہ تدوین وترتیب عمل میں آئی۔(۲)

(ح) فقہی اصطلاحات کا ظہور بھی اسی دور میں ہوا، یعنی جائز و ناجائز، حلال و حرام، مکروہ ومستحب، فرض، واجب وغیرہ کی درجہ بندی گو عملاً یہ درجات پہلے بھی پائے جاتے تھے۔(۳)

(ط) اس دور میں چار بڑے مکاتب فقہ وجود میں آئے اور ہر مکتب فکر کے لحاظ سے فقہی کتب کی تدوین وترتیب کا سلسلہ شروع ہوا۔(۴)

یہ تو طئے ہے کہ اسلام ایک ہمہ گیر وسیع اور دائمی نظام حیات ہے اور اس نے اپنی اس امتیازی شان ہمہ گیری اور دائمی حیثیت کی بقا کے واسطے اپنے اندر ایک ایسی لچک اور گنجائش رکھی ہے کہ ہر دور میں اور ہر جگہ انسانی ضرورت کا ساتھ دے سکے اور کسی منزل پر اپنے پیرو کی رہبری سے قاصر نہ رہے؛ چنانچہ علماء ربانیین نے اس ضرورت کا احساس کیا اور اس کے لیے سب سے پہلے سراج الامت حضرت امام ابوحنیفہ متوفی: سن ۸۰ھ آمادہ ہوئے۔(۵)

فقہ حنفی

ائمہ اربعہ جن کے مذاہب اس وقت دنیا میں رائج ہیں، ان میں امام ابوحنیفہ اپنے علم وفضل اور سن وسال میں سب سے مقدم تھے اور بالواسطہ یا بلاواسطہ تمام ائمہ آپ کے فیض یافتہ تھے، امام اعظم ابوحنیفہ رحمہ اللہ کو ایک طرف تابعی ہونے کا شرف حاصل ہے، جو بقیہ ائمہ

---

(۱) فیض الباری:۱/۱۴

(۲) تاریخ الفقہ الاسلامی ،ص:۱۰۲

(۳) چراغِ راہ،ص:۳۴۵

(۴) تاریخ التشریع الاسلامی ،ص:۱۴۴

(۵) فیض الباری :۱/۱۴

میں سے کسی کو حاصل نہیں، دوسری طرف آپ عمر میں ان میں سب سے بڑے ہیں، ملا علی قاری امام ابوحنیفہ کے فضائل مناقب میں تحریر فرماتے ہیں:

" الحاصل أن التابعي أفضل الأمة بعد الصحابة و نعتقد أن الإمــام الأعـظـم والهــمــام الأقـدم أبو حنيفة أفضل الـمـجتهـديـن وأكمل الفقهاء في علوم الدين ثم الإمام مالك ؛ فإنه من اتباع الدين ثم الإمام الشافعي ؛ لكونه تـلـميذ الإمام مالك ؛ بل تلميذ الإمام محمد ثم الإمام أحمد بن حنبل ؛ فإنه كتلميذ الشافعي " (۱)

"حاصل یہ ہے کہ تابعین کا درجہ صحابہ کرام کے بعد امت میں سب سے بڑھا ہوا ہے، اسی وجہ سے ہمارا اعتقاد ہے کہ امام اعظم ابوحنیفہ کا مرتبہ ائمہ مجتہدین میں سب سے اونچا ہے اور فقہا علوم دینیہ میں آپ سب سے بلند واکمل ہیں، آپ کے بعد امام مالک کا درجہ ہے، جو تبع تابعین کی صف میں ہیں؛ پھر امام شافعی کا اس لیے کہ آپ امام مالک؛ بلکہ امام محمد کے شاگرد ہیں؛ پھر امام احمد کا جو امام شافعی کے شاگرد کے درجہ میں ہیں"

امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا منہج استنباط

مسائل کی تحقیق وتخریج میں امام ابوحنیفہ کا طریقہ اجتہاد کیا تھا؟ اس کی وضاحت کرتے ہوئے خود امام ابوحنیفہ نے فرمایا ہے میں سب سے پہلے کتاب اللہ کی طرف رجوع کرتا ہوں؛ اگر اس میں مسئلہ نہیں ملتا ہے تو سنت رسول کی طرف رجوع ہوتا ہوں اور اگر اس میں بھی کوئی مسئلہ نہیں ملتا ہے تو پھر اقوال صحابہ کی طرف رجوع کرتا ہوں اور جس صحابی کا قول

(۱) مقدمہ فتاوی دار العلوم: ۱/۴۳

کتاب وسنت سے زیادہ قریب معلوم ہوتا ہے اسے اختیار کرلیتا ہوں؛ لیکن اقوال صحابہ کے دائرہ سے قدم باہر نہیں نکالتا؛ لیکن جب صحابہ کے بعد معاملہ ابراہیم، شعبی، ابن سیرین، حسن، عطا اور سعید ابن مسیّب وغیرہ تک جاتا ہے تو یہ وہ لوگ تھے جو اجتہاد کرتے تھے اور میں بھی ان کی طرح اجتہاد کرتا ہوں۔(۱)

علامہ مکی نے مناقب میں امام ابوحنیفہ کے طریقہ اجتہاد کی وضاحت کرتے ہوئے لکھا ہے کہ آپ حسب ضرورت قیاس سے کام لیتے تھے، اس سے کام نہ چلتا تو استحسان کو اپناتے اور اس سے بات نہ بنتی تو تعامل مسلمین کو دلیل بناتے۔(۲)

غرض امام ابوحنیفہ کے نزدیک مصادر فقہ اور اصولِ استنباط سات تھے:

● کتاب اللہ ● سنتِ رسول ﷺ ● اقوالِ صحابہ ● اجماعِ امت ● قیاس ● استحسان ● عرف یعنی تعاملِ ناس، مزید تفصیلات آئندہ فقہ حنفی کی تدوین کے ذیل میں آرہی ہیں۔

فقہ مالکی

یہ فقہ امام دارالہجرت مالک بن انس کی طرف منسوب ہے، فقہ مالکی اہل سنت والجماعت کا دوسرا بڑا فقہی مسلک ہے اس کی نشوونما مدینۃ الرسول میں ہوئی، جو مہبط وحی مسکن رسول اور ہزاروں جلیل القدر صحابہ کا ماوی وملجا تھا اور یہاں سے پورے حجاز میں اس کی اشاعت ہوئی؛ پھر بصرہ، مصر، افریقہ، اندلس وغیرہ میں اس کو غلبہ حاصل ہوا، امام مالک کے اصول میں سے سب سے اہم چیز علامہ ابن خلدون کے بقول اہلِ مدینہ کا تعامل تھا۔(۳)

امام مالک تقریباً پچاس سال درس وافتا میں مشغول رہے، طلبہ اور عوام جو مسائل

---

(۱) مقدمہ فتاوی تاتارخانیہ:۱/۱۳۲، المدخل، ص:۱۳۹

(۲) مناقب للمکی، ص:۷۵

(۳) مناقب للمکی، ص:۷۵

آپ سے پوچھتے تھے آپ کے شاگردان مسائل کے جوابات یاد کر لیتے یا لکھ لیتے تھے، آپ کی وفات کے بعد آپ کے شاگردوں نے آپ کے جوابات اور فقہی اقوال و آرا کو مدون کیا، یہ مجموعہ فقہ مالکی کے نام سے مشہور ہوا۔

امام مالک رحمہ اللہ کا طریقۂ اجتہاد

امام مالک کا طریقہ اجتہاد اور منہج استنباط یہ تھا کہ اگر کوئی مسئلہ درپیش ہوتا تو آپ سب سے پہلے کتاب اللہ کی طرف مراجعت فرماتے اور اگر اس مسئلہ کی کتاب اللہ میں کوئی صراحت نہیں ملتی تو پھر آپ سنتِ رسول ﷺ کی طرف متوجہ ہوتے؛ اگر اس میں بھی کوئی حکم شرعی نہیں ملتا تو پھر اقوالِ صحابہ، تعامل مدینہ، قیاس، اجتہاد، استحسان اور سد ذرائع کی طرف متوجہ ہوتے۔(۱)

فقہ شافعی

یہ فقہ امام محمد بن ادریس شافعی کی طرف منسوب ہے، اس کی نشو ونما مکہ مکرمہ میں ہوئی اور پھر اطراف واکناف عالم میں پھیل گئی اور امام شافعی نے اولا مالک بن انس کی خدمت میں رہ کر ان کے مناہج استنباط اور اصول استنباط وطرق اجتہاد سے خوب آگاہی حاصل کی؛ پھر امام اعظم کے معتمد شاگردِ رشید امام محمد بن الحسن الشیبانی کی صحبت میں رہ کر فقہ حنفی کے مناہج اور اس کے اصول وکلیات کو اپنے سینہ میں محفوظ کیا اور پھر دونوں مکاتب فقہ کا نچوڑ وماحصل فقہ شافعی کی صورت میں مدون کر کے ایک نئی راہ قائم کی، آپ کی فقہ دو حصوں پر مشتمل ہے: فقہ شافعی قدیم اور فقہ شافعی جدید۔

فقہ شافعی قدیم فقہ شافعی کا وہ حصہ ہے جسے امام شافعی نے عراق میں آ کر مرتب کیا تھا، اس میں عراقی رنگ کا غلبہ ہے۔

فقہ شافعی جدید یہ وہ حصہ ہے جسے آپ نے مصر میں آ کر مرتب کیا تھا، اس میں

(۱) المدخل، ص:۱۵٦

حجازی رنگ کا غلبہ ہے، فقہ شافعی میں عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ کی فقہی آرا اور ان کے مناہج فکر سے بہت فائدہ اٹھایا گیا ہے۔(۱)

امام شافعی رحمہ اللہ کا منہج استنباط

ائمہ اربعہ میں سے امام شافعی وہ خوش بخت انسان ہیں جنھیں اپنے مناہج فکر اور اصول استنباط واستخراج کو خود مدون کرنے کا موقع ملا ہے، امام صاحب کی تحریرات سے معلوم ہوتا ہے، وہ بالترتیب سات ادلہ کو پیش نظر رکھ کر مسائل مستنبط کرتے تھے:

۱) اولا کتاب اللہ کی طرف رجوع کرتے اور اسے اپنے مسائل کی بنیاد بناتے۔
۲) اگر کتاب اللہ میں حکم نہیں ملتا تو سنت رسول کی طرف متوجہ ہوتے۔
۳) اگر سنت رسول میں کوئی حکم نہیں ملتا تو پھر اجماع امت کا سہارا لیتے۔
۴) اگر ان تینوں میں حکم نہیں ملتا ہے تو پہلے کتاب اللہ کی روشنی میں قیاس کرتے۔
۵) پھر سنت رسول ﷺ کی روشنی میں قیاس کرتے۔
۶) اجماع کی روشنی میں قیاس کرتے۔
۷) اور آخر میں مختلف فیہ احکام پر قیاس کرتے۔(۲)

فقہ حنبلی

فقہ حنبلی امام احمد بن حنبل کی طرف منسوب ہے، امام احمد بن حنبل بلند پایہ محدث ہونے کے ساتھ ساتھ فقہ شافعی کے سربراہ امام شافعی سے فقہ میں کمال پیدا کیا اور ان کی خدمت میں رہ کر ان کے اصول اور مصادر فقہ سے پوری طرح واقفیت حاصل کی اور پھر حدیث وفقہ کے امتزاج سے ایک نئے فقہی مسلک کی بنیاد ڈالی، جو فقہ حنبلی کے نام سے موسوم ہوئی، آپ کی فقہ بہت سادہ اور زیادہ تر نصوص کے ظاہر تک محدود ہے؛ کیونکہ آپ عقل

(۱) کشف الظنون:۲/۱۲۸۵
(۲) المدخل،ص:۱۵۹

ودرایت سے کام لینے کے زیادہ قائل نہ تھے، آپ کی فقہ کی بنیاد دراصل احادیث وآثار پر ہے، قیاس واجتہاد کو اس میں بہت کم دخل ہے، اس لیے بعض بعض مسائل میں امام صاحب کے سات سات اقوال بھی ملتے ہیں۔(۱)

امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ کا طریقہ اجتہاد

وہ اصول استنباط اور مناہج استخراج جن پر امام احمد بن حنبل نے اپنے فقہ وفتاوی کی بنیاد رکھی ہے، علامہ ابن قیم حنبلی رحمہ اللہ کی تحقیق کے مطابق چار ہیں:

۱) نصوص: امام صاحب جب کسی مسئلہ میں قرآن وحدیث کی نص پاتے تو اس کے مطابق فیصلہ فرماتے اور اس کے خلاف جو اقوال وفتاوی ہوتے ان کا اعتبار نہیں کرتے۔

۲) فتاوی صحابہ: اگر کسی مسئلہ میں نص نہیں ملتی اور اس مسئلہ میں کسی صحابی کا فتوی ہوتا، اس کو اختیار کرتے اور صحابہ کے اقوال کے دائرہ سے باہر نہیں نکلتے۔

۳) اگر کسی مسئلہ میں مرفوع اور صحیح حدیث نہیں ملتی تو حدیث مرسل اور ضعیف کو اپنے فتوی کی بنیاد بنالیتے۔

۴) ضرورۃً ہی قیاس سے کام لیتے۔(۲)

دیگر فقہی مکاتب

ائمہ اربعہ کے فقہی مکاتب ان کے طریقہ کار اور اصول فقہ کی تدوین کے ساتھ اسی دور میں بعض دیگر ائمہ مجتہدین کے فقہی مکاتب بھی وجود میں آئے، جو اپنی قوت اجتہاد اور لیاقت استنباط میں نہایت اعلی درجہ کے حامل تھے؛ مگر اللہ تعالی کے یہاں یہ بات مقدر نہیں تھی کہ ان کے مذہب کو بقاواستحکام حاصل ہو؛ چنانچہ کم ہی عرصہ میں وہ مذاہب ناپید ہوگئے؛

---

(۱) فقہ شافعی اور اس کی خصوصیات سہ ماہی بحث ونظر شمارہ، ص:۱۵

(۲) المدخل، ص:۱۲۲

البتہ ان کی چیدہ چیدہ آرا کتابوں میں اب بھی موجود ہیں، ان میں سے پانچ شخصیتیں خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

امام اوزاعی

آپ کا پورا نام ابوعمر عبدالرحمٰن بن محمد ہے، یمن کے قبیلہ ذی الکلاع کی ایک شاخ اوزاع تھی، اس نسبت سے اوزاعی کہلائے، ۸۸ھ میں شام میں پیدا ہوئے اور ۱۵۷ھ میں وفات پائی، حدیث کے بڑے عالم تھے، اصحاب حدیث کی جماعت سے تعلق تھا اور قیاس سے اجتناب کرتے تھے، شام اور اندلس کے علاقہ میں ان کے مذہب کو قبولیت حاصل ہوئی، لیکن جلد ہی ان کے متبعین ناپید ہو گئے۔(۱)

سفیان ثوری

ابوعبداللہ سفیان بن سعید ثوری ۹۷ھ میں کوفہ میں پیدا ہوئے اور ۱۴۱ھ میں بصرہ میں وفات پائی، فقہ اور حدیث دونوں پر آپ کی گہری نظر تھی، عام طور پر آپ کی آرا امام ابوحنیفہ کی آرا کے قریب قریب ہوتی تھی، ابتدا امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ سے چشمک تھی پھر بعد کو غلط فہمی دور ہو گئی اور امام ابوحنیفہ کے قدرداں ہو گئے۔(۲)

لیث بن سعد

یہ مصر میں پیدا ہوئے اور وہیں ۱۷۵ھ میں وفات پائی، کہا جاتا ہے کہ تفقہ میں ان کا درجہ امام مالک اور امام شافعی رحمہ اللہ سے کم نہیں تھا، خود امام شافعی رحمہ اللہ ان کو امام مالک سے زیادہ فقیہ قرار دیتے تھے، لیکن ان کے مذہب کو زیادہ رواج حاصل نہ ہوسکا اور جلد ہی ختم ہو گیا۔(۳)

---

(۱) تذکرۃ الحفاظ، ص: ۱۷۰-۱۷۲، تاریخ التشریع الاسلامی لخضری بک، ص: ۱۹۰

(۲) تاریخ التشریع الاسلامی، ص: ۱۷۰

(۳) تاریخ التشریع الاسلامی، ص: ۱۹۹

داؤد ظاہری

آپ کا پورا نام ابو سلیمان داود بن علی اصفہانی ہے، ۲۰۰ھ میں کوفہ میں پیدا ہوئے اور ۲۷۰ھ میں وفات پائی ابتدا میں فقہ شافعی کے متبع تھے، بعد میں پھر اپنے مسلک کی بنیاد رکھی ،ظاہر نص پر عمل کرنے میں غلو تھا اور اس غلو کی وجہ سے بعض آرا حد معقولیت سے گذر جاتی تھی، داؤد ظاہری نے بہت سی کتابیں بھی تالیف کی ہیں، اس مکتب فکر کی نمائندہ شخصیت علامہ ابن حزم اندلسی (متوفی: ۴۵۶ھ) ہیں؛ جنہوں نے اپنی معروف کتاب المحلی لکھ کر اصحاب ظواہر کی فکری آراء کو محفوظ کر دیا ہے، انہی کی الاحکام فی اصول الاحکام بھی ہے، جس میں اصحاب ظواہر کے اصول فقہ مدون ہیں، پانچویں صدی ہجری تک یہ مذہب باقی تھا، پھر اس کا نام ونشان مٹ گیا، (۱) موجودہ دور میں سلفیت کو اس دبستان فقہ کا احیا قرار دیا جا سکتا ہے۔

ابن جریر طبری

ابو جعفر محمد بن جریر طبری ۲۲۴ھ میں طبرستان میں پیدا ہوئے ، ۳۱۰ھ میں وفات پائی، انہوں نے فقہ حنفی، فقہ مالکی اور فقہ شافعی تینوں کو حاصل کیا، لیکن کسی کی تقلید نہیں کی اور خود اجتہاد کیا، تفسیر طبری اور تاریخ طبری ان کی مشہور کتابیں ہیں، جو بعد کے اہل علم کیلئے اولین مراجع کا درجہ رکھتی ہیں، اسی طرح فقہی اختلافات پر کتاب اختلافات الفقہاء چھپ چکی ہے، ختم ہو جانے والے مذاہب میں اسی کو زیادہ دنوں تک زندگی حاصل رہی، پانچویں صدی کے نصف تک بہت سے لوگ اس فقہ پر عامل تھے۔ (۲)

تدوین کا چوتھا دور

یہ دور تقلید شخصی کا دور ہے اور امت کا سواد اعظم تقلید شخصی کا پابند ہے اور امت کے علما

(۱) تاریخ التشریع الاسلامی ،ص:۱۹۲

(۲) تاریخ التشریع الاسلامی،ص:۱۹۹

نے ائمہ اربعہ امام ابوحنیفہ، امام مالک، امام شافعی، امام احمد بن حنبل میں سے کسی ایک کی تقلید کو امت کے لیے لازم اور ضروری قرار دیا ہے؛ چنانچہ اس دور میں بڑے بڑے علما نے ان ائمہ کی تقلید کو اپنے لیے ضروری تصور کیا اور اس پر عمل کیا اور آج تک پوری امت سوائے چند حضرات کے تقلید شخصی کے وجوب کے قائل ہیں۔(۱)

تدوین کا پانچواں دور

چوتھی صدی کے نصف آخر سے عصر حاضر تک ہے، اس دور کی چند خصوصیات درجِ ذیل ہیں:

(الف) اس دور کے اہم امور میں سے یہ ہے کہ فقہی کتابوں کی طباعت شروع ہوئی اگر اس زمانہ میں کتابوں کی طباعت نہ ہوتی تو آج اتنی کتابیں میسر نہ ہوتیں۔(۲)

(ب) فقہ کے قواعد اور اصطلاحات کتابی شکل میں جمع کیے گئے۔(۳)

(ج) اسی عہد میں شخصی اور عائلی مسائل کو کتابی شکل میں جمع کیا گیا۔(۴)

(د) اسی عہد میں فقہی تطبیقات کی تدوین اور کتب فتاوی کی تالیف ہوئی گو اس کا آغاز پہلے ہی ہو چکا تھا؛ مگر اس دور میں اس کی کثرت ہوگئی اس لیے جو حضرات سرکاری مفتی کی حیثیت سے کام کرتے تھے یا بلند پایہ علما جن سے عوام الناس استفادہ کرتے تھے وہ اپنے فتاوی کو کتابی صورت میں جمع کرتے تھے ان میں سے اکثر کتب فتاوی ابواب فقہی پر مرتب کی گئی ہیں۔(۵)

(ھ) اس عہد میں کتبِ فتاوی کی اہم کتابیں تصنیف کی گئیں، مثلاً فتاوی تاتارخانیہ، فتاوی

---

(۱) المدخل، ص:۱۷۱-۱۸۲

(۲) تاریخ الفقہ الاسلامی، ص:۱۸۷

(۳) تاریخ الفقہ الاسلامی، ص:۱۸۷

(۴) تاریخ الفقہ الاسلامی، ص:۱۸۷

(۵) تاریخ الفقہ الاسلامی، ص:۱۹۵

خانیہ، فتاوی حامدیہ، فتاوی ہندیہ وغیرہ۔(۱)

(و) اسی عہد میں ''مجلة الأحكام الشرعية'' کی اشاعت بحیثیت قانون مدنی ازروئے فقہ احناف ہوئی۔

(ز) اسی عہد میں قانون سازی کا حلقہ بے حد وسیع ہوگیا؛ چنانچہ تمام بلاد اسلامیہ میں مختلف موضوعات کے متعلق قوانین وضع ہوئے، مثلاً تجارتی قوانین، جائیداد کے قوانین، اصولی قوانین، جیسے قانون اجرا اور قانونِ مرافعہ جس کو ہمارے یہاں قانونِ محکمات حقوق کہا جاتا ہے، مملکتِ عثمانیہ اور ممالکِ اسلامیہ جیسے شام، فلسطین اور عراق میں اس زور شور سے قوانین وضع ہوئے کہ قریب قریب فقہ کے تمام ابواب کے احکام میں کم وبیش قانونی تعدیل یا نسخ کا عمل نظر آتا ہے۔(۲)

چند فقہی اصطلاحات

دینِ اسلام میں بعض چیزوں کو کرنے کا انسان کو مکلّف بنایا گیا ہے؛ جسے فقہا کرام کی اصطلاح میں مامورات کہا جاتا ہے اور بعض چیزیں ایسی ہیں جن کے کرنے سے روکا گیا ہے، انہیں منہیات کہا جاتا ہے، جو مامورات کے قبیل سے ہیں ان کے مختلف درجات ہیں؛ اسی طرح منہیات کے بھی چند درجے ہیں، ذیل میں ان سب کا مختصر تعارف پیش کیا جاتا ہے:

فرضِ اعتقادی

فرض اعتقادی وہ ہے جو دلیل قطعی سے ثابت ہو، اس میں کسی قسم کا شبہ نہ ہو، اس کا حکم یہ ہے کہ اس کا جاننا ضروری ہے اور قلب سے تصدیق کرنا اور اس پر عمل کرنا لازم ہوتا ہے، اس کا منکر کافر ہے اور بلا عذر ایک بار بھی ترک کرنے والا فاسق ہے:

---

(۱) چراغِ راہ، اسلامی قانون نمبر:۲/ ۳۷

(۲) چراغِ راہ، اسلامی قانون نمبر:۲/ ۳۷

"تثبت بدليل لاشبهة فيه، وحكمه اللزوم علما وتصديقا بالقلب، وعملا بالبدن، يكفر جاحده ويفسق تاركه بلا عذر" (۱)

جیسا کہ اگر کوئی پانچ وقت کی نماز کے فرض ہونے یا رمضان کے روزے کے فرض ہونے کا انکار کردے تو وہ کافر ہو جائے گا اور اگر بلا عذر چھوڑ دے تو فاسق قرار پائے گا۔(۲)

فرضِ عملی

فرض عملی وہ ہے جس کا ثبوت دلیلِ قطعی سے تو نہ ہو مگر مجتہد کے پاس کوئی ایسی دلیلِ ظنی ہو جو اپنی قوت کے لحاظ سے دلیل قطعی کے قریب قریب ہو، ایسی دلیل سے ثابت ہونے والے عمل کو فقہا کرام کی اصطلاح میں فرض عملی کہا جاتا ہے:

"إن المجتهد قد يقوى عنده الدليل الظني حتى يصير قريبا عنده من القطعي فما ثبت به فرضا عمليا ؛ لأنه يعامل معاملة الفرض" (۳)

جیسے وقوف عرفہ کو فرض قرار دینا، اسی طرح چوتھائی سر کے مسح کے فرض ہونے کا قائل ہونا۔(۴)

واجب

واجب وہ مامور بہ ہے جو دلیلِ ظنی سے ثابت ہو؛ یہی وجہ ہے کہ اس سے یقینی علم حاصل نہیں ہوتا ہے اور نہ اس کا منکر کافر ہوتا ہے؛ لیکن اس پر عمل کرنا لازم ہوتا ہے اور اس کا

---

(۱) نورالأنوار، ص:۱۷۰

(۲) كشف الأسرار :۳۰۰/۲،أقسام الغزيمة

(۳) ردالمحتار:۱۷۰/۱

(۴) عمدة الرعاية حاشية شرح الوقاية :۲۵۵/۱،كتاب الطهارة

تارکِ شرعاً فاسق کہلاتا ہے؛ چنانچہ ملاجیون فرماتے ہیں:

" الواجب وهو ماثبت بدليل فيه شبهة ، وحكمه اللزوم عملاً لا علمًا على اليقين حتى لا يكفر جاحد ويفسق تاركه " (١)

جیسے وتر کی نماز، قربانی اور صدقۂ فطر وغیرہ۔(٢)

سنتِ مؤکدہ

سنتِ موکدہ وہ عمل ہے، جو حضور اکرم ﷺ نے ہمیشہ کیا ہو، یا آپ ﷺ نے اس کام کے کرنے کی تاکید فرمائی ہو؛ مگر جانب ترک بالکل مسدود نہ کی ہو، اس کا ترک بُرا ہے اور کرنا ثواب اور ترک کی عادت بنا لینے پر عذاب ہوگا؛ چنانچہ مفتی عمیم الاحسان صاحب رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

" ومن السنن سنة هدى هي ما واظب عليها النبى ﷺ مع الترك أحيانا على سبيل العبادة ويقال له السنة الموكدة " (٣)

جیسے وضوء میں دونوں ہاتھوں کا تین تین بار دھونا اور تکبیر تحریمہ کے وقت دونوں ہاتھوں کا اٹھانا۔(٤)

سنتِ غیر مؤکدہ

سنتِ غیر مؤکدہ وہ عمل ہے، جو آپ ﷺ نے بطورِ عادت کیا ہو، اور اسی کو اصولی

(١) نورالأنوار، ص:١٧٠
(٢) كشف الأسرار :٣٠٢/١،أقسام الغزيمة
(٣) قواعد الفقہ، ص:٣٢٨
(٤) شامی:١٠٣/١، سنن الوضوء

حضرات سنن زوائد بھی کہتے ہیں؛ چنانچہ علامہ شامی فرماتے ہیں:

" فمعنى كون سنة الزوائد عادة أن النبي صلى الله عليه وسلم واظب عليها حتى صارت عادة له ولم يتركها إلا أحيانا .....ولما لم تكن من مكملات الدين وشعائره سميت سنة الزوائد بخلاف سنة الهدى " (۱)

''سنت زوائد کو سنن عادی کہنے کا مطلب یہ ہے کہ نبی کریم ﷺ نے اس عمل پر مداومت کی ہو، حتی کہ وہ عادت کے درجے میں ہو گیا ہو اور اسے کبھی کبھار ہی چھوڑا ہو اور یہ سنن چونکہ سنت ہدی کی طرح دین کے مکملات اور ان کے شعائر کے قبیل سے نہیں ہیں؛ اس لیے ان کو سنن زوائد کہتے ہیں''

جیسے آپ ﷺ کے کھانے پینے اور سونے اٹھنے وغیرہ کے معمولات۔ (۲)

مستحب

مستحب وہ فعل ہے جو شریعت میں پسند کیا گیا ہو؛ خواہ حضور ﷺ نے ترغیب دی ہو یا کیا ہو یا علماء کرام نے پسند کیا ہو، اس کا کرنا ثواب اور نہ کرنے پر کوئی گناہ نہ ہو۔

" المستحب مارغب فيه الشارع ولم يوجبه" (۳)

''مستحب وہ عمل ہے جس کی ترغیب شارع نے دی ہو؛ لیکن اسے ضروری قرار نہیں دیا ہو''

" إن المستحب ما أحبه العلماء وهذا ما اعتاد به النبي

---

(۱) ردالمحتار: ۱/۴۷۷

(۲) تیسیر علم اصول الفقه: ۱/۳۱

(۳) قواعدالفقه ،ص: ۴۸۳

صلى الله عليه وسلم " (۱)

""مستحب وہ عمل ہے جسے علماء بہتر سمجھتے ہوں اور یہ عمل عموماً وہی ہوتا ہے جس پر آپ کا عمل رہا ہو"

جیسے تراویح کی نماز کا تہائی یا آدھی رات تک مؤخر کرنا۔(۲)

حرام قطعی

حرام قطعی یہ فرض کا مقابل ہے، یعنی جس کی ممانعت دلیلِ قطعی سے ثابت ہو، جیسا کہ شراب کی حرمت، یہ دلیل قطعی سے ثابت ہے، اس کا ارتکاب کرنا گناہِ کبیرہ ہے اور حرام سے بچنا فرض اور باعثِ ثواب ہے؛ چنانچہ مولانا عبدالحی فرنگی محلی لکھتے ہیں:

" إن الحرام كشرب الخمر داخل في الفرض بحسب الترك ؛ فإن تركه فرض ؛ لأن دليل الحرمة قطعي " (۳)

مکروہِ تحریمی

مکروہِ تحریمی یہ واجب کا مقابل ہے، یعنی وہ کام جس کی ممانعت دلیل ظنی سے ثابت ہو اس کے کرنے سے عبادت ناقص ہو جاتی ہے اور کرنے والا گنہگار ہوتا ہے اور بار بار اس کا کرنا گناہِ کبیرہ ہے۔

" فالمكروه تحريما نسبته إلى الحرام كنسبة الواجب إلى الفرض فيثبت بما يثبت به الواجب ، يعنى بظني الثبوت ويأثم بارتكابه كمايأثم بترك الواجب" (۴)

---

(۱) نورالانوار، ص:۱۷۱

(۲) فتح القدير :۴۶۹/۱

(۳) حاشیہ نورالانوار، ص:۱۴۹

(۴) ردالمحتار :۳۳۷/۱

جیسے مردوں کے لئے ریشمی لباس یا سونے کی انگوٹھی کا استعمال کرنا۔(۱)

مکروہِ تنزیہی

مکروہ تنزیہی جس کا کرنا شریعت میں پسندیدہ نہیں ہے؛ مگر نہ اس حد تک کہ اس پر عذاب کی وعید فرمائی ہو، وہ فعل شرعاً ناجائز نہیں ہوتا؛ البتہ اس سے بچنا اچھا ہے:

" المکروه هو ما راجح الترک وإن کان إلى الحل أقرب تکون تنزيهية ومعنى القرب إلى الحل أنه لا يستحق فاعله العتاب بل يستحق تاركه ادنى الثواب " (۲)

''مکروہ تنزیہی وہ عمل ہے جس کا نہ کرنا راجح ہو اور وہ حلال امور کے قریب قریب ہوتا ہے، مطلب یہ ہے کہ اس کا ارتکاب کرنے والا عتاب کا مستحق نہیں ہوتا ہے؛ البتہ نہ انجام دینے والا کچھ نہ کچھ ثواب کا مستحق ہوتا ہے''

خلافِ اولیٰ

وہ فعل ہے جس کا نہ کرنا بہتر ہو؛ لیکن اگر کسی نے کرلیا تو کچھ مضائقہ نہیں اور اس پر عتاب بھی نہیں ہے۔(۳)

فقہ حنفی — ایک تعارف

عباسی دور اسلامی اور عربی علوم فنون کا سنہرا دور رہا ہے، اسی عہد میں بڑے بلند پایہ، عالی ہمت اور اپنی ذہانت وفطانت کے اعتبار سے محیر العقول علما وفقہا پیدا ہوئے، کیوں کہ اس عہد کی ضرورت کے لحاظ سے اسی درجہ کے اہل علم کی ضرورت تھی، پھر ان میں سے بعض بلند

---

(۱) علم اصول الفقه للخلاف :۱/۱۱۶

(۲) قواعد الفقه،ص:۵۰۳

(۳) ردالمحتار:۱/۹۱

پا یہ فقہا نے مستقل دبستان فقہ کی بنیاد رکھی اوران سے علمی وعملی تاثر کی وجہ سے اہل علم کی ایک معتد بہ تعداد ان کے ساتھ ہوگئی اوراس نے ان کے علوم کی اشاعت وتدوین اور تائید وتقویت کے ذریعہ مستقل فقہی مکاتب کو وجود بخشا، ان شخصیتوں میں سب سے ممتاز شخصیت امام ابوحنیفہؒ کی ہے، انہی کی فقہ کا تعارف مختصر طور پر ذیل میں پیش کیا جارہا ہے:

فقہ حنفی

یہ فقہ امام ابوحنیفہ کی طرف منسوب ہے، آپ کا نام نعمان، والد کا ثابت، دادا کا زوطی، فارس النسل تھے، آپ کے دادا کو اللہ تعالی نے دولت ایمانی سے سرفراز فرمایا تھا، آپ کے والد کا بچپن تھا کہ ان کے والد انہیں لے کر حضرت علی رضی اللہ عنہ کی خدمت میں گئے، حضرت علی رضی اللہ عنہ خود ثابت اور ثابت کی اولاد کے لئے برکت کی دعا فرمائی، امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ اسی دعا کا ظہور ہیں، ابوحنیفہ آپ کی کنیت ہے، جو آپ کی صاحبزادی کی نسبت سے ہے، حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

"لو أن الدين عِند الثريا لذهب به رجل من فارس أو قال مِن أبناءِ فارس حتى يتناوله" (۱)

"گودین ثریا پر ہوتا، تب بھی اسے فارس کا ایک شخص حاصل کر کے ہی رہتا، یا فرمایا: فارس کے کچھ لوگ"

بعض روایتوں میں دین کے بجائے ایمان کا لفظ آیا ہے(۲)اور بعض روایتوں میں دین وایمان کے بجائے علم کا لفظ ہے،(۳) حافظ جلال الدین سیوطی شافعی رحمہ اللہ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی اس پیشن گوئی کا مصداق امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کو قرار دیا ہے(۴) آپ نے صحابہ کا

(۱) صحيح مسلم، باب فضل فارس، حدیث نمبر:۴۶۱۸

(۲) بخاری، باب قوله وآخرين منهم لما يلحقوا ألخ، حدیث نمبر:۴۵۱۸

(۳) سير اعلام النبلاء:۱۰/۲۱۰

(۴) تبييض الصحيفه، ص:۳و۴

زمانہ پایا ہے، محققین کے نزدیک یہ راجح ہے کہ آپ نے صحابہ سے روایت تو نہیں کی ہے لیکن ان کی ملاقات کا شرف آپ کو حاصل ہے اور تابعی ہونے کے لئے صحابی کو دیکھنا کافی ہے، روایت کرنا ضروری نہیں ہے؛ چنانچہ ابن ندیم نے بھی آپ کو تابعین میں شمار کیا ہے، (۱) ۸۰ھ میں پیدا ہوئے اور ۱۵۰ھ میں وفات پائی۔

فقہ حنفی کی سند

حدیث وفقہ میں امام جعفر صادق، زید بن علی، عبداللہ بن حسن، نفس ذکیہ، عطا بن ابی رباح، عکرمہ، نافع وغیرہ امام ابوحنیفہؒ کے اساتذہ میں ہیں؛ لیکن آپ نے سب سے زیادہ جن کی فکر کا اثر قبول کیا وہ تھے حماد بن سلیمان، جو عراق میں فقہ کا مرجع تھے، آپ نے ان سے اٹھارہ سال استفادہ کیا اور ان کی وفات تک ان کا ساتھ نہ چھوڑا، حماد، ابراہیم نخعی کے اور نخعی، علقمہ بن قیس کے اور علقمہ، حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کے شاگرد خاص تھے، اس طرح امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ صحابی رسول حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کے طریقہ اجتہاد اور منہج استنباط کے وارث اور اس کے فکر کے ترجمان ونقیب ہوئے، چنانچہ غور کریں تو فقہ حنفی ان کے فقہ وفتاوی یا ان کے ہی مختلف اقوال میں سے کسی کی ترجیح سے عبارت ہے، امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے اقوال کا اور حضرت ابن مسعودؓ کی آراء کا تقابل کیا جائے تو کم ہی مواقع ہوں گے، جن میں فرق محسوس ہوگا، اس لئے کہا جاسکتا ہے کہ فقہ حنفی کی موجودہ صورت کی تخم حضرت ابن مسعودؓ ہی نے سرزمین کوفہ میں ڈالی تھی، جس کی نسل بہ نسل علقمہ، ابراہیم اور حماد نے آبیاری کی اور اپنے اجتہاد کے ذریعہ اس میں اضافہ کرتے رہے، پھر اس سرمایہ کو امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ نے پورے تفحص و تنقیح کے بعد مرتب کرایا، امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ نے پورے علاقہ مشرق میں اس کو رواج دیا اور امام محمد ان دفینوں کو سینوں میں محفوظ کردیا، اگر یہ کہا جائے کہ یہ فقہ حنفی کا سلسلہ نسب ہے تو غلط نہ ہوگا، اسی کو لوگوں نے استعارہ کی زبان میں اس طرح کہا ہے اور خوب کہا ہے:

---

(۱) الفہرست لابن ندیم: ۲۵۵/۱

" زرعه ابن مسعود وحصده ابراهيم وداسه حماد وطحنه أبو حنيفة وعجنه أبو يوسف وخبزه محمد ويأكل منها جميع الناس" (۱)

"ابن مسعود ﷺ نے فقہ کی کاشت کی، علقمہ نے سیراب کیا، ابراہیم نے کاٹا، حماد نے دانے الگ کیے، ابوحنیفہ نے پیسا، ابویوسف نے گوندھا، محمد نے روٹی پکائی اور تمام لوگ اس روٹی سے کھا رہے ہیں"

فقہ حنفی کے مآخذ

فقہ حنفی کا مآخذ کیا ہے، صاحب مذہب نے کن اصول کی بنیاد پر مسائل کا استنباط کیا ہے؟ صاحب مذہب امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ نے اس کو خود ہی واضح فرمایا ہے، وہ کہتے ہیں:

"اگر قرآن میں مل جائے تو میں اس کا حکم لیتا ہوں، قرآن میں نہ ہو تو سنت رسول کو لیتا ہوں، اور کتاب وسنت میں کوئی حکم نہیں ملتا تو نبی اکرم ﷺ کے صحابہ میں سے جس کا قول چاہتا ہوں لیتا ہوں؛ لیکن ان کے قول سے کسی اور کے قول کی طرف نہیں جاتا اور جب بات ابراہیم، ابن سیرین، عطا اور سعید بن میّب کی آتی ہے تو جیسے ان لوگوں نے اجتہاد کیا ہے میں بھی اجتہاد کرتا ہوں" (۲)

علامہ شعرانی رحمہ اللہ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کا قول ان الفاظ میں نقل کرتے ہیں:

" إنما اعمل اولا بِكتابِ اللهِ ثم بِسنةِ رسولِ الله ثم بِاقضِيةِ أبي بكر وعمر وعثمان وعلي ثم بِاقضِيةِ بقية

(۱) مناقب ابی حنیفہ: ۱/۳۴۳

(۲) الانتقاء لابن عبدالبر، ص: ۱۴۳

الصحابة ثم اقِيس بعد ذلِک ذِا اختلفوا" (۱)

''میں اولاً کتاب اللہ پر؛ پھر سنت رسول پر؛ پھر خلفا اربعہ کے فیصلہ جات پر؛ اس کے بعد دوسرے صحابہ کے فیصلوں پر عمل کرتا ہوں؛ اگر صحابہ میں اختلاف ہوتا ہے تو قیاس سے کام لیتا ہوں (اور انہیں میں سے کسی کا قول اختیار کرتا ہوں)''

امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کا تفقہ سبھوں کو تسلیم ہے، امام شافعی رحمہ اللہ جیسے بلند پایہ محدث وفقیہ کہا کرتے تھے:

" الناس فِي الفِقهِ عِيال على أبِي حنِيفة " (۲)

''لوگ فقہ میں امام ابوحنیفہ کے محتاج ہیں''

فقہ حنفی پر فقہاء کوفہ کا اثر

فقہ حنفی کی تدوین اور اس کے عمومی مزاج کو سمجھنے کے لئے اس بات کو پیش نظر رکھنا ضروری ہے کہ جس فقہ کی جس شہر اور علاقہ میں نشو ونما ہوئی ہے، اس نے وہاں کے علماء اور ارباب نظر کا خاص اثر قبول کیا ہے، مثلاً فقہ مالکی مدینہ میں پروان چڑھی اور یہیں اس نے ارتقاء کے سارے مراحل طے کئے، چنانچہ علماء مدینہ اور وہ صحابہ جن کے حلقۂ درس وروایت سے مدینہ آباد رہا، فقہ مالکی کی اساس زیادہ تر انھیں کی روایات اور اجتہادات پر ہے، حضرت عمرؓ اور حضرت عبداللہ بن عمرؓ کی آراء سے امام مالک کے مسلک کا تقابل کیا جائے، تو بہت کم فرق محسوس کیا جائے گا، مکہ میں حضرت عبداللہ بن عباسؓ کے علم وتفقہ کا چراغ عالمتاب روشن تھا اور مکہ کے اکثر اہل علم انھیں کے تلامذہ اور مستفیدین میں تھے، امام شافعی کے علمی اور فقہی سفر کا آغاز یہیں سے ہوا، چنانچہ فقہ شافعی پر ابن عباسؓ کی روایات اور آراء

---

(۱) المیزان الکبری:۲/۱

(۲) تذکرۃ الحفاظ:۱۴۸/۱

کا خاص اثر نظر آتا ہے —— یہی حال فقہ حنفی کا ہے، اس نے کوفہ میں آنکھ کھولی، جوان ہوئی اور یہیں اسے پختگی حاصل ہوئی، مکہ و مدینہ اور حجاز کو اگر یہ اہمیت حاصل ہے کہ یہیں سے نبوت محمدی ﷺ کا سورج طلوع ہوا اور علوم نبوت کی پہلی کرن نے اسی علاقہ کو ضیاء بار کیا، تو کوفہ کو بھی یہ امتیاز حاصل ہے کہ خلیفہ مظلوم حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کی شہادت کے بعد عالم اسلام کا نہ صرف سیاسی بلکہ علمی، فکری اور تمدنی دار الخلافہ بھی کوفہ منتقل ہو گیا اور اکابر صحابہ یہاں آگئے، حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ تو عہد فاروقی ہی میں اس شان کے ساتھ یہاں خیمہ زن ہوئے تھے کہ مزاج نبوت کے خاص شناور اور فقہ الرائے کے اولین مؤسس سیدنا حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے ان کو بھیجتے ہوئے اہل کوفہ کو لکھا تھا کہ ''ابن مسعود کو بھیج کر میں ایثار سے کام لے رہا ہوں''؛ لیکن اب خود حضرت علی رضی اللہ عنہ اور اکابر صحابہ رضی اللہ عنہم کا قدم کوفہ و عراق کی خاک کو اکسیر بنا رہا تھا، کہا جاتا ہے کہ یہ وہ خوش قسمت شہر تھا جہاں ایک ہزار سے زیادہ صحابہ نے اپنا رخت سفر کھولا اور یہیں مقیم ہو رہے اور بقول علامہ شبلی نعمانیؒ ان میں ۲۴ بدری صحابہ تھے۔(۱)

مختلف مکاتب فقہ پر اس شہر کے علماء اور اصحاب افتاء کی رائے کا اثر ایک فطری بات ہے اور شاہ ولی اللہ صاحبؒ نے بھی اس کی طرف اشارہ کیا ہے :

> ''علماء تابعین میں سے ہر عالم کے لئے ان کے نقطۂ نظر کے مطابق فقہی مذہب بن گیا تھا اور ہر شہر میں کسی عالم نے امام کی حیثیت اختیار کرلی تھی، جیسے مدینہ میں سعید بن مسیّب اور سالم بن عبداللہ اور ان کے بعد ابن شہاب زہری اور قاضی یحییٰ بن سعید اور قاضی ربیع بن عبدالرحمٰن، مکہ میں عطاء بن ابی رباح، کوفہ میں ابراہیم نخعی اور شعبی، بصرہ میں حسن بصری، یمن میں طاؤس بن کیسانی، شام میں مکحول

(۱) سیرت النعمان، ص:۳۴

......سعید بن میسّب اور ان کے اصحاب اہل حرمین کو فقہ کے معاملہ میں سب سے بلند پایہ باور کرتے تھے اور ابن عمر، عائشہ ، ابن عباس کے فتاویٰ اور مدینہ کے قضاۃ کے فیصلے ان کے مذہب کی اصل ہیں، ابراہیم نخعی اور ان کے اصحاب کا خیال تھا کہ ابن مسعود اور ان کے اصحاب، فقہ میں سب سے راجح اور فائق ہیں''(۱)

کوفہ کے مخصوص حالات

کوفہ کے بارے میں یہ بات بھی ذہن میں رکھنی چاہئے کہ بمقابلہ دوسرے شہروں کے کوفہ وعراق کے علاقہ کو ایک خاص امتیاز حاصل تھا، عراق وہ جگہ تھی جہاں عربی وعجمی تہذیب باہم گلے ملتی تھی اور وہ عرب کے سادہ اور ایران کے پرتکلف معاشرہ کا امتزاج اور سنگم تھا، یہاں کے فقہاء نہ صرف ایک نئے عقیدہ سے بلکہ وہ ایک نئی تہذیب سے بھی آشنا ہوئے تھے، اس لئے ان کے سامنے ایسے مسائل کثرت سے آتے تھے جن کے حل کے لئے قیاس اور رائے کے سوا چارہ نہ تھا اور ان کو بار بار اس امر کا احساس ہوتا تھا کہ نصوص ''جزئیات'' کے احاطہ سے قاصر ہیں، اور واقعات وحوادث بے شمار ہیں ''النصوص معدودة والحوادث غير محدودة''(۲) فقہاء حجاز جو ایک خالص عربی داں طبقہ کے درمیان اجتہاد وافتاء کا فریضہ انجام دے رہے تھے، اس صورت حال سے دوچار نہ تھے۔

دوسرا فرق یہ تھا کہ علمی مسائل میں بھی عربوں کا مزاج سادہ اور تکلفات سے خالی تھا، یہ وہی مزاج تھا جس کو پیغمبر اسلام ﷺ نے ان الفاظ میں بیان فرمایا تھا کہ ''إنا أمة أمية لا نكتب ولا نحسب الشهر هكذا وهكذا''(۳) اسی لئے ہم دیکھتے ہیں کہ فقہاء حجاز

---

(۱) الإنصاف في بيان أسباب الاختلاف، ص:۷

(۲) أصول الفقه لابن العربي :۱/۶۰

(۳) بخاری، باب قول النبی صلی اللہ علیہ وسلم : لا نكتب ألخ، حدیث نمبر:۱۷۸۰

کے یہاں قیل وقال کم ہے، استنباط احکام میں زیادہ تر نصوص کے ظاہری مفہوم پر اکتفا کیا جاتا ہے، اس کے برخلاف مشرقی علاقہ جومختلف ادوار میں مختلف تحریکات اور افکار کی آماجگاہ رہ چکا تھا، ذہانت، دقتِ نظر، موشگافی اور تشقیق اس کی خمیر میں داخل تھی، فقہاءعراق اس کو نظر انداز نہ کر سکتے تھے؛ اسی لئے فقہاء کے ہاں قیل وقال ممکن الوقوع مسائل واحکام پر بحث، نصوص کے ظاہری مفہوم کے ساتھ ساتھ اس کی تہہ میں غواصی احکام کی مختلف شقوں کا استخراج ،احکام کی علت اور اس کی حکمت پر نظر اور اس کے تحت نصوص کی تخصیص اور مجمل کی تعیین اور الفاظ کی منطقی تحدید زیادہ پائی جاتی ہے۔

تیسرا فرق یہ تھا کہ مشرقی علاقہ کی اس ذکاوت وطباعی نے جہاں اس کو علوم اسلام کا لالہ زار اور گلستان سدابہار بنادیا تھا اور حدیث وتفسیر اور مختلف علوم کی امامت اسی خطہ کو حاصل ہوگئی تھی، وہیں یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ یہی علاقہ سیاسی معرکہ آرائی اور سیاست کے پہلو بہ پہلو اعتقادات کی طبع آزمائی اور مختلف فرق باطلہ کی فتنہ سامانی کا مرکز بھی بنا ہوا تھا، اس کی وجہ سے وضع حدیث کی ایسی ارزانی ہوئی کہ کوئی فرقہ نہ تھا جس کے پاس اس کے عقائد واعمال اور اس کی محبوب شخصیتوں کے فضائل وکمال کے لئے روایات کا ایک وافر ذخیرہ موجود نہ ہو، حجاز کے علاقہ میں نسبتاً یہ فتنہ اتنا شدید نہ تھا، اس لئے اس فتنہ نے فقہاءعراق کو اس بات پر مجبور کیا کہ وہ احادیث کے قبول کرنے میں خوب جزم واحتیاط سے کام لیں، ایسی روایتیں جو کتاب اللہ سے ادنی درجہ بھی مختلف محسوس ہوں، ان کو قبول نہ کریں اور مجرد سند کے بجائے حدیث کے متن کو بھی درایت کی میزان پر رکھیں، احکام شرعی کی علت کے استخراج پر خاص زور دیں؛ تاکہ دین کا مجموعی مزاج منقح ہو اور اس کی روشنی میں قیاس واستنباط کریں، فقہاء حجاز اس صورت حال سے دوچار نہ تھے؛ اسی لئے ہم دیکھتے ہیں کہ ان کے ہاں زیادہ تر روایات پر اکثر صرف رواۃ کی ثقاہت پر بحث کی جاتی ہے، احادیث کی بناء پر کثرت سے قرآن کے عموم میں تخصیص اور مطلق میں تقیید کا عمل کیا جاتا ہے اور راویوں کے بارے میں اس درجہ کی

شدت نہیں پائی جاتی جو فقہائے عراق برتتے ہیں۔

امام ابوحنیفہؒ اور فقہاء عراق کی فقہ کے مزاج کو سمجھنے کے لئے ضروری ہے کہ حجاز وعراق کے حالات کے اس فرق کو سامنے رکھا جائے کہ اہل بصیرت پر یہ بات مخفی نہیں کہ یہ وہ خاص اسباب ہیں جن کی وجہ سے بہت سے احکام میں حجاز وعراق کے فقہاء کے طرز فکر اور طریق اجتہاد میں نمایاں فرق ہوجاتا ہے، جیسے خبر واحد کے ذریعہ قرآن کے عموم میں تخصیص، یا اطلاق میں تقیید، جن مسائل میں ابتلاء عام ہو ان میں خبر واحد کا مقبول ہونا یا نہ ہونا، راوی کے تفقہ یا قوت حفظ کی وجہ سے روایت کی ترجیح، شریعت کے تسلیم شدہ اُصول وقواعد کے مقابلہ میں خبر واحد کی قبولیت اور عدم قبولیت وغیرہ۔

فقہ حنفی کی تدوین

امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ نے دوسرے فقہا کی طرح انفرادی طور پر اپنی آرا مرتب نہیں کی؛ بلکہ حضرت عمرؓ کی طرح شورائی انداز اختیار کیا؛ چنانچہ علامہ موفق رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

"فوضع أبوحنيفة مذهبه شورى بينهم ولم يستبِد بنفسِه دونه" (۱)

"امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ نے اپنا مذہب شورائی رکھا اور وہ شرکا شوری کو چھوڑ کر تنہا اپنی رائے مسلط نہیں کرتے تھے"

اس کا نتیجہ تھا کہ بعض اوقات ایک مسئلہ پر ایک ماہ یا اس سے زیادہ بحث ومباحثہ کا سلسلہ جاری رہتا تھا؛ چنانچہ علامہ کردری رقم طراز ہیں:

"فكان يطرح مسئلة ثم يسأل ما عندهم ويقول ماعنده ويناظرهم فِي كلِ مسئلة شهرا أوأكثر ويأتي بِالدلائِلِ انور مِن السِراجِ الأزهرِ" (۲)

---

(۱) مناقب ابی حنیفۃ:۲/۱۳۳

(۲) مناقب أبي حنيفة للكردري:۱/۵۷

''امام صاحب ایک مسئلہ پیش کرتے اور اس پر ایک ماہ بلکہ اس سے بھی زیادہ تبادلہ خیال کا سلسلہ جاری رہتا پھر جب روشن چراغ کی طرح دلائل واضح ہوجاتے تو لکھا جاتا''

اور اسد بن فرات کی روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ عام مسائل پر بھی تین تین دنوں بحث اور غور وفکر کا سلسلہ جاری رہتا، پھر اس کو بقید تحریر لایا جاتا (۱) اور اس بحث و تمحیص میں کبھی کبھی آواز بھی کافی تیز ہوجاتی تھی۔ (۲)

اس مجلس میں جو مسائل مرتب ہوئے اور جو زیر بحث آئے ان کی تعداد کیا تھی؟ اس سلسلہ میں تذکرہ نگاروں کے مختلف بیانات ملتے ہیں، مسانید امام ابوحنیفہ کے جامع علامہ خوار زمی نے تراسی ہزار کی تعداد لکھی ہے جس میں اڑتیس ہزار کا تعلق عبادات سے تھا اور باقی کا معاملات سے، (۳) بعض حضرات نے ۶ / لاکھ اور بعضوں نے ۱۲ / لاکھ سے بھی زیادہ بتائی ہے، حضرت مولانا مناظر احسن گیلانی رحمہ اللہ کا خیال ہے کہ اس تعداد میں ان مسائل کو بھی شامل کرلیا گیا ہے جو امام کے مقرر کیے ہوئے اصول وکلیات کی روشنی میں مستنبط کیے ہوئے ہیں، اگر تراسی ہزار ہی مانے جائیں تو یہ کیا کم ہے؟۔

شرکاء مجلس تدوین

امام ابوحنیفہ نے جس طریقہ سے فقہ کی تدوین کا ارادہ کیا وہ نہایت وسیع اور پر خطر کام تھا، اس لیے انہوں نے اتنے بڑے کام کو اپنی ذاتی رائے اور معلومات پر منحصر کرنا نہیں چاہا، اس غرض سے امام صاحب نے اپنے شاگردوں میں سے چند نامور اشخاص کا انتخاب کیا، جن میں سے اکثر خاص خاص فنون میں ماہر تھے، مثلاً یحیی بن ابی زائدہ، حفص بن غیاث، قاضی ابویوسف، داؤد الطائی، ابن حبان مندل کو حدیث اور آثار میں نہایت کمال تھا،

---

(۱) حسن التقاضی، ص: ۱۲

(۲) حوالہ سابق

(۳) مناقب الامام الاعظم ملا علی قاری، ص: ۲۷۳

امام صاحب نے ان لوگوں پر مشتمل ایک مجلس مرتب کی اور با قاعدہ طور پر فقہ کی تدوین شروع ہوئی، امام طحاوی نے بسند متصل اسد بن فرات سے روایت کی ہے کہ ابوحنیفہ کے تلامذہ جنھوں نے فقہ کی تدوین میں حصہ لیا تھا، ان کی مجموعی تعداد چالیس (۴۰) تھی، جن میں یہ لوگ زیادہ ممتاز تھے: ابویوسف، زفر، داود طائی، اسد بن عمر، یوسف بن خالد التیمی، یحیی بن ابی زائدہ، امام طحاوی نے یہ بھی روایت کی ہے کہ لکھنے کی خدمت یحیی سے متعلق تھی، امام طحاوی نے جن لوگوں کے نام گنائے ہیں ان کے سوا عافیہ ازدی، ابوعلی، علی بن مسہر، قاسم بن معن، ابن مندل اس مجلس کے منبر رہے تھے۔(۱)

کتابوں میں عام طور پر یہ ذکر ملتا ہے کہ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے مجلس تدوین فقہ میں اپنے عہد کے چالیس ممتاز علماء شامل تھے؛ لیکن ان کے سنین وفات اور امام صاحب سے وابستگی کے زمانہ کو دیکھتے ہوئے صحیح بات یہ معلوم ہوتی ہے کہ سارے حضرات شروع سے آخر تک اس کام میں شریک نہیں رہے؛ بلکہ مختلف ارکان نے مختلف ادوار میں کار تدوین میں ہاتھ بٹایا ان میں بعض وہ تھے جنہوں نے آخری زمانہ میں اس کام میں شرکت کی، عام طور پر شرکاء مجلس کا نام ایک جگہ نہیں ملتا، مفتی عزیز الرحمٰن صاحب بجنوری اور ڈاکٹر محمد میاں صدیقی نے ان ناموں کو اکٹھا کرنے کی کوشش کی ہے، شرکاء مجلس کے نام اس طرح ہیں:

نام	وفات	نام	وفات
امام ابویوسف	متوفی: ۱۸۲ھ	محمد بن حسن شیبانی	متوفی: ۱۸۹ھ
حسن بن زیاد	متوفی: ۲۰۲ھ	زفر بن ہذیل	متوفی: ۱۵۸ھ
مالک بن مغول	متوفی: ۱۵۹ھ	داؤد طائی	متوفی: ۱۶۰ھ
مندل بن علی	متوفی: ۱۶۸ھ	نصر بن عبدالکریم	متوفی: ۱۶۹ھ
عمر بن میمون	متوفی: ۱۷۱ھ	حبان بن علی	متوفی: ۱۷۲ھ
ابوعصمہ	متوفی: ۱۷۳ھ	زہیر بن معاویہ	متوفی: ۱۷۳ھ

(۱) شرح فقہ اکبر، ص: ۱۴۶

- قاسم بن معن متوفی:۱۷۵ھ
- حماد بن ابی حنیفہ متوفی:۱۷۶ھ
- ہیاج بن بطام متوفی:۱۷۷ھ
- شریک بن عبداللہ متوفی:۱۷۸ھ
- عافیہ بن یزید متوفی:۱۸۱ھ
- عبداللہ بن مبارک متوفی:۱۸۱ھ
- نوح بن دارج متوفی:۱۸۲ھ
- ہشیم بن بشیر سلمی متوفی:۱۸۳ھ
- ابوسعید یحی بن زکریا متوفی:۱۸۲ھ
- فضیل بن عیاض متوفی:۱۸۷ھ
- اسد بن عمرو متوفی:۱۸۸ھ
- علی بن مسہر متوفی:۱۸۹ھ
- یوسف بن خالد متوفی:۱۸۹ھ
- عبداللہ بن ادریس متوفی:۱۹۲ھ
- فضل بن موسی متوفی:۱۹۲ھ
- حفص بن غیاث متوفی:۱۹۲ھ
- وکیع بن جراح متوفی:۱۹۷ھ
- یحیی بن سعید قطان متوفی:۱۹۸ھ
- شعیب بن اسحاق متوفی:۱۹۸ھ
- ابوحفص بن عبدالرحمٰن متوفی:۱۹۹ھ
- ابومطیع بلخی متوفی:۱۹۹ھ
- خالد بن سلیمان متوفی:۱۹۹ھ
- عبدالحمید متوفی:۲۰۳ھ
- ابوعاصم النبیل متوفی:۲۱۲ھ
- مکی بن ابراھیم متوفی:۲۱۵ھ
- حماد بن دلیل متوفی:۲۱۵ھ
- ہشام بن یوسف متوفی:۱۹۷ھ

البتہ ان میں سے دو شاگردوں کے ذریعہ فقہ حنفی میں غیر معمولی ترقی ہوئی، ان میں سے ایک امام ابو یوسف ہیں، آپ کا اصل نام یعقوب ہے، لیکن کنیت سے زیادہ مشہور ہیں ۱۱۳ھ میں پیدا ہوئے اور ۱۸۲ھ میں وفات پائی، امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کی حیات تک ان سے وابستہ رہے، امام مالک رحمہ اللہ سے بھی استفادہ کیا، محدثین ان کی ثقاہت اور حدیث میں ان کے علوم مرتبت پر گویا متفق ہیں، مہدی کے عہد خلافت ۱۶۶ھ میں قاضی بنائے گئے اور مہدی، ہادی اور ہارون رشید خلفا کے دور میں قاضی القضاۃ رہے، آپ اسلامی تاریخ کے پہلے قاضی القضاۃ تھے، آپ کی متعدد کتابوں کا ذکر تذکرہ نگاروں نے کیا ہے، جیسے اصول فقہ

میں کتاب الرائ، کتاب الوصایا، کتاب اختلاف الامصار، الرد علی مالک بن انس ، وغیرہ(۱) لیکن آپ کی اکثر کتابیں دستیاب نہیں ہیں ، کتاب الآثار، کتاب الخراج اور اختلاف ابی حنفیہ مع ابن ابی لیلی ، جسے امام شافعی رحمہ نے کتاب الام میں نقل کیا ہے دستیاب ہیں۔

اور دوسری شخصیت امام محمد حسن بن فرقد شیبانی کی ہے،آپ ۱۳۲ھ میں پیدا ہوئے ، کوفہ میں پرورش پائی ،آپ نے مسعر بن کدام ، امام اوزاعی اور سفیان ثوری سے حدیث کا درس لیا،لیکن فقہ وحدیث میں سب سے زیادہ جس شخصیت نے آپ کو متاثر کیا وہ ہیں امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ ، امام صاحب کے انتقال کے بعد امام ابو یوسف اور پھر امام مالک سے استفادہ کیا اور ۱۸۹ھ میں وفات پائی۔

فقہ حنفی کا مدار آپ ہی کی کتابوں پر ہے؛لیکن آپ کی جو کتابیں ہیں وہ چند ہی ہیں، جبکہ کہا جاتا ہے کہ آپ کی تصانیف کی تعداد (۹۹۰) تھی،(۲) متقدمین کا طریقہ تھا کہ وہ ہر بحث کو مستقل کتاب کے عنوان سے لکھتے تھے، جیسے کتاب الصلوۃ، کتاب الزکوۃ،ممکن ہے کہ اس پہلو سے آپ کی تصنیفات کی تعداد اتنی زیادہ ہوں۔

فقہ حنفی کی کتابیں

بنیادی طور پر فقہ حنفی کی کتابوں کے تین حصے کئے گئے ہیں، ظاہر روایت ،نوادر اور فتاوی وواقعات۔

ظاہر روایت

ظاہر روایت سے مراد امام محمد رحمہ اللہ کی چھ کتابیں ہیں، مبسوط، جامع صغیر، جامع کبیر، زیادات، سیر صغیر، سیر کبیر، یہ چھ کتابیں ظاہر روایت کہلاتی ہیں، کیوں کہ یہ شہرت وتواتر

---

(۱) الفهرست لابن نديم ،ص:۲۸۶

(۲) النافع الكبير مقدمه الجامع الصغير :۲۵

کے ساتھ اور مستند طریقہ پر منقول ہیں، انہیں اصول بھی کہا جاتا ہے، ان میں سے مکرر مسائل کو حذف کر کے علامہ ابوالفضل محمد بن احمد مروزی معروف بہ حاکم شہید (متوفی:۳۳۲ھ) نے الکافی فی فروع الحنفیہ کے نام سے مرتب کیا ہے، اسی کی شرح علامہ سرخسی نے المبسوط کے نام سے کی ہے، جو متداول ہے؛ لیکن اصل متن مستقل طور پر تشنہ طبع ہے۔

نوادر

ان چھ کتب کے علاوہ امام محمد رحمہ اللہ کی دوسری کتابیں مثلاً : ھارونیات، کیسانیات، رقیات، نیز امام ابویوسف کی کتاب الامالی، حسن بن زیاد کی کتاب المجرد اور امام صاحب کے تلامذہ کی دوسری کتابیں نوادر کہلاتی ہیں؛ کیوں کہ امام محمد رحمہ اللہ کی مذکورہ چھ کتابیں جو ظاہر روایت کہلاتی ہیں، اس درجہ شہرت و تواتر کے ساتھ اور مستند و معتبر طریقہ سے یہ کتب منقول نہیں ہیں۔(۱)

فتاوی و واقعات

جن مسائل کی بابت امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کی رائے منقول نہیں ہے اور بعد کے مشائخ نے ان کی بابت اجتہاد کیا ہے ان کو فتاوی و واقعات کہا جاتا ہے، اس سلسلہ میں ابو اللیث سمرقندی کی کتاب النوازل، علامہ ناطفی کی مجمع النوازل والواقعات اور صدر الشہید کی الواقعات اس موضوع پر اولین کتابیں ہیں، جن میں سے نوازل سمرقندی طبع ہو چکی ہے، مگر ناشر کی لاپرواہی پر بہت افسوس ہے کہ اغلاط کی تصحیح پر بالکل توجہ نہیں دی اور اغلاط کے ساتھ ہی شائع کر دیا، ضرورت ہے کہ کوئی اہل علم ان اغلاط کی تصحیح پر توجہ دے اور اپنی تحقیق و تعلیق کے ساتھ دوبارہ شائع کرے۔

فقہ حنفی کی دیگر اہم کتابیں

ان کتب کے علاوہ فقہ حنفی کی اہم کتابیں اس طرح ہیں:

---

(۱)　رسم المفتی، ص:۲۸

کتاب		مصنف	وفات
مختصر الطحاوی	:	امام ابوجعفر طحاوی	متوفی: ۳۲۱ھ
المنتقی فی فروع الحنفیہ	:	ابوالفضل محمد بن احمد مروزی	متوفی: ۳۳۲ھ
مختصر کرخی	:	عبیداللہ بن حسین کرخی	متوفی: ۳۴۰ھ
مختصر قدوری	:	ابوالحسین احمد بن محمد قدوری	متوفی: ۴۲۸ھ
تحفۃ الفقہاء	:	علاء الدین محمد بن احمد سمرقندی	متوفی: ۵۷۵ھ
بدائع الصنائع	:	علاء الدین ابوبکر بن مسعود کاسانی	متوفی: ۵۸۷ھ
بدایۃ المبتدی	:	ابوالحسن علی مرغینانی	متوفی: ۵۹۳ھ
ہدایہ	:	ابوالحسن علی مرغینانی	متوفی: ۵۹۳ھ
المختار	:	مجد الدین عبداللہ بن محمود موصلی	متوفی: ۶۸۳ھ
وقایۃ الروایہ	:	برہان الشریع محمود بن احمد	متوفی: ۶۷۳ھ
فتاوی قاضی خاں	:	علامہ فخر الدین اوزجندی	متوفی: ۵۹۲ھ
مجمع البحرین وملتقی النھرین	:	مظفر الدین احمد ابن ساعاتی	متوفی: ۶۹۴ھ
کنز الدقائق	:	عبداللہ بن احمد نسفی	متوفی: ۷۱۰ھ
الجامع الوجیز	:	محمد بن بزاز کردری	متوفی: ۸۲۷ھ
البنایہ	:	علامہ بدر الدین عینی	متوفی: ۸۵۵ھ
فتح القدیر	:	علامہ کمال الدین بن ھمام	متوفی: ۸۶۱ھ
ملتقی الابحر	:	ابراہیم بن محمد حلبی	متوفی: ۹۵۶ھ
فتاوی ھندیہ	:	زیر نگرانی اورنگ زیب رحمہ اللہ	متوفی: ۱۱۱۸ھ
تنویر الابصار وجامع البحار	:	شمس الدین محمد بن عبداللہ تمرتاشی	متوفی: ۱۰۰۴ھ
الدر المختار	:	علامہ علاو الدین حصکفی	متوفی: ۱۰۸۸ھ
رد المحتار	:	علامہ ابن عابدین شامی	متوفی: ۱۲۵۲ھ

طبقات فقہاء

علامہ ابن کمال پاشا (متوفی: ۹۴۰ھ) کی تصریح کے مطابق فقہاء احناف کے کل سات طبقات ہیں:

۱) مجتہدین فی الشرع

وہ حضرات جو براہ راست ادلہ اربعہ (قرآن وسنت، اجماع وقیاس) سے اصول وکلیات اور جزئیات واحکام مستنبط کرتے ہیں، جیسے ائمہ اربعہ اور ان کے درجہ کے مجتہدین، ان کو مجتہدین مطلق بھی کہا جاتا ہے۔

۲) مجتہدین فی المذہب

وہ حضرات فقہا ہیں جو قواعد وکلیات میں تو اپنے استاد اور مجتہد مطلق کے پابند ہوتے ہیں؛ لیکن جزئیات اور فروعی مسائل میں استاد کی تقلید چھوڑ دیتے ہیں، اس تصریح کے مطابق اس زمرے میں امام ابو یوسف اور امام محمد وغیرہ کو داخل ماننا محل نظر ہے؛ کیوں کہ ان حضرات نے فروع کی طرح اصول میں بھی اجتہادات کئے ہیں اور امام ابو حنیفہ کے اصول سے اختلاف کیا ہے، اس لئے شوافع کے یہاں جو مجتہد منتسب کی تعریف ہے وہ زیادہ صحیح معلوم ہوتی ہے ان حضرات نے یہ تعریف کی ہے کہ جو حضرات رائے اور دلیل رائے، فروع اور استنباط کے اصول میں کسی امام کے مقلد نہ ہوں، البتہ ان کے اجتہاد استنباط کا نہج کسی صاحب مذہب امام کے مطابق ہو(۱) اس تعریف کے مطابق ابو یوسف، امام محمد اور امام زفر کو مجتہد منتسب قرار دیا جاسکتا ہے۔

۳) مجتہدین فی المسائل

مذہب میں کچھ مسائل ایسے بھی ہوتے ہیں جن کے بارے میں اصحاب مذہب کی

---

(۱) مقدمه المجموع، ص:۲۲

کوئی صراحت منقول نہیں ہوتی، تو جو حضرات فقہا مذہب کے قواعد وضوابط کو سامنے رکھ کر غیر منصوص مسائل کے احکام متعین کرتے ہیں انہیں مجتہدین فی المسائل کا لقب دیا جاتا ہے، یہ حضرات اصول وفروع کسی چیز میں بھی اپنے امام سے الگ راہ اپنانے کا حق نہیں رکھتے اس طبقہ میں امام احمد بن عمر خصاف (متوفی:۲۶۱ھ)، امام طحاوی (متوفی:۳۲۱ھ)، امام ابوالحسن کرخی (متوفی:۳۴۰ھ)، شمس الائمہ حلوانی (متوفی:۴۲۸ھ) شمس الائمہ سرخسی (متوفی: ۴۸۳ھ) فخر الاسلام بزدوی (متوفی:۴۸۲ھ) اور علامہ فخر الدین قاضی خاں (متوفی: ۵۵۲ھ) وغیرہ کے اسما قابل ذکر ہیں۔

۴) اصحاب التخریج

وہ فقہا کرام جو اجتہاد کی صلاحیت تو نہیں رکھتے؛ لیکن اصول وماخذ کو محفوظ رکھنے کی بنا پر اتنی قدرت ضرور رکھتے ہیں کہ ذو وجہیں یا مجمل قول کی تعیین وتفصیل کرسکیں، اور نظائر فقہیہ اور قواعد مذہب پر نظر کر کے اپنی ذمہ داری انجام دینے کے اہل ہوں، انہیں اصحاب تخریج کہا جاتا ہے، اس طبقہ میں امام جصاص رازی (متوفی:۳۷۰ھ) اوران جیسے حضرات کا نام لیا جاسکتا ہے۔

۵) اصحاب الترجیح

اس طبقہ کے فقہا کا کام یہ ہے کہ وہ مذہب کی بعض روایت کو دوسری روایت پر اپنے قول: ''ھذا أولی، ھذا اصح، ھذا أوضح'' وغیرہ کلمات کے ذریعہ ترجیح دیتے ہیں، اس طبقہ میں ابو الحسن قدوری (متوفی:۴۲۸ھ)، صاحب ہدایہ، علامہ مرغینانی (متوفی:۵۹۳ھ) وغیرہ شامل ہیں۔

۶) اصحاب تمیز مقلدین

ان حضرات کا کام صرف اتنا ہے کہ وہ مذہب کی مضبوط وکمزور روایات میں

فرق وامتیاز کرتے ہیں اور ظاہر الروایت اور روایت نادرہ کی پہچان رکھتے ہیں، اکثر اصحاب متون اس طبقہ سے تعلق رکھتے ہیں، مثلاً صاحب کنز علامہ نسفی (متوفی: ۷۱۰ھ)، صاحب مختار علامہ موصلی (متوفی: ۶۸۳ھ) اور صاحب وقایہ علامہ تاج الشریعہ (متوفی: ۷۲۷ھ) وغیرہ، یہ حضرات اپنی تصنیفات میں مرد اور غیر معتبر اقوال نقل کرنے سے احتراز کرتے ہیں۔

۷) اصحاب غیر ممیّز مقلدین

جو حضرات گذشتہ طبقات میں سے کسی بھی ذمہ داری کو اٹھانے کی اہلیت نہ رکھتے ہوں، انہیں ساتویں طبقہ میں رکھا جاتا ہے درحقیقت یہ لوگ فقیہ نہیں بلکہ محض ناقل فتاوی ہیں، آج کل کے اکثر مفتیان کرام کا تعلق اسی طبقہ سے ہے، اس لئے اس طبقہ کے لوگوں پر پوری احتیاط لازم ہے، جب تک مسئلہ منقح نہ ہو اس وقت تک جواب دینے سے گریز کرنا چاہئے۔(۱)

فقہ حنفی کی خصوصیات

یہ تو ایک ثابت شدہ حقیقت ہے کہ فقہ حنفی کی تدوین شورائی طریقے پر ہوئی ہے؛ یہی وجہ ہے کہ اجتماعی طریق اجتہاد اور آزادانہ بحث ونقد نے فقہ حنفی میں نصوص ورائے اور مقاصد شریعت وانسانی مصالح کے درمیان ایک خاص قسم کا توازن پیدا کردیا ہے، جو دوسرے مکاتب فقہیہ میں کم نظر آتا ہے، فقہ حنفی کے طریق اجتہاد اور اصول استنباط نیز اس کی مستنبط جزئیات وفروعات پر غور کرنے کے بعد اس فقہ کا عمومی مزاج ومذاق اور خصائص وامتیازات جو سمجھ میں آتے ہیں ان کا تذکرہ مناسب معلوم ہوتا ہے، ذیل میں اسی نقطہ نظر سے گفتگو کی گئی ہے:

---

(۱) رسم المفتی، ص:۲۸-۳۲

نصوص سے غایت اعتناء

فقہ حنفی کی سب سے بڑی خصوصیت اس فقہ میں نصوص شرعیہ سے غایت اعتنا ہے، اس فقہ میں خبر واحد کو قیاس پر مقدم رکھا گیا ہے، حدیث مرسل یعنی وہ حدیث جس کو تابعی نے براہِ راست رسول اللہ ﷺ سے نقل کیا ہو اور درمیانی واسطہ یعنی صحابی کا ذکر نہ کیا ہو(۱) امام ابوحنیفہ نے بعض خاص شرطوں اور تفصیلات کے ساتھ قبول کیا ہے، عبادات کے باب میں احناف نے بعض مواقع پر ضعیف روایات کو بھی قبول کرلیا ہے، نماز میں قہقہہ کا ناقض وضو ہونا ، (۲) اس کی واضح مثال ہے، آثارِ صحابہ کو بھی فقہ حنفی میں حجت مانا گیا ہے، اس سلسلہ میں فقہائے احناف کا نقطہ نظر یہ ہے کہ جن مسائل میں قیاس واجتہاد کی گنجائش نہیں ہے، ان میں صحابہ کی رائے حدیث رسول کے درجہ میں ہوگی؛ کیوں کہ ضروری ہے کہ ان حضرات نے یہ رائے آپ ﷺ سے سن کر یا آپ ﷺ کو کرتے ہوئے دیکھ کر ہی قائم کی ہوگی؛ چنانچہ امام ابوحنیفہ نے حیض کی کم سے کم مدت تین دن اور زیادہ سے زیادہ دس دن، حضرت انس رضی اللہ عنہ (۳) اور حضرت عثمان بن ابی العاص رضی اللہ عنہ ہی کی آرا (۴) پر مقرر کی ہے۔

مصادرِ شرعیہ کے مدارج کی رعایت

مختلف دلائل کے درجات و مراتب کی رعایت اور ان میں غایت درجہ توازن واعتدال، فقہ حنفی کا نمایاں وصف ہے؛ یہی وجہ ہے کہ کتاب اللہ کی اولیت اور اس کی بالاتری کا اس میں ہر جگہ لحاظ کیا گیا ہے، حدیث سورہ فاتحہ کو نماز کے لیے ضروری قرار دیتی ہے۔(۵)

قرآن کہتا ہے کہ قرآن پڑھا جائے تو سکوت اور گوش برآواز رہنا ضروری ہے۔(۶)

---

(۱) التقریب:۱/۳

(۲) سنن الدار قطني:۱/۱۶۳

(۳) مصنف ابن ابی شیبه، باب ما قالوا في الحيض ،حدیث نمبر:۱۹۲۹۷

(۴) مصنف ابن ابی شیبه، باب ما قالوا في الحيض ،حدیث نمبر:۱۹۲۹۸

(۵) بخاری، باب وجوب القراءة للإمام ،حدیث نمبر:۷۱۴

(۶) الاعراف:۲۰۲

حنفیہ نے ان دونوں کو اپنی اپنی جگہ پر رکھا ہے؛ چنانچہ سورہ فاتحہ کی تلاوت کو واجب قرار دیا(۱) لیکن اقتدا کررہا ہوتو کہا کہ امام کی قرات اصل اپنی طرف سے ہوتی ہے اور نیابۃً اپنے مقتدیوں کی طرف سے ہے،(۲) حدیث سے نیت کی تاکید ثابت ہے،(۳) قرآن نے جہاں تفصیل کے ساتھ ارکان وضو کا ذکر کیا ہے، نیت کے بارے میں کچھ نہیں کہا ہے، (۴) احناف نے حدیث وقرآن دونوں پرعمل کیا، وضو کے انہی افعال کو رکن قرار دیا جن کا ذکر قرآن میں موجود ہے اور حدیث سے جو نیت کی تاکید ثابت ہے اسے مسنون کہا تاکہ دونوں پرعمل ہوجائے، احادیث سے آمین کا ثبوت ہے،(۵) روایات آمین بالجھر کی بھی ہیں،(٦) اور سر کی بھی ،(۷) لیکن خود قرآن مجید نے دعا کا جو ادب بتایا وہ یہ کہ کیفیت میں خشوع اور تضرع ہو اور آواز پست ہو، (۸) حنفیہ نے دونوں کی رعایت کی ہے، ہدایت قرآنی کے مطابق آمین (چونکہ دعا ہے) آہستہ کہی جائے (۹) اور جہر کی حدیث کو ابتدائے اسلام یا تعلیم وتربیت کے نقطہ نظر سے آپ ﷺ کا وقتی عمل سمجھا جائے تاکہ کسی کو انکار کرنے کی نوبت نہ آئے۔(۱۰)

نقد حدیث میں اصول درایت سے استفادہ

امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے حدیث کو پرکھنے کے لیے درایت سے فائدہ اٹھانے کی

---

(۱) هدایه مع البنایه:۲/۲۴۵،بیروت
(۲) بدائع الصنائع، فی ارکان الصلاۃ :۱/۲۵۷
(۳) بخاری ، باب بدء الوحي ،حدیث نمبر:۱
(۴) المائدہ:۲
(۵) صحيح البخاري ، باب جهر المأموم بالتأمين ،حدیث نمبر:۷۴۰
(٦) السنن الكبرى للبيهقى باب جهر الإمام ،حدیث نمبر:۲۵۴۵
(۷) المستدرك على الصحيحين مع تعليق الذهبي ، باب قراء ت النبي ﷺ،حدیث نمبر:۲۹۱۳
(۸) الأنعام:۶۳
(۹) تبيين الحقائق، فصل الشروع فی الصلاۃ:۲/۸۵
(۱۰) بدائع الصنائع، فصل فی سنن حكم التكبير في أيام التشريق:۲/۲-۳

طرح ڈالی اور اس کے لیے دوصورتیں اختیار کیں، اول تو خود حدیث کے متن اور اس کے مضمون پر نظر ڈالی کہ آیا یہ دین کے مجموعی مزاج سے مطابقت رکھتا ہے یانہیں؟ اگرنہیں تو ایسی اخبارِ آحاد کی کوئی مناسب تاویل کی اور اس پر رائے کی بنیادنہیں رکھی، دوسرے راوی پر بھی غور کیا کہ خود راوی میں حدیث کے مضمون کو پوری طرح سمجھنے اور منشا نبوی تک پہونچنے کی صلاحیت ہے یانہیں کہ کبھی راوی معتبر ہوتا ہے؛ مگر غلط فہمی سے بات کچھ کی کچھ ہو جاتی ہے، یا کبھی دوروایتیں متعارض نظر آتی ہیں اور تاویل وتوجیہ کے ذریعہ ان میں تطبیق کی گنجائش بھی نہیں رہی تو جس مضمون کی روایت زیادہ فقیہ راویوں سے مروی ہواس کو ترجیح دی جائیگی؛ اس سلسلہ میں امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کا وہ واقعہ بہت ہی مشہور ہے جو امام اوزاعی رحمہ اللہ سے ملاقات کے وقت پیش آیا تھا، امام اوزاعی رحمہ اللہ نے دریافت کیا کہ آپ حضرات رکوع سے پہلے اور رکوع کے بعد رفع یدین کیوں نہیں کرتے؟ امام صاحب رحمہ اللہ نے فرمایا کہ صحیح طور پر اس کا ثبوت نہیں ہے، اوزاعی رحمہ اللہ نے جواب دیا کہ مجھ سے زہری نے اور زہری نے سالم سے اور سالم نے عبداللہ بن عمرؓ سے حضور ﷺ کا رفع یدین کرنا نقل کیا ہے، امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ نے فرمایا کہ مجھ سے حماد نے، ان سے ابراہیم نے ابراہیم سے علقمہ واسود نے اوران دونوں نے حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے نقل کیا ہے کہ آپ ﷺ صرف آغاز نماز ہی میں رفع یدین فرمایا کرتے تھے، امام اوزاعی رحمہ اللہ کے پیش نظر یہ بات تھی کہ ان کے اور رسول اللہ ﷺ کے درمیان تین ہی واسطے ہیں اور وہ بھی ایسے کہ اپنے اعتبار وثقاہت کے لحاظ سے حدیث اور روایت کی دنیا کے آفتاب وماہتاب ہیں؛ لیکن امام ابوحنیفہ نے اپنے نقطہ نظر کی ترجمانی اس طرح کی کہ حماد زہری سے اور ابراہیم سالم سے زیادہ فقیہ ہیں اور حضرت عبداللہ بن عمرؓ کا شرف صحبت ملحوظ نہ ہوتا تو میں کہتا کہ علقمہ ان سے زیادہ فقیہ ہیں اور عبداللہ بن مسعود ؓ تو عبداللہ بن مسعودؓ ہی ہیں، یہ سن کر امام اوزاعی رحمہ اللہ خاموش ہو گئے۔(۱)

(۱) قواعد فی علوم الفقہ،ص:۲۲۶، لعلامہ ظفر احمد عثمانی رحمۃ اللہ علیہ

احناف کی اس اصل سے دوسرے فقہاء ومحدثین نے بھی فائدا ٹھایا ہے، غور کیجئے عبداللہ بن عباس ﷺ سے بسند صحیح مروی ہے کہ حضور اکرم ﷺ نے اپنی صاحبزادی حضرت زینب رضی اللہ عنہا کو چھ سال کے بعد حضرت ابوالعاص ﷺ کی زوجیت میں نکاح جدید کے بغیر سابقہ نکاح ہی کی بنا پر دے دیا تھا، (۱) حالاں کہ درمیان میں چھ سال کا وقفہ ہوا، جس میں ابوالعاص مشرک تھے؛ گویا آپ ﷺ نے شرک کے باوجود رشتہ نکاح کو باقی رکھا، اس کے برخلاف حضرت عمرو بن شعیب عن أبیہ عن جدہ ﷺ کی روایت ہے کہ آپ ﷺ نے دوبارہ نئے مہر کے ساتھ دونوں کا نکاح فرمایا، (۲) اس دوسری روایت کے متعلق امام ترمذی رحمہ اللہ کا بیان ہے کہ سند کے اعتبار سے اس کی صحت مشکوک ہے، (۳) مگر ساتھ ہی امام ترمذی رحمہ اللہ نے یہ صراحت کی ہے کہ ائمہ اربعہ اور دوسرے فقہا کا اسی پر عمل ہے، امام ترمذی رحمہ اللہ یزید بن ہارون کے واسطے سے لکھتے ہیں:

"حدِیث ابنِ عباس أجود إِسنادا والعمل على حدِيثِ عمرِو بنِ شعيب" (۴)

یہاں دوسرے فقہا ومحدثین نے بھی امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ ہی کے مزاج کے مطابق روایت کے ردوقبول میں درایت ہی سے کام لیا ہے؛ تاہم اس بات کی وضاحت مناسب ہوگی کہ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کا یہ اصول کوئی خودساختہ نہیں تھا، خود صحابہ ﷺ کے دور میں ہمیں اس کی مثال ملتی ہے، حضرت عمر ﷺ نے مطلقہ بائنہ کی عدت کے نفقہ کے متعلق حضرت فاطمہ بنت قیس رضی اللہ عنہا کی روایت کو یہی کہہ کر رد کردیا تھا کہ ایک ایسی عورت کی بات پر اعتماد کر کے ہم کس طرح کتاب وسنت کو نظرانداز کردیں جس کے بارے میں معلوم نہیں کہ اس

---

(۱) سنن الترمذی، باب ما جاء في الزوجين المشركين يسلم أحدهما، حدیث نمبر:۱۰۶۲

(۲) سنن الترمذی، باب ما جاء في الزوجين المشركين يسلم أحدهما، حدیث نمبر:۱۰۶۱

(۳) حوالہ سابق

(۴) سنن الترمذی، باب ما جاء في الزوجين المشركين يسلم أحدهما

نے صحیح کہایا غلط اور یادرکھایا پھر بھول گئی۔(۱)

اسی طرح ہم عمرؓ کو دیکھتے ہیں کہ بعض فقہا صحابہؓ کی تنہا روایت قبول کر لیتے ہیں اور بعض صحابہ کی روایت کسی تائیدی راوی کے بغیر قبول نہیں کرتے (۲) یہی طریقہ تو امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ نے اپنے طریقہ استنباط میں اختیار کیا ہے۔

حقوق اللہ میں احتیاط

فقہ حنفی کی ایک اہم خصوصیت حقوق اللہ اور حلال وحرام میں احتیاط کی راہ اختیار کرنا ہے، امام کرخی رحمہ اللہ نے لکھا ہے:

"اِن الاحتیاط فِي حقوق اللّٰه جائِز وفی حقوق العِباد لا یجوز إِذا دارتِ الصلوة بین الجوازِ والفسادِ فالاحتیاط أن یعِید الادا" (۳)

"حقوق اللہ میں احتیاط جائز ہے، حقوق العباد میں جائز نہیں؛ چنانچہ جب نماز میں جواز وفساد کے دو پہلو پیدا ہوجائیں تو احتیاط نماز کے اعادہ میں ہے"

چنانچہ غور کیا جائے تو عبادات میں امام صاحب رحمہ اللہ کے یہاں احتیاط کے پہلو کو خاص طور پر پیشِ نظر رکھا گیا ہے، نماز میں گفتگو کو مطلقا مفسد قرار دیا گیا ہے، چاہے بھول کر یا اصلاح نماز کی غرض سے کیوں نہ گفتگو کی گئی ہو،(۴) مصحف کو دیکھ کر نماز پڑھنے کو مفسد مانا گیا ہے،(۵) نماز کی حالت میں قہقہہ کو ناقض وضو قرار دیا گیا،(۶) روزہ خواہ کسی طور پر

(۱) ترمذی، باب ما جاء في المطلقة ثلاثا ،حدیث نمبر:۱۱۰۰
(۲) مسلم ، باب الاستیذان ،حدیث نمبر:۴۰۰۷
(۳) أصول الکرخی ،ص:۱۲۳
(۴) عالمگیری:۱/۹۸،دارالکتاب
(۵) الھندیہ:۱/۱۰۱،دارالکتاب
(۶) ردالمحتار:۲/۶۷۲،زکریا

توڑا جائے، خوردونوش کے ذریعہ یا جماع کے ذریعہ، اس کو موجب کفارہ کہا گیا ہے، (۱) دسویں ذی الحجہ کو افعال حج میں ترتیب ضروری قرار دی گئی ہے، (۲) حرمت مصاہرت میں بھی سختی برتی گئی، زنا بلکہ دواعی زنا کو بھی حرمت کے ثبوت کے لیے کافی سمجھا گیا، (۳) حرمت رضاعت کے معاملہ میں بھی دودھ کی کسی خاص مقدار کو پینے کی قید نہیں رکھی گئی؛ بلکہ ایک قطرہ دودھ کو بھی حرمت رضاعت کا باعث قرار دیا گیا۔(۴)

یسر وسہولت کا لحاظ

فقہ حنفی میں انسانی ضروریات اور مجبوریوں کا خیال اور شریعت کے اصل مزاج یسر اور رفع حرج کی رعایت قدم قدم پر نظر آتی ہے، مثلاً اکثر فقہا نے نجاست کو مطلقا نماز کے منافی قرار دیا ہے اور ادنی درجہ کی نجاست کو بھی قابل عفو نہیں مانا، (۵) لیکن امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ نے اول تو نصوص کے لب ولہجہ، فقہا کے اتفاق واختلاف اور ان کے حالات ومجبوریوں کو سامنے رکھتے ہوئے نجاست کی تقسیم کی اور غلیظہ وخفیفہ دو قسمیں قرار دیں، دوسرے نجاست غلیظہ میں ایک درہم اور نجاست خفیفہ میں ایک چوتھائی تک معاف قرار دیا، (۶) پانی کثیر وقلیل مقدار کے لیے کوئی تحدید نہ کی اور اس کو لوگوں کی رائے پر رکھا، جو خود پاکی یا ناپاکی کے مسائل سے دوچار ہوں (۷) حقیقت یہ ہے کہ یہ امام ابوحنیفہ کے کمال ذہانت اور غایت درجہ فراست کی بات ہے جو انہوں نے اس سلسلہ میں اختیار کی ہے، ایسا ہوسکتا ہے کہ ایک ہی

---

(۱) عالمگیری:۱/۲۰۵،دار الکتاب

(۲) البحر الرائق، کتاب الحج، باب الجنایات فی الحج:۲۲۲/۷

(۳) الدر المختار:۷۹/۲،زکریا

(۴) شامی:۳۷۵/۱۰،باب الرضاع

(۵) الفقہ الاسلامی وادلتہ، الباب الاول الطھارت:۲۸۳/۱

(۶) عالمگیری:۱/۲۵-۲۶،دار الکتاب

(۷) الدر المختار: ۳۲۰/۱،زکریا

مقدار کسی علاقہ کے لیے کثیر اور کسی علاقہ کے لیے قلیل قرار پائے، مثلاً: ہندوستان کے نشیبی خطہ میں جہاں جگہ جگہ پانی کے بڑے بڑے تالاب ہیں اور پانی کی سطح ۵۰، ۶۰/فٹ پر ہے اور راجستھان کے صحرا جہاں پانی کی شدید قلت اور پانی کی سطح نہایت نیچے ہے، کو قلیل وکثیر مقدار کے معاملہ میں ایک ہی پیمانہ کے تحت رکھنا لوگوں کے لیے نہایت تنگی اور دشواری کا باعث ہوگا، احناف کی اس رائے کی روشنی میں ایسے مختلف حالات میں تنگی ودشواری سے بچا جا سکے گا، گرما کے موسم میں تاخیر اور نسبتاً ٹھنڈا ہونے کے بعد نمازِ ظہر کا مستحب ہونا، (۱) اور اچھی طرح صبح کھلنے کے بعد نماز فجر کی ادائیگی کو ترجیح دینا، (۲) فقہ حنفی کے اسی مزاج کا عکاس ہے، زکوۃ کی ادائیگی میں شوافع کے یہاں ضروری ہے کہ قرآن میں بیان کردہ آٹھوں مصارف اور ہر مصرف کے کم سے کم تین حقدار کو دیا جائے؛ گویا ہر کم وبیش زکوۃ کم سے کم ۲۴/ حقداروں پر تقسیم کی جائے، تب زکوۃ ادا ہوگی، اس میں جس قدر دقت ہے وہ محتاج اظہار نہیں، احناف نے کہا کہ کسی ایک مصرف اور اس کے ایک فرد کو بھی زکوۃ کی ادائیگی کا حق ہے، (۳) اس میں جس قدر سہولت ہے وہ ظاہر ہے؛ تاہم ایسا نہ سمجھنا چاہئے کہ احناف یسر وسہولت کے لیے اور حرج ومشقت کے ازالہ کی غرض سے نصوص اور حدیث کی صراحتوں کو بھی نظر انداز کر دیتے ہیں، علامہ ابن نجیم مصری رحمہ اللہ کا بیان ہے:

" المشقة والحرج اِنما یعتبرانِ فِي موضع لانص فِیهِ" (۴)

''مشقت وحرج کا اعتبار ایسی جگہ ہوتا ہے جہاں نص موجود نہ ہو''

واقعہ یہ ہے کہ احناف نے اس باب میں جس درجہ توازن برتا ہے اور شریعت الٰہی اور ضرورت انسانی کو جس طرح دوش بدوش رکھا ہے وہ شریعت کے اوامر ونواہی اور شریعت کے مقاصد ومصالح دونوں میں گہری بصیرت اور عمیق فہم کا ثبوت ہے۔

---

(۱) الدر المختار: ۲/۲۲، زکریا

(۲) الدر المختار: ۲/۲۴، زکریا

(۳) تبیین الحقائق، باب المصرف: ۳/۲۶۷

(۴) الاشباہ والنظائر، ص: ۱۳۸

عقل واصول سے مطابقت

فقہائے احناف نے دین کے اصول مسلمہ اور قواعد متفقہ نیز عقل سے ہم آہنگی کا خاص خیال رکھا ہے، مثلاً: شریعت کی ایک تسلیم شدہ اصل یہ ہے کہ انسانی جسم پاک ہے اور اس کو چھونا موجب نجاست نہیں، یہ عین مطابق عقل و دانش بھی ہے؛ چنانچہ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ نے شرمگاہ یا عورتوں کے چھونے کو ناقض وضو قرار نہیں دیا، (۱) آگ میں پکی ہوئی چیزوں کے استعمال کو بھی ناقض وضو نہیں سمجھا، (۲) صلوۃ کسوف میں دو، تین، چار اور پانچ رکوع والی روایات کے مقابلہ ہر رکعت میں ایک رکوع والی روایت کو ترجیح دیا کہ یہ نماز کے عام اصول ومعمول کے مطابق ہے، (۳) جانور کا دودھ روک کر اسے فروخت کیا جائے، ایسی صورت میں بعض روایتوں سے پتہ چلتا ہے کہ جانور اور دودھ سے انتفاع کے بدلے ایک صاع کھجور ادا کی جائے، ظاہر ہے کہ یہ حکم شریعت کے عام قانون مکافات اور اصولِ مجازات سے مطابقت نہیں رکھتے؛ چنانچہ حنفیہ نے اس روایت کو اخلاقی ہدایت پر محمول کیا ہے اور اس نفع کو قانونی طور پر نا قابل عوض ٹھہرایا ہے؛ کیوں کہ دین اور اصول انصاف کے مسلمہ اصولوں میں سے یہ ہے کہ جو شخص نقصان کا ذمہ دار ہو، وہی نفع کا بھی حقدار ہے؛ چنانچہ اس صورت میں اگر وہ جانور ہلاک ہوجاتا تو خریدار کو ہی یہ نقصان اٹھانا پڑتا، تو ضروری ہے کہ اس مدت میں جانور کے ذریعۂ جو نفع حاصل ہوا ہو، وہی اس کا مالک اور حقدار قرار پائے، (۴) فقہائے احناف کی آراء اور دوسرے فقہی مذاہب سے اس کا تقابل کیا جائے تو قدم قدم پر فقہ حنفی کا یہ مذاق نمایاں ہوکر سامنے آئے گا۔

---

(۱) الدرالمختار، سنن الوضوء :۱/۴۰۵

(۲) المبسوط للسرخسی:۱/۱۴۲

(۳) شامی، باب الکسوف :۶/۱۸۶

(۴) عالمگیری، الفصل الثانی فی معرفة عیوب الدواب وغیرها:۳/۷۲

مذہبی رواداری

مذہبی آزادی اور غیر مسلموں کے ساتھ رواداری اور مذہبی وانسانی حقوق کا لحاظ جس درجہ فقہ حنفی میں رکھا گیا ہے وہ غالبا اس کا امتیاز ہے، غیر مسلموں کو اپنے اعتقادات کے بارے میں اور ان اعتقادات پر مبنی معاملات کے بارے میں احناف کے یہاں خاص فراخدلی اور وسیع النظر فی پائی جاتی ہے، قاضی ابوزید دبوسی نے امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے اس ذوق ومزاج پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھا ہے:

" الأصل عند أبي حنيفة أن مايعتقِده أهل الذِمة ويدينونه يتركون عليه " (۱)

''امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے نزدیک اصل یہ ہے کہ اہل ذمہ جو عقیدہ رکھتے ہوں اور جس دین پر چلتے ہوں ان کو اس پر چھوڑ دیا جائے''

چنانچہ جن غیر مسلموں کے یہاں محرم رشتہ داروں سے نکاح جائز ہو، امام صاحب کے نزدیک ان کے لیے اپنے ایسے رشتہ داروں سے نکاح کرنے پر روک نہیں لگائی جائے گی، (۲) اسی طرح غیر مسلم زوجین میں سے ایک فریق مسلمان قاضی کی طرف رجوع ہو اور شریعتِ اسلامیہ کے مطابق فیصلہ کا طالب ہو تو قاضی اس معاملہ میں دخل نہیں دے گا، جب تک کہ دونوں فریق اس کے خواہش مند نہ ہوں، (۳) اسی طرح غور کریں کہ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے نزدیک جس طرح مسلم ملک کا غیر مسلم شہری کسی مسلمان کو قتل کرنے کے جرم میں قصاصاً قتل کیا جائے گا اسی طرح مسلمان سے بھی غیر مسلم شہری کے قتل پر قصاص لیا جائیگا ، (۴) یہی حال

---

(۱) تأسيس النظر، ص:۱۳

(۲) شامی، باب نكاح الكافر:۲۷۹/۱۰

(۳) شامی، باب نكاح الكافر: ۲۸۳/۱۰

(۴) كتاب الأم، باب دية أهل الذمة:۳۲۲/۷

دیت۔ اور خون بہا کا بھی ہے، امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ نے انسانی خون میں کوئی امتیاز روا نہیں رکھا ہے، مسلمانوں اور غیر مسلموں کی دیت کی مقدار برابر رکھی ہے؛ جب کہ عام فقہاء کی رائے اس سے مختلف ہے، یہ چند مثالیں ہیں، ان کے علاوہ بھی بہت سی ایسی جزئیات موجود ہیں جن سے فقہ حنفی کے اس مزاج کی نشاندہی ہوتی ہے۔

مسلمانوں کی طرف گناہ کی نسبت سے احتراز

فقہ حنفی کی ایک اہم خصوصیت یہ بھی ہے کہ فعل مسلم کو حتی المقدور حرمت کی نسبت۔ سے بچانے اور حلال جہت پر محمول کرنے کی کوشش کی جاتی ہے، امام کرخی رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

"إن أمور المسلمين محمول على السِدادِ والصلاحِ حتى يظهر غيره، مثال من باع دِرهما ودِينارا بِدِرهمينِ ودِينارين جاز البيع وصرف الجِنسِ اِلى خِلافِ جِنسِه" (۱)

"مسلمانوں کے معاملات صلاح ودرستگی پر محمول کئے جائیں گے، تا آنکہ اس کے خلاف ظاہر وواضح ہوجائے، مثلا: کوئی شخص ایک درہم اور ایک دینار، دو درہم اور دو دینار کے بدلہ فروخت کرے تو معاملہ جائز ہوگا اور ایک درہم کو دو دینار اور ایک دینار کو دو درہم کے مقابل سمجھا جائے گا"

اسی طرح ثبوت نسب کے معاملہ میں حنفیہ نے ممکن حد تک احتیاط اور زنا کی طرف انتساب سے بچانے کی کوشش کی ہے، قاضی ابوزید دبوسی رحمہ اللہ نے صحیح لکھا ہے:

"الأصل عِندنا أن العِبرة فِي ثبوتِ النسبِ صِحة الفِراشِ وكونِ الزوجِ مِن اهلِهِ لابِالتمكنِ بِالوطي" (۲)

(۱) أصول الكرخي، ص:۱۴۰

(۲) تأسيس النظر، ص:۵۹

''ہمارے یہاں اصل یہ ہے کہ ثبوت نسب کے لیے (نکاح کے ذریعہ) فراش کا صحیح ہونا اور شوہر کا اس کا اہل ہونا کافی ہے، فی الواقع وطی پر قادر ہونا ضروری نہیں ہے''

چنانچہ وقت نکاح سے ٹھیک چھ ماہ پر ولادت ہو تب بھی حنفیہ کے یہاں نسب ثابت ہو جائے گا، اس طرح زوجین میں مشرق و مغرب کا فرق ہو اور بظاہر زوجین کی ملاقات ثابت نہ ہو اس کے باوجود نسب ثابت ہو جائے گا؛ تاکہ کسی مسلمان کی طرف فعل زنا کی نسبت سے بچا جا سکے، (۱) کسی مسلمان پر کفر کا فتوی لگائے جانے اور دائرہ اسلام سے خارج کئے جانے میں امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کس درجہ محتاط تھے، اس کا اندازہ علامہ ابن نجیم مصری رحمہ اللہ نے جو واقعہ بیان کیا ہے اس سے بخوبی لگایا جا سکتا ہے، ابن نجیم رحمہ اللہ نے لکھا ہے کہ امام صاحب سے ایک ایسے شخص کے بارے میں پوچھا گیا جو کہتا تھا کہ مجھے جنت کی امید نہیں، جہنم کا اندیشہ نہیں، خدا سے ڈرتا نہیں ہوں، قرات اور رکوع و سجدہ کے بغیر نماز پڑھ لیتا ہوں اور ایسی چیز کی شہادت دیتا ہوں جسے دیکھا تک نہیں، حق کو ناپسند کرتا ہوں اور فتنہ کو پسند کرتا ہوں، امام صاحب رحمہ اللہ نے ان تمام باتوں کی توجیہ فرمائی، فرمایا کہ جنت کے امیدوار نہ ہونے کا مطلب یہ ہے کہ خدا کی رضا کا امیدوار ہوں اور جہنم سے نہ ڈرنے کا مطلب یہ ہے کہ صرف اللہ تعالی سے ڈرتا ہوں، اللہ تعالی سے ڈرنے کا مطلب یہ ہے کہ خدا سے ظلم کا خطرہ نہیں، بغیر رکوع و سجدہ اور قرات کے نماز سے مراد نمازِ جنازہ ہے، بن دیکھی گواہی توحید کی گواہی ہے، حق سے بغض رکھنے سے مراد موت کو ناپسند کرنا ہے کہ موت بھی سب سے بڑی حقیقت ہے، فتنہ سے محبت کے معنی اولاد سے محبت ہے؛ کیونکہ کہ اولاد کو قرآن میں فتنہ قرار دیا گیا ہے؛ چنانچہ استفسار کرنے والا کھڑا ہوا، امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کی جبین فراست کو بوسہ دیا اور عرض کیا کہ آپ ظرفِ علم ہیں، (۲)

---

(۱) شامی ، فصل في ثبوت النسب:۱۶۲/۶

(۲) الاشباہ مع حموی، ص:۳۰۴

غور کیا جائے کہ کس طرح ایک مسلمان کی طرف کفر کی نسبت کرنے سے بچایا گیا؛ البتہ اگر قائل خود ہی کفر کا اعتراف کرلے تو پھر کسی تاویل کی ضرورت ہی باقی نہیں رہ جاتی۔

قانون تجارت میں دقیقہ سنجی

عبادات کے باب میں نصوص وافر مقدار میں منقول ہیں، نکاح کے متعلق بھی جزئیات اور تفصیلات کا ایک قابل لحاظ حصہ کتاب وسنت میں موجود ہے؛ لیکن تجارت کے باب میں کتاب وسنت میں صرف ضروری اصول اور بنیادی قواعد کی نشاندہی کردی گئی ہے، جن سے شریعت کے مقاصد کی وضاحت ہوجاتی ہے، جزوی تفصیلات بہت کم مذکور ہیں اور ایسا ہونا مصلحت کے عین مناسب ہے؛ کیوں کہ اگر معاملات میں عبادات کی طرح حد بندی کردی جاتی تو تغیر پذیر حالات اور متعین قدروں میں ان پر عمل مشکل ہوجاتا، اس لیے تجارت کی جزوی تفصیلات قیاس ورائے اور اجتہاد واستنباط ہی کی رہین منت ہیں اور ان تفصیلات کی تنقیح میں شرح وبسط اور دقت نظر مجتہد کی بصیرت اور فہم کا اصل مظہر ہے، امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ بڑے تاجروں میں تھے اور کوفہ میں سب سے بڑی دوکان آپ ہی کی تھی، اس لیے طبعی بات ہے کہ تجارت کے احکام جس تفصیل اور وسعت وعمق اور دقت نظری کے ساتھ آپ کے یہاں ملتے ہیں دوسرے فقہا کے یہاں نہیں ملتے، مثلاً:

۱) حدیث میں قبضہ سے پہلے کسی سامان کو فروخت کرنے سے منع کیا گیا ہے؛ لیکن امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ نے زمین کو منقولہ جائداد کے حکم سے مستثنی رکھا کہ شریعت کا اصل منشا دھوکہ اور غرر سے تحفظ ہے، منقولہ اشیا میں اس کا امکان موجود ہے کہ شاید قبضہ میں آنے سے پہلے ہی یہ شی ہلاک وضائع ہوجائے اور غیر منقولہ جائداد میں بظاہر یہ امکان نہیں ہے۔(۱)

۲) حدیث میں بعض مواقع پر کسی تفصیل کے بغیر ذخیرہ اندوزی (احتکار)

---

(۱) البحر الرائق، فصل فی بیان التصرف فی البیع والثمن قبل قبضہ:۲۲۸/۱۶

کو منع کیا گیا ہے،(۱) بعض مواقع پر خصوصیت سے اشیا خوردنی میں ذخیرہ اندوزی کی مذمت آئی ہے، امام ابوحنیفہ لوگوں کی ضروریات سے بخوبی واقف تھے اور اس بات سے بھی آگاہ تھے کہ بعض اشیا کہ سال بھر ان کی رسد برقرار رکھنے کے لیے ایک گونہ ذخیرہ اندوزی ضروری ہے اور اس میں شارع کا اصل منشا فروخت کے ذخیرہ کی ممانعت نہیں ہے، بلکہ گاہکوں کے استحصال سے روکنا اور روزمرہ کی زندگی میں ان دشواریوں سے بچانا ہے، ان تمام پہلوؤں کو سامنے رکھتے ہوئے امام صاحب نے یہ رائے قائم کی کہ نہ ہر شی میں احتکار ممنوع ہے اور نہ یہ ممانعت غذائی اشیا تک محدود ہے؛ بلکہ عام انسانی ضرورت بھی اس ممانعت میں داخل ہے کہ ان میں احتکار اسی درجہ لوگوں کے لیے مشکلات اور دقتوں کا باعث ہے جتنا کہ اشیا خوردنی میں۔(۲)

۳) بیع سلم (ایسی بیع جس میں قیمت فوری ادا کی جاتی ہے اور سامان بعد میں سپرد کیا جاتا ہے) میں معاملہ کے وقت مبیع (سامان) موجود نہیں ہوتی، بعد کو ادا کی جاتی ہے، اس لیے ضروری ہے کہ اس کی اچھی طرح تعیین عمل میں آجائے؛ تاکہ آئندہ نزاع کا کوئی امکان باقی نہ رہ جائے، فقہ حنفی میں اس کی بڑی تفصیل ملتی ہے؛ چنانچہ امام صاحب رحمہ اللہ نے ضروری قرار دیا کہ اس شی کی جنس، نوعیت، مقدار، صفت، ادائیگی کی مدت، مبیع کی حوالگی کے مقام کے علاوہ کس شہر کی صنعت ہے؟ اور اس کی صراحت بھی کر دی جائے کہ مختلف شہروں اور علاقوں کی صنعتوں اور ان کی قیمتوں میں قابل لحاظ فرق ہوتا ہے،(۳) اسی طرح امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ نے گوشت میں بیع سلم کی اجازت نہیں دی اور وجہ یہ بیان کی کہ گوشت کبھی فربہ ہوتا ہے اور کبھی اس کے برعکس(۴) بہرحال تجارتی قوانین میں اس کی بہت سی

---

(۱) صحيح مسلم، تحريم الاحتكار في الأقوات، حدیث نمبر:۳۰۱۲

(۲) بدائع الصنائع، كتاب الاستحسان:۲۳/۱۱

(۳) الدرالمختار، باب السلم:۲۳۳/۲۰

(۴) الدرالمختار، باب السلم:۲۴۲/۲۰

جزئیات موجود ہیں جو امام صاحب کی دقت نظر، مقاصد شریعت، فہم صحیح، انسانی ضروریات سے آگہی، تاجروں کے مزاج سے واقفیت اور احتیاطی پیش بندی کا مظہر ہیں۔

حیلہ شرعی

حیلہ کے اصل معنی معاملات کی تدبیر میں مہارت کے ہیں: "الحذق فِی تدبِیرِ الأمورِ "(۱) شریعت کی اصطلاح میں حرمت و معصیت سے بچنے کے لیے ایسی خلاصی کی راہ اختیار کرنے کا نام ہے جس کی شریعت نے اجازت دی ہو، (۲) حیلہ کے تعلق سے احناف کے نقطہ نظر کا انصاف اور حقیقت پسندی کے ساتھ مطالعہ کیا جائے اور صرف حیلہ کی تعبیر پر توجہ مرکوز نہ رکھی جائے تو معلوم ہوگا کہ یہ فن احناف کے یہاں کمال ذکاوت، امت کو حرام سے بچانے کی سعی اور شریعت کی حدود اربعہ میں رہتے ہوئے انسانیت کو حرج سے بچانے کے محمود جذبات کا عکاس ہے، علامہ سرخسی رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

"فالحاصِل ان مایتخلص بِه الرجل مِن الحرامِ اویتوصل بِه اِلی الحلالِ مِن الحِیلِ فھو حسن واِنما یکرہ ذلِک ان یحتال فِی حقٍ لِرجل حتی یبطِله اوفِی باطِل حتی یموھه فماکان علی ھذا السبِیلِ فھو مکروہ وماکان علی السبِیلِ الذِی قلنا اولا فلا باس بِه " (۳)

"حاصل یہ ہے کہ وہ حیل جن کے ذریعہ انسان حرام سے خلاصی یا حلال تک رسائی کا خواہاں ہو بہتر ہے، ہاں کسی کے حق کا ابطال یا باطل کی ملمع سازی مقصود ہو تو ناپسندیدہ ہے؛ غرض یہ ہے کہ یہ

(۱) الأشباہ والنظائر، ص:۴۰۶
(۲) المبسوط:۳۳/۴۸۶
(۳) المبسوط:۳۳/۴۸۶

صورت درست نہیں ہے اور پہلے ذکر کی گئی صورت درست ہے‘‘

اس وضاحت کے بعد کسی صاحب انصاف کے لیے احناف کے نقطہ نظر سے انکار کی گنجائش باقی نہیں رہتی، اس کا اندازہ اس سے ہوتا ہے کہ ہمارے فقہا کرام نے عام طور پر عبادات میں حیلہ سے گریز کیا ہے، ابوبکر خصاف کی تالیف کتاب الحیل والمخارج میں عبادات میں صرف چند حیلہ ذکر کئے گئے ہیں؛ اگر کسی شخص پر زکوۃ واجب ہوگئی ہو اور کوئی مستحق زکوۃ اس مقروض کو اپنی زکوۃ دے دے اور پھر اس سے وہی رقم بطورِ ادا قرض کے وصول کرلے۔(۱) اسی طرح اگر میت کی تدفین میں زکوۃ خرچ کرنے پر مجبور ہو تو یوں کرے کہ متوفی کے ولی جو صاحبِ نصاب نہ ہو کو زکوۃ دے دے اور وہ اسے کفن میں خرچ کردے، مسجد کی تعمیر کرنی ہو تو اس علاقہ کے فقراء کو زکوۃ دے دے کہ بطورِ خود مسجد تعمیر کرلیں، نیز یہ احتیاط بھی برتے کہ خاص تعمیر کے لیے نہ دے، بلکہ کہے کہ یہ تمہارے لیے صدقہ ہے۔(۲)

غور کیجئے کہ حیلہ کی ان صورتوں میں کہیں تحریم حلال اور فرائض وواجبات سے پہلو تہی کا کوئی جذبہ نظر آتا ہے؟ خود امام ابوحنیفہ سے طلاق وغیرہ کے مسائل میں جو حیلے منقول ہیں اور جو ان کی حیرت انگیز اور تعجب خیز ذکاوت کا ثبوت ہیں وہ بالکل اسی نوع کے ہیں اور حیلہ کے ناقدین جیسے امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ نے بھی اس کی داد دی ہے۔(۳)

علامہ ابن قیم رحمہ اللہ جو حیلہ کے زبردست ناقد ہیں؛ انہوں نے اعلام الموقعین میں حیلہ کی تین قسمیں بیان کی ہیں، ایک وہ جس کا مقصد ظلم کو قبل از وقت روکنا ہو، دوسرے یہ کہ جو ظلم ہو چکا ہو اس کو دفع کیا جائے، تیسرے جس ظلم کو دفع کرنا ممکن نہ ہو اس کے مقابلہ میں اس طرح عمل کیا جائے، خود ابن قیم کا بیان ہے کہ پہلی دونوں صورتیں جائز ہیں اور تیسری

---

(۱) ہندیه، کتاب الحیل فی مسائل الزکاۃ :۶۸/۱۵

(۲) ہندیه، کتاب الحیل فی مسائل الزکاۃ :۷۰/۱۵

(۳) اعلام الموقعین، فصل في الحيل المحرمة:۲۵۱/۳

صورت میں تفصیل ہے، (۱) پس حیلہ کا اگر صحیح مقاصد کے لیے استعمال کیا جائے تو یہ عین رحمت ہے اور دین کے مزاج یسر اور رفع حرج کے عین مطابق ہے اور اس باب میں فقہائے احناف کی ذکاوت وفطانت ایک ناقابل انکار حقیقت ہے۔

فقہ تقدیری

فقہ حنفی کا ایک امتیاز فقہ تقدیری بھی ہے، فقہ تقدیری کا مطلب یہ ہے کہ مسائل کے پیش آنے سے پہلے ہی ممکن الوقوع مسائل کے حل کی طرف توجہ دی جائے، فقہاء حجاز جو عقلی امکانات کے تفحص اور قیل وقال سے دور اور سادہ طور پر مسائل کو سمجھنے اور رائے قائم کرنے کے خوگر تھے، وہ اس طرح کے مسائل کے احکام بتانے سے گریز کرتے تھے؛ لیکن فقہاء عراق جن کے یہاں دقیقہ سنجی، دور بینی، طلب وتفحص اور شریعت کی روح اور مقاصد میں غواصی کا رنگ غالب تھا فقہ تقدیری ان کے مزاج میں داخل تھی اور وہ اس پر مجبور بھی تھے کہ مشرق کے علاقہ میں نئی نئی قوموں اور علاقوں کے مملکت اسلامی میں شمولیت کی وجہ سے وہ نو پید مسائل سے بمقابلہ فقہا حجاز کے زیادہ دوچار تھے، اسی لیے فقہاء احناف کے یہاں فقہ تقدیری کا حصہ زیادہ ہے اور افسوس کہ نصوص کے ظاہر پر جمود اور اس کے دقیق مطالعہ اور روح ومقصد تک رسائی سے مناسبت نہ ہونے کی وجہ سے بعض محدثین رحمہ اللہ نے امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے اس ہنر کو عیب سمجھ لیا؛ حالانکہ خود حدیث میں موجود ہے کہ جب آپ انے فتنہ دجال کے ظہور اور اس زمانہ میں دن اور رات کے اوقات کی غیر معمولی وسعت کا ذکر فرمایا تو صحابہ ث نے استفسار کیا کہ اس وقت نماز پنجگانہ کیوں کر ادا کی جاسکے گی، (۲) غور کیجئے کہ یہ مسئلہ قبل از وقوع حل کرنا نہیں ہے تو اور کیا ہے؟۔

فقہ تقدیری کے بارے میں فقہاء عراق اور فقہاء حجاز کے نقطہ نظر کا فرق اس واقعہ سے

---

(۱) اعلام الموقعین:۲۴۰/۳، في الحیل المحرمة

(۲) صحیح مسلم، باب ذکر الدجال وصفته وما معه، حدیث نمبر:۵۲۲۸

ظاہر ہوتا ہے، جسے خطیب بغدادی نے نقل کیا ہے کہ حضرت قتادہ جب کوفہ تشریف لائے تو غائب شخص کی بیوی اور اس کے مہر کے بارے میں امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ اور قتادہ کے درمیان گفتگو ہوئی، قتادہ نے دریافت کیا کہ کیا کوئی ایسا واقعہ پیش آیا ہے؟ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ نے نفی میں جواب دیا، قتادہ نے کہا جب یہ واقعہ پیش نہیں آیا تو اس کے بارے میں دریافت کرنے کی کیا ضرورت ہے، امام صاحب رحمہ اللہ نے فرمایا کہ ہم مسائل کے پیش آنے سے پہلے اس کی تیاری کرتے ہیں تاکہ مسائل جب پیش آجائیں تو ہم بآسانی اس سے عہدہ برآ ہوسکیں:

" إنا نستعِد لِلبلاءِ فإذا ما وقع عرفنا الدخول فيه والخروج مِنه " (۱)

ان تفصیلات سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ فقہ حنفی کی مقبولیت اور اس کے شیوع کی اصل وجہ اس کی یہی خصوصیات ہیں یعنی توازن واعتدال، ضرورت انسانی کی رعایت، نصوص ومصالح کی باہم تطبیق، شریعت کی روح اور مقصد کی رعایت اور ظاہر پر جمود بے جا سے گریز، اقلیت کے ساتھ منصفانہ رویہ، شخصی آزادی کا احترام اور تقاضائے تمدن سے زیادہ مطابقت اور ہم آہنگی ہے اور بالخصوص ایک ترقی یافتہ تمدن کا ساتھ دینے کی صلاحیت ایسی بات ہے جس نے بجا طور پر خطہ مشرق کو جو بمقابلہ دوسرے علاقوں کے زیادہ متمدن اور تہذیب آشنا تھا، فقہ حنفی پر فریفتہ کردیا؛ اس لئے ہر زمانے میں دنیا کے اکثر علاقوں میں اس فقہ کے متبعین کی کثیر تعداد رہی ہے، اس وقت ہندوستان، پاکستان، بنگلہ دیش، ترکی، روس، چین، آزاد ایشیا کی جمہوریتیں، ایران کا سنی علاقہ اور افغانستان میں قریب قریب ننانوے فیصد حنفی المسلک لوگ ہیں، اس کے علاوہ عراق، مصر، شام، فلسطین اور دنیا کے اکثر ملکوں میں احناف موجود ہیں، بعض اہل علم کا خیال ہے کہ تقریباً اسی فیصد اہل سنت حنفی ہیں۔ (۲)

---

(۱) تاریخ بغداد: ۱۰۶/۶، ذکر من اسمہ نعمان

(۲) حیات امام ابوحنیفہ، ص: ۹۹، تالیف: شیخ ابوزھرہ، ترجمہ: غلام احمد حریری

انہی وجوہ سے شاہ ولی اللہؒ لکھتے ہیں:

”عرفني رسول الله ﷺ أن في المذهب الحنفي طريقة رفيقة هي أوفق الطرق بالسنة المعروفة التي جمعت ونقحت في زمان البخاري وأصحابه“ (۱)

”دوران مکاشفہ مجھے رسول اللہ ﷺ نے بتایا کہ (تشریح کتاب وسنت اور استنباط مسائل کے سلسلہ میں) مذہب حنفی کا طریقہ تمام طریقوں میں سب سے زیادہ سنت معروفہ (احادیث مبارکہ) کے موافق ہے، جس کو امام بخاری وغیرہ کے زمانہ میں منقح کیا گیا اور جمع کیا گیا“

اور اسی فقہ کے طریقۂ نماز کو غیر مقلدین کے خاتم المحدثین نواب صدیق حسن خاں صاحب اقرب الی السنۃ سمجھتے تھے، (۲) اور صرف یہی نہیں کہ نواب صاحب حنفی طریقۂ نماز کو اقرب الی السنۃ سمجھتے تھے؛ بلکہ حنفی طریقہ کے مطابق ہی نماز پڑھتے تھے؛ چنانچہ نواب صاحب کے صاحبزادے نواب سید علی حسن خان لکھتے ہیں:

”والدجاہ مرحوم نماز پنجگانہ حنفی طریقہ پر پڑھتے تھے“ (۳)

یہی اقرب الی السنۃ نماز کو آج کل سنت کے خلاف کہا جا رہا ہے اور احناف پر یہ الزام لگایا جا رہا ہے کہ وہ حدیث کو چھوڑ کر قیاس ورائے اور اماموں کے اقوال پر عمل کرتے ہیں؛ حالاں کہ احناف جس قدر حدیث پر عمل کرتے ہیں کوئی اور نہیں کرتا، احناف کے یہاں حدیث مرفوع بھی حجت ہے، حدیث موقوف بھی حجت ہے، حدیث مرسل بھی حجت ہے اور ضعیف حدیث بھی رائے وقیاس کے مقابلہ میں مقدم اور حجت ہے، جبکہ یہ غیر مقلدین

---

(۱) الإنصاف، ص:۱۷

(۲) الدین یسر، ص:۱۷۶، از مولانا جعفر شاہ پھلواری

(۳) مآثر صدیقی: ۶۳/۴

صرف مرفوع حدیث کو حجت مانتے ہیں اور وہ بھی جب ان کے حق میں ہو، اگر خلاف ہو تو رد کر دیتے ہیں، ان کے یہاں نہ موقوفاتِ صحابہ حجت ہیں نہ مرسل احادیث حجت ہیں، اور نہ ہی ضعیف احادیث حجت ہیں، پھر بھی یہ خود کو عامل بالحدیث کہتے ہیں، اور احناف جو سب احادیث کو حجت مانتے ہیں وہ ان کے گمان میں عامل بالقیاس اور تارک حدیث ہیں۔

درحقیقت یہ لوگ خود تارکین حدیث ہیں، سوائے آمین بالجہر، رفع یدین، فاتحہ خلف الامام جیسے چند متنازعہ مسائل میں احادیث مختلفہ پر عمل کرنے کے ان کے پلے کچھ نہیں، متنازعہ مسائل میں بھی جن احادیث کو وہ اپنے موقف کے مطابق سمجھتے ہیں ان پر عمل کرتے ہیں، باقی تمام احادیث کو پس پشت ڈال دیتے ہیں اور ان کی تمام تحقیقات کا مدار یہی مسائل ہیں، گویا یہ مسائل فروعی مسائل نہیں؛ بلکہ کفر وایمان کی بنیاد ہیں، یہی وجہ ہے کہ غیر مقلدین کے یہاں ہر وہ شخص اہل حدیث اور پکا محمدی مسلمان ہے جو آمین پکار کر کہے، رفع یدین کرے، سینہ پر ہاتھ باندھے، امام کے پیچھے سورۂ فاتحہ پڑھے، خواہ وہ کتنا ہی جاہل، گندے اخلاق والا اور بدکردار کیوں نہ ہو، ہاں جو ان مسائل پر عامل نہیں خواہ وہ کتنا ہی بڑا عالم باعمل اور متقی و پرہیزگار کیوں نہ ہو، وہ نہ اہل حدیث ہے، نہ محمدی مسلمان ہے، یاللعجب! آپ ان غیر مقلدین کے بارے میں خود انہی کے پیشوا نواب وحید الزمان حیدرآبادی کی زبانی سنئے:

> ’’غیر مقلدوں کا گروہ جو اپنے تئیں اہل حدیث کہتے ہیں، انہوں نے ایسی آزادی اختیار کی ہے کہ مسائل اجماعی کی بھی پرواہ نہیں کرتے، نہ سلف صالحین صحابہ اور تابعین کی، قرآن کی تفسیر صرف لغت سے اپنی من مانی کر لیتے ہیں، حدیث شریف میں جو تفسیر آچکی ہے، اس کو بھی نہیں سنتے، بعضے عوام اہل حدیث کا حال یہ ہے کہ انہوں نے صرف رفع یدین اور آمین بالجہر کو اہل حدیث ہونے کے لئے کافی سمجھا ہے، باقی اور آداب اور سنن اور اخلاق نبوی سے کچھ

مطلب نہیں، غیبت، جھوٹ، افتراء سے باک نہیں کرتے، ائمہ مجتہدین رضوان اللہ علیہم اجمعین اور اولیاء اللہ اور حضرات صوفیاء کے حق میں بے ادبی اور گستاخی کے کلمات زبان پر لاتے ہیں، اپنے سوا تمام مسلمانوں کو مشرک اور کافر سمجھتے ہیں، بات بات میں ہر ایک کو مشرک اور قبر پرست کہہ دیتے ہیں''(۱)

اس فرقہ کی طرف سے فقہ اور ائمہ فقہ خصوصاً امام ابوحنیفہ اور ان کی طرف منسوب فقہ ،فقہ حنفی کے تعلق سے جو زبان درازیاں ہورہی ہیں، وہ ہر حساس دل کے لئے باعث تشویش اور حیرت واستعجاب ہے، اسی کا مشاہدہ کرکے حبیب الدین صاحب —— جو دل درمند اور فکرارجمند رکھتے ہیں، جو ہیں تو عصری تعلیم یافتہ اور ان کی عمر بھی اسی دشت کی سیاحی میں گذری؛ لیکن وہ دیندار گھرانے کے چشم و چراغ ہیں اور حضرت مولانا حسام الدین فاضلؒ اور ان کے نامور صاحبزادے سابق امیر ملت اسلامیہ حضرت مولانا محمد حمید الدین حسامی عاقل رحمۃ اللہ علیہ کی بے مثال صحبت وتربیت نے اس میں مزید نکھار پیدا کیا اور اس کے نتیجے میں ان کو دینی کتب سے خاص لگاؤ پیدا ہوا، آپ اگرچہ عربی کتب سے براہ راست استفادہ نہیں کرپاتے ہیں؛ لیکن اپنے ذوق کی تسکین کا سامان اردو اور انگریزی زبان میں موجود لٹریچر سے فراہم کرتے رہتے ہیں اور اہل علم سے بھی تبادلہ خیال کرتے رہتے ہیں —— ہمارے جامعہ کے ناظم جناب رحیم الدین انصاری صاحب دامت برکاتہم سے رجوع ہوئے اور فرقۂ مذکورہ کی ریشہ دوانیوں کا ذکر کرتے ہوئے یہ فرمائش کی کہ طہارت ونماز سے متعلق جو مسائل ہیں ان کو براہ راست نصوص سے مدلل کرکے لکھا جائے؛ تاکہ اس فرقہ کی طرف سے عوام کے مابین جو غلط فہمیاں پھیلائی جارہی ہیں ان کا مثبت طور سے ازالہ ہوجائے۔

ہمارے ناظم صاحب جو اس طرح کے تحقیقی کام کو نہ صرف یہ کہ بنظر استحسان دیکھتے

(۱) لغات الحدیث: ۹۱/۲، از نواب وحید الزمان حیدرآبادی

ہیں؛ بلکہ اس کی سرپرستی بھی فرماتے ہیں، کام کرنے والوں کی ہمت افزائی کرتے ہیں اور اس راہ میں حائل دشواریوں کو حل بھی کرتے ہیں، آپ نے اس کام کی اہمیت ونزاکت کو محسوس کرتے ہوئے راقم الحروف کو طلب کیا، اور یہ کام میرے سپرد کیا؛ لیکن ادارہ کے مفوضہ ذمہ داریوں کے ساتھ اسے انجام دینا مشکل تھا، اور سردست ذمہ داریوں میں تخفیف بھی قرین مصلحت نہیں تھی، جس کی بناء پر یہ کام جامعہ کے ایک فیض یافتہ ہونہار فاضل ومفتی جناب مولانا مفتی مکرم محی الدین زاداللہ علمہ وفضلہ استاذ حدیث وفقہ کے ذمہ یہ کام کیا گیا کہ وہ میری نگرانی میں اسے انجام دیں؛ چنانچہ مولانا —— جو خود علمی خانوادہ کے چشم و چراغ ہیں اور کئی کتابیں ان کے قلم سے بھی منظر عام پر آچکی ہیں —— نے بہت سلیقے سے یہ کام کیا ہے، مسائل کو نصوص سے مدلل کیا ہے، حوالہ جات کا غیر معمولی اہتمام کیا ہے، حدیث کی صحت وسقم اور اس کے درجہ کو بھی بیان کیا ہے، مسائل میں پائے جانے والے اختلاف کی نشاندہی بھی کی ہے، زبان عام فہم اور شستہ ہے، یہ کتاب اس لائق ہے کہ ہر عالم کے پاس ہو، ائمہ مساجد بھی اس سے فائدہ اٹھائیں، اللہ تعالیٰ اس کتاب کو قبولیت سے نوازے، مؤلف کے لئے ذخیرۂ آخرت ثابت ہو، جناب حبیب الدین صاحب جو اس کتاب کے اصل محرک ہیں، ان کو دنیا وآخرت کی سرخروئی حاصل ہو، جامعہ جو اس کتاب کو منظر عام پر لانے کی جدوجہد میں شریک ہے، اسے ترقیات سے نوازے، اور اس کا فیض عام وتام ہو، ہمارے ناظم صاحب کی عمر میں برکت دے اور ادارہ کو ہر قسم کے شرور وفتن سے محفوظ رکھے اور ادارہ ان کی نظامت میں ترقی کی طرف رواں دواں رہے۔ آمین

۲۳/۳/۱۴۳۲ھ

محمد جمال الدین
دار العلوم حیدرآباد

ابتدائیہ

از مؤلف

اللہ تعالیٰ نے انسانوں کی ہدایت کے لئے دو چیزیں ساتھ ساتھ چلائی ہیں: ایک سلسلہ آسمانی کتابوں کا اور علوم وحی کا اور دوسرا سلسلہ حاملینِ وحی انبیاء کرام علیہم السلام کا، انسانوں کے حق میں یہ دوسرا ذریعہ اس لحاظ سے اہم ہے کہ اس کے بغیر پہلے ذریعہ تک ان کی رسائی ناممکن ومحال ہے، انبیاء کرام علیہم السلام کا فرضِ منصبی امت کے سامنے آیاتِ خداوندی کی تلاوت اور ان کی تعلیم وبیان دونوں ہے۔

انبیاء کرام علیہم السلام نے اپنا یہ منصب صحابہ کرام کو منتقل کیا ہے، ان برگزیدہ حضرات نے اس وراثت کو سینے سے لگایا، جان ودل سے اس کی حفاظت کی اور اسے اپنے باصلاحیت، عادل ومتدین شاگردوں کے حوالہ کیا، یوں چودہ سو سال قبل کی یہ امانت ہم تک اسلاف کی انہی قربانیوں کے صدقے میں پہونچی ہے، اسلاف کا خونِ جگر بھی اس میں صرف ہوا ہے اور دل ودماغ کی جولانیاں بھی اس میں کھپی ہیں۔

شیاطین کے بہکاوے کی وجہ سے امت میں اس حوالے سے دو طرح کے لوگ ظاہر ہوئے، ایک تو وہ لوگ جنہوں نے آسمانی کتابوں کی تعظیم وفرمانبرداری اس میں سمجھی کہ نعوذ باللہ حاملینِ کتب انبیاء کرام علیہم السلام کی اہمیت وحیثیت ہی کو گھٹا دیا جائے اور انہیں محض ایک ڈاکیہ اور پیغام رساں کے مماثل قرار دیا جائے، دوسرے وہ لوگ جنہوں نے اپنی بددماغی سے حاملینِ وحی کی تعظیم وفرمانبرداری، اس میں دیکھی کہ وارثین انبیاء کی وقعت وعظمت کو ختم کیا جائے اور انہیں انبیاء کرام کا حریف قرار دیا جائے، یہ دوسری قسم کے لوگ

امت کے حق میں اس اعتبار سے زیادہ خطرناک ہیں کہ بظاہر عظمت رسول اور سنت رسول کے دعویدار ہونے کی وجہ سے کوئی ان کے فکر وفہم پر شک نہیں کرسکتا؛ بلکہ ان کے اس پرفریب دعوے کی بنا پر ان کے دام میں نہایت جوش وولولہ سے پھنس جاتا ہے؛ لیکن اس راہ کی جاہلانہ پیش قدمی، رفتہ رفتہ اسے حاملینِ وحی کی بے حرمتی کے دہانے پر بھی پہنچا دیتی ہے، پھر وہ نامعلوم طور پر اسلام کے طوق کو اتار پھینکتا ہے، ارتداد وانکارِ حدیث کی تاریخ اس قسم کے عبرت انگیز شواہد سے بھری پڑی ہے، اعاذنا الله منه .

علماء اسلام وفقہاء امت کی بے احترامی کا فتنہ اگرچہ کوئی نیا فتنہ نہیں، تاہم بدقسمتی سے اِدھر چند دہوں سے امت میں اسے جو قبولِ عام نصیب ہوا ہے، اس کی سابق میں نظیر نہیں ،خدا کی جانب سے حاصل ہوئے کچھ دینی شعور اور نماز و روزہ کی توفیق کی ناقدری اس طریقہ پر کی جارہی ہے کہ سارے دین کو اوہام وخیالات اور ظنون کا مجموعہ بتایا جاتا ہے، اہل علم وذکر سے وابستگی کو اپنی جہالت سے آباء واجداد کی تقلید مذموم کا مصداق قرار دیا جاتا ہے، فقہ کے فروعی اور غیر اہم اختلافات کو اس قدر اہمیت دی جاتی ہے کہ گویا نجات اخروی کا مدار اسی پر موقوف ہے، اپنی ساری توانائیاں، چند ایک طہارت ونماز کے مسائل میں صرف کردی جاتی ہیں اور قطعاً اس جانب توجہ نہیں دی جاتی ہے کہ امت کے کتنے افراد بے نمازی و بے ایمانی کی حالت میں دنیا سے رخصت ہورہے ہیں؟ فإلى الله المشتكى ؛ حالاں کہ وہ دین جسے امت کی اکثریت نے اختیار کیا ہوا ہے، نہ ہی وہ اوہام وخیالات کا پلندہ ہے اور نہ ہی ائمہ و فقہاء سے وابستگی تقلید مذموم کہی جاسکتی ہے اور نہ ہی فقہی اختلافات حق و باطل اور نجات وخسران کا معیار بن سکتے ہیں۔

فقہی اختلافات کی تاریخ

واقعہ یہ ہے کہ دور اول ہی سے یہ فقہی و ذیلی اختلافات چلے آرہے ہیں ، باہمی احترام ومحبت سے ہر ایک دوسرے کی رائے کو وزن دیا کرتا تھا، بیسیوں مسائل میں صحابہ کرام ﷺ

باہم مختلف۔ تھے، کم از کم مصنف ابن ابی شیبہ و مصنف عبدالرزاق کا دیکھنے والا اس کے انکار کی جرأت نہیں کرسکتا، مگر کہیں ایسا نہیں ہوا کہ ان کے یہ ثانوی اختلافات خدانخواستہ آپسی جدال وخونریزی کا باعث ہوئے ہوں؛ بلکہ اس قسم کی فضا پیدا کرنے والوں پر صحابہ کرام ﷺ کی مقدس ترین ہستیوں نے وہیں پر روک لگادی تھی، بخاری کی روایت ہے کہ:

"حضرت عبداللہ بن عباس ﷺ کے سامنے کسی نے کہا کہ معاویہ ﷺ تو وتر کی ایک ہی رکعت پڑھا کرتے ہیں، حضرت ابن عباس ﷺ نے جواب میں فرمایا کہ انہوں نے ٹھیک ہی کیا ہے، وہ فقیہ آدمی ہیں، رسالتمآب ﷺ کی انہوں نے صحبت اٹھائی ہے" (۱)

امام احمد بن حنبلؒ حجامہ (پچھنا لگوانے) کو ناقض وضو خیال کرتے تھے اور اس کے مطابق فتوی بھی دیا کرتے تھے، ایک دفعہ کسی نے ان سے کہا کہ:

"اگر کوئی امام اس صورت میں وضو کئے بغیر نماز پڑھاتا ہے تو کیا اس کے پیچھے نماز پڑھ لوں؟ امام احمد بن حنبلؒ نے تعجب سے کہا: سبحان اللہ! کیا امام مالک بن انسؒ اور امام سعید بن المسیبؒ کے پیچھے تم نماز نہیں پڑھو گے؟ (یہ دونوں حضرات حجامہ سے وضو نہ ٹوٹنے کے قائل تھے" (۲)

فروعی اختلافات کے اسباب اوران کی شرعی حیثیت

صحابہ کرام ﷺ اور اسلاف امت کے درمیان فروعی اختلافات کے پیدا ہونے کے بے شمار فطری وقدرتی اسباب ہیں، بسا اوقات نبی کریم ﷺ سے کوئی عمل کئی طریقوں سے ثابت ہوتا ہے تو جو صحابی ﷺ جس طریقے کو کثرت واہتمام سے دیکھتا ہے، بس اسے وہ

---

(۱) بخاری، باب ذکر معاویہ ﷺ، حدیث نمبر:۳۷۶۴،۳۷۶۵

(۲) مجموع الفتاوی لابن تیمیہ :۲۰/۳۶۴-۳۶۵

اختیار کر لیتا ہے، کبھی ایسا ہوتا ہے کہ کوئی عمل نبوی زمانہ سابق کا ہوتا ہے، بعد ازاں وہ عمل نبی ﷺ نے ترک کر دیا ہوتا ہے تو وہاں اگر چہ دونوں عمل، عملِ نبوی ﷺ ہی ہوتے ہیں، مگر قابل اخذ بعد والا عمل ہوتا ہے، کبھی نبی ﷺ نے کسی خاص موقع پر کوئی عمل کیا ہوتا ہے، اس کی وجہ بیان نہیں کی ہوتی ہے تو وہاں صحابہ کرام ﷺ اپنے فہم سے اس عمل نبوی ﷺ کی جدا جدا وجہ بیان کرتے ہیں، اس طرح اختلاف آراء ہو جاتا ہے، کبھی ایسا ہوتا ہے کہ الفاظِ حدیث کے ضبط کرنے میں فرق ہو جاتا ہے جس کی بنا پر خود بخود دو طرح کے مفہوم کے امکانات پیدا ہو جاتے ہیں، کبھی ایسا ہوتا ہے کہ الفاظِ حدیث کے ضبط کرنے میں تو یکسانیت رہتی ہے، مگر بذاتِ خود وہ لفظ ایک سے زائد معنی کا احتمال رکھتا ہے اور ہر شخص اپنے فہم و اجتہاد کے موافق الگ الگ معنی اختیار کرتا ہے، کبھی کوئی مسئلہ ایسا سامنے آتا ہے کہ جس کا صریح حکم کتاب وسنت میں موجود نہیں ہوتا، ہر صحابی و مجتہد اپنی اجتہادی صلاحیت کو بروئے کار لاتا ہے اور کوئی حکم بیان کرتا ہے، جس کی وجہ سے ایک سے زائد آراء امت کے سامنے آتی ہیں، کبھی کسی مسئلہ میں کوئی حدیث موجود رہتی ہے، مگر کسی وجہ سے اس کی صحت میں تردد واقع ہو جاتا ہے اور مجتہد کسی دوسرے قرائن کی بنیاد پر ایک رائے قائم کر لیتا ہے اور اس حدیث کو اختیار نہیں کرتا، اس طرح اختلافِ آراء ہو جاتا ہے۔(۱)

اس قسم کے فروعی اختلافات ناگزیر اور ایک بیدار مغز معاشرہ کا لازمی حصہ بھی ہیں اور شریعت میں گوارا اور پسندیدہ بھی، غزوۂ بنی قریظہ کے موقع پر نبی ﷺ نے اپنے اصحاب سے فرمایا تھا کہ:

''ہر گز تم میں سے کوئی بنو قریظہ کے علاوہ کہیں نماز عصر نہ پڑھے، راستہ میں عصر کا وقت ہو گیا تو صحابہ کرام ﷺ کی دو جماعتیں ہو گئیں، ایک جماعت کا کہنا تھا کہ نبی ﷺ کے ارشاد گرامی کا مقصد جلد از جلد

---

(۱) حجة الله البالغة :۱/۴۰۲-۴۱۰

بنو قریظہ پہنچنے کا حکم کرنا ہے، یہ منشأ نہیں کہ نماز کا وقت ختم ہونے کے اندیشہ کے باوجود راستہ میں نماز نہ پڑھی جائے، غرض اس جماعت نے راستہ ہی میں نماز عصر پڑھ لی، دوسری جماعت کا خیال تھا کہ فرمان نبوی کا منشأ بنو قریظہ ہی میں پہنچ کر نماز پڑھنے کا حکم کرنا ہے، چاہے نماز قضا ہو جائے؛ چنانچہ اس جماعت نے بنو قریظہ پہنچ کر ہی نماز پڑھی، نبی ﷺ کو اس کی اطلاع ہوئی تو آپ ﷺ نے کسی جماعت کی بھی تردید نہیں فرمائی'' (۱)

'' ایک سفر میں دو صحابی چل رہے تھے، نماز کا وقت ہو گیا، پانی دستیاب نہ تھا، دونوں نے تیمّم کر کے نماز پڑھ لی، بعد ازاں پانی مل گیا تو ایک صحابی رضی اللہ عنہ نے تو پہلی نماز پر اکتفا کیا، مگر دوسرے نے وضو کر کے اپنی نماز دہرالی، پھر نبی ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر دونوں نے اپنا عمل بیان کیا تو آپ ﷺ نے پہلے والے صحابی رضی اللہ عنہ سے فرمایا: تم نے سنت کے مطابق کام کیا ہے اور دوسرے صحابی رضی اللہ عنہ سے فرمایا تم کو دو اجر ملے'' (۲)

حضرت قاسم بن محمدؒ فرمایا کرتے تھے:

'' رسول اللہ ﷺ کے صحابہ کا اختلاف بعد والوں کے لئے رحمت ہی رحمت ہے'' (۳)

عون بن عبداللہ بن عتبہ بن مسعود رضی اللہ عنہ ارشاد فرماتے ہیں:

'' مجھے یہ پسند نہیں کہ اصحاب محمد ﷺ اختلاف نہ کریں؛ اس لئے کہ اگر

---

(۱) بخاری، حدیث نمبر: ۹۴۶، فتح الباری: ۴۰۹/۷

(۲) أبو داؤد، باب في المتيمم يجد الماء، حديث نمبر: ۳۳۸

(۳) حلية الأولياء: ۱۱۹/۷

وہ اختلاف نہ کریں اور کسی مسئلہ میں اجماع کر لیں تو کوئی شخص کوئی اور راہ کو اختیار کرے گا تو مخالف سنت ہوگا، اس کے برخلاف اگر صحابہ کرام ﷺ میں اختلاف ہو اور کوئی آدمی ان میں سے کسی کے قول کو اختیار کر لے تو وہ درحقیقت سنت ہی کو اختیار کرنے والا ہوگا'' (۱)

حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ سے بھی منقول ہے کہ:

''صحابۂ کرام ﷺ کے درمیان مسائل میں اختلاف نہ ہوتا تو لوگ بڑی تنگی میں ہوتے، اختلاف کا فائدہ یہ ہے کہ لوگوں کو وسعت وسہولت نصیب ہوئی'' (۲)

امام ابن تیمیہؒ فرماتے ہیں کہ:

''ان (فروعی) اختلافات کی نوعیت ایسی ہے جیسے حجاج کرام کے مکہ معظمہ تک پہنچنے کے مختلف راستے، ہر راہی اپنی سہولت وصوابدید اور اپنے مصالح کے اعتبار سے کوئی راستہ اختیار کرتا ہے اور منزل مقصود تک رسائی سے ہمکنار ہوتا ہے'' (۳)

اختلاف اور خلاف کے مابین فرق

بعض حضرات کو اختلاف کا نام سن کر بڑی وحشت ہوتی ہے، وہ اسے دین میں تفرق اور رخنہ اندازی خیال کرتے ہیں؛ لیکن دراصل یہ ایک غلط فہمی ہے، جو اصطلاحاتِ شریعت اور استعمالات سلف سے ناواقفیت کی بنا پر پیدا ہوتی ہے، یہاں اصل میں دو لفظ ہیں: خلاف اور اختلاف، تفرقہ ورخنہ اندازی کے مترادف پہلا لفظ ہے، دوسرا لفظ نہیں، ابوالبقاء الکفوی نے خلاف اور اختلاف کے مابین چار فرق بیان کئے ہیں:

---

(۱) سنن دارمی: ۱۵۱/۱

(۲) جامع بیان العلم: ۸۰/۲

(۳) مجموع الفتاوی: ۲۴۲/۲۴ وما بعدها

۱) اختلاف میں راستہ الگ ہوتا ہے؛ لیکن منزل مقصود ایک، جب کہ خلاف کی صورت میں ہر ایک کا راستہ بھی الگ، ہوتا ہے اور مقصود بھی الگ۔

۲) اختلاف کسی دلیل کے پیش نظر ہوتا ہے جبکہ خلاف بلا دلیل اور ہٹ دھرمی کی بنا پر ہوتا ہے۔

۳) اختلاف کا تعلق آثار رحمت سے ہے اور خلاف، کا آثار بدعت سے۔

۴) اختلاف حدود شریعت میں ہوتا ہے اور خلاف کتاب وسنت اور اجماع امت سے متصادم ہوتا ہے۔(۱)

امام سیوطیؒ فرماتے ہیں:

> ''اچھی طرح جان رکھو کہ ملت اسلامیہ میں مذاہب کا اختلاف بڑی نعمت اور بزرگی وفضیلت کی چیز ہے، اس کے بھید اور حکمت کو علماء خوب جانتے ہیں، جاہل اس کے ادراک سے کورے ہیں، اسی کا نتیجہ ہے کہ بعض جاہلوں کے منہ سے یہ جملہ سنا جاتا ہے کہ نبی ﷺ تو ایک شریعت لے کر آئے ہیں تو یہ چار مذاہب کہاں سے پیدا ہو گئے؟''(۲)

تاہم اگر کسی کو یہ سادے حقائق ہضم نہ ہوتے ہوں تو وہ اسلاف کے ان فروعی اختلافات کو اپنی تعبیر کے لحاظ سے اختلاف کا نام دینے کی حماقت بھی نہ کرے؛ اس لئے کہ کہنے کو تو یہ اختلافات ہیں، مگر حقیقت میں امت کے لئے وسعت ورحمت کے سرچشمے ہیں، حضرت طلحہ بن مطرف تابعیؒ کے سامنے جب اختلافِ سلف کا تذکرہ آتا تو فرماتے: ''اسے اختلاف کا نام بھی مت دو؛ بلکہ وسعت وسہولت کہو''(۳) امام احمد بن حنبلؒ کے زمانے میں

---

(۱) كليات أبو البقاء الكفوي :۱/۷۹-۸۰

(۲) جزيل المذاهب في اختلاف المذاهب للإمام السيوطيؒ

(۳) حلية الأولياء :۵/۱۱۹

کسی نے کتاب الاختلاف کے نام سے اختلافاتِ سلف کو جمع کیا تھا تو امام احمدؒ نے فرمایا کہ اسے ''کتاب الاختلاف'' نہ کہو؛ بلکہ ''کتاب السعة'' کہو''۔(۱)

اہل حق کے اختلافات کا محل

اہل حق علماء وسلف صالحین کا آپسی اختلاف دین کے اصول وعقائد میں نہیں ہوتا، فروع وفقہیات میں ہوتا ہے، جو نہ کفر کا باعث ہوتا ہے نہ گمراہی وجدال کا، ہر ایک کے پاس اپنے موقف پر دلائل ہوتے ہیں اور ہر ایک کو علم وحکمت اور فہم خداداد سے حصہ ملا ہوتا ہے اور پروردگارِ عالم کی زبانی ان علماء ومجتہدین کا حال یہ ہوتا ہے: ''اس فیصلے کی سمجھ ہم نے سلیمان علیہ السلام کو دی اور (ویسے) ہم نے دونوں ہی کو حکمت اور علم عطا کیا تھا'' (۲) اہل بصیرت کے مطابق امتِ محمدیہ کے اہل حق علماء کا آپسی اختلاف، انبیاء کرام کی شریعتوں کے اختلاف کی طرح ہے، قرآن صراحت کرتا ہے کہ ''ہر ایک (امت) کے لئے ہم نے ایک (الگ) شریعت اور طریقہ مقرر کیا ہے'' (۳) اختلاف شرع کے باوجود انبیاء کرام ایک ایسی وحدت ہیں کہ کوئی ان میں سے کسی ایک کی تکذیب کرتا ہے تو اس کا اثر اس پوری اکائی پر پڑتا ہے اور وہ جمیع پیغمبروں کی تکذیب کرنے والا ٹھہرتا ہے'' (۴) ائمہ اربعہ کے آپسی اختلاف کو اسی نہج پر سمجھنا چاہئے۔

حکایت کیا جاتا ہے کہ: مامون الرشید کے عہد میں ایک شخص اسلام سے عیسائیت کی جانب مرتد ہو گیا تھا، (العیاذ باللہ) ایسے آدمی کی سزا شریعت میں گردن زدنی ہے، مامون الرشید نے سزا کے نفاذ سے قبل اس سے ارتداد کا سبب دریافت کیا؛ تاکہ اس کے شبہات کو دور کر کے اسلام کی طرف اس کی واپسی کی راہ پیدا کی جاسکے، اس مرتد نے ارتداد کا باعث

(۱) مجموع الفتاوی: ۳۰/۷۹

(۲) الأنبیاء: ۷۹

(۳) المائدة: ۴۸

(۴) الشعراء: ۱۰۵-۱۲۳

یہی علمی اختلافات بتلایا، اس پر مامون نے کہا کہ:

''ہمارے یہاں دوطرح کے اختلافات پائے جاتے ہیں: ایک تو جیسے اذان کے کلمات، جنازہ کی تکبیرات، تشہد کے صیغے، تکبیرات تشریق، قرأت کے طریقے، فتوی کے دلائل وغیرہ کا اختلاف، یہ اختلاف تو اختلاف ہی نہیں یہ تو صوابدید، وسعت اور تخفیف کی بات ہے، اذان کے دوہرے کلمات کہنے والا اکہرے کلمات کہنے والے کو خطاوار نہیں کہتا، نہ ہی آپس میں وہ ایک دوسرے پر اس معاملہ میں عار وعتاب کرتے ہیں، اور ایک اختلاف کتاب اللہ کی محتمل آیات کی تأویل وتفسیر کا ہے اور یہ اختلاف ایسا ہے کہ توریت وانجیل بھی اس سے خالی نہیں، اللہ تعالیٰ نے اپنی حکمتِ بالغہ ہی سے اس طرح کے اختلاف کا امکان رکھا ہے، وہ اگر چاہتا ہے تو ایسا کوئی موقع ہی نہ رکھتا اور اختلاف ہی پیدا نہ ہوتا، مگر اس صورت میں آزمائش وتکلیف، مسابقت ومنافست کے معنی ہی فوت ہوجاتے'' (۱)

مامون الرشید نے اس خوبی سے اس مرتد کے سامنے یہ مضمون کھولا کہ وہ تائب ہوکر کلمۂ شہادت پڑھنے لگا، اور مامون کے خلیفہ برحق ہونے کی گواہی دینے لگا۔

اختلافاتِ فقہیہ کے فہم کے لئے علم حدیث کی ضرورت

اختلافات ائمہ کی حکمتوں اور فروعی اختلافات کی معقولیت تک رسائی کے لئے علم حدیث سے زبردست واقفیت نہایت ضروری ہے، بدقسمتی سے آج ماحول کچھ ایسا ہوگیا ہے کہ چند ایک احادیث کے محض ترجمے دیکھ کر مسائل دین میں معرکہ آرائی شروع کردی جاتی ہے اور بے وجہ گمراہی مول لی جاتی ہے، امام احمد بن حنبلؒ سے کسی نے پوچھا:

---

(۱) عیوان الاخبار: ۲/۱۵۴

''کیا آدمی ایک لاکھ حدیثیں یاد کرلے تو فقیہ ہو جائے گا؟ امام احمد بن حنبلؒ نے فرمایا: نہیں، سائل نے کہا: پھر کیا دولاکھ حدیثیں؟ فرمایا نہیں، کہا: پھر کیا تین لاکھ حدیثیں؟ فرمایا: نہیں، کہا: پھر کیا چار لاکھ حدیثیں؟ اس پر امام احمدؒ نے اثبات میں ہاتھ سے خفیف سا اشارہ فرمایا''(۱)

متعارض روایات میں تعارض ختم کرنے کے اصول

علماء کرام کی تصریح کے مطابق، فقہ واجتہاد کی خدمت انجام دینے والوں کے لئے تنہا متونِ احادیث کا حفظ کافی نہیں؛ بلکہ یہ بھی ضروری ہے کہ اس کے متعلقات پر بھی بھرپور بصیرت حاصل ہو، متونِ احادیث کے متعلقات میں ایک اہم بحث متعارض روایات کے مابین محاکمہ کی ہے، یہ بات محتاجِ بیان نہیں ہے کہ قرآن پاک کے کلام الٰہی ہونے اور معجزہ ہونے کی ایک بنیادی دلیل اس کا تعارض واختلاف سے پاک ہونا ہے، ارشاد خداوندی ہے:

''کیا یہ لوگ قرآن میں غور وفکر سے کام نہیں لیتے؟ اگر یہ اللہ کے سوا کسی اور کی طرف سے ہوتا تو وہ اس میں بکثرت اختلافات پاتے''(۲)

احادیث نبوی ﷺ اپنی وضع وحقیقت کے لحاظ سے قرآن پاک کا بیان ہے، ارشاد ربانی ہے:

''ہم نے تم پر بھی یہ قرآن اس لیے نازل کیا ہے، تاکہ تم لوگوں کے سامنے ان باتوں کی واضح تشریح کردو جوان کے لیے اتاری گئی ہیں''(۳)

---

(۱) إعلام الموقعین :۴۵/۱

(۲) النساء:۸۲

(۳) النحل:۴۴

نیز ارشاد ہے:

''اور یہ (محمد ﷺ) اپنی خواہش سے کچھ نہیں بولتے، یہ تو خالص وحی ہے جو ان کے پاس بھیجی جاتی ہے''(۱)

حضرت امام شافعیؒ فرماتے ہیں:

''کسی استثناء کے بغیر، سنت تمام کی تمام، قرآن کریم کی شرح ہے''(۲)

اس بناء پر کلام الٰہی کی طرح کلام نبی ﷺ بھی آپسی تعارض واختلاف کے عیب سے پاک ہے۔

لیکن بسا اوقات سطحی نظر اور کوتاہ فہمی کی وجہ سے آیات واحادیث میں تعارض جیسی صورتحال دکھائی دیتی ہے، ایسے مواقع پر گہرائی وگیرائی سے اگر صورتحال کا جائزہ لیا جاتا ہے تو اپنے ہی فہم وبصیرت کا قصور عیاں ہوتا ہے، اور آیات، واحادیث کی حقانیت مزید آشکارا ہوتی ہے۔

نافع بن ازرق رضی اللہ عنہ نے کسی موقع پر تتبع وتلاش کر کے چند ایسی آیات قرآنی کو جمع کیا جو ایک دوسرے کے معارض معلوم ہوتی تھیں، پھر انہیں رئیس المفسرین وترجمان القرآن حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ کی خدمت میں پیش کر کے ان کا حل دریافت کیا، حضرت عباس رضی اللہ عنہ نے بڑی خوبی سے اس تعارض کو دفع فرمایا، پھر اخیر میں یوں فرمایا:

''قرآن کریم میں تعارض واختلاف نہیں ہوسکتا کیونکہ کل کا کل قرآن، اللہ کی جانب سے ہے''(۳)

جمہور امت کا موقف، سنت رسول ﷺ کے بارے میں بھی یہی ہے کہ دو صحیح حدیثوں کے درمیان حقیقی اعتبار سے تعارض کا پایا جانا ناممکن ہے، اگر کہیں تعارض کی سی صورت نظر آتی

(۱) النجم:۳-۴

(۲) الاتقان:۴/۲۴-۲۵

(۳) الموافقات:۳/۲۱۴-۲۱۶

ہوتو وہاں یہ اطمینان رکھنا چاہیے کہ وہ تعارض حقیقی نہیں بلکہ ظاہری تعارض ہے، جو غور وفکر کرنے سے فی الفور رفع ہوسکتا ہے؛ البتہ اتنا ضرور ہے کہ قرآن کریم کے مقابلے، احادیث کے درمیان ظاہری تعارض کا تناسب کئی گنا زیادہ معلوم ہوتا ہے، اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ قرآن کا بیشتر حصہ محکمات پر اور قطعی احکام پر مشتمل ہے جن میں تعارض کا امکان نہیں، اور جہاں تعارض کی صورت محسوس ہوتی ہو، وہاں تعارض کو ختم کرنا کچھ دشوار نہیں۔(۱)

ایک اور وجہ یہ بھی سمجھ میں آتی ہے کہ احادیث میں لاتعداد جزوی احکام بیان ہوئے ہیں، جن کے مواقع ومحل جداگانہ ہیں، جن کے زمانی ومکانی حدود الگ ہیں، احکامات کے جاری کرنے اور احکامات پر عمل پیرا ہونے میں فرق مراتب کا لحاظ بھی ناقابل انکار ہے، جب تک حدیث کے ایک طالب علم کے پیش نظر حدیث فہمی کے یہ ضروری علوم نہ ہوں گے، وہ شکوک وشبہات میں گرفتار رہے گا اور اپنی کج فہمی سے احادیث کو تعارض واختلاف کے ساتھ مورد الزام ٹھہرائے گا۔

حضرات محدثین اور فقہاء عظام کو اللہ تعالیٰ جزائے خیر عطا فرمائے کہ انہوں نے بہت سارے ایسے اصولوں کی نشاندہی فرمادی ہے، جنہیں بروئے کار لاکر احادیث کے تعلق سے اپنے ایمان ویقین کو سلامت رکھا جاسکتا ہے اور علوم وحی سے اپنا رشتہ برقرار رکھا جاسکتا ہے، فقہاء احناف کے مطابق رفع تعارض کا اصل الاصول یہ ہے: ''نسخ پھر ترجیح پھر تطبیق''(۲) یعنی دو احادیث کے درمیان اگر تعارض معلوم ہوتا ہے تو وہاں اولاً اس کی تعیین کی جانی چاہیے کہ ناسخ حدیث کونسی ہے اور منسوخ کونسی؟ ناسخ قابل عمل رہے گی اور منسوخ پر عمل نہ ہوگا۔

نسخ اور اس کے اصول

نسخ کی ایک صورت تو بالکل بے غبار اور غیر مبہم ہے اور وہ یہ کہ خود حضور ﷺ نے ایک

---

(۱) المهذب في علم اصول الفقه: ۵/۲۴۳۷

(۲) التقریر والتحبیر: ۳/۳

حکم کا ناسخ اور دوسرے کا منسوخ ہونا بتادیا ہے، مثلاً آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ

"میں نے تم کو قبر کی زیارت سے منع کیا تھا، لیکن اب کر سکتے ہو"(۱)

اسی طرح آپ ﷺ نے شراب کے کچھ مخصوص برتنوں کی بابت فرمایا کہ:

"میں نے ان کے استعمال سے منع کیا تھا؛ لیکن اب اجازت دیتا ہوں"(۲)

اس طرح کی نصوص میں ایک کا ناسخ ہونا اور دوسرے کا منسوخ ہونا بالکل واضح ہے، لیکن بہت کم نصوص ہیں جن میں اس وضاحت اور صراحت کے ساتھ نسخ کا ذکر آیا ہو۔ ان کے علاوہ مختلف صورتیں ہیں جن میں فقہاء اندازہ کر سکتے ہیں کہ یہاں ایک حکم ناسخ اور دوسرا منسوخ ہوگا۔ گو یقین کے ساتھ ایسا نہیں کہا جاسکتا، اور وہ صورتیں یہ ہیں:

۱) خود صحابی، حضور ﷺ کے کسی عمل کے بارے میں بتائے کہ آپ ﷺ نے یہ فعل، اس فعل کے بعد کیا تھا جیسے: حدیث میں ہے کہ آنحضرت ﷺ کا آخری عمل آگ کی پکی ہوئی چیزوں کے کھانے کے بعد وضو نہیں کرنے کا تھا۔(۳)

۲) صحابی کسی عمل کے بارے میں کہیں کہ ہمیں یہ اور پھر اس سے مختلف یہ حکم دیا گیا، مثلاً حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: مباشرت بلا انزال کی صورت میں غسل کے ضروری نہ ہونے کا حکم، ابتدائی زمانے کا تھا اور رخصت وسہولت پر مبنی تھا؛ لیکن بعد میں اس صورت میں بھی غسل کے ضروری ہونے کا حکم دے دیا گیا۔(۴)

۳) کبھی امت کا اجماع واتفاق کسی حکم کے منسوخ قرار پانے کے لیے نشان و پہچان بنتا ہے، جیسے شراب نوشی کرنے والے کو چوتھی بار بطور سزا قتل کر دیئے جانے کا

---

(۱) مسلم:۹۷۷

(۲) مسلم:۹۷۷

(۳) ابوداؤد:۱۹۲

(۴) ابوداؤد:۲۱۵

حکم آپ ﷺ سے منقول ہے؛ لیکن دوسری روایات اور قرون خیر کے معمولات کو سامنے رکھ کر فقہاء اس پر متفق ہیں کہ یہ حدیث معمول نہیں، اس لیے اس کو منسوخ سمجھا جائے گا۔(۱)

۴) دو نصوص میں سے ایک کسی بات کی اباحت کا اور دوسری ممانعت کا تقاضہ کرتی ہو، مثلاً ایک روایت سے "گوہ" کا حرام ہونا ظاہر ہوتا ہے اور دوسری روایت اس کے جواز کو بتاتی ہے، ایسی صورت میں بعض علماء اصول کا خیال ہے کہ اباحت والا حکم منسوخ اور ممانعت کا حکم ناسخ ہوگا۔(۲)

ترجیح کے اصول اور طریقے

جن متعارض نصوص میں ناسخ ومنسوخ کی تحقیق نہ ہو وہاں اس کے سوا چارہ نہیں کہ ایک کو ترجیح دیا جائے اور دوسرے کو نظر انداز کر دیا جائے۔

کوچہ اجتہاد واستنباط کے مسافر کو چونکہ قدم قدم پر اس مسئلہ سے سابقہ پیش آتا ہے اور وہ متعارض ومتضاد روایات کے درمیان ترجیح پر بعض اوقات مجبور ہوتا ہے، اس لیے تمام ہی اصولیین نے اس کو خاص اہمیت دی ہے اور اپنی کتابوں میں اکثر اس کے لیے مستقل فصل قائم کی ہے اور چونکہ فقہ کی طرح حدیث سے بھی اس موضوع کا گہرا تعلق ہے، اس لیے اصول حدیث کی کتابوں میں بھی اس نے خاص اعتناء والتفات حاصل کیا ہے، تاہم قدیم مصنفین اور اہل علم میں علامہ ابوبکر محمد بن موسیٰ بن عثمان بن حازم ہمدانی (۵۸۴ھ) نے ناسخ ومنسوخ حدیثوں سے متعلق اپنی شہرۂ آفاق اور یکتائے روزگار تالیف "کتاب الاعتبار" میں قریب قریب اکثر اہم وجوہ کو مثالوں کے ساتھ جمع کر دیا ہے، حازمیؒ نے مجموعی طور پر پچاس وجوہ ترجیح ذکر کیے ہیں اور یہ اعتراف بھی کیا ہے کہ اور بھی بہت سی وجوہ ہیں جن کے ذکر سے

---

(۱) الأجوبة الفاضلة:۱۹، فتح الملهم مقدمه: ۸۷

(۲) اصول السرخسي:۲/۲۰

ہم نے گریز کیا ہے؛ تاکہ یہ مختصر تحریر طویل نہ ہو جائے ،(۱) حافظ عراقیؒ نے ان پر مزید اضافہ کیا ہے اور وجوہ ترجیح کی تعداد ایک سو دس تک پہنچا دی ہے، بعد کے مصنفین میں علامہ شوکانیؒ نے بڑی جامعیت کے ساتھ ہر وجوہ ترجیح کا انتخاب کرنے کی کوشش ہے۔

اصول کی کتابوں میں جن وجوہ ترجیح کا ذکر کیا گیا ہے، یہاں ان سب کا ذکر کرنا طوالت کا باعث ہوگا، اس لیے ہم یہاں صرف اہم وجوہ ترجیح ہی کے ذکر پر اکتفا کرتے ہیں۔

راوی کی کثرت

محدثین کے یہاں ایک اہم وجہ ترجیح دو حدیث میں سے ایک کی طرف راویوں کی کثرت اور دوسری کی طرف مقابلتاً راویوں کی قلت ہے۔ اکثر فقہاء و محدثین، کثرت روایت کو بھی وجہ ترجیح مانتے ہیں لیکن احناف کی طرف یہ بات منسوب ہے کہ وہ اس کو وجہ ترجیح نہیں مانتے ہیں۔(۲)

تاہم بعض سربرآوردہ فقہاء احناف کا طرز عمل یہ بتلاتا ہے کہ کثرت رواۃ بھی فی الجملہ ترجیح کا ایک اہم سبب ہے، امام سرخسیؒ کا بیان ہے کہ امام محمدؒ بھی کثرت رواۃ کی بناء پر روایت کو قابل ترجیح سمجھتے ہیں، چنانچہ امام موصوفؒ نے اپنی کتاب سیر کبیر میں لکھا ہے کہ علماء سیرت میں تین گروہ ہیں، اہل شام، اہل حجاز اور اہل عراق، لہٰذا جس مسئلہ میں ان تینوں گروہوں میں سے دو متفق ہوں وہ راجح ہوگا۔(۳)

راوی کی ثقاہت

روایت کے اسناد و اعتبار کا اصل مدار اس بات پر ہے کہ اس کے نقل کرنے والوں کی

---

(۱) الاعتبار: ۱/۲۱

(۲) ارشاد الفحول: ۲۷۶

(۳) اصول السرخسیؒ: ۲/۱۲۴

صداقت وراست گوئی اور حفظ و یادداشت پر کس حد تک اعتماد کیا جاسکتا ہے؟ اسی صداقت اور یادداشت پر اطمینان واعتبار کا اصطلاحی نام ''ثقاہت'' ہے، بعض اوقات دو روایتوں میں سے ہر ایک کے ناقل ثقہ اور معتبر ہوتے ہیں مگر ان میں کم وبیش کا تفاوت ہوتا ہے، ایسی صورت میں نسبتاً زیادہ ثقہ راوی کی روایت کو ترجیح ہوگی۔

آمین زور سے کہی جائے یا آہستہ؟ اس سلسلہ میں حضرت وائل بن حجر کی روایت اکثر کتب حدیث میں نقل کی گئی ہے، مگر شعبہ نے ان سے آمین کا آہستہ اور سفیان ثوری نے زور سے کہنا نقل کیا ہے، شعبہ اور سفیان دونوں ہی فن حدیث کے آفتاب و مہتاب ہیں اور محدثین کے درمیان اپنی جلالت شان میں تسلیم شدہ حقیقت کے مالک ہیں، احناف نے شعبہ اور شوافع نے سفیان ثوری کی روایت کو ترجیح دیا ہے اور اول الذکر نے شعبہ اور ثانی الذکر نے سفیان کو ثقاہت میں فائق مانا ہے۔(۱)

راوی کا تفقہ

روایت کی ترجیح کی اہم وجہ راوی میں ''تفقہ'' کا پایا جانا ہے، اس لیے کہ فقیہ روایت کے معنی کو زیادہ صحیح طور پر سمجھ سکتا ہے اور نقل کرسکتا ہے، حضرت وکیع فرماتے ہیں:

''فقہاء کی روایت شیوخ کی روایت سے زیادہ قابل قبول ہے''(۲)

حنفیہ نے اس اصول کو خاص طور پر سامنے رکھا ہے اور اس لیے حنفیہ کے ہاں فقہاء صحابہ، حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ اور حضرت علی رضی اللہ عنہ وغیرہ کی روایت کو خصوصی اہمیت دی جاتی ہے۔

تکبیر تحریمہ کے علاوہ دیگر مواقع صلوٰۃ میں رفع یدین کیا جائے یا نہ کیا جائے؟ اس

---

(۱) التعلیق الحسن علی آثار السنن: ۱/۹۷

(۲) الاعتبار: ۱/۱۴

سلسلہ میں خود صاحب مذہب امام ابوحنیفہؒ سے براہ راست منقول ہے کہ آپ نے راویوں کے تفقہ ہی کی بناء پر ترک رفع یدین کی روایت کو رفع یدین والی روایت پر قابل ترجیح مانا ہے۔(۱)

براہ راست سماعت حدیث

ایک نے براہ راست حدیث سنی ہو اور دوسرے کو محدث نے حدیث کا نوشتہ دیا ہو کہ وہ اس سے روایت کرے، تو سنی اور سنائی ہوئی حدیث راجح ہوگی، علامہ حازمیؒ نے اس کی مثال دی ہے کہ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ کی روایت کہ جس چمڑے کو دباغت دے دی جائے وہ پاک ہو جاتا ہے، کو عبداللہ بن عکیم ﷺ کی روایت کہ مردار کے چمڑے اور پٹھے سے فائدہ نہ اٹھاؤ، پر ترجیح ہوگی؛ کیوں کہ پہلی روایت کو راوی نے سن کر نقل کیا ہے اور دوسری روایت کو نوشتہ سے۔(۲)

خبر مشہور

فقہاء احناف نے متواتر اور خبر واحد کے درمیان ایک درجہ ''خبر مشہور'' کا رکھا ہے، خبر مشہور وہ حدیث ہے جو تابعین اور تبع تابعین کے ادوار میں ''تواتر'' کا درجہ حاصل کر لیتی ہے، ایسی حدیثیں خبر واحد پر ترجیح رکھتی ہیں، مثلاً ایک روایت میں ہے کہ مدعی گواہ پیش نہ کر سکے تو دوسرے فریق سے قسم کھلائی جائے، گویا گواہی پیش کرنا مدعی کا ذمہ ہے، اور قسم کھانا مدعی علیہ کی ذمہ داری، لیکن ایک اور روایت میں ہے کہ مدعی کو اپنے دعویٰ پر دو گواہ میسر نہ ہوں تو ایک گواہ پیش کر دے اور ایک بار قسم کھالے، پہلی حدیث خبر مشہور اور دوسری خبر واحد ہے۔ حنفیہ نے اس لیے پہلی حدیث کو ترجیح دی ہے اور دوسری حدیث میں تاویل کیا ہے۔(۳)

---

(۱) الاجوبة الفاضلة:۲۱۳،فتح القدیر:۱/۲۱۹

(۲) کتاب الاعتبار:۱/۹

(۳) تیسر التحریر: ۳/۱۶۴

احتیاطی پہلو کی رعایت

حدیث کے متن و معنی میں اس بات کا بھی لحاظ رکھا جاتا ہے کہ جس میں احتیاطی پہلو نمایاں ہوں، اس کو ترجیح دی جائے، مثلاً ایک حدیث کسی بات کی ممانعت کو بتلاتی ہو اور دوسری اباحت کو یا ایک حدیث وجوب کو اور دوسری عدم وجوب کو بیان کرتی ہو تو پہلی صورت میں ممانعت کو اور دوسری صورت میں وجوب کو ترجیح دی جائے گی۔

جیسے ایک روایت میں پیشاب کے تعلق سے عمومی ممانعت ہے کہ پیشاب سے اجتناب کیا کرو کہ اس میں بے احتیاطی کرنے سے قبر کا عذاب ہوتا ہے، دوسری روایت میں ہے کہ قبیلہ عرینہ کے لوگوں کو ایک خاص موقع پر آپ ﷺ نے اونٹوں کے پیشاب پینے کی اجازت عطا فرمائی تھی، یہاں احتیاطی پہلو کی رعایت کرتے ہوئے احناف نے پہلی روایت کو ترجیح دی ہے۔

زمینی پیداوار کے بارے میں ایک روایت میں یہ عمومی حکم ہے کہ ہر ایسی پیداوار جس کی سیرابی آسمان کے پانی سے ہوئی ہو اس میں عشر واجب ہے، دوسری میں ہے کہ پانچ وسق سے کم پیداوار میں عشر واجب نہیں، یہاں بھی احتیاطی پہلو کا تقاضہ یہ ہے کہ پہلی روایت کو دوسری روایت پر راجح قرار دیا جائے۔(۱)

قول و فعل میں تعارض

اگر حدیث قولی اور حدیث فعلی میں تعارض ہو تو حدیث قولی کو ترجیح دی جاتی ہے، اس لیے کہ افعال کے مختلف وجوہ و اسباب ہو سکتے ہیں؛ لیکن زبان کے ذریعہ جو بات کہی جاتی ہے اس کی حیثیت اصول و قواعد کی ہوتی ہے۔

حضور ﷺ نے استنجاء کی حالت میں قبلہ کی طرف رخ یا پشت کرنے سے منع فرمایا

---

(۱) التقریر و التحبیر: ۵/۳

ہے، یہ آپ ﷺ کی حدیث قولی ہے، اس کے مقابلے میں ایسی روایات بھی ہیں جن سے خود آپ ﷺ کا قبلہ کی طرف پشت یا رخ کر کے استنجاء کرنا ثابت ہے، یہ آپ ﷺ کا فعل ہے، جس کی کوئی خاص وجہ ہوسکتی ہے، پس ترجیح اس بات کو ہے کہ استنجاء کی حالت میں قبلہ کی طرف رخ یا پشت کرنا مکروہ ہے جیسا کہ حنفیہ کا مسلک ہے۔

اضافہ شدہ روایت

ایک ہی روایت کو دو راوی نقل کرتا ہے؛ لیکن ایک راوی ایسا اضافہ نقل کرتا ہے جس کو دوسرے نے بیان نہیں کیا ہے تو یہ اضافہ شدہ روایت راجح ہوگی، اس لیے کہ ثقہ راوی کا اضافہ معتبر ہے، جیسے حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے آپ ﷺ سے نقل کیا ہے: خریدار اور تاجر میں اختلاف ہوجائے، سامان بعینہ موجود ہو تو دونوں سے قسم کھلائی جائے اور سامان و قیمت ایک دوسرے کو واپس کرا دی جائے، اس میں ''سودا موجود ہو'' کا اضافہ صرف اس روایت میں ہے، حنفیہ نے اس کو قبول کیا ہے اور صرف اسی صورت میں باہم قسم کھلانے اور واپسی کا حکم دیا ہے جبکہ سامان ابھی موجود ہو۔(۱)

راوی کی تفسیر

حدیث کے معنی اور مراد کی تعیین میں، حنفیہ نے بسا اوقات راوی کی تفسیر کا بھی اعتبار کیا ہے، مثلاً حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ کتے کا جوٹھا سات دفعہ دھویا جائے اور فتویٰ تین بار دھونے کا منقول ہے، حنفیہ نے اس فتویٰ کو اس روایت کی تفسیر مانا اور سات دفعہ دھونے کے حکم کو نسخ یا استحباب پر محمول کیا۔(۲)

قرآن سے مطابقت

بعض اوقات خارجی اسباب کے تحت بھی حدیث کو ترجیح دی جاتی ہے، مثلاً ایک

(۱) أصول السرخسیؒ: ۲/۲۵

(۲) آثار السنن مع التعليق الحسن: ۱/۱۲

حدیث قرآن مجید کے ظاہری مفہوم کے مطابق ہو اور دوسری اس کے مغائر تو پہلی قسم کی روایت کو ترجیح دی جاتی ہے۔ امام کے پیچھے سورہ فاتحہ پڑھنے کے سلسلہ میں دونوں طرح کی روایات ہیں مگر امام صاحبؒ نے اس روایت کو ترجیح دیا ہے جس میں امام کے پیچھے سورہ فاتحہ نہ پڑھنے کی تلقین ہے کہ یہ قرآن مجید کی اس آیت کے مطابق ہے جس میں قرآن مجید پڑھتے وقت بغور سننے اور خاموش رہنے کا حکم دیا ہے، (۱) اسی طرح کی اور بھی بہت سی روایات ہیں جن میں فقہاء نے اپنے اپنے مذاق کے مطابق قرآن مجید سے مطابقت اور ہم آہنگی کی بناء پر ترجیح سے کام لیا ہے۔

دوسری حدیث سے مطابقت

کبھی ایک حدیث اس لیے راجح سمجھی جاتی ہے کہ دوسری حدیث بھی اس کی تائید میں ہوتی ہے، مثلاً ایک روایت میں ہے کہ جب امام بیٹھ کر نماز پڑھائے تو تم بھی بیٹھ کر نماز پڑھو (خواہ کھڑے ہوکر پڑھنے کی طاقت ہو)۔ دوسری روایت میں ہے کہ نبی ﷺ نے اپنے مرض الوفات میں بیٹھ کر امامت فرمائی اور لوگ کھڑے ہوکر اقتداء کررہے تھے، یہاں پر یہ دوسری روایت اس لیے بھی قابل ترجیح ہے کہ ایک اور روایت سے اس کی مطابقت ہوتی ہے جس میں نبی ﷺ نے ارشاد فرمایا: کھڑے ہوکر نماز پڑھو، جب اس کی استطاعت نہ ہو تو بیٹھ کر نماز پڑھ سکتے ہو۔ (۲)

خلفاءراشدین کا عمل

حدیث کی ایک وجہ ترجیح، خلفاءراشدین یا ان میں سے بعض کا تعامل بھی ہے؛ (۳) اس لیے کہ خلفائے راشدین کا ہر عمل ان کے منصب خلافت کے پیش نظر صحابہ کی نگاہ میں رہتا

(۱) اعراف: ۲۰۴

(۲) الرسالۃ: ۲۵۱/۱

(۳) کتاب الاعتبار: ۱/۱۷

تھا اور حضور ﷺ نے صحابہ کی ایسی تربیت فرمائی تھی کہ وہ کوئی خلاف سنت بات دیکھتے تو برداشت نہ کر پاتے، مثلاً نماز میں ''بسم اللہ'' زور سے کہی جائے یا آہستہ؟ اس سلسلہ میں راویوں کے بیان میں اختلاف ہے، لیکن حضرت انس رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ میں نے حضور ﷺ، حضرت ابوبکر وعمر اور عثمان رضی اللہ عنہم کے پیچھے نماز پڑھی، یہ سب اس کو زور سے نہیں پڑھتے تھے۔(۱)

قیاس سے مطابقت

دو حدیثوں میں سے ایک قیاس کے مطابق ہو اور دوسری خلاف قیاس، تو مطابق قیاس حدیث کو ترجیح دی جائے گی،(۲) جیسے تیمّم میں ہاتھ کا کہاں تک مسح کیا جائے؟

اس سلسلہ میں مختلف روایتیں ہیں، گٹوں تک، کہنیوں تک، اس میں کہنیوں تک والی حدیث قیاس سے مطابقت رکھتی ہے کیونکہ تیمّم وضو کا قائم مقام ہے، اور وضو میں ہاتھ کہنیوں تک دھوئے جاتے ہیں، تو تیمّم میں بھی یہیں تک ہاتھوں کا مسح کیا جائے گا۔

اصول عام سے ہم آہنگی

اگر ایک روایت اصل کے مطابق ہو اور دوسری اس کے خلاف تو حنفیہ اور اکثر فقہاء کے نزدیک وہ روایت راجح ہوگی جو اصل سے مطابقت رکھتی ہو۔(۳)

حنفیہ نے اس اصول کو بہ مقابلہ دوسرے فقہاء کے زیادہ سامنے رکھا ہے، مثلاً اصل یہ ہے کہ انسان کا پورا جسم پاک ہے، اس کے کسی حصہ کو چھونا ناقض وضو نہ ہو خواہ شرمگاہ ہی کیوں نہ چھوئے، چنانچہ احناف نے اس روایت کو ترجیح دی جو شرمگاہ کے مس کرنے کو ناقض وضو نہیں قرار دیتی ہے، عورتیں بھی مردوں ہی کی طرح اصلاً پاک ہیں، اس لیے ان کو چھونے سے وضو نہیں ٹوٹنا چاہیے، احناف نے اس مضمون کی روایت کو قبول کیا ہے۔

---

(۱) نسائی، کتاب الافتتاح:۱/۱۴۵

(۲) إرشاد الفحول:۲۸۰

(۳) الابہاج:۳/۲۳۳

کثیر الوقوع مسئلہ میں خبر واحد

ایسا مسئلہ جو کثیر الوقوع ہو اس سے متعلق خبر واحد بھی مرجوح تسلیم کی گئی ہے، (۱) اس لیے کہ اس واقعہ کی نوعیت متقاضی ہے کہ بہت سارے لوگوں کو اس کا راوی ہونا چاہیے تھا، جیسے شرمگاہ کو چھونے پر آیا وضو کرنا لازم ہوتا ہے یا نہیں؟ اس بارے میں حضرت بسرۃ بنت صفوان ﷺ کی روایت ہے کہ جب تم میں سے کوئی اپنی شرمگاہ کو چھوئے تو وضو کرلے؛ (۲) لیکن یہ خبر واحد ہے اور ایسے مسئلہ سے متعلق ہے جو کثیر الوقوع ہے، اس لیے حنفیہ نے اس روایت کو اختیار نہیں کیا ہے۔ (۳)

صحیحین کی حدیث

منجملہ وجوہ ترجیح کے ایک یہ بھی ہے کہ بخاری و مسلم میں ذکر کی گئی حدیثیں، بحیثیت مجموعی دوسری کتب حدیث کی روایات پر فوقیت رکھتی ہیں؛ (۴) اس لیے کہ امام بخاری اور امام مسلم کی شرطیں، حدیث قبول کرنے میں اس درجہ سخت ہیں جو دوسرے محدثین کے یہاں نہیں ملتیں، تاہم اس وجہ ترجیح کا مدار بنیادی طور پر ظن وتخمین پر ہے، ممکن ہے ان محدثین سے کسی راوی کی تحقیق میں تساہل ہو جائے یا جزوی طور پر کوئی دوسرا محدث اسی معیار پر حدیث روایت کرے، اس لیے اہل علم نے اسے بہت زیادہ اہمیت نہیں دی ہے، یہی وجہ ہے کہ ائمہ اربعہ اور مشہور فقہاء و مجتہدین نے بہت سے مسائل میں صحیحین کی احادیث پر دوسری مرویات کو ترجیح دیا ہے، حازمیؒ نے تو پچاس وجوہ ترجیح میں کہیں اس کے ذکر کی ضرورت ہی محسوس نہیں کی ہے۔ افسوس کہ فی زمانہ ایک طبقہ نے اس وجہ ترجیح کو ایسی اساس مان لیا ہے کہ

---

(۱) إرشاد الفحول: ۲۷۹

(۲) أبو دائود: ۱۸۱

(۳) خبر الواحد وحجیته: ۱/۳۱۷

(۴) إرشاد الفحول: ۲۷۸

ہر حدیث کو جو صحیحین کی روایت کے خلاف ہو، یکسر نا قابل اعتناء سمجھتے ہیں، یہ محض کوتاہ فکری اور کم نظری کی بات ہے۔

تطبیق اور اس کی حیثیت

متعارض نصوص میں جب نسخ اور ترجیح کی راہ مسدود ہو جائے تو اخیر میں تطبیق کا سہارا لیا جاتا ہے، تطبیق دراصل ایک درمیانی اور سمجھوتے کی راہ ہے، جس کی طرف اس وقت رجوع کیا جاتا ہے، جبکہ نسخ یا ترجیح کی فیصلہ کن راہ اوجھل ہو جائے۔

تطبیق کی صورتیں

تطبیق کی مختلف صورتیں ہو سکتی ہیں، یہاں چند اہم وجوہ تطبیق کو بیان کیا جاتا ہے:

۱) مختلف نصوص کے احکام کو الگ الگ حالات سے متعلق مانا جائے، مثلاً نماز کی رکعات کے بارے میں شک پیدا ہو جائے تو کیا کرے؟ اس سلسلہ میں مختلف روایات ہیں، حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نماز کا اعادہ کرے۔ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ تحری کرے اور قلب کا رجحان جس طرف ہو اس کو صحیح مان کر نماز پوری کر لے۔ حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے اور بعض دیگر صحابہ سے روایت ہے کہ جن دو تعداد میں شک ہو، ان میں سے کمتر کو بنیاد مان کر نماز پوری کر لے، امام ابوحنیفہؒ نے ان تمام روایات کو جمع کیا ہے، پہلی بار شک ہو تو نماز کا اعادہ کرے، بار بار شک کی نوبت آتی ہو تو غور و فکر کے بعد جس طرف گمان ہو، اس پر عمل کرے، کسی جانب بھی غالب گمان نہ ہو پائے تو کم تعداد کو بنیاد مان کر نماز پوری کرے، اس طرح مختلف حالات میں ان مختلف روایات پر عمل کرے۔(۱)

۲) مختلف نصوص کے احکام کو مختلف اشخاص سے متعلق مانا جائے۔ جیسے ایک روایت میں آنحضرت ﷺ نے بحالت روزہ بیوی سے بوس و کنار کی اجازت دی اور ایک میں

---

(۱) العرف الشذی: ۹۲/۱

منع فرمایا ہے، پہلی روایت کا تعلق، ان اشخاص سے ہے جو اپنی خواہش پر قابو یافتہ ہوں یا جن کی خواہش کمزور پڑ گئی ہو اور دوسری روایت ان نوجوان صحتمند اشخاص سے متعلق ہے جو بوس و کنار کی راہ سے جماع کے عمل تک جا پہنچتے ہوں۔(۱)

۳) مختلف نصوص سے ثابت ہونے والے احکام کے الگ الگ درجات مقرر کیے جائیں، مثلاً قرآن مجید نے وضو کے صرف چار ارکان بتائے ہیں: دونوں ہاتھوں، سروں اور چہرہ کا دھونا اور سر کا مسح کرنا، حدیث سے نیت اور افعال وضوء میں ترتیب وغیرہ کے احکام بھی معلوم ہوتے ہیں، پس قرآن میں مذکور چاروں افعال وضو کے ارکان وفرائض اور حدیث سے ثابت شدہ یہ احکام مستحب مانے جائیں گے۔

عموماً نبی ﷺ سے ہر نماز کے لیے نیا وضو کرنا منقول ہے؛ لیکن فتح مکہ کے موقع پر یہ نقل کیا گیا ہے کہ آنحضرت ﷺ نے ایک ہی وضو سے پانچوں نمازیں پڑھی تھیں، پہلے عمل کو عزیمت اور دوسرے عمل کو رخصت پر محمول کیا جائے گا۔(۲)

زیادہ تر متعارض روایات میں تطبیق کے لیے یہی صورت اختیار کی جاتی ہے، احناف، مالکیہ اور شوافع کا عام طریقہ یہ ہے کہ وہ ایسے احکام کے درمیان درجہ بندی کرتے ہیں، اور ایک کو زیادہ افضل اور دوسرے کو کم افضل قرار دیتے ہیں، حنابلہ کی آراء کو سامنے رکھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ ان میں توسع اور تنوع کو پسند کرتے ہیں، اور حدیث سے ثابت مختلف طریقوں کو یکساں قابل عمل تسلیم کرتے ہیں، غالباً یہی طریقہ محدثین کے یہاں زیادہ مقبول ہے اور شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کی تحریروں سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ بھی اسی طرف رجحان رکھتے تھے اور ایک مسئلہ میں منقول مختلف صورتوں کو یکساں درجہ دیتے تھے،(۳) واقعہ یہ ہے کہ بہت ساری روایات میں تطبیق کی اس صورت کو بے تکلف اختیار کیا جاسکتا ہے

(۱) حجة الله البالغه: ۳۹۵/۱
(۲) حاشيه حجة الله البالغه : ۳۹۲/۱
(۳) حجة الله البالغه: ۳۹۱/۱

اور ایسا کرنے میں کسی قسم کی قباحت یا تلفیق (لامذہبیت) کا مفسدہ لازم نہیں آتا، جیسے تکبیر تحریمہ میں ہاتھ پہلے اٹھائے جائیں یا تکبیر پہلے کہی جائے، اس بارے میں تین طرح کی روایات موجود ہیں:

(۱) ہاتھ پہلے اٹھائے جائیں پھر تکبیر کہی جائے۔

(۲) اس کے برعکس۔

(۳) دونوں ساتھ ساتھ۔

تکبیر تحریمہ کے بعد استفتاح کے طور پر کونسی دعا پڑھی جائے؟ اس بارے میں روایات مختلف ہیں بعض میں ہے کہ معروف ثنا پڑھی جائے، بعض میں ہے کہ "**انی وجهت وجهی للذی فطر السماوات والارض حنیفا و ما انا من المشرکین**" وغیرہ پڑھی جائے۔

نماز کے بعد امام داہنی جانب رخ کر کے بیٹھے یا بائیں جانب، دونوں طرح کی روایات موجود ہیں، فرض نمازوں کے بعد اوراد واذکار کے مختلف صیغے وطریقے وارد ہوئے ہیں جو بظاہر ایک دوسرے کے معارض ہیں۔

ظاہر ہے، ان تمام صورتوں میں حسب موقع ہر ہر روایت پہ عمل کرنے کو کوئی فقیہ یا مجتہد نامناسب نہیں کہہ سکتا اور ایسا کرنے سے ایک انسان، تقلید شخصی کی محفوظ شاہراہ سے ہٹ کر ہوا وحرص کے راستہ پر نہیں پڑ سکتا۔

موجودہ دور کے بعض مغالطے احادیث کے حوالہ سے

اس وقت ہر عامی وجاہل کی زبان پر یہ فقرہ عام ہو گیا کہ صحیح احادیث صرف بخاری ومسلم ہی میں ہیں، یہ فقرہ کئی ایک غلط دعووں کا مجموعہ ہے، اس کے ضمن میں:

(۱) ایک دعوی تو یہ ہے کہ دیگر کتب احادیث میں صحیح احادیث ہے ہی نہیں۔

(۲) دوسرا دعوی یہ ہے کہ بخاری ومسلم میں سرے سے ایسی احادیث موجود ہی

نہیں جن کی صحت میں کلام ہو۔

(۳) تیسرا دعوی یہ کہ ہر صحیح حدیث قابل عمل ہے اور ضعیف حدیث مطلقا مردود ہے۔

ذیل میں بالترتیب ان بے بنیاد دعوؤں کا جائزہ لیا جاتا ہے:

کیا صحیح احادیث بخاری و مسلم ہی میں؟

یہ دعوی خود امام بخاریؒ و مسلمؒ کی تصریحات سے غلط ثابت ہوتا ہے، امام بخاریؒ کا فرمان ہے:

''میں نے اپنی اس کتاب میں صحیح احادیث ہی کی تخریج کی ہے اور جن صحیح احادیث کو میں نے اپنی کتاب میں نہیں لیا ہے وہ اس سے زیادہ ہیں''(۱)

ایک موقع پر فرمایا:

''مجھے ایک لاکھ صحیح احادیث یاد ہیں''(۲)

ایک اور جگہ فرمایا:

''میں نے یہ کتاب چھ لاکھ احادیث سے منتخب کر کے لکھی ہے، گویا امام بخاریؒ کے پاس چھ لاکھ احادیث کا ذخیرہ تھا، اس میں سے انہوں نے سات ہزار دو سو پچھتر (۷۲۷۵) احادیث منتخب کی ہیں''(۳)

چنانچہ امام بخاریؒ نے اپنی کتاب کے نام ہی میں اس کی تصریح کر دی کہ یہ کتاب صحیح احادیث کا محض ایک انتخاب اور اختصار ہے، صحیح بخاری کا مکمل نام یہ ہے: ''الجامع الصحیح

(۱) شروط الأئمة الخمسة للحازمی ،ص:۸۱

(۲) شروط الأئمة الخمسة للحازمی ،ص:۸۱

(۳) انعام الباری:۱۱۳/۱

المختصر من أمور رسول الله ﷺ وسننه وأيامه "۔

امام مسلم نے بھی اپنی صحیح میں ایک جگہ صاف کہہ دیا کہ

''ایسی بات نہیں کہ میں نے ہر صحیح حدیث کو اپنی کتاب میں رکھ دیا ہے ؛ البتہ اتنا ضرور ہے کہ (میری دانست کے مطابق)میری کتاب کی ہر حدیث صحیح ہے''(۱)

اس کے باوجود لوگوں نے امام بخاریؒ و مسلمؒ سے عقیدت مندی کے غیر معتدل جوش میں خود انہی کی تصریحات کی خلاف ورزی کردی اوران کے اقوال کو کوئی وقعت نہیں دی، اُس دور کے بالغ نظر علماء کو اُسی وقت اس فساد و بگاڑ کا اندازہ ہوگیا تھا؛ چنانچہ امام ابوزرعہؒ اور امام ابن وارہؒ کے بارے میں منقول ہے کہ انہوں نے امام مسلمؒ پر اس معاملہ میں سخت عتاب کیا تھا کہ:

''انہوں نے اپنی کتاب کا نام صحیح کیوں رکھا؟ یہ تو شر پسندوں کو انکارِ حدیث کی ڈھال فراہم کرنا ہوا، اب بے شمار احادیث کے بارے میں وہ صاف کہہ دیں گے کہ یہ ''صحیح'' میں نہیں ہیں ؛ لہٰذا مردود ہیں، امام مسلمؒ نے معذرت کی کہ میں نے یہ کب کہا کہ صحیح مسلم کے ماسوا احادیث ضعیف ہیں''(۲)

''امام ابوزرعہ پر اللہ کی رحمت ہو، انہوں نے ٹھیک ہی اندازہ کیا تھا، آج وہ فتنہ واقع ہوکر ہی رہا''(۳)

حقیقت یہ ہے کہ بخاری و مسلم کے علاوہ دیگر کتب احادیث میں بھی احادیثِ صحیحہ کا بڑا ذخیرہ پایا جاتا ہے، موطا امام مالکؒ کی تقریباً تمام ہی احادیث نہایت صحیح اور عالی سند کی حامل ہیں، امام شافعیؒ فرماتے ہیں:

---

(۱) صحيح مسلم ، باب التشهد في الصلاة ،حدیث نمبر:۶۱۲

(۲) شروط الأئمة ،ص:۸۴

(۳) قواعد في علوم الحديث ،ص:۲۸۸

''کتاب اللہ کے بعد صحیح ترین کتاب موطا مالک ہے''(۱)

نسائی شریف کے تعلق سے ائمہ محدثین کا خیال یہ ہے کہ

''وہ بخاری و مسلم کے طریق کو جامع ہے؛ بلکہ بعض کا کہنا ہے کہ راویوں کی چھان پھٹک کے سلسلہ میں ان کی شرائط بخاری و مسلم کی شرائط سے زیادہ سخت ہیں''(۲)

امام ابوداؤدؒ خود فرماتے ہیں:

''میرے پاس پانچ لاکھ احادیث رسول ﷺ تحریری شکل میں موجود ہیں جن میں سے چار ہزار آٹھ سو احادیث کا انتخاب کر کے اپنی سنن میں رکھا ہے، اور وہ ساری صحیح یا صحیح کی طرح ہیں''(۳)

ابن ماجہ جسے صحاح ستہ میں آخری مقام دیا جاتا ہے، اس کی بھی بعض احادیث کے بارے میں علماء کا کہنا ہے کہ ''ان کی سندیں بخاری کی سند سے زیادہ قوی ہے''۔(۴)

طحاوی شریف جو فقہ حنفی کی مؤید احادیث کا جامع ترین مأخذ ہے، اس کے مؤلف امام طحاویؒ علم حدیث میں امام بخاریؒ و مسلمؒ کے درجہ کے ہیں اور ان کی کتاب اصحابِ تحقیق کے نزدیک سنن ابوداؤد کے ہم پلہ یا اس سے بھی فائق ہے۔(۵)

حافظ ابن کثیرؒ کہتے ہیں کہ مسند احمد میں بہت سارے ایسے متون و اسناد مل جاتے ہیں جو بخاری و مسلم کے ہم پلہ ہیں، مگر بخاری و مسلم میں موجود نہیں، اسی طرح طبرانی کبیر و اوسط، مسند ابویعلی و بزار اور دیگر کتب احادیث میں اس درجہ کی صحیح احادیث مل جاتی ہیں، اس

---

(۱) حجة الله البالغة :۱/۳۷۷

(۲) ما تمس إليه الحاجة ،ص:۲۳

(۳) شروط الأئمه للحازمی ،ص:۸۲

(۴) انعام الباری :۱/۱۱۳

(۵) ما تمس إليه الحاجة ،ص:۲۹

میدان کا ماہر اپنی مہارت کا مظاہرہ کر کے ان کا انتخاب کر سکتا ہے۔(۱)

مصنف ابن ابی شیبہ اس محدث کی کتاب ہے جو امام احمد بن حنبلؒ، امام بخاریؒ، امام مسلمؒ، امام ابوداوٗدؒ، امام ابن ماجہؒ، امام ابوزرعہ اور دیگر ائمہ حدیث کے استاذ ہیں، صحاح ستہ میں بہت ساری احادیث ان کے واسطہ سے آئی ہیں، چالیس ہزار کے لگ بھگ مرفوع وموقوف روایات اس میں موجود ہیں اور بہت ساری روایتیں صحیحین کے شرائط پر پوری اترتی ہیں۔

ایسے میں کیا یہ انصاف کا تقاضہ ہوگا کہ بخاری ومسلم کے علاوہ ان ساری صحاح روایات سے صرف نظر کر لیا جائے؟ جب کہ بخاری ومسلم کی جمیع روایات، مکررات کو حذف کرنے کے بعد چار ہزار کے قریب رہ جاتی ہیں، جن میں سے بھی بیشتر روایات کی تخریج میں امام بخاری ومسلم متفق ہیں۔

بخاری ومسلم وغیرہ میں چند ہزار صحیح احادیث کے موجود ہونے اور بہت ساری صحیح احادیث کے غیر موجود ہونے کی اصل وجہ یہ ہے کہ یہ ائمہ محدثین، فقہ وفروعات میں اپنے اجتہاد یا کسی امام سے انتساب کی بنا پر جس رائے وحکم کو راجح و بہتر خیال فرماتے تھے، اس کے موافق روایات نقل کرتے چلے جاتے تھے اور باقی احادیث کو معرض بحث میں لاتے ہی نہ تھے۔(۲)

کیا صحیحین کی ساری احادیث صحیح ہیں؟

دوسرا دعویٰ کہ بخاری ومسلم میں سرے سے غیر صحیح احادیث موجود ہی نہیں، درست نہیں ہے، واقعہ یہ ہے کہ ان دونوں جلیل القدر کتابوں میں بھی چند ایک احادیث ایسی پائی جاتی ہیں، جنہیں اگر غیر صحیح کہنے کی جرأت نہ بھی کی جائے تو صحیح کا نام دینے میں بھی علماء کو تأمل ہے۔

---

(۱) ما تمس إليه الحاجة، ص:۲۲

(۲) معارف السنن:۶/۳۷۸-۳۸۰

مثلاً : بخاری میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے حضرت ماعزؓ پر حد زنا جاری فرمانے کے بعد ان پر نماز جنازہ پڑھی تھی؛ حالاں کہ سنن کی روایت نماز جنازہ پڑھنے کی صاف نفی کرتی ہے اور یہی صحیح ہے، گمانِ غالب یہ ہے کہ بخاری کی روایت میں کسی راوی سے خطا ہوئی ہے۔(۱)

بخاری کی اس روایت کے بارے میں کہ ’’حضرت ابراہیم علیہ السلام قیامت کے دن اپنے باپ آزر سے اس حال میں ملاقات کریں گے کہ آزر کے چہرے پر پژمردگی چھائی ہوئی ہوگی‘‘، امام اسماعیلیؒ فرماتے ہیں:

’’اس حدیث کے صحیح ہونے میں اس لحاظ سے اشکال ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام سے یہ وعدہ فرمایا کہ وہ قیامت کے دن انہیں بے عزت نہیں فرمائیں گے اور اللہ تعالیٰ وعدہ خلافی نہیں فرماتے ‘‘(۲)

واقعۂ معراج کی تاریخ کے تعلق سے بخاری و مسلم میں مذکور ہے کہ ’’آمدِ وحی سے پہلے کا ہے‘‘، علامہ ابن حزمؒ کہتے ہیں:

’’اس روایت میں اوپر کے کسی راوی سے وہم کا صدور یقینی ہے‘‘(۳)

مسلم شریف میں حجۃ الوداع سے متعلق ایک روایت میں ہے کہ ’’طواف زیارت سے فراغت کے بعد آنحضرت ﷺ منی واپس ہوگئے اور نماز ظہر منی میں پڑھی‘‘، اور ایک روایت میں ہے کہ ’’مکہ میں پڑھی، پھر منی تشریف لے گئے‘‘، علامہ ابن حزمؒ کہتے ہیں:

’’ان دونوں روایت میں سے بلاشبہ ایک روایت جھوٹ ہے‘‘(۴)

---

(۱) فتح الملھم :۱/۱۰
(۲) فتح الملھم :۱/۱۸
(۳) فتح الملھم :۱/۵۵،قواعد في علوم الحديث ،ص:۲۸۷
(۴) قواعد في علوم الحديث ،ص:۲۸۷

"مسلم شریف کی روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کا حضرت ام حبیبہ رضی اللہ عنہا سے نکاح کا واقعہ ابوسفیان رضی اللہ عنہ کے قبول اسلام کے بعد کا ہے، حالاں کہ سب کو معلوم ہے کہ ابوسفیان رضی اللہ عنہ فتح مکہ کے موقع پر اسلام لائے اور حضرت ام حبیبہ رضی اللہ عنہا سے رسالت مآب ﷺ کا نکاح اس سے کئی سال پہلے حبشہ میں نجاشی کی وساطت سے ہوا تھا" (۱)

حافظ ابن قیمؒ نے اس حدیث کے بارے میں یہ تبصرہ فرمایا ہے کہ:

"صحیح بات یہ ہے کہ یہ حدیث غیر محفوظ ہے؛ بلکہ اس میں خلط واقع ہوگیا ہے" (۲)

مسلم کی ایک روایت ہے کہ "اللہ تعالیٰ نے مٹی کو ہفتہ کے دن پیدا فرمایا"، یحییٰ بن معینؒ اور امام بخاریؒ وغیرہ کا کہنا ہے کہ:

"یہ روایت غلط ہے، کلام رسول ﷺ نہیں؛ کیوں کہ کتاب وسنت اور اجماع سے یہ بات ثابت ہے کہ آسمان وزمین کی تخلیق چھ دن میں ہوئی ہے اور پھر آخر میں جمعہ کے روز حضرت آدم علیہ السلام کی پیدائش ہوئی، مسلم شریف کی مذکورہ بالا روایت سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ آسمان وزمین کی پیدائش سات روز میں ہوئی ہے، جو ظاہر ہے کہ درست نہیں، صحیح ترین سند سے جو بات ثابت ہے وہ یہ کہ تخلیق کا آغاز (ہفتہ کے روز سے نہیں؛ بلکہ) اتوار کے دن سے ہوا ہے" (۳)

---

(۱) قواعد في علوم الحديث، ص:۲۸۷

(۲) جلاء الافهام، ص:۱۵۹-۱۶۸

(۳) مجموع الفتاوی :۲۵۶/۱

علامہ ابن تیمیہؒ فرماتے ہیں کہ:

”امام بخاریؒ کی تصحیح کا معیار امام مسلمؒ کے معیار سے کہیں زیادہ بلند ہے ، بخاری کی جن روایات پر نقد کیا گیا ہے وہاں پر امام بخاریؒ ہی کا پلڑا بھاری معلوم ہوتا ہے، جب کہ مسلم کی جن معدودے چند روایات پر نقد کیا گیا ہے وہاں نقد کرنے والے حق بجانب ہیں“ (۱)

اس بحث کا مقصد خدانخواستہ بخاری ومسلم کی تنقیص کرنا نہیں ہے، بخاری ومسلم کی شان تو اپنی جگہ مسلّم اور غیر متنازعہ ہے، حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کے فرمان کے مطابق جو ان کی بے ادبی یا سُبکی کرتا ہے، وہ بدعتی، گمراہ اور اہل ایمان کے راستہ سے ہٹا ہوا ہے، مقصود افراط وتفریط اور بے جا تعمق سے احتراز کرنے اور دامن انصاف کو تھامے رہنے کو بیان کرنا ہے۔ (۲)

احادیث کے قابل عمل ہونے کا معیار

تیسرا دعوی کہ ہر صحیح حدیث قابل عمل ہے اور ضعیف حدیث مطلقا مردود ہے، یہ کلیہ بھی قطعا باطل ہے، امام ترمذیؒ فرماتے ہیں:

”میری کتاب میں دو ایسی احادیث ہیں جن پر کسی (قابل ذکر) فقیہ کا عمل نہیں“ (۳)

(۱) ”کوئی شرابی چوتھی بار شراب نوشی کا ارتکاب کرے تو اسے قتل کردو“ (۴)

حالاں کہ یہ روایت مسلم کی شرط پر ہے اور دس سے زائد صحابہ ﷺ سے مروی ہے۔ (۵)

---

(۱) مجموع الفتاوی :۲۵۶/۱

(۲) فتح الملهم :۱۰۸/۱

(۳) ترمذی ،کتاب العلل :۲۳۳/۲

(۴) ترمذی ، أبواب الحدود :۲۶۷/۱

(۵) قوت المغتذی :۲۶۷/۱

(۲) حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ''نبی ﷺ نے مدینہ منورہ میں رہ کر ظہر وعصر اور مغرب وعشاء کو کسی خوف یا بارش کے عذر کے بغیر جمع فرمایا'' (۱) یہ حدیث بھی نہایت صحیح ہے، مگر کسی کے یہاں قابل عمل نہیں۔

اس کے برخلاف یہ حدیث کہ ''وارث کے لئے کوئی وصیت درست نہیں'' امام شافعیؒ کی تصریح کے مطابق محدثین کے یہاں (مضبوط طریقے سے) ثابت نہیں، تاہم امت نے اسے قبول کیا اور آیت وصیت کے لئے ـــ جس میں وارث کے حق میں وصیت کرنے کا حکم دیا گیا تھا ـــ (۲) ناسخ تسلیم کیا، (۳) ایسے ہی روایت کہ ''رسول اللہ ﷺ نے اپنی صاحبزادی حضرت زینب رضی اللہ عنہا کو چھ سال کے وقفہ کے بعد ان کے سابقہ شوہر ابو العاص رضی اللہ عنہ کے یہاں (ان کے اسلام قبول کرنے پر) نیا نکاح کئے بغیر لوٹا دیا، یہ روایت سنداً تو صحیح ہے، تاہم قابل عمل نہیں، جب کہ یہ روایت کہ ابو العاص رضی اللہ عنہ کے قبول اسلام کے بعد نئے نکاح کے ساتھ حضرت زینب رضی اللہ عنہا کو ان کی زوجیت میں دیا گیا تھا، سنداً پہلی حدیث کے مقابلہ میں کمزور ہے، مگر امت میں مقبول ومعمول بہ ہے اور اسی کے مطابق مسئلہ شرعیہ بھی ہے۔ (۴)

بسا اوقات احادیث بظاہر صحیح معلوم ہوتی ہیں، مگر قطعیات وقواعد کلیہ کے معارض ہوتی ہیں، جس کی بنا پر صحیح ہونے کے باوجود معلول قرار پاتی ہیں اور قابل قبول نہیں رہتی، اس اصول پر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور ائمہ عظام نے چند ایک احادیث کو اختیار کرنے سے انکار کیا ہے، (۵) بکثرت ایسا بھی ہوتا ہے کہ بعض احادیث بظاہر ضعیف ہوتی ہیں، مگر امت نے اسے قبول کیا

(۱) ترمذی، باب ما جاء في الجمع بين الصلاتين: ۱/۴۷، مسلم مع الفتح، باب جواز الجمع بين الصلاتين في السفر: ۲/۲۶۵

(۲) البقرة: ۱۸۰

(۳) فتح المغيث، ص: ۱۲۰-۱۲۱

(۴) أبوداؤد مع البذل: ۳/۲۹۸

(۵) فتح الملهم: ۱/۱۸-۲۰، فتاوی عزیزیہ، ص: ۶۷، طبع دہلی

ہوتا ہے تو وہ حدِ اعتبار میں آجاتی ہیں ؛ بلکہ بسا اوقات احادیث متواترہ کا درجہ اختیار کرلیتی ہیں ۔(۱)

راویانِ حدیث پر جرح

اس موقع سے اس مغالطہ پر تنبیہ بھی مناسب معلوم ہوتی ہے کہ سند کے رجال ورواۃ کے اعتبار سے کسی حدیث پر ضعف کا حکم لگانا ایک اجتہادی معاملہ ہے، ایسا عین ممکن ہے کہ ایک راوی کسی امامِ جرح وتعدیل کے یہاں ثقہ ومعتبر ہو اور دوسرے کے یہاں نا قابلِ اعتبار ہو، جو وجہ ایک امام کے یہاں جرح کا تقاضا کر رہی ہو، ہوسکتا ہے دوسرے امام کے یہاں وہ وجہ طعن نہ ہو، امام ذہبیؒ فرماتے ہیں:

> ''ایسا کبھی نہیں ہوا کہ ائمہ جرح وتعدیل کسی کی ثقاہت یا ضعف پر متفق ہوگئے ہوں، صورتحال یہ ہے کہ چند اصحاب اگر کسی پر جرح کرتے ہیں تو دیگر حضرات اس کی توثیق کرتے ہیں''(۲)

اس خصوص میں اگر تعصب وتشدد پیش نظر ہو تو نہ امام بخاریؒ بچ پاتے ہیں، نہ امام ابوحنیفہؒ، نہ امام مالکؒ وامام شافعیؒ اور دیگر جبال العلم ہی، اور اگر عقیدت وتساہل سے کام لیا جائے تو پھر بہت سارے ضعفاء ومجاہیل اور وضّاعین کی قسمت جاگ جائے۔

خلق قرآن کے مسئلہ کی بنا پر امام ابوزرعہؒ اور امام ابوحاتمؒ جیسے پائے کے محدثین نے امام بخاریؒ سے حدیث لینا ترک کردیا تھا۔(۳)

امام دار قطنیؒ نے امام ابوحنیفہؒ پر کلام کردیا کہ وہ حدیث کے معاملہ میں ضعیف ہیں؛(۴) حالاں کہ یحیی بن معینؒ —— جو امام بخاریؒ ودیگر اصحاب صحاح کے استاذ اور جرح وتعدیل

---

(۱) فتح الملھم :۵۸/۱

(۲) الرفع والتکمیل،ص:۱۸۱-۱۸۲

(۳) میزان الاعتدال :۱۳۸/۳

(۴) سنن دار قطنی ،حدیث نمبر:۱۲۴۶

کے مسلمہ امام ہیں ـــــ وہ کہتے ہیں: ’’امام ابو حنیفہؒ حدیث کے معاملہ میں ثقہ ہیں‘‘۔(۱)

ایک فقہی مسئلہ کے معاملہ میں امام ابن ابی ذئبؒ نے امام مالکؒ پر اتنی سخت جرح کردی کہ اس کا نقل کرنا بھی بارِ خاطر ہے، فرمایا: ’’امام مالکؒ توبہ کرلیں ورنہ وہ گردن زدنی کے قابل ہیں‘‘، (۲) یحیی بن معینؒ نے امام شافعیؒ پر کلام کردیا، (۳) علامہ ابن حزمؒ نے یہ عجوبہ کاری کردی کہ امام ترمذیؒ وامام ابن ماجہؒ جیسے اصحاب سنن کو مجہول ٹھہرادیا۔(۴)

آج کے دور میں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہر عامی و جاہل جرح وتعدیل کا خودساختہ امام بن بیٹھا ہے اور بے خوف ہوکر جس حدیث کو چاہے ضعیف کہہ دیتا ہے اور جسے چاہتا ہے صحیح کا نام دے دیتا ہے اور اس حوالے سے جس امام پر چاہے نقد کرتا ہے، حالاں کہ احادیث ورجال کے بارے میں اس طرح کی آزادانہ رائے زنی اور شوق و دل لگی بڑے خطرہ کی چیز ہے اس طرح کے جرح کا ارتکاب کرکے آدمی نہ جانے کہاں سے کہاں پہنچ جاتا ہے۔

احادیث کیا گمراہی کا سبب بن سکتی ہیں؟

علم حدیث کی انہی نزاکتوں کو پیش نظر رکھ کر امام لیث بن سعدؒ نے فرمایا کہ:

’’حدیث (میں جاہلانہ طبع آزمائی انسان کو) گمراہ کرنے والی چیز ہے، سوائے علماء کے‘‘(۵)

امام ابن عیینہؒ فرماتے ہیں کہ

’’سوائے فقہاء کے حدیث سے باقی انسان بہک جاتے ہیں‘‘(۶)

---

(۱) تهذيب التهذيب :۱۰/۴۵۰

(۲) ادب الاختلاف ص:۱۴۹

(۳) فتح الملهم :۱/۷۴

(۴) ميزان الاعتدال :۴/۶۷۸

(۵) ترتيب المدارك :۱/۹۶

(۶) اثر الحديث في اختلاف الأئمة ص:۶۳

امام ابن وہبؒ کہتے ہیں کہ:

’’ہر ایسا حدیث والا، جس کا فقہ میں کوئی امام نہ ہو، وہ گمراہ آدمی ہے اور اگر اللہ تعالیٰ نے امام مالکؒ وامام لیثؒ کے ذریعہ ہماری دستگیری نہ فرمائی ہوتی تو ہم بھی گمراہ ہو جاتے‘‘(۱)

اہل علم سے وابستگی کی ضرورت

پس دین کی سلامتی اور گمراہی سے حفاظت اس میں ہے کہ آدمی علوم شرعیہ میں بے جادست درازی اور مسائل دین میں رائے زنی نہ کرے، اہل علم وذکر کی اتباع وتقلید کرے؛ اس لئے کہ امام شافعیؒ کے مطابق امت کے عالی مقام علماء جو کچھ فرماتے ہیں وہ سنت رسول ﷺ کی شرح ہوتی ہے اور تمام سنت قرآن کی شرح ہے۔(۲)

جلیل القدر محدث حضرت عبداللہ بن مبارک فرمایا کرتے تھے:

’’یوں نہ کہو کہ یہ امام ابوحنیفہؒ کی رائے ہے؛ بلکہ یوں کہو کہ یہ حدیث کی تفسیر ہے‘‘(۳)

علامہ ابن حزم فرماتے ہیں:

’’مجتہدین جو کچھ مستنبط فرماتے ہیں، وہ سب شریعت میں شمار ہیں، اگر چہ ان کے دلائل عوام پر مخفی ہوں اور جو ان ائمہ مجتہدین کے تعلق سے بدگوئی اور نازیبا کلمات کہتا ہے اور یوں کہتا ہے کہ وہ ایسے طریقے جاری کرتے ہیں جن کا اللہ نے کبھی حکم ہی نہیں دیا تو ایسا شخص راستہ سے گمراہ ہے‘‘(۴)

---

(۱) اثر الحديث في اختلاف الأئمة ص:۹۰

(۲) الاتقان في علوم القرآن:۴/۲۴-۲۵

(۳) ذيل الجواهر المضيئة للعلامة على القاريؒ :۲/۴۶۰

(۴) الميزان الكبرى للعلامة الشعراني :۱/۱۶

خیر القرون میں تقلید

خیر القرون میں عام طور پر مسلمانوں میں تدین غالب تھا، اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی رضا جوئی ان کی اولین ترجیح ہوا کرتی تھی، حیلے حوالوں سے اور نفس پرستی کی راہوں سے وہ کوسوں دور تھے، ان کو جب کوئی مسئلہ درپیش ہوتا اور شرعی حکم معلوم کرنا ہوتا تو وہ لاعلی التعیین کسی بھی عالم وفقیہ سے رجوع کر لیتے تھے، وہ علماء وفقہاء بھی تقوی وتدین میں ان سے فائق، کتاب وسنت پھر اقوال صحابہ وسلف ان کے سامنے ہوتے تھے، اور وہ نہایت دیانتداری و ذمہ داری سے مسائل واحکام بیان کرتے تھے۔

تقلید شخصی

چند صدیاں گذرنے کے بعد عوام الناس کے مزاجوں میں نمایاں فرق پیدا ہونے لگا اور وہ ہر مسئلہ میں بجائے منشأ شریعت کو پیش نظر رکھنے کے، اپنی سہولت و راحت کو فوقیت دینے لگے ایسے میں انہیں کسی ایک جامع وباکمال شخصیت کی پیروی کا پابند کئے بغیر ان کے اس مزاج پر روک لگانا مشکل تھا، بعد کی صدیوں میں تو صورتحال اور بگڑ گئی اور لوگ علانیہ حیلے حوالے اور نفس کوشی کی راہ پر گامزن ہونے لگے، اس صورتحال کے پیش نظر امت کی اکثریت کا اس پر اجماع ہو گیا کہ کسی ایک شخص کی کامل تقلید و پیروی ہی کو لازم قرار دے دیا جائے، خدائی نظام کے تحت چوں کہ روئے زمین پر کامل احاطہ وتفصیل کے ساتھ صرف ائمہ اربعہ ہی کی فقہ باقی رہ گئی تھی؛ اس لئے پوری امت علیحدہ علیحدہ طور پر کسی ایک امام کی مقلد ہو کر رہ گئی، جمہور امت کا موقف زائد از ایک ہزار سال سے یہی ہے اور ہر گذرتے لمحے اس کی اہمیت و سالمیت میں اضافہ ہی ہو رہا ہے، اس الہامی اجماع کی برکت سے امت کی کثیر طبقہ ہر زمانے میں فکری وعملی بے راہ روی سے محفوظ رہا۔

منقول ہے کہ'' قاضی اسماعیل بن اسحاقؒ ایک دفعہ خلیفہ معتضد کے دربار میں داخل

ہوئے، خلیفہ نے انہیں ایک کتاب پیش کی، جس میں مصنف نے چن چن کر مختلف علماء کے رخصت وراحت بھرے انوکھے فتاوی مع دلائل جمع کیے تھے، قاضی موصوف نے عرض کیا: اے امیر المؤمنین! اس کتاب کا مصنف زندیق و بد دین معلوم ہوتا ہے، خلیفہ نے کہا: کیوں؟ کیا یہ دلائل واحادیث صحیح نہیں؟ قاضی صاحب نے کہا:

احادیث ودلائل تو واقع کے مطابق ہی ہیں، مگر فساد یہ ہے کہ جو عالم جن دلائل واحادیث کی بنا پر نبیذ کے مباح ہونے کا قائل ہے، وہ متعہ کی اباحت کا قائل نہیں اور جو متعہ کی اباحت کا قائل ہے، وہ نبیذ کا قائل نہیں، ظالم مصنف نے یہ کیا کہ نبیذ کے مباح ہونے میں پہلے عالم کی رائے کو نقل کر دیا اور متعہ کے مباح ہونے میں دوسرے عالم کی رائے کو نقل کر دیا اور واقعہ یہ ہے کہ جو شخص اس قسم کا مواد اکٹھا کرتا ہے اور اس پر عمل کرتا ہے تو اس کا دین رخصت ہو جاتا ہے، اس پر معتضد نے اس کتاب کو جلا ڈالا" (۱)

معمرؒ کہتے ہیں:

"اگر کوئی شخص موسیقی اور عورتوں سے بدفعلی کے جواز کے بارے میں اہل مدینہ کا قول اختیار کرے اور متعہ کے جواز اور بیع صرف کے معاملہ میں اہل مکہ کا قول اختیار کرے اور نبیذ (نشہ آور) کے جواز کے سلسلہ میں اہل کوفہ کا قول اختیار کرے تو وہ اللہ کے بندوں میں بدترین بندہ ہے" (۲)

اس سے معلوم ہوا کہ آج کل جو یہ نظریہ پیش کیا جاتا ہے کہ جب سارے ائمہ برحق

---

(۱) السنن الکبری للبیہقي :۱۰/۲۱۱

(۲) التلخیص الحبیر :۳/۱۸۷

ہیں تو ایک کی پابندی کیوں ضروری ہے، جب کوئی جس امام کے مسئلہ پر عمل کرنا چاہے وہ اس کے لئے درست ہے، یہ غلط اور دین کو ایک کھلونا بنانا ہے، اس صورت میں اتباع شریعت پیش نظر ہونے کے بجائے اتباع نفس وہوٰی ہوگا، جو شرعاً درست نہیں ہے۔

موجودہ دور کی علمی بے راہ روی

موجودہ زمانے میں ایک بار پھر پوری شدت سے توحید پرستی اور پیروئی سنت کے خوشنما عنوان سے نفس پرستی وخودرائی کے فتنہ نے سر اُبھارا ہے، بدقسمتی سے اس فتنہ کی یلغار حسب سابق فقہ حنفی پر ہے، نہ صرف فقہ حنفی کے مسائل کو تمسخر و بے ہودہ گوئی کا نشانہ بنایا جارہا ہے؛ بلکہ اس کے عالی مقام مجتہدین اور بنفسِ نفیس امام اعظمؒ کی پاکباز ذات کو سوقیانہ تنقیدوں کا نشانہ بنا کر اپنی آخرت کو داؤ پر لگایا جارہا ہے۔

یہ یورش ایسی نہیں تھی کہ جس پر خاموش تماشائی بن کر بیٹھا جائے، وقت کا تقاضہ یہ بھی نہیں تھا کہ اس قسم کی نامسعود کوششوں کو آفتاب پر تھوکنے کے مترادف قرار دے کر انہیں نظر انداز کردیا جائے کہ اس طرح کا خاموش احتجاج ایسے ماحول کے مناسب ہے، جہاں علم وفہم کی کچھ نہ کچھ خوبو پائی جاتی ہو اور لوگوں کو اسلامی تاریخ اور علماء اسلام کی خدمات سے واقفیت ہو، وہاں محض خاموشی ہی ایسے فتنوں کو اپنی موت ماردیتی ہے، یہاں صورتحال ایسی نہیں ہے؛ اس لئے اہل حق علماء نے ان جاہل رؤوساء کا تعاقب کیا، امام اعظم کی عظمت ومرتبت، ان کی تقوی شعار زندگی، علم حدیث وفقہ میں ان کی بلند مقامی، ان کی جانب سے اسلام کی عظیم الشان خدمت کو بھی علماء نے موضوع بنایا اور ان کی فقہ، کتاب وسنت سے اس کی قربت ومطابقت، ہر عہد میں اس کی جامعیت کو بھی زیر بحث لایا، نیز ان بددیانت ونام نہاد اہل علم کا بھی منہ بند کردیا جو فقہ حنفی کو قیاسات اور کتاب وسنت سے متصادم آراء کا مجموعہ قرار دیتے ہیں۔

ماضی قریب میں علامہ شوق نیمویؒ، محدث دکن حضرت عبداللہ شاہ نقشبندیؒ، علامہ ظفر احمد عثمانیؒ، ابن حجر ثانی علامہ انور شاہ کشمیریؒ، علامہ شبیر احمد عثمانیؒ، علامہ یوسف بنوریؒ، علامہ خلیل احمد سہارنپوریؒ، شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا کاندھلویؒ، مولانا یوسف کاندھلویؒ وغیرہ نے اس سلسلہ میں نمایاں خدمات انجام دی ہیں، مؤخر الذکر حضرات نے شروحات کتب حدیث کے ذیل میں ان کو موضوعِ بحث بنایا ہے، جب کہ مقدم الذکر تینوں حضرات نے باقاعدہ طور پر ابواب فقہ کی ترتیب کے مطابق فقہ حنفی کو آثار واحادیث سے مدلل کرنے کی خدمت انجام دی ہے، ان تینوں بزرگوں میں بھی حضرت علامہ ظفر احمد عثمانیؒ کا کام اس حوالے سے دائرۃ المعارف کا درجہ رکھتا ہے، اور یہ فی الحقیقت حکیم الامت مجدد الملت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ کے مجددانہ کارناموں میں سے ایک ہے، حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے وقت کی ایک اہم ضرورت خیال کرتے ہوئے اس کام کا خود ہی آغاز فرمایا تھا، تاہم بعض وجوہ کی بنا پر یہ سلسلہ پایۂ تکمیل کو نہیں پہنچ سکا، بالآخر حضرتؒ نے یہ کام اپنے لائق وباکمال بھانجے محدث العصر حضرت علامہ ظفر احمد عثمانی تھانویؒ کے سپرد فرمایا اور خود اس کی سرپرستی اور ان کے کام پر نظر ثانی فرماتے رہے، بیس سال سے زائد عرصہ میں یہ کام مکمل ہوا اور اس شان سے منظر عام پر آیا کہ وقت کے بڑے بڑے محدثین نے حیرت واستعجاب اور داد وتحسین کی ملی جلی کیفیت کے ساتھ اس کا استقبال کیا اور بعض معاصر علماء نے اسے اس صدی کے علم حدیث کا کارنامہ قرار دیا۔(۱)

عالم عرب میں علامہ زاہد الکوثریؒ کا مقام کسی تعارف کا محتاج نہیں، بعض اہل علم کے مطابق ان کا مقام عالم عرب میں ویسا ہی ہے جیسا برصغیر میں حضرت علامہ انور شاہ کشمیریؒ کا رتبہ، علامہ کوثریؒ اپنے ایک مضمون میں علماءِ ہند کی خدمات حدیث کا تعارف کراتے ہوئے جب اعلاء السنن (تالیف علامہ ظفر احمد عثمانیؒ) پر پہنچتے ہیں تو بے ساختہ ان کے قلم سے یہ جملے نکلے ہیں کہ

(۱) نقوش درفتگاں، ص:۱۷

''فی الحقیقت میں مؤلف مذکور کے اس استقصاء و تفصیل سے دہشت زدہ ہوں، احادیث احکام کو اس قدر جامعیت کے ساتھ جمع کرنا، پھر ان کے اسناد و رجال پر مدلل و تشفی بخش بحث کرنا، معارض روایات کی بے تکلف توجیہ کرنا، یہ حقیقت میں مردانِ کار اور رجالِ ہمت ہی کا کام ہوسکتا ہے، ان کی علمی و تصنیفی خدمات ایسی ہی بلند پایہ و بے نظیر ہوتی ہیں'' (۱)

زیر نظر کتاب کی ترتیب اور طریقۂ تالیف

ادھر چند سالوں کے دوران اردو میں بھی اس قسم کی خدمات سامنے آئی ہیں، اور واقعہ یہ ہے کہ اس معاملہ میں علامہ شوق نیموی کی ''آثار السنن'' اور علامہ عثمانیؒ کی ''إعلاء السنن'' کی مرجعیت کا انکار نہیں کیا جاسکتا، احقر نے بھی انہی کتب سے استفادہ کرتے ہوئے ایک طالب علمانہ کوشش کی ہے اور طہارت و نماز سے متعلق مسائل اس نہج پر یکجا کئے ہیں، اس کتاب کی تألیف میں مذکور الصدر دو کتابوں کے علاوہ مصنف ابن أبی شیبہ، فتح الملہم، بذل المجہود، اوجز المسالک، الفقہ الإسلامی وأدلتہ، علامہ لکھنویؒ کی ''السعایہ''، فتح القدیر، تبیین الحقائق، طحطاوی علی المراقی اور بعض دیگر کتابیں پیش نظر رہیں، پھر انہی کتب کے واسطے سے ڈیجیٹل لائبریری سے بڑی حد تک استفادہ کیا اور یہ واقعہ ہے کہ موجودہ دور میں ''ڈیجیٹل لائبریری'' نے تصنیف و تألیف کی راہ کی بہت ساری مشکلات آسان کردی ہے۔

زیر نظر کتاب میں دیگر ائمہ (امام مالکؒ، امام شافعیؒ، امام احمد بن حنبلؒ) کے مسالک کو بھی حاشیہ میں نقل کرنے کا اہتمام کیا گیا ہے، اس کے لئے زیادہ تر اعتماد ''الفقه الإسلامي وأدلته'' پر کیا گیا۔

ایسے ہی کتاب مذکور میں اس کا بھی التزام کیا گیا کہ ہر حدیث کا درجۂ استناد بھی

(۱) مقالات الکوثری، ص: ۷۲-۷۶

قارئین کے سامنے آجائے، احادیث کے درجہ کی صراحت کرنے میں علامہ نوویؒ، حافظ ابن حجرؒ، علامہ زیلعیؒ، علامہ ابن الہمامؒ، علامہ نیمویؒ، علامہ عثمانیؒ ودیگر معتدل ائمہ کے علاوہ نامور محدث ظاہری علامہ ناصر الدین البانیؒ کی تحقیقات وتعلیقات سے بھی استفادہ کیا گیا ہے، اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ عام طور پر ان کی تعلیقات احادیث کی کتب متداولہ پر پائی بھی جاتی ہیں، اور ایک خاص طبقہ کے یہاں سند وحجت کا درجہ بھی رکھتی ہیں، تاہم ناصر الدین البانیؒ کے نقد وتحقیق کے طریقۂ کار کے بارے میں محدث العصر شیخ محمد محمد عوامہ حفظہ اللہ ورعاہ کا عالمانہ وبصیرت مندانہ تبصرہ یہ ہے کہ البانی احادیث پر ضعف کا حکم لگانے میں نہایت جلد باز وبے بصیرت واقع ہوئے ہیں اور اس تعلق سے موصوف کا طرز عمل سخت غیر معتدل وغیر سنجیدہ ہے، وہ سرسری طور پر سند کے رجال پر نظر ڈالتے جاتے ہیں اور آنکھ بند کر کے احادیث پر صحت وضعف کا حکم لگاتے چلے جاتے ہیں؛ حالاں کہ احادیث کو صحیح وضعیف قرار دینے کے لئے صرف رجال سے واقفیت کافی نہیں؛ بلکہ جرح وتعدیل کی تاریخ کے علاوہ فقہ جرح وتعدیل کی معرفت بھی ضروری ہے، ورنہ آدمی سے اس میدان میں ایسی لغزشیں سرزد ہو جاتی ہیں جو اسے مسند تحقیق سے نیچے گرا دیتی ہیں اور اہل تحقیق کی نظر میں اسے بے وقعت کر دیتی ہیں، پس اگر البانی کی تضعیف پر اعتماد کیا جاتا ہے تو بہت ساری صحیح احادیث سے امت کو ہاتھ دھونا پڑتا ہے اور علوم وحی کے ایک بڑے حصہ سے محروم ہونا پڑتا ہے، جو ظاہر ہے کسی ادنی مسلمان کو بھی گوارا نہیں ہو سکتا، (۱) اس لئے زیر نظر کتاب میں بالعموم تصحیح احادیث کے معاملہ میں تو اگرچہ البانی کی رائے پر اس وجہ سے اعتماد کر لیا گیا کہ البانی نے اس خصوص میں ہمارے باتوفیق محقق علماء کی موافقت کی ہے؛ البتہ تضعیف احادیث کے متعلق البانی صاحب کی رائے کو قولِ فیصل کا درجہ نہیں دیا گیا؛ بلکہ دیگر ائمہ جرح وتعدیل کی آراء نقل کی گئی ہیں۔

اتنی وضاحت کے بعد اب موقع ہے کہ اس ابتدائیہ کا خاتمہ کیا جائے، میں اس موقع

---

(۱) اثر الحدیث:۳۲-۴۱-۱۶۰

پر اپنے محسن و مشفق استاذ گرامی قدر حضرت مولانا مفتی محمد جمال الدین صاحب مدظلہ العالی (صدر مفتی دار العلوم حیدر آباد) کا نہایت ممنون ہوں کہ حضرت الاستاذ نے اپنی گونا گوں علمی مصروفیات کے باوجود احقر کی اس تالیف کی خاص توجہ کے ساتھ نگرانی فرمائی، اس کام کا خاکہ حضرت الاستاذ ہی کا تیار کردہ ہے اور اس کے شروع کے صفحات خود حضرت ہی نے تیار کئے تھے، احقر نے حضرت الاستاذ کی رہنمائی و سرپرستی اور آپ کے تیار کئے ہوئے کام ہی کو پیش نظر رکھتے ہوئے اس کام کو آگے بڑھا کر مکمل کیا ہے، اللہ تبارک وتعالیٰ حضرت مدظلہ العالی کو اجر جزیل عطا فرمائے اور دائمی طور پر حضرت کی علمی سرپرستی نصیب فرمائے!

اس موقع سے ہمارے مخدوم و محسن شخصیت جامعہ اسلامیہ دار العلوم حیدر آباد کے ناظم عالی مقام محترم جناب رحیم الدین انصاری صاحب زید مجدہم کا شکریہ ادا کرنا بھی نہایت ضروری ہے کہ آنمحترم نے احقر کو پہلے سے مفوضہ ذمہ داری میں تخفیف کر کے اس علمی خدمت کے لئے فارغ کیا، پھر اپنے ادارہ سے اس کی اشاعت کا نظم فرما کر اسے عوام الناس کے لئے استفادہ کے قابل کیا، **فجزاهم الله عنا وعن سائر المسلمن خير الجزاء ۔**

احقر کے والد گرامی قدر حضرت محمد مظہر محی الدین صاحب مدظلہ جو بلحاظِ پیشہ انجینئر ہیں اور ایک وسیع المطالعہ وسیع النظر بزرگ، صاحب دیوان شاعر و رباعی گو، اور حضرت محدث دکن کے مریدین و مسترشدین میں سے ہیں وہ احقر کی ہر چھوٹی بڑی علمی کاوش کے نگران ہوتے ہیں، اس علمی کام میں بھی شروع سے آخر تک ان کی سرپرستی حاصل رہی، نیز عم محترم عالی مقام ڈاکٹر محمد مدثر محی الدین صاحب زید مجدہ العالی (حالی مقیم امریکہ) احقر کے تحریری کاموں کے بارے میں واقفیت لیتے رہتے ہیں اور اس سلسلہ میں حوصلہ افزائی فرماتے رہتے ہیں، جزاہم اللہ، اللہ تعالیٰ ان بزرگوں کے سایہ کو صحت وعافیت کے ساتھ تادیر ہم پر قائم ودائم رکھے اور ان کی مقبول دعاؤں میں حصہ نصیب فرمائے۔

ہمارے محترم دوست مولانا غیاث الدین صاحب حسامی زید مجدہ و مولانا فیاض

الدین صاحب حسامی زید مجدہ (اساتذہ عائشہ صدیقہ للبنات) اور مولانا مفتی محمد عبد اللہ سلیمان مظاہری (قبا گرافکس، 9704172672) کا بھی ممنون ہوں کہ ان حضرات کرام نے کمپوزنگ کے صبر آزما مرحلے کو بخوبی پورا فرمایا۔

اخیر میں اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ اس کتاب کو اپنی بارگاہ میں شرفِ قبولیت سے نوازے، اس کے نفع کو عام و تام فرمائے اور احقر اور اس کے والدین و بزرگوں کے لئے صدقۂ جاریہ بنائے، و آخر دعوانا أن الحمد للہ ر ب العالمین ۔

محمد مکرم محی الدین حسامی قاسمی
(استاذ دار العلوم حیدر آباد)

۲۳/ربیع الاول ۱۴۳۲ھ
۲۷/فروری ۲۰۱۱ء

طہارت اور نماز کے مسائل

کتاب الصلوٰة

پانی کا بیان

طبیعت و ماہیت کے اعتبار سے پانی کی دو قسمیں ہیں:

مطلق پانی

عام بول چال میں جس پانی کو لوگ پانی کہتے ہیں اور پانی کے لفظ سے بغیر کسی خصوصیت کے جو عام لوگ سمجھتے ہیں، اسے مطلق پانی کہتے ہیں۔

مقید پانی

وہ پانی جس کو عام بول چال میں پانی نہیں کہتے ہیں؛ بلکہ پانی کے ساتھ کوئی اور خصوصیت لگاتے ہیں جیسے تربوز کا پانی، ناریل کا پانی، گلاب کا پانی، گنے کا پانی (رس) وغیرہ۔

ارشاد باری تعالیٰ ہے ''اور وہ تم پر آسمان سے پانی برساتا ہے تاکہ اس پانی کے ذریعہ سے تم کو حدث اصغر و اکبر سے پاک کردے'' (۱) ایک اور جگہ ارشاد ربانی ہے: ''ہم نے آسمان سے پانی برسایا جو پاک صاف کرنیکی چیز ہے (۲)

ان دونوں آیات میں ''ماءً'' (پانی) عربی قاعدہ کے لحاظ سے نکرہ ہے جسے اللہ تعالیٰ نے انسانوں پر مختلف احسانات کے تذکرہ کے دوران ذکر کیا ہے، جس کی وجہ سے پانی میں عموم پایا گیا اور اس سے معلوم ہوا کہ پانی دو طرح کا ہوتا ہے: ایک عام پانی اور دوسرا وہ پانی جس میں کسی قسم کی قید لگی ہوئی ہو اور اس کی شناخت عام بول چال میں اس قید کے ساتھ ہوتی ہو۔

---

(۱) الانفال:۱۱

(۲) الفرقان:۴۸

مطلق اور مقید پانی کا تصور احادیث و آثار کی روشنی میں

ارشاد نبوی ہے:

۱) کوئی چیز پانی کو ناپاک نہیں کرتی مگر یہ کہ جب وہ چیز غالب، ہو پانی کے رنگ، بو اور مزہ پر (۱)

۲) رسول اللہ ﷺ نے اپنی ایک صاحبزادی کے انتقال کے موقع سے فرمایا "ہماری صاحبزادی کو غسل ایسے پانی سے دو جس میں بیری کے پتوں کی آمیزش ہو" (۲)

۳) "یہی تلقین آپ ﷺ نے ایک اور صحابی کے غسل وفات کے موقع پر بھی اپنے اصحاب کو فرمائی تھی" (۳)

۴) "حضور اکرم ﷺ اور حضرت میمونہؓ نے ایسے برتن سے پانی لے کر غسل فرمایا جس میں گوندھے ہوئے آٹے کا اثر تھا" (۴)

۵) "حضرت علیؓ، مہندی کی آمیزش رکھنے والے رقیق پانی سے ازالہ حدث کو کافی قرار دیتے تھے" (۵)

۶) حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کا فتوی ہے کہ "جنبی، حوض کے اندر غسل نہ کرے الا یہ کہ حوض میں چالیس ڈول پانی ہو" (۶) ایک اور فتوی ہے "اگر تم جنبی ہو جاؤ اور کسی تالاب

---

(۱) طحاوی : باب الماء یقع فیه النجاسة : ۲۹ . صحیح : اعلاء السنن : ۱/۲۶۶

(۲) بخاری: باب ما یستحب ان یغسل وتراً: ۱۲۵۴

(۳) بخاری : باب الکفن فی ثوبین : ۱۲۶۵

(۴) سنن ابن ماجه : باب الرجل والمرأة یغتسلان من اناء واحد : ۳۷۸. صحیح: ارواء الغلیل : ۱/۶۴

(۵) الاستذکار : ۱/۲۸

(۶) تهذیب الاثار : ۱۰۹۳ تحقیق محمود محمد شاکر : یؤیده الاثار

کے پاس سے گذرو تو اس سے چلو بھر بھر کر اپنے اوپر ڈالو پھر اگر یہ پانی بہہ کر تالاب میں چلا جائے تو کوئی پرواہ نہ کرو''(۱)

فقہاء کا استنباط کردہ قاعدہ

فقہاء نے انہی احادیث و آثار کی روشنی میں ماء مقید کی پہچان کے لئے ایک جامع قاعدہ مقرر کیا ہے اور وہ یہ ہے کہ پانی دو امور کی بناء پر مقید ہو جاتا ہے یا اپنی اصلیت کو کھو دیتا ہے:

۱) پانی اور غیر پانی کے مابین پکانے کی وجہ سے مکمل آمیزش ہو گئی ہو مثلاً دال وغیرہ ملا کر پانی کو پکا دیا گیا ہو یا پانی اور غیر پانی کے مابین مکمل آمیزش اس بناء پر ہو گئی ہو کہ غیر پانی نے پانی کو چوس کر اپنے وجود کا حصہ بنا لیا ہو جیسے وہ پانی جو مختلف میوؤں میں رس کی شکل میں موجود ہوتے ہیں جنہیں نچوڑے بغیر حاصل نہیں کیا جا سکتا۔

۲) پانی پر کسی پاک جامد یا سیال چیز کا غلبہ ہو گیا ہو:

جامد شئی کا غلبہ اس وقت سمجھا جائے ہو گا جب کہ اس کی وجہ سے پانی کے بہاؤ اور پتلے پن میں فرق پڑ گیا ہو جیسے پانی میں مٹی گر گئی ہو، جس سے پانی کیچڑ کی شکل اختیار کر گیا ہو، سیال شئی اگر ایسی ہو کہ اس کے اور پانی کے درمیان نہ ظاہری اعتبار سے کوئی فرق ہو نہ ہی عام انسان اسے پانی کے علاوہ کوئی اور چیز سمجھتے ہوں، صرف شریعت نے فرق کیا ہو، جیسے وضو یا غسل میں استعمال شدہ پانی تو یہاں غلبہ اس وقت سمجھا جائے گا جب کہ وہ مقدار میں اصل پانی سے زیادہ ہو اور اگر سیال شئی اور پانی، بہاؤ اور پتلے پن میں تو یکسانیت رکھتے ہوں البتہ اوصاف یعنی رنگ بو اور مزہ میں مختلف ہوں تو وہاں غلبہ اس وقت سمجھا جائے گا جب کہ سیال شئی کے اکثر یا نصف اوصاف پانی پر غالب آ جائیں جیسے سرکہ کے اوصاف ثلاثہ رنگ، بو اور مزہ میں سے کوئی دو وصف یا دودھ کے جملہ دو وصف رنگ و مزہ میں سے کوئی ایک وصف

---

(۱) مصنف عبدالرزاق : ۳۰۴ :باب الماء يمسه الجنب فيه رجل مجهول

پانی پر غالب آ گیا ہو۔ ان ساری صورتوں میں پانی، مطلق کے دائرہ سے نکل کر مقید کی فہرست میں شامل ہو جائے گا اور اس سے وضوء یا غسل درست نہیں ہوگا۔(۱)

شرعی وفقہی لحاظ سے پانی کی اقسام

اس اعتبار سے پانی کی پانچ قسمیں ہیں:

۱) طاہر مطہر غیر مکروہ: یعنی وہ پانی جو خود پاک ہو اور اس سے وضو و غسل اور ازالہ حدث بغیر کراہت کے درست ہو جیسے ماء مطلق، ایسے ہی وہ پانی جس میں زیادہ دنوں تک ایک جگہ پڑے رہنے سے کچھ تبدیلی آ گئی ہو وہ بھی طاہر مطہر غیر مکروہ پانی ہے نیز درج ذیل پانی بھی طاہر مطہر غیر مکروہ ہیں:

الف: برسات کا پانی اللہ تعالی کا ارشاد ہے ''اور ہم نے آسمان سے پانی برسایا جو پاک وصاف کرنے کی چیز ہے''(۲)

ب: سمندر کا پانی حضرت ابو ہریرہؓ سے مروی ہے، رسول اللہ نے فرمایا ''جس شخص کو سمندر کا پانی پاک نہ کرے تو اللہ بھی اسے پاک نہیں کرتا''(۳) حضرت عبد اللہ مدلجیؓ نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ ہم لوگ دریائی سفر کرتے ہیں اور پینے کے لئے ہمارے ساتھ کچھ پانی بھی ہوتا ہے، اگر ہم اس سے وضو کریں تو پیاسے رہیں گے، کیا ہمارے لئے یہ جائز ہے کہ ہم سمندر کے پانی سے وضو کر لیں، آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: سمندر کا پانی پاک ہے (اس سے وضو کیا جا سکتا ہے) اور اس کی مچھلیاں بھی حلال ہیں۔(۴)

---

(۱) تبیین الحقائق ۱/۲۰

(۲) الفرقان : ۴۸

(۳) دار القطنی : الطهارة : ۸۱.حسن امام دار قطنی

(۴) ترمذی : باب ما جاء فی ماء البحر : ۶۹ حسن صحیح : امام ترمذی

ج: دریا کا پانی: حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا ہے" سمندر کا پانی اور فرات (دریا) کے پانی میں سے جس سے چاہے وضو کرلو، ان سے وضو کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے۔(۱)

د: برف اور اولے کا پانی: حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ آپ ﷺ اپنی دعاؤں میں یہ بھی دعا فرمایا کرتے تھے، اے اللہ، مجھ سے میرے گناہوں کو برف اور اولے کے پانی سے دھو دیجئے"(۲)

استدلال اس حدیث سے اس طرح ہے کہ اگر برف اور اولے کا پانی پاک نہ ہوتا تو آپ ﷺ اس سے اپنے گناہوں کے دھلنے کی خدائے تعالی سے درخواست نہ کرتے کیوں کہ؛ ناپاک ہونے کی صورت میں مزید ناپاک ہوجاتا۔ حضرت امام عامر شعبی وحکم رحمہما اللہ سے برف کے پانی سے وضو کرنے کے متعلق دریافت کیا گیا تو آپ رحمہما اللہ نے فرمایا، برف کے پانی سے وضو کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں (۳)

ہ: کنواں، تالاب، حوض اور چشمہ کا پانی، اللہ تعالی کا ارشاد ہے: کیا تو نے اس بات پر نظر نہیں کی کہ اللہ تعالی نے آسمان سے پانی برسایا پھر اس کو زمین کے سوتوں میں داخل کردیا۔(۴)

آیت بالا سے معلوم ہوا کہ اللہ تعالی آسمان سے پانی نازل فرماتا ہے اور پھر اس پانی کو زمین میں موجود سوتوں کے واسطہ سے زمین میں محفوظ کردیتا ہے اور کچھ پانی نشیبی زمین پر بھی موجود رہتا ہے، زمین پر موجود پانی تالاب اور حوض ہیں اور چشمہ اور کنواں درحقیقت زمین

(۱) منصف ابن ابی شیبه : باب من رخص فی الوضوء بماء البحر : ۱۳۹۲ : صحیح سلسلة الاثار الصحیحة : ۳۳۳

(۲) بخاری : باب ما یقول بعد التکبیر : ۷۱۱

(۳) مصنف ابن ابی شیبه باب فی الوضوء بالثلج : ۱۸۶۰ اسناد ضعیف لضعف جابر الجعفی وباقی رجاله ثقات رجال الشیخین شعیب الارنووط : مسند احمد : ۲۰۹۱

(۴) الزمر : ۲۱

کے اندر محفوظ پانی کا نکالنا ہے یا اس کا چشمہ کی صورت میں ابلنا ہے اور جب آسمان سے نازل ہونے والا پانی پاک ہے تو یہ سارے پانی بھی پاک ہوں گے، نیز ایک مرتبہ آپ ﷺ سے بیر بضاعہ کے متعلق دریافت کیا گیا تو آپ ﷺ نے فرمایا ''بضاعہ نامی کنواں کا پانی پاک ہے اسے کوئی چیز ناپاک نہیں کرے گی۔(۱)

اس حدیث سے کنویں کے پانی کے پاک ہونے کا علم ہوتا ہے، حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے راویت ہے کہ نبی کریم ﷺ سے دریافت کیا گیا ہے کہ جنگل میں جو پانی جگہ جگہ جمع رہتے ہیں اور چوپائے ودرندے جسے پیتے ہیں، کیا وہ پانی پاک ہے؟ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا ''جب پانی دوقلہ ہوجائے تو اسے کوئی چیز ناپاک نہیں کرے گی'' (۲)

اس حدیث سے حوض اور چشمے کے پانی کا پاک ہونا معلوم ہوا، حضرت جابر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ زمزم کنواں کے پاس تشریف لائے، تو لوگوں نے آپ ﷺ کے لئے ایک ڈول پانی نکالا، آپ ﷺ نے اس پانی کونوش فرمایا'' (۳) اس سے کنویں کے پانی کا پاک ہونا معلوم ہوتا ہے۔

۲) طاہر مطہر مکروہ: جو پانی بذات خود پاک ہو، مگر طاہر مطہر غیر مکروہ پانی کے ہوتے ہوئے اس سے وضو و غسل کرنا مکروہ تنزیہی ہو؛ (۴) البتہ اگر وہ پانی نہ ہو تو مکروہ نہیں ہوگا، احناف کے یہاں اس کا مصداق درج ذیل پانی ہیں: پالتو بلی، آزاد مرغی، پھاڑ کھانے والے پرندے، سانپ اور چوہا کا جھوٹا پانی، جب کہ پانی کم ہو، حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ بلی کے

---

(۱) ترمذی تحقیق الالبانی : باب الماء لا ینجسه شئ : ٦٦ صحیح

(۲) مسند احمد: مسند عبد الله بن عمر تحقیق شعیب الارنووط :٤٦٠٥. صحیح

(۳) مسلم : باب حجة النبی ﷺ: ١٢١٨

(۴) مراقی الفلاح : ٣

سجھوٹے وضو کرنے کو ناپسند فرماتے تھے۔(۱) اس تعلق سے کچھ اور بحث جھوٹے پانی کے بیان کے تحت آئے گی انشاءاللہ۔

۳) طاہر غیر مطہر: وہ پانی جو خود پاک ہو؛ لیکن اس سے وضو اور غسل درست نہ ہو احناف کے یہاں اس پانی کا مصداق ماء مستعمل (یعنی استعمال شدہ پانی) ہے اور ماء مستعمل کی تعریف احناف کے یہاں یہ ہے کہ جو پانی حدث (خواہ اصغر ہو یا اکبر) کو دور کرنے کے واسطے استعمال کیا گیا ہو یا ثواب حاصل کرنے کی نیت سے جسم پر استعمال کیا گیا ہو(۲) بشرطیکہ وہ پانی جسم سے علیحدہ ہو چکا ہو، مثلاً جس پانی سے بے وضو شخص نے وضو کرلیا، یا جنبی شخص نے غسل کرلیا، یا باوضو شخص نے ہی سابقہ وضو باقی رہنے کے باوجود دوبارہ وضو کرلیا یہ سب پانی احناف کے یہاں ماء مستعمل ہے۔

اس پانی کے پاک ہونے کی دلیل وہ حدیث ہے جو حضرت جابرؓ سے مروی ہے: آپؓ کا بیان ہے کہ میں مریض تھا، آپ ﷺ میرے یہاں تشریف لائے اور وضو فرما کر (بغرض شفاء) وضو کا پانی میرے جسم پر بہادیا،(۳) رسول اللہ ﷺ کے اعضاء مبارکہ سے گرنے والے وضو کے پانی کو حاصل کرنے کے لئے صحابہؓ گویا ٹوٹ پڑتے تھے اور عقیدت کے ساتھ چہرہ ودیگر اعضاء پر مل لیا کرتے تھے۔(۴)

حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں: زمانہ رسالت میں نظر اتارنے کا طریقہ یہ معروف تھا کہ جس کی نظر لگ جاتی اسے وضو کرنے کا حکم دیا جاتا پھر اس کے استعمال شدہ پانی سے نظر

---

(۱) مصنف عبد الرزاق: باب سور الهرة : ۳۴۰. اسناد ضعيف لضعف عبد الله بن عمر العمری وباقی رجاله ثقات رجال الشيخين . شعيب الارنووط : مسند : احمد : ۲۲۸. حسن : مجمع الزوائد : باب غسل الكافر اذا اسلم : ۱۵۶۱

(۲) طحطاوی علی مراقی الفلاح ۱/۱۳، فتح القدير ۱/۵۸

(۳) بخاری : باب عيادة المغمی عليه : ۵۳۲۷

(۴) مسلم باب سترة المصلی :۵۰۳

زدہ شخص غسل کرتا۔(۱) خود رسول اللہ نے اس تدبیر کو برقرار رکھا ارشاد نبوی ہے: جب تم سے یعنی نظر کنندہ سے غسل کرنے کا مطالبہ کیا جائے تو تم غسل کرلو (اور اپنا غسالہ نظر زدہ کو دیدو؛ تا کہ وہ نظر کی دوری کا علاج کرلے)(۲) ان احادیث سے معلوم ہوا کہ وضو اور غسل میں استعمال شدہ پانی ناپاک نہیں ہوتا، طاہر اور پاک باقی رہتا ہے۔

جہاں تک اس پانی کے غیر مطہر یعنی اس سے طہارت حاصل نہ ہونے کا مسئلہ ہے تو اس کا ثبوت اس حدیث سے ہے جو حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: تم میں سے کوئی ٹھہرے ہوئے (قلیل) پانی میں غسل نہ کرے جبکہ وہ حالت جنابت میں ہو۔(۳) حضور ﷺ کا یہ ارشاد حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی زبانی سن کر ان کے ایک شاگرد نے دریافت کیا کہ اگر ایسی ضرورت کسی کو پیش آجائے تو پھر آدمی کو کیا کرنا چاہئے؟ تو آپ رضی اللہ عنہ نے جواباً فرمایا: پانی ہاتھ سے لے کر غسل کرے (اس میں داخل ہو کر ڈبکی لگا کر غسل نہ کرے)۔(۴)

حدیث مذکور سے استدلال کا طریقہ یہ ہے کہ اس حدیث میں ناپاک شخص کو پانی کے اندر اتر کر غسل کرنے کے بجائے ہاتھ سے پانی لے کر غسل کرنے کی تلقین کی گئی ہے، اس میں حکمت یہی ہے کہ پہلی شکل کے اختیار کرنے سے خواہ مخواہ بلا ضرورت پورا پانی متاثر ہو جاتا ہے، برخلاف دوسری صورت کے کہ اس میں صرف بقدر ضرورت پانی کو استعمال کیا جاتا ہے۔ یہاں نکتہ کی بات یہ ہے کہ اگر ازالہ حدث سے پانی کے اندر کوئی فرق نہ پڑنے کا معاملہ ہوتا تو بیرون حوض کے بجائے اندرون حوض غسل کا حکم دیا جاتا؛ تا کہ اس میں پانی کی بھی مکمل بچت ہوتی اور حدث بھی دور ہو جاتا؛ حالاں کہ ایسا حکم نہیں دیا گیا تو معلوم ہوا کہ ازالہ حدث

---

(۱) ابو اداؤد : تحقیق البانی : باب ما جاء فی العین : ۳۸۸۰ صحیح

(۲) مسلم : باب الطب والمرض : ۲۱۸۸

(۳) مسلم : باب النھی عن الاغتسال فی الماء الراکد : ۲۸۳

(۴) حوالۂ سابق

سے پانی میں فرق پڑجاتا ہے اوراس کے دو بنیادی امتیازات پاک اور پاک کرنے کی صلاحیت میں سے دوسرا امتیاز فوت ہو جاتا ہے اور ایسا پانی پھر ازالہ حدث کے قابل نہیں رہتا ہے۔

ماء مستعمل سے طہارت حاصل نہ ہونے کی تائید اس سے بھی ہوتی ہے کہ ریگستان عرب میں پانی کی قلت کے باوجود صحابہ وتابعین سے کہیں یہ منقول نہیں ہے کہ انہوں نے ماء مستعمل کو جمع کر کے دوبارہ اسے استعمال کیا ہو؛ بلکہ ضرورت کے موقع پر تیمّم تو کیا ہے لیکن ماء مستعمل کو دوبارہ استعمال نہیں کیا ہے۔(۱)☆

۴) ماء مشکوک: وہ پانی جو خود پاک ہے، لیکن اس کا مطہر یا غیر مطہر ہونا یقینی نہیں ہے، یعنی اگر اس سے وضو وغسل کریں تو اسے نہ جائز کہہ سکتے ہیں اور نہ ناجائز۔ پانی کی یہ قسم صرف احناف کے یہاں ہے، اس پانی کا مصداق احناف کے یہاں گدھے اور خچر کا جھوٹا پانی ہے، حضرت ابن عمرؓ گدھے وغیرہ کے باقی ماندہ پانی سے وضو کرنے کو اچھا نہیں خیال فرماتے تھے (۲) مزید تفصیل جھوٹے پانی کے بیان میں آئے گی۔

۵) ماء نجس: وہ پانی جس میں ناپاکی گرگئی ہو اور وہ تھوڑا پانی ہو اور اگر زیادہ پانی ہو تو اس کا رنگ، بو اور مزہ بدل گیا ہو، ماء نجس سے تمام فقہاء کے یہاں نہ وضو وغسل کیا جاسکتا ہے اور نہ ہی نجاست کو دور کیا جاسکتا ہے۔

---

(۱) موسوعہ فقھیہ ۳۹/۳۶۰

(☆) حنفیہ کی طرح شافعیہ وحنابلہ کے نزدیک بھی ماء مستعمل طاہر غیر مطہر ہے البتہ مالکیہ کے نزدیک طاہر ومطہر ہے تاہم دوسرے پانی کے ہوتے ہوئے اس سے وضو یا غسل کرنا مکروہ ہے۔ الفقه الاسلامی وادلته : ۱/۲۷۴. ۲۷۷

(۲) مصنف ابن ابی شیبه : باب فی الوضوء بسؤر الحمار والکلب : ۳۰۶. ۳۰۷ سند صحیح قد حکم الالبانی بالصحة علی رجال هذا الحدیث فی حدیث اخر ابن ماجة : باب الوفاء بالنذر : ۲۱۲۹

مقدار کے اعتبار سے پانی کی اقسام

اس لحاظ سے پانی کی دو قسمیں ہیں (۱) قلیل (۲) کثیر

احادیث میں پانی کی قلت و کثرت کا کوئی ایسا معیار نہیں بیان کیا گیا ہے جسے دوٹوک یا فیصلہ کن کہا جا سکے، اس سلسلہ میں تقریباً تمام ہی ائمہ نے پانی کے قلیل یا کثیر ہونے کا اندازہ پانی کی پاکی و ناپاکی کو بیان کرنے والی روایات کی روشنی میں کی ہے، پانی کی پاکی وناپاکی کے متعلق متعدد متعارض روایات ہیں:

(الف) بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ پانی کسی صورت میں ناپاک نہیں ہوتا (۱) جیسے مدینہ کے نشیبی حصہ میں واقع بضاعہ نامی کنویں کے پانی کے پاک ہونے کے بارے میں (جس سے متعدد باغوں کی سینچائی بھی ہوا کرتی تھی) جب صحابہ کرام نے اندیشے ظاہر کیے تو آپ ﷺ نے یہ حکمت بھرا جملہ ارشاد فرما کر کہ "پانی کو کوئی چیز ناپاک نہیں کرتی" ان کے شبہات کا خاتمہ کر دیا تھا۔

(ب) بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ وصف کے بدل جانے کی صورت میں پانی ناپاک ہو جاتا ہے، جیسے ارشاد نبوی ہے: بلاشبہ پانی کو کوئی چیز ناپاک نہیں کرتی؛ مگر جو پانی کی بو، مزہ اور رنگ پر غالب آجائے (۲)

(ج) بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ جب پانی دو مٹکے ہو جائیں تو وہ ناپاکی کو نہیں اٹھاتا۔ (۳) جیسے چٹیل میدان کا وہ پانی، جس سے باری باری چوپائے درندے سیراب ہوتے ہیں، اس کا حکم جب آپ سے دریافت کیا گیا تو آپ نے یہ جملہ ارشاد فرمایا تھا، ظاہر ہے کہ ایسا پانی جس سے خلق کثیر مستفید ہوتی ہو وہ چشموں اور آبشاروں ہی کا ہو سکتا

---

(۱) ترمذی : باب ما جاء ان الماء لا ینجسه شئی : ٦٦. حسن : امام ترمذیؒ

(۲) سنن ابن ماجه : باب الحیاض : ۵۲۱. صححه الائمة : خلاصة البدر المنیر : ۱/۸

(۳) ترمذی تحقیق الالبانی باب ماجاء لا ینجسه شئ : باب منه اخر : ٦٧. صحیح

ہے، جو بظاہر چند مٹکوں کی شکل میں دکھائی دیتا ہے، لیکن وہ زمین سے مسلسل نکلتا اور رستا رہتا ہے، درندوں اور چوپایوں کا لعاب یا کوئی اور چیز اس کی سطح پر ٹھہری نہیں رہتی؛ بلکہ بہہ کر چلی جاتی ہے۔

(د) بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ کچھ پانی محض نجاست کے گرنے سے ناپاک ہوجاتا ہے، خواہ کوئی تغیر ہوا ہو یا نہیں، جیسے یہ روایات کہ: کتّا برتن میں منہ ڈالدے تو تمام پانی ضائع کردیا جائے اور برتن کی بھی صفائی کی جائے (۱) حالاں کہ مشاہدہ ہے کہ کتے کے منہ ڈالنے سے برتن کے قلیل پانی میں کوئی تغیر پیدا نہیں ہوتا، ہرگز تم میں سے کوئی ٹھہرے ہوئے پانی میں پیشاب نہ کرے پھر وہ اس سے غسل کرے گا! (۲) پھر وہ اس سے وضو کرے گا! (۳) حالاں کہ پیشاب کے پڑنے سے پانی میں کوئی خاطر خواہ تبدیلی پیدا نہیں ہوتی، جب تم میں سے کوئی اپنی نیند سے بیدار ہو تو اپنا ہاتھ (پانی والے) برتن میں نہ ڈالے جب تک کہ اسے تین بار دھو نہ لے؛ کیوں کہ اسے پتہ نہیں کہ اس کا ہاتھ (نیند کی حالت میں) کہاں کہاں پہنچا ہے (۴) حالاں کہ ہاتھ پر بدن کی کچھ گندگی لگی ہوئی ہو تب بھی اس سے برتن کے پانی میں کوئی تبدیلی واقع نہیں ہوتی۔ یہ چار طرح کی روایات ہیں۔☆

---

(۱) مسلم: باب حکم ولوغ الکلب: ۲۷۹

(۲) بخاری باب البول فی الدائم: ۲۳۶

(۳) ترمذی باب فی کراھیة البول فی المال الراکد: ۶۸۔ حسن صحیح امام ترمذی

(۴) مسلم: باب کراھة غمس المتوضی وغیرہ یدہ المشکوک فی نجاستھا فی الاناء: ۲۷۸

☆ اصحاب ظواہر نے صرف پہلی روایت لی ہے، باقی تمام روایات کو انہوں نے نظر انداز کردیا ہے، وہ اس بات کے قائل ہیں کہ پانی میں نجاست گرنے سے پانی مطلقاً ناپاک نہیں ہوتا، خواہ پانی تھوڑا ہو یا زیادہ اور چاہے پانی کا کوئی وصف بدلے یا نہ بدلے، ہر صورت میں وہ پانی پاک ہے (تحفۃ الاحوذی: ۶۶/۱) فقہاء مالکیہ نے پہلی اور دوسری قسم کی روایات کے مجموعی مضمون کو اختیار کیا ہے گویا ان کے یہاں پانی کے قلیل یا کثیر ہونے کا مدار وصف کے بدلنے نہ بدلنے پر ہے، نجاست کے گرنے سے پانی کا کوئی وصف بدل جاتا ہے تو وہ قلیل ہے ورنہ کثیر۔ شوافع وحنابلہ نے پہلی دو قسم کی روایات کو پیش نظر رکھتے ہوئے تیسری قسم کی روایات کو بنیاد بنایا ہے، ان کے یہاں پانی کے قلیل وکثیر ہونے کا مدار، دو مٹکوں کی مقدار پر ہے، جو پانی دو مٹکوں کے برابر یا اس سے زیادہ ہو وہ کثیر ہے نجاست کے گرنے سے وہ ناپاک اس وقت ہوتا ہے جب پانی کا کوئی وصف بدل جائے اور جو پانی دو مٹکوں سے کم ہو وہ قلیل ہے، وہ محض وقوع نجاست سے ناپاک ہوجاتا ہے، خواہ کوئی وصف نہ بدلا ہو۔

احناف نے ان تمام روایات کو جمع کیا ہے اور نہایت بصیرت سے ان کے جدا جدا محمل متعین کیا ہے، پہلی قسم کی روایات میں پانی کے اصل مزاج کا بیان ہے کہ پانی اپنی اصلی حالت کے اعتبار سے پاک بنایا گیا ہے اور محض وہم سے ناپاک نہیں ہوجاتا، دوسری اور تیسری قسم کی روایات خود اپنے سیاق وسباق خارجی اور قرائن کی روشنی میں ماء کثیر اور ماء جاری پر محمول ہیں اور چوتھی قسم کی روایات ماء قلیل پر محمول ہیں۔

غرض مجموعہ روایات سے صرف اتنی بات سامنے آتی ہے کہ بعض پانی، ماء کثیر ہوتے ہیں جو معمولی مقدار میں نجاست کے گرنے سے ناپاک نہیں ہوجاتے، تا آنکہ ان کے اوصاف میں فرق نہ پڑجائے اور بعض پانی ماء قلیل کہلاتے ہیں، جو محض معمولی نجاست کے گرنے سے بھی اپنی طہارت کھو بیٹھتے ہیں، بقیہ قلیل وکثیر کی حتمی تحدید کیا ہے؟ روایات اس سے خاموش ہیں۔(۱)

پس حنفیہ بھی قلیل وکثیر کی قطعی تحدید نہیں کرتے، رائے مبتلی بہ یعنی خود انسان کے اپنے شعور ووجدان پر اس معاملے کو چھوڑ دیتے ہیں، یہی حنفیہ کا اصل موقف ومسلک ہے جو احادیث کے عین موافق ہے(۲) بعد کو متاخرین نے عوام کی سہولت کے پیش نظر ''دہ دردہ'' یعنی سو ہاتھ مربع کو قلت وکثرت کا معیار قرار دیا کہ جو پانی دہ دردہ ہو وہ کثیر اور جو اس سے کم ہو وہ قلیل ہوگا؛(۳) کیوں کہ جو پانی اتنی مقدار میں (دہ دادہ) ہو، وہ اس کیفیت پر ہوگا کہ اگر اس کے ایک کنارے کو حرکت دی جائے تو مقابل کنارے پر کوئی حرکت پیدا نہیں ہوتی اور عرف میں اس قسم کے پانی کو ماء کثیر تسلیم کیا جاتا ہے۔(۴)

---

(۱) فتح الملهم ۱/ ۴۴۰، ۴۴۳، اعلاء السنن ۱/ ۲۵۷، ۲۶۵

(۲) البحر الرائق ۱/ ۷۵، ۸۲

(۳) اللباب في شرح الكتاب : ۱/ ۱۳

(۴) شرح الوقاية :۸۱/۱

جھوٹے پانی کا بیان

جھوٹے پانی کا حکم طے کرنے کے متعلق سے احادیث میں دو اہم قاعدے بیان ہوئے ہیں:

الف: حرج اور تنگی جھوٹے پانی کے حکم میں تخفیف کا باعث ہوتی ہے،

ب: گوشت کی حلت وحرمت جھوٹے پانی میں اثر انداز ہوتی ہے کہ لعاب گوشت ہی سے پیدا ہوتا ہے، قاعدہ اولی کی تائید ان احادیث سے ہوتی ہے جس میں کہا گیا ہے کہ بلی کا جھوٹا ناپاک نہیں ہے؛ کیوں کہ بلی کا تعلق ان جانوروں سے ہے جن کی تمہارے یہاں بکثرت آمدورفت رہتی ہے(۱) قاعدہ ثانیہ کا بیان اس حدیث میں ہے جو حضرت براءؓ سے مروی ہے رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: وہ جانور جن کا گوشت کھایا جاتا ہے (یعنی پاک ولائق استعمال ہے) ان کے جھوٹے (کے استعمال کرنے) میں کوئی حرج نہیں (۲)

یہ دو قاعدے اس قدر جامع ہیں کہ محض انہی کی مدد سے تمام حیوانات کے جھوٹوں کے احکام طے کئے جاسکتے ہیں۔

۱) وہ حیوانات جن کا گوشت بھی پاک وحلال ہو اور ان کے جھوٹے کو ناپاک قرار دینا بھی موجب حرج ہو، تو ایسے جانوروں کا جھوٹا بلا تردد پاک ہے، جیسے گائے، بھینس، بکری اور بقیہ پالتو جانوروں کا جھوٹا، یہی حکم انسان کے جھوٹے کا بھی ہے۔

۲) جن حیوانات میں ان دونوں امور میں سے کسی ایک کا بھی تحقق نہ ہو تو، ان کا جھوٹا ناپاک ہے، جیسے کتا، خنزیر اور تمام جنگلی درندوں کا جھوٹا۔

---

(۱) ترمذی تحقیق الالبانی باب ماجاء فی سور الھرۃ : ۹۲. صحیح

(۲) السنن الکبری للبیھقی باب فی سور مایو کل لحمه : ۱۲۳۴ دارقطنی : باب نجاسة البول : ۴۷۲۔ ضعیف: تا ھم اس مسئلہ پر امت کا اجماع ھے :الاجماع لابن المنذر : باب ماا جمعوا علیه فی الماء :۱۳

۳)　　وہ حیوانات جن میں امر دوم کا تحقق بالیقین نہیں ہوتا یعنی جن کا گوشت یقینی طور پر حلال و پاک تو نہ ہو؛ البتہ امر اول کا تحقق یقینی طور پر ہو، یعنی ان کے جھوٹے کے ناپاک قرار دینے میں سخت تنگی و دشواری کا باعث ہو تو ایسے جانوروں کا جھوٹا مکروہ قرار پائے گا، جیسے بلی، اور حرام پرندوں کا جھوٹا۔

۴)　　وہ حیوانات جن میں امر دوم کا تحقق بالیقین نہ ہو اور امر اول کے تحقق وعدم تحقق میں اشتباہ ہو یعنی ان کا گوشت تو یقینی طور پر حرام ہو؛ لیکن ان کے جھوٹے کو ناپاک قرار دینا آیا حرج و تنگی کا باعث بنے گا یا نہیں، اس میں اشتباہ ہو، تو ایسے جانوروں کا جھوٹا مشکوک کہلاتا ہے، جیسے گدھے اور خچروں کا جھوٹا۔

یہ تو اصولی اعتبار سے حیوانات کے جھوٹوں کے احکام کی تفصیلات تھیں، ذیل میں فرداً فرداً ان حیوانات کے جھوٹوں کے احکام لکھے جاتے ہیں جو صریح احادیث سے ثابت ہیں۔

۱)　　انسان کا جھوٹا پاک ہے، خواہ انسان ناپاکی کی حالت میں ہو، یا کفر میں مبتلا ہو، حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں: میں حالت حیض میں پانی پیا کرتی تو کبھی آپ ﷺ وہ برتن مجھ سے لے لیتے اور اپنا دہن مبارک وہاں رکھتے جہاں میں نے اپنا منہ رکھا تھا(۱) رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: شیطان کا میرے پاس سے گذر ہوا تو میں نے اسے دبوچا اور اس کی گردن مروڑی یہاں تک کہ اس کی زبان کی رطوبت میں نے اپنے ہاتھ میں محسوس کی، مارے کرب کے وہ کہنے لگا: آپ ﷺ نے مجھے تکلیف سے دوچار کر دیا۔(۲) شیطان جو بانی کفر ہے، اس کا لعاب جب قابل ازالہ نہیں تو عام کفار کا لعاب و جھوٹا بھی ناپاک نہیں کہلائے گا، ابراہیم نخعی ؒ کا ارشاد ہے: آدمی بے تردد، گھوڑے، بکری، اونٹ کے جھوٹے سے وضو کر سکتا ہے۔(۳)

---

(۱)　مسلم : کتاب الحیض: ۳۰۰

(۲)　مجمع الزوائد باب سور الکافر: ۱۵۹۴ . صحیح: اعلاء السنن : ۱/۲۹۴

(۳)　کتاب الآثار لامام محمد باب سؤر الفرس والبغل والحمار والسور : ۲. صحیح

۲) کتے کا جھوٹا ناپاک ہے، ارشاد نبوی ہے: جب تم میں سے کسی کے برتن میں کتا منہ ڈال دے تو پانی کو گرا دو اور برتن کو تین دفعہ دھوڈالو(۱) یہ ارشاد بھی ہے: جب کتا برتن میں منہ ڈال دے تو برتن کو سات دفعہ دھوڈالو اور پہلی بار مٹی سے بھی مانجھ لو۔(۲)

۳) خنزیر کا جھوٹا بھی ناپاک ہے ارشاد ربانی ہے خنزیر سراسر مجسم نجاست ہے(۳)(☆)

۴) درندوں کا جھوٹا بھی ناپاک ہے، رسول اللہ ﷺ سے اس پانی کے تعلق سے حکم دریافت کیا گیا جس پر باری باری درندے و چوپائے آتے اور اسے استعمال کرتے ہیں، آپؐ نے ارشاد فرمایا: جب پانی دو مٹکوں کے بقدر ہو تو وہ نجاست کو نہیں اٹھاتا۔(۴)

درندوں کا جھوٹا اگر پاک ہوتا تو آپ اس کے پاک ہونے کی تصریح کرتے جیسے بلی کے جھوٹے کے بارے میں دریافت کرنے پر آپ ﷺ نے اس کے ناپاک نہ ہونے کی تصریح فرمادی تھی، حالاں کہ یہاں بجائے اس کے آپ ﷺ نے پانی کی وہ مقدار بیان فرمائی جو نجاست کے گرنے سے متاثر نہیں ہوتی۔

ایک سفر کے موقع پر حضرت عمرو بن عاصؓ نے پانی کے ایک حوض کے مالک سے یہ تحقیق کرنی چاہی کہ آیا درندے بھی اسے استعمال کرتے ہیں؟ اس پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فوری مداخلت کرتے ہوئے حوض والے کو جواب دینے سے روک دیا تھا۔(۵)

---

(۱) دار قطني باب ولوغ الكلب في الاناء: ۱۹۷ . صحيح : نصب الرايه : ۱/۱۳۱

(۲) مسلم باب حكم ولوغ الكلب :۶۷۷

(۳) انعام : ۱۴۵

(☆) امام شافعیؒ واحمدؒ کے نزدیک بھی کتے اور خنزیر کا جھوٹا ناپاک ہے امام مالکؒ کے نزدیک پاک ہے البتہ امام مالکؒ کے نزدیک کتا یا خنزیر کسی برتن میں منہ ڈالدیں تو محض حکم شرعی سمجھتے ہوئے برتن کو دھونا ضروری ہے۔ الفقہ الاسلامی:۱/۲۸۵۔۲۸۶

(۴) ابو داؤد تحقيق الالباني: ۶۳ .صحيح

(۵) مؤطا مالك باب الطهور للوضوء : ۶۲

درندوں کے جھوٹے کے بارے میں صحابہ کے درمیان یہ تجسس و تحقیق کی فکر، مداخلت و زبان بندی درندوں کے جھوٹوں کے نجس و نا قابل استعمال ہونے کو ثابت کرتا ہے؛ البتہ پانی اگر کثیر مقدار میں ہو اور درندے وغیرہ اس میں منہ ڈالدیں تو وہ ناپاک نہیں ہوتا، غالبًا ایسے ہی پانی کے بارے میں جب آپؐ سے دریافت کیا گیا تو آپ نے فرمایا تھا: تمام درندوں کے باقیماندہ پانی سے وضو کیا جا سکتا ہے(۱)(☆)

۵) بلی کے جھوٹا کے بارے میں ارشاد نبوی ﷺ ہے: بلی ایک درندہ صفت جانور ہے(۲) جیسے اور درندوں کا جھوٹا ناپاک ہے ایسے ہی بلی کا جھوٹا بھی ناپاک ہونا چاہئے؛ تاہم بلی چوں کہ ایک گھریلو جانور ہے، اندرون خانہ بار بار اس کی آمد و رفت رہتی ہے اور بلی کی عادت ادھر ادھر منہ ڈالنے کی ہوتی ہے، اس لئے رسول اللہ ﷺ نے اس دشواری کا لحاظ کرتے ہوئے، بلی کے جھوٹے کو ناپاک قرار نہیں دیا، ارشاد ہے: بلی کا جھوٹا ناپاک نہیں ہے یہ تو ہر وقت تمہارے پاس آتی جاتی رہتی ہے(۳)

دیگر گھریلو جانور، جیسے: چوہا، سانپ، بچھو وغیرہ، فضائی پرندے: باز، چیل، شکرا، وغیرہ کی بھی بلی سے زیادہ آزادانہ طور پر گھروں میں آمد و رفت رہتی ہے؛ اس لئے ان کے جھوٹے کا حکم بھی بلی کے جھوٹے کی طرح ہوگا۔

بلی کے جھوٹے کے بارے میں کتب احادیث میں ایک ارشاد نبویؐ یہ بھی منقول ہے: جس برتن میں بلی منہ ڈالے اسے ایک دفعہ دھو ڈالو،(۴) یہ حکم گویا بلی کی اصل خلقت

---

(۱) معرفة السنن والاثار : باب سؤر مالایو کل لحمه. قوی: امام بیهقی

(☆) امام مالکؒ و شافعیؒ و احمد بن حنبلؒ کے نزدیک درندوں کا جھوٹا پاک ہے۔ الفقه الاسلامی وادلته : ۲۸۶/۱

(۲) مصنف ابن ابی شیبه تحقیق محمد عوامه : الوضوء بسؤر الهرة : ۳۴۵. حسن

(۳) ترمذی : سورالهرة : حسن صحیح. امام ترمذیؒ : ۹۲

(۴) ترمذی سؤر الکلب: ۹۱. حسن صحیح :امام ترمذی

کے اعتبار سے ہے، حنفیہ نے بلی وغیرہ کی اصل خلقت اور عمومی دشواری سے پیدا شدہ سہولت دونوں کو مدنظر رکھتے ہوئے بلی وغیرہ کے جھوٹے کو پاک؛ البتہ مکروہ تنزیہی قرار دیا ہے، یعنی کوئی اور سادہ پانی دستیاب ہو تو اس کی موجودگی میں بلی کے جھوٹے کو استعمال کرنا بہتر نہ ہوگا۔(۱)(☆)

۶) گدھے اور خچر کا جھوٹا: گدھا ایسا جانور ہے جس کا گوشت کھانا حرام ہے، (یہی حکم خچر کا بھی ہے)(۲) اس لحاظ سے، اس کا جھوٹا قطعی ناپاک ہونا چاہئے مگر چوں کہ اس کی بود و باش آبادیوں ہی میں ہوتی ہے، کہیں سواری کے طور پر اس کا استعمال ہوا کرتا ہے، کہیں گھر کے صحنوں میں اس کو باندھے رکھنے کا بھی رواج ہے، اس بناء پر یکلخت اس کے جھوٹے کو ناپاک قرار دے دینا حرج کا باعث بن سکتا تھا، اس لئے بالکلیہ ناپاک تو نہیں کہا گیا؛ لیکن دوسری طرف یہ بھی حقیقت ہے کہ بلی اور دیگر گھریلو جانوروں کی طرح گدھوں اور خچروں کی گھروں کے اندر بآسانی آزادانہ آمد و رفت اور اختلاط بھی نہیں رہتا، اس بناء پر ان کے جھوٹے کو بلی وغیرہ کے جھوٹے کی طرح مکمل پاک بھی قرار دینا مشکل ہے، اس لئے گدھے کا جھوٹا خود بخود طبعی طور پر مشکوک قرار پایا، پس ان کا جھوٹا نہ کسی پاک چیز کو ناپاک کرسکتا ہے اور نہ کسی ناپاک چیز کو پاک کرسکتا ہے، کسی وقت اگر ان کے جھوٹے کے علاوہ کوئی اور پانی موجود نہ ہو تو صرف اس سے وضو پر اکتفاء نہ کیا جائے؛ بلکہ احتیاطاً تیمّم بھی کرلیا جائے۔(۳)

---

(۱) طحطاوی علی المراقی : ۱/ ۲۷

(☆) ائمہ ثلاثہ اور امام ابو یوسفؒ کے نزدیک بلی کا جھوٹا مطلق پاک ہے۔ الفقه الاسلامی : ۱/ ۲۸۶

(۲) مسلم باب تحریم اکل لحم الحمور الاهلية : ۱۹۳۶، ۵۱۰۶

(۳) بدائع ۱/ ۶۳۔ شامی ۱/ ۱۴۸۔

حضرت ابراہیم نخعیؒ فرماتے ہیں: خچر اور گدھے کے جھوٹے میں کوئی خیر نہیں، کوئی شخص ان کے جھوٹے سے وضو نہ کرے البتہ گھوڑے، بکری، اونٹ کے جھوٹے سے بے تردد وضو کیا جا سکتا ہے(۱)(☆)

(۱) کتاب الِاٰثار امام محمد : باب سور الفرس والبغل والحمار: ٦.صحیح

(☆) ائمہ ثلاثہ کے نزدیک گدھے اور خچر کا جھوٹا پاک ہے خلاصہ یہ کہ مالکیہ کے نزدیک تمام جانوروں کا جھوٹا پاک ہے، بدایة المجتهد ۱/۲۷.۳۰، الشرح الصغیر ۱/۴۳، الشرح الکبیر ۱/۴۳.۴۴) شوافع وحنابلہ کے یہاں صرف کتے اور خنزیر کا جھوٹا ناپاک ہے، بقیہ جانوروں کا جھوٹا پاک ہے(المجموع : ۱/۲۲۷، مغنی المحتاج ۱/۸۳، کشاف القناع ۱/۲۲۱،الفقه الاسلامی : ۱/ ۲۸٦

نجاست کا بیان

نجاست کی دو قسمیں ہیں: (۱) نجاست حقیقیہ، (۲) نجاست حکمیہ

نجاست حقیقیہ

جس چیز سے انسان نفرت کرتا ہے اور اپنے بدن اور کپڑوں اور کھانے پینے کی چیزوں کو اس سے بچاتا ہے، اور شریعت بھی اسے گھن والی چیز مانتی ہے، مثلاً: جو چیزیں انسان کے بدن سے نکلیں اور ان سے وضو یا غسل واجب ہو جائیں، جیسے: پیشاب، پاخانہ، منی، مذی، ودی، پیپ، قئی جب کہ منہ بھر کر ہو، حیض ونفاس اور استحاضہ کا خون، دودھ پیتے بچے اور بچیوں کا پیشاب خواہ وہ کھانا کھانا شروع کیے ہوں یا نہ کیے ہوں، شراب، بہتا خون، مردار کا گوشت، جن جانوروں کا گوشت کھانا شریعت میں جائز نہیں ہے، یا کھانا جائز ہو ان سب کا پیشاب اور پاخانہ، آدمی کا پاخانہ، کتے کا پاخانہ و پیشاب، مرغی، بطخ وغیرہ کا پاخانہ درندے، بلی، چوہے کا پاخانہ، سانپ کا پیشاب و پاخانہ، حرام پرندوں کا بٹ، یہ سب احناف کے یہاں نجاست حقیقیہ میں داخل ہیں۔

سورۃ، اعراف کی آیت: ۱۵۷ میں بعثت نبوی ﷺ کا ایک نمایاں کارنامہ تحریم خبائث (خبیث وگندی چیزوں کو حرام قرار دینا) بھی بیان کیا گیا ہے، مفسرین کے مطابق خبائث سے مراد وہ چیزیں بھی ہیں جن سے طبیعت گھن کرتی ہو، جیسے خون، مردار وغیرہ، شریعت کی بول چال میں خبیث عموماً ناپاک ونجس چیز پر بولا جاتا ہے(۱) اوپر جن امور کا ذکر کیا گیا ہے ان سے ہر سلیم الطبع انسان گھن محسوس کرتا ہے، اس لئے ان کے ناپاک ونجس ہونے میں بھی شبہ نہیں ہے۔

---

(۱) اعلاء السنن ۱/۴۰۰

نجاست حقیقیہ کی دو قسمیں ہیں: نجاست غلیظہ اور نجاست خفیفہ

نجاست غلیظہ: ایسی چیز ہے جس کے ناپاک ہونے میں کسی قسم کا شبہ نہ ہو اور نہ اس سے بچنے میں انسان کو دشواری ہو اور کسی دلیل سے اس کا پاک ہونا ثابت نہ ہوتا ہو، جیسے: انسان کا پیشاب و پاخانہ، ودی، مذی اور بہتا خون۔

الف: پیشاب خواہ انسان کا ہو یا حرام جانوروں کا بہرحال نجاست غلیظہ میں داخل ہے، آپ ؐ کا ارشاد ہے: پیشاب سے بچا کرو؛ کیوں کہ عام طور پر عذاب قبر پیشاب سے نہ بچنے کی وجہ سے ہوتا ہے، (۱) اس حدیث سے صراحۃً معلوم ہوا کہ پیشاب خواہ کسی کا ہو بلا تفریق ناپاک ہے اور اس ناپاکی سے نہ بچنے پر قبر میں عذاب بھی ہوتا ہے۔

ب: پاخانہ: انسان اور تمام جانوروں (خواہ وہ حلال ہوں یا حرام) کا پاخانہ نجاست غلیظہ کے قبیل سے ہے، حضرت خزیمہ بن ثابت ؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ سے پوچھا گیا کہ قضائے حاجت کے بعد صفائی کس چیز سے کی جائے؟ آپ ﷺ نے فرمایا کہ تین پتھروں سے؛ البتہ ان میں کسی جانور کا پاخانہ نہ ہو، (۲) اور حضرت عبد اللہ بن مسعود ؓ سے منقول ہے کہ حضور اکرم ﷺ جب قضائے حاجت کے لئے جانے لگے تو مجھے تین پتھر لانے کا حکم دیا، مجھے دو پتھر ملے اور تیسرا پتھر نہ مل سکا تو میں نے لید لے لی اور آپ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا، آپ ﷺ نے دو پتھر لے لیا، اور لید کو پھینک دیا اور فرمایا کہ یہ تو ناپاک ہے۔ (۳)

ج: مذی کے ناپاک ہونے پر اجماع ہے، حضرت علیؓ فرماتے ہیں کہ مجھے مذی زیادہ نکلتی تھی، میں نے اس بابت ایک صاحب کو مکلّف کیا کہ وہ آپ ﷺ سے اس کا حکم

---

(۱) دار قطني: ۴۷۴ باب نجاسة البول صحيح : خلاصة البدر المنير : ۱/۴۵

(۲) ابوداؤد تعليق الالباني: باب ما ينهى عنه ان يستنجي به : ۴۱

(۳) بخاری باب الاستنجاء بالحجارة : ۱۵۵

دریافت کریں، ان کے پوچھنے پر آپ ﷺ نے فرمایا، وضو کرلو (غسل کی ضرورت نہیں) اور شرمگاہ کو دھولو۔(۱)

د: ودی: ایک سفید گاڑھا مادہ ہوتا ہے جو بعض لوگوں کو پیشاب کے بعد یا کبھی پہلے آتا ہے، یہ بھی ناپاک ہے، حضرت ابن عباسؓ اور حضرت عائشہؓ سے منقول ہے کہ جب ودی نکلے تو آلہ تناسل کو دھوئے اور وضو کرے۔(۲)

ہ: قئی: قئی اگر منہ بھر ہو تو ناپاک ہے نبی کریم ﷺ نے حضرت عمارؓ کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا: کپڑوں کو پانچ چیزوں سے ملوث ہوجانے پر دھویا جائے، پاخانہ، پیشاب، قئی، خون اور منی سے (۳) حضرت عمارؓ کی حدیث اگرچہ عام ہے خواہ منہ بھر کر ہو یا منہ بھر سے کم ہو، دونوں صورتوں میں وضو ٹوٹ جانا چاہئے تھا، لیکن حضرت ابوہریرہؓ نے حضور اکرم ﷺ کا یہ ارشاد نقل کیا ہے کہ وضو سات امور کی وجہ سے دوبارہ کرنا ضروری ہے، جن میں سے ایک منہ بھر کر قئی بھی ہے۔(۴) اس حدیث کی بناء پر منہ بھر کر ہونے کی قید احناف نے لگائی ہے، اب منہ بھر کر قئی ہونا، اس وقت مانا جائے گا جب کہ اس کو روکنا مشکل ہو۔(۵)(☆)

و: منی بھی ناپاک ہے، اس سلسلہ کی جتنی بھی روایات موجود ہیں تمام میں منی کو کسی نہ کسی طریقہ سے زائل کرنے کا حکم یا عمل منقول ہے، (۶) اگر منی پاک ہوتی تو کم از

(۱) بخاری باب غسل المذی والوضوء عنه : ۲۶۶
(۲) مصنف ابن ابی شیبه باب فی المنی والمذی والودی : ۹۸۲، ۹۸۹ .حسن : اثار السنن : ۱/۱۶
(۳) سنن دار قطنی باب نجاسة البول ضعیف سلسلة الاحادیث الضعیفة : ۴۸۴۹
(۴) جامع الکبیر : ۱۱۴۱۵ حرف الیاء ضعیف
(۵) فتح القدیر : ۱/۶۷
(☆) انسان کا بول و براز مذی ودی اور قئی کے نجس ہونے پر تمام ائمہ متفق ہیں۔ الفقه الاسلامی : ۱/۳۰۳، ۳۰۴
(۶) بخاری: باب غسل المنی وفرکه، مسلم: باب حکم المنی ، دار قطنی: باب ما ورد فی طهارة المنی :۴۵۷

کم کسی ایک روایت میں سہی اسے کپڑے یا بدن پر یونہی برقرار رکھنے کا تذکرہ ملتا؛ حالانکہ کوئی ایک روایت بھی اس مضمون کی موجود نہیں ہے؛ بلکہ دار قطنی کی روایت میں تو منی کے کپڑے پر لگ جانے کی صورت میں، اسی طرح صفائی ضروری قرار دی گئی ہے، جس طرح بول و براز اور قئی لگ جانے کی صورت میں ضروری قرار دی گئی ہے، (۱) (☆)

ز: بہتا خون بھی ناپاک ہے، خواہ کسی جاندار کے جسم سے معمول کے مطابق بہے، جیسے حیض و نفاس کا خون ہو یا زخم سے بہنے والا خون ہو، قرآن پاک میں ہے کہ ''بہتا خون ناپاک ہے'' (۲) البتہ شہید کا خون جب تک اس کے جسم پر ہو پاک ہے، نبی کریم ﷺ نے شہداء احد کے بارے میں فرمایا تھا: ان سبھوں کو (غسل دینے کی ضرورت نہیں) خون کے ساتھ ہی دفن کرو، کیوں کہ اللہ کے راستے میں جس شخص کو زخم لگتا ہے وہ قیامت کے دن اس حالت میں آئے گا کہ اس کے زخم سے خون بہتا ہوگا، رنگ تو خون کا ہوگا؛ لیکن اس میں مشک کی سی خوشبو پھوٹ رہی ہوگی (۳) اسی طرح جو خون زخم کے سرے پر ہو اور نہ بہے وہ معاف ہے، کیوں کہ وہ بہتا خون نہیں ہے، ☆

ح: شراب: شراب کی ناپاکی پر اجماع ہے، قرآن پاک میں اسے رجس (ناپاک) کہا گیا ہے، اس بناء پر تمام فقہاء اس کے ناپاک ہونے کے قائل ہیں۔ (۴)

---

(۱) دار قطنی : ۴۶۸

(☆) یہی امام مالک کا بھی مسلک ہے، امام شافعیؒ و احمدؒ کے یہاں منی پاک ہے۔ الفقه الاسلامی : ۱/۳۱۵

(۲) الانعام : ۱۴۵

(۳) نسائی مع تعلیق الالبانی باب ثواب من کلم فی سبیل الله : ۴۳۵۶. صحیح

☆ شوافع حضرات بہنے والے خون کو بھی پاک کہتے ہیں بشرطیکہ وہ صاحبِ خون ہی کے جسم پر ہو اگر اس کے جسم سے جدا ہوگیا تو جب تک عرف عام میں اسے قلیل کہا جاتا ہو وہ معاف ہے ورنہ ناپاک ہوگا، البتہ کتا اور خنزیر کا خون ہر حال میں ناپاک ہے۔ الاقناع للشربینی ۱/۸۲. ۸۳

(۴) موسوعه فقهیه ۵/۲۷

ابوثعلبہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے: رسول اللہ ﷺ سے کفار ومشرکین اور اہل کتاب کے ان برتنوں کے استعمال کی بابت دریافت کیا گیا جن میں وہ لوگ خنزیر کا گوشت پکاتے ہیں اور شراب پیتے ہیں؟ آپ ﷺ نے فرمایا: اور اگر دوسرے برتن میسر ہوں تو انہی میں کھاؤ پیو، اگر تمہیں دوسرے برتن نہ ملیں تو پہلے ان برتنوں کو پانی سے دھو دیا کرو پھر اس میں کھاؤ پیو(۱) حضرت حسن بصریؒ سے منقول ہے کہ اگر گھڑے بھر پانی میں بھی شراب کا ایک قطرہ گر جائے تو پورے گھڑے کے پانی کو ضائع کر دو(۲) حضرت مجاہدؒ سے منقول ہے کہ اگر کپڑے میں شراب لگ جائے تو اسے دھوڈالو، کیوں کہ یہ تو خون سے زیادہ ناپاک ہے۔(۳)

نجاست غلیظہ کی معاف شدہ مقدار

نجاست غلیظہ بدن یا کپڑے پر لگ جائے اور درہم یعنی ہتھیلی کی چوڑائی سے کم ہو تو دھوئے بغیر نماز ہو جائے گی؛ اگرچہ اسے بھی دھو لینا اچھا ہے، کیوں کہ اتنی مقدار شریعت نے معاف قرار دی ہے ورنہ حرج لازم آئے گا۔(۴)

پتھر کے ذریعہ استنجاء کی حدیث میں ہے کہ پتھر سے مقام پاخانہ صاف کر دیا جائے تو نماز جائز ہو جائے گی(۵) حالانکہ پتھر کے ذریعہ صفائی سے نجاست مکمل صاف نہیں ہوگی صرف کمی ہوگی، اس کے باوجود نماز جائز کر دی گئی تو اس کا مطلب ہے کہ اتنی مقدار نجاست غلیظہ معاف ہے، پاخانہ کا مقام ایک درہم کی مقدار یا ہتھیلی کی گہرائی کے بقدر ہے، اس لئے

---

(۱) ابوداؤد باب الاکل فی آنیة اھل الکتاب : ۳۸۳۹، صحیح : ارواء الغلیل: ۱/ ۷۵

(۲) مصنف ابن ابی شیبہ باب القطرة من الخمر والدم تقع فی الماء : ۱۷۸۳ صحیح : رجال الشیخین شعیب الارنووط: مسند احمد : ۲۰۶۲۴

(۳) مصنف ابن ابی شیبہ باب فی القیٔ والخمر یصیب الثوب : ۲۰۴۰

(۴) اعلاء السنن : ۱/ ۴۰۵

(۵) ابوداؤد: تحقیق الالبانی : باب الاستنجاء بالحجارة : ۴۰ حسن

اتنی مقدار معاف رہے گی ، اس سے زیادہ لگی ہوئی ہو تو دھوئے بغیر نماز جائز نہیں ہوگی ، یہی امام شعبیؒ اور امام نخعیؒ کا بھی مسلک ہے ، امام نخعیؒ کہا کرتے تھے : مقاعد یعنی جائے پاخانہ کا تذکرہ حضرات علماء اچھا نہیں سمجھتے تھے اس لئے انہوں نے اس کے بجائے درہم کو معیار بنایا (۱) سنن ابوداؤد کی روایت ہے کہ آپ ﷺ صبح کی نماز پڑھا کر تشریف فرما ہوئے ، کسی نے آپ ﷺ سے کہا : یارسول اللہ ﷺ! آپ کے کپڑے پر کچھ خون لگا ہوا ہے ، اس پر آپ ﷺ نے کپڑے کی صفائی کا تو انتظام فرمایا ، لیکن نماز کا اعادہ نہیں کیا ، معلوم ہوا کہ خون اگر قلیل مقدار میں کپڑے کو لگا ہو تو نماز کا اعادہ نہیں کیا جائے گا (۲) حضرت ابوہریرہ ؓ سے مروی ہے ، آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا : ایک درہم کے بقدر خون لگا ہوا ہو تو نماز کا اعادہ کیا جائے گا ۔ (۳)

نجاست خفیفہ : ایسی چیز جس کی ناپاکی پر قطعی و حتمی دلیل موجود نہ ہو ؛ بلکہ اس کے پاک ہونے اور ناپاک ہونے میں دونوں قسم کے دلائل ہوں ۔

۱) ماکول اللحم (وہ جانور جن کا گوشت کھانا حلال ہے) جانوروں کا پیشاب نجاست خفیفہ ہے ، کیوں کہ اس کے پاک و ناپاک ہونے میں دونوں طرح کی روایات موجود ہیں : آپ ﷺ نے ایک خاص موقع پر اہل عرینہ کو اونٹ کا پیشاب پینے کا حکم فرمایا تھا ، (۴) اونٹ کا پیشاب اگر ناپاک ہوتا تو آپ ﷺ اس کے پینے کا حکم کیسے دیتے ؟ سنن دار قطنی کی روایت میں آپ ﷺ نے عمومی طور پر بلا کسی تفریق کے پیشاب سے بچنے کا حکم فرمایا اور نہ بچنے کو عذاب قبر کا سبب بتلایا (۵) پیشاب اگر پاک ہوتا تو آپ ﷺ اس سے بچنے کا حکم

---

(۱) کفایہ مع الفتح ۱/۱۷۷

(۲) بذل المجہود ۱/۲۲۴

(۳) دار قطنی باب قدر النجاسة التی تبطل الصلوة : ۱۵۱۱ ضعیف تاید بفتوی العلماء اعلاء : ۱/۴۰۴

(۴) ترمذی باب بول ما یوکل لحمہ : ۷۲. حسن صحیح امام ترمذیؒ

(۵) دار قطنی : باب نجاسة البول : ۴۷۵. صحیح امام دار قطنی

کیوں دیتے؟ ایسے ہی کسی جانور کا پیشاب اگر پاک ہوتا تو آپ ﷺ اس کا استثناء کئے بغیر عمومی طور پر پیشاب سے اجتناب کا حکم کیسے دیتے؟ (☆)

ظاہر ہے کہ پہلی حدیث ماکول اللحم جانور کے پیشاب کو پاک قرار دیتی ہے اور دوسری حدیث سے اس کا ناپاک ہونا معلوم ہوتا ہے اس وجہ سے احناف نے اسے نجاست خفیفہ قرار دیا ہے۔

۲) غیر ماکول اللحم پرندوں کی بیٹ بھی نجاست خفیفہ ہے، کیوں کہ پرندوں کی عادت فضاء ہی میں بیٹ کرنے کی ہوتی ہے، انسان جو زمین پر آباد ہیں، ان کے لئے ظاہر ہے کہ ایسی ناگہانی نجاست سے بچنے کے لئے ہمہ وقت، کوئی ڈھال موجود نہیں، اس لئے ان پرندوں کی بیٹ کو کم تر درجہ کی نجاست قرار دینا ضرورت کا تقاضہ ہے، اور یہ واقعہ ہے کہ جہاں نص اور صریح دلیل موجود نہیں ہوتی، وہاں ضرورت خود تخفیف کو ثابت کر دیتی ہے۔ (۱) (☆)

نجاست خفیفہ کی معاف شدہ مقدار

نجاست خفیفہ بدن یا کپڑے کے چوتھائی حصہ سے کم پر لگ جائے تو معاف ہے، چوتھائی حصہ کے برابر یا اس سے زیادہ ہو تو معاف نہیں، یعنی اسے دھوئے بغیر نماز درست نہ ہوگی، متعدد مواقع پر شریعت میں چوتھائی کو کل کے قائم مقام رکھا گیا ہے، جیسے سر کے مسح کے معاملے میں چوتھائی سر کا مسح مکمل سر کے مسح کی جانب سے کافی

(☆) امام مالکؒ واحمدؒ کے نزدیک حلال جانور کا بول و براز پاک ہے اور حرام جانوروں کا ناپاک اور امام شافعیؒ کے نزدیک حلال و حرام دونوں قسم کے جانوروں کا بول و براز ناپاک ہے۔ الفقه الاسلامی : ۱/۳۱۲، ۳۱۳

(۱) تبیین الحقائق : ۱/۷۵

(☆) امام مالکؒ واحمدؒ کے نزدیک تمام پرندوں کی بیٹ پاک ہے۔ الفقه الاسلامی: ۱/۳۱۲

سمجھا گیا ہے (۱) پس نجاست خفیفہ سے اگر چوتھائی بدن یا کپڑا آلودہ ہو گیا ہو تو وہ معاف نہیں، اسے بہر صورت زائل کرنا ضروری ہے (۲)(☆)

نجاست حقیقیہ (غلیظہ و خفیفہ) کے پاک کرنے کا طریقہ

نجاست حقیقہ کے پاک کرنے کے بنیادی طور پر دو طریقے ہیں:

الف: جو نجاست خشک ہونے کے بعد آنکھ سے نظر آئے، اس کے پاک کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ اتنی مرتبہ دھوئے کہ عین نجاست زائل ہو جائے، چاہے ایک مرتبہ میں زائل ہو جائے چاہے پانچ مرتبہ میں، چاہے پانی کے استعمال سے زائل ہو جائے یا پانی کے علاوہ کسی سیال مزیلِ نجاست شئی کے استعمال کرنے سے۔

ایک عورت نے آپ ﷺ سے اس کپڑے میں نماز پڑھنے کے تعلق سے دریافت کیا جو وہ حالت حیض میں پہنا کرتی تھی، آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ایسی عورت اپنے کپڑے کا جائزہ لے، اگر اس میں خون نظر آئے تو اسے کھرچ دے اور اسے دھوئے (یعنی عین نجاست کے زائل ہونے تک دھوئے) پھر وہ اس میں نماز پڑھ سکتی ہے (۳) مستحاضہ عورت کو بھی آپ ﷺ نے کسی معین عدد کی رہنمائی فرمائے بغیر محض خون کے دھونے اور صاف کرنے کا حکم فرمایا تھا، (۴) اس سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ نظر آنے والی نجاست میں مقصود عین نجاست کو دور کرنا ہے، حضرت عائشہؓ فرماتی

---

(۱) مسلم باب المسح علی الناصیة : ۲۷۴. نسائی : المسح علی العمامة مع الناصیة : ۱۰۷.
دار قطنی :باب جواز المسح علی العمامة مع الناصیة

(۲) الفتاوی الهندیة : ۱۶۱/۲

(☆) چوتھائی بدن یا کپڑے سے مراد عضو یا کپڑے کا وہ چوتھائی حصہ ہے جس پر نجاست لگی ہے مثلاً ہاتھ یا پاؤں پر نجاست خفیفہ لگی ہے تو چوتھائی تک معاف ہے اسی طرح کپڑے کے دامن یا آستین یا کلی پر لگی ہے تو دامن، آستین، کلی کے چوتھائی حصہ تک معاف ہے۔ الفتاوی الهندیة : ۱۶۱/۲

(۳) ابو داؤد مع تعلیق الالبانی باب المرأة تغسل ثوبها الذی تلبسه فی حیضها : ۳۶۵.۳۶۱ صحیح

(۴) مسلم باب المستحاضة : ۳۳۳

ہیں: ہمارے پاس ایک ہی کپڑا ہوا کرتا تھا، اس میں ہم حائضہ بھی ہوجایا کرتی تھیں، پس جب اس کو کچھ خون لگ جاتا تو ہم اس کو تھوک سے صاف کرلیتی تھیں اور ناخن سے رگڑ دیا کرتی تھیں۔(۱)

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ پانی کا استعمال ہی ازالہ نجاست کے لئے ضروری نہیں، بلکہ پانی کے علاوہ دیگر پاک کرنے والی چیزیں جیسے: سرکہ، عرق گلاب، تھوک، وغیرہ سے بھی صفائی ہوسکتی ہے۔

فائدہ: نجاست کو خوب دور کرنے کی کوشش کے باوجود نجاست کا دھبہ یا کچھ اثر رہ جائے تو کوئی حرج نہیں، حضرت خولہ بنت یسارؓ نے آپ ﷺ سے عرض کیا: یارسول اللہ ﷺ! حیض کے خون کا اثر کپڑے سے اس کو دھونے کے باوجود نہ جائے تو کیا کرنا ہوگا؟ آپ ﷺ نے فرمایا کہ: پانی سے دھولینا کافی ہے، اثر اور دھبہ کا باقی رہ جانا کچھ نقصاندہ نہیں۔(۲)

ب: جو ناپاکی خشک ہونے کے بعد نظر نہ آتی ہو، جیسے: پیشاب، شراب، اس کو اتنی مرتبہ دھوئے اور ہر مرتبہ نچوڑے کہ دھونے والے کو کپڑا پاک ہونے کا ظن غالب ہوجائے، رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: تم میں سے کوئی نیند سے بیدار ہو تو اپنے ہاتھ کو برتن میں نہ ڈالے؛ یہاں تک کہ اس کو تین مرتبہ دھوئے؛ اس لئے کہ وہ نہیں جانتا کہ اس کا ہاتھ رات میں جسم کے کس کس مقام پر پہونچا(۳) یہاں نجاست غیر مرئیہ ہے تو تین مرتبہ دھونے کے لئے کہا گیا، پس دیگر نظر نہ آنے والی نجاستوں کے سلسلہ میں بھی یہی حکم رہے گا۔

زمین کی صفائی کا طریقہ

زمین ناپاک ہوگئی ہو تو اس کو پاک کرنے کے کئی طریقے ہیں، یا تو ناپاک جگہ پر کثیر

---

(۱) بخاری باب هل تصلي المراة في ثوب حاضت فيه : ۳۰۶

(۲) ابو داؤد باب المرأة تغسل ثوبها الذى تلبسه في حيضها : ۳۶۵. ارواء الغليل ۱/ ۱۸۹

(۳) مسلم حديث نمبر باب كراهة غمس المتوضى يده : ۲۷۸

مقدار میں پانی بہادیا جائے یا اس ناپاک حصہٴ زمین کو کھود کر مٹی کہیں اور پھینک دی جائے یا سورج کی تپش یا ہوا کی وجہ سے وہ حصہ ازخود خشک ہو جائے۔

احادیث میں زمین کی پاکی کے یہ تینوں طریقے مذکور ہیں، ایک اعرابی نے مسجد میں پیشاب کردیا تو لوگ اس سے الجھنے لگے، آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا، اس کو چھوڑ دو اور اس کے پیشاب پر ایک بڑا ڈول پانی بہادو۔(۱)

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے: ایک اعرابی مسجد میں آیا اور مسجد میں پیشاب کردیا تو رسول اللہ ﷺ نے اس جگہ کے کھود دینے کا حکم دیا، پھر اس پر پانی ڈالدیا گیا۔(۲) حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے: میں زمانہ رسالت میں نوجوانی اور تجرد کے زمانے میں مسجد میں سویا کرتا تھا اور کتے مسجد کے اندر اِدھر اُدھر پیشاب کردیا کرتے تھے لیکن لوگ اس پر پانی نہیں ڈالا کرتے تھے(۳) زمین اگر خشک ہونے کے باوجود پاک تسلیم نہ کی جائے تو یہ کہنا پڑے گا کہ مسجد نبوی کو زمانہ رسالت میں یوں ہی ناپاکی کی حالت میں چھوڑ دیا جاتا تھا؛ حالاں کہ یہ مفروضہ کسی صورت میں درست نہیں ہوسکتا۔ حضرت ابو قلابہؒ فرماتے ہیں: جب زمین خشک ہوجائے تو وہ پاک ہوجاتی ہے۔(۴)(☆)

بے مسامات والی اشیاء کی پاکی کا طریقہ

وہ چیزیں جن میں مسامات نہیں ہوتے، یعنی جن میں نجاستوں کو اپنے اندر جذب

---

(۱) بخاری باب الرفق فی الامر کله : ۵٦٧٩

(۲) مسند ابی یعلی : ۳٦۲٦ . فبه سفیان بن مالک قال ابو زرعة لیس بالقوی وبقیة رجاله رجال الصحیح : مجمع الزوائد : ۱۵٧۹

(۳) ابوداؤد مع تعلیق الالبانی باب فی طهور الارض اذا یبست : ۳۸۲.صحیح

(۴) مصنف ابن ابی شیبه باب فی الرجل یتوضأ فیطأ علی العذرة : ٦۱۳ صحیح : سلسلة الاثار الصحة : ٦۴۸

(☆) دیگر ائمہ کے نزدیک صرف دھوپ اور ہوا لگنے سے زمین پاک نہیں ہوتی تحفۃ الاحوذی:۱/۱۲۹

کرنے کی صلاحیت نہیں ہوتی، جیسے: آئینہ، تلوار، اسٹیل، پلاسٹک، لوہے وغیرہ دھاتوں کے ساز وسامان، ان کو اگر نجاست لگ جائے تو دھونا ضروری نہیں ہے، پونچھ لینے سے بھی یہ اشیاء پاک ہو جائیں گی، حضرات صحابہ کرام اپنی تلواروں سے کفار کے ساتھ جہاد وقتال کیا کرتے تھے اور انہیں پونچھ لیا کرتے تھے پھر (دوران جنگ) انہی کو لگا کر نماز پڑھ لیا کرتے تھے۔(۱)

جوتے اور موزے وغیرہ کی صفائی کا طریقہ

جوتے اور موزے کو اگر نظر آنے والی نجاست لگ جائے اور وہ خشک ہو جائے تو زمین پر رگڑ لینے سے وہ پاک ہو جاتے ہیں، حضرت ابو ہریرہ ؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا: اگر تم میں سے کسی کے جوتے کو اور ایک روایت میں ہے کہ موزوں کو نجاست لگ جائے تو مٹی اسے پاک کرنے والی چیز ہے (۲)

حضرت ابن عباس ؓ سے دریافت کیا گیا: کوئی شخص نماز کے لئے نکلتا ہے اور راستہ میں (بے خیالی کے عالم میں) کسی گندگی کو روند دیتا ہے، (تو اسے کیا کرنا چاہئے؟) آپ ؓ نے فرمایا: اگر نجاست تر ہو تو وہ جس جگہ (موزہ یا جوتے پر) لگی ہے اسے دھولینا چاہئے اور اگر خشک ہو تو کچھ حرج نہیں (یعنی دھونے کی ضرورت نہیں، زمین نے خود اس کی صفائی کا کام کر دیا)۔(۳)(☆)

---

(۱) فتح القدیر ۱/۱۷۱

(۲) ابو دؤد مع تعلیق الالبانی باب فی الاذی یصیب النعل : ۳۸۵ صحیح

(۳) مصنف ابن ابی شیبہ :۲۱۳ تقدم تحقیقہ

(☆) امام مالکؒ کے نزدیک نظر آنے والی نجاست اگر خشک ہو تو رگڑ لینے سے جوتے یا موزے صفائی ہو جاتی ہے تر ہو تو دھونا ضروری ہے امام شافعیؒ کے نزدیک دونوں صورتوں میں دھونا ہی ضروری ہے امام احمدؒ کے نزدیک تھوڑی مقدار میں ہو تو رگڑ لینا کافی ہے ورنہ دھونا ضروری ہے البتہ موزے یا جوتے پر اگر نظر نہ آنے والی نجاست لگ گئی ہے تو بالاتفاق ائمہ اربعہ کے یہاں دھونا ہی ضروری ہے۔ الفقہ الاسلامی : ۱/۲۴۴، ۲۵۸، ۲۶۱، ۲۶۲

گھی یا تیل وغیرہ کی صفائی کا طریقہ

جمے ہوئے گھی یا تیل میں نجاست گر جائے تو اتنا حصہ پھینک دینا چاہئے جس کے متعلق خیال ہو کہ یہاں تک گندگی کا اثر پہنچا ہے، حضرت عبداللہ بن عباسؓ حضرت میمونہؓ رضی اللہ عنہا سے روایت کرتے ہیں کہ نبی ﷺ سے کسی نے دریافت کیا کہ اگر گھی میں چوہا گر جائے تو کیا کیا جائے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: اس کے اردگرد جو گھی ہوا سے پھینک دو اور بقیہ گھی کھاؤ(۱) اور اگر گھی یا تیل پگھلا ہوا ہو تو چوں کہ ان اشیاء کا چکناہٹ والا مزاج ہونے کی وجہ سے، نجاست کے اجزاء ان میں پورے طور پر رل مل نہیں ہوسکتے، اس لئے بدن کپڑے وغیرہ کی طرح ان کی صفائی بھی پانی کے ذریعہ بھی ممکن ہے، پانی کی مدد سے ان کی صفائی اس حد تک کی جائے کہ اجزاء نجاست کے دور ہو جانے کا گمان غالب پیدا ہو جائے، اس کا طریقہ یہ ہے کہ گھی یا تیل کو کسی برتن میں ڈال کر اسی کے برابر مقدار میں پانی ملایا جائے پھر کسی لکڑی وغیرہ سے دونوں کو خوب ہلایا جائے یہاں تک کہ یہ گمان غالب پیدا ہو جائے کہ پانی، گھی یا تیل کے تمام اجزا کے ساتھ خلط ملط ہو گیا ہے اس کے بعد کچھ دیر ٹھہر کر یا تو اوپر ہی اوپر پانی کی سطح سے تیل نکال لیا جائے یا برتن کے پیندے میں باریک سوراخ کر کے پانی کا اخراج کیا جائے پھر نیا پانی لے کر یہی عمل دو دفعہ مزید کر لیا جائے تو وہ گھی یا شہد پاک ہو جائے گا۔(۲)

وہ اشیاء جو ناپاک نہیں

(الف) حیوان کے تمام وہ اجزاء جن میں دوران خون نہیں ہوتا، جیسے: دانت، بال، ہڈی، کھر، سینگ، چونچ، پٹھا، وغیرہ یہ سب پاک ہیں، خواہ زندہ حیوان کے ہوں یا مردہ کے، خواہ ان کا گوشت کھایا جاتا ہو یا نہیں کھایا جاتا ہو (البتہ خنزیر بہر صورت ناپاک ہے)

---

(۱) بخاری باب ما یقع من النجاسات فی السمن ۲۳۳

(۲) رد المحتار : ۳/۲۸. مراقی الفلاح مع الطحطاوی : ۱/ ۱۸۶. الموسوعة الفقهیه : ۲۱/۳۳

حضرت ابن عباس ؓ سے مروی ہے: رسول اللہ ﷺ نے تو مردار کا گوشت حرام فرمایا ہے البتہ؛ کھال، بال، اون وغیرہ کے استعمال میں کوئی مضائقہ نہیں، (۱) سند کے ایک راوی عبدالجبار اگرچہ ضعیف اور متکلم فیہ راوی ہے تاہم ابن حبان نے انہیں ثقات میں سے ذکر کیا ہے (۲) حضرت حماد بن سلیمانؒ کہتے ہیں: مردار کے بالوں کے استعمال میں کوئی حرج نہیں (۳)

امام زہریؒ ہاتھی وغیرہ کی ہڈیوں کے بارے میں کہا کرتے تھے: میں نے علماء سلف کو ان سے کنگھی کرتے ہوئے اور ان کے بنے ہوئے ظروف سے تیل لگاتے ہوئے دیکھا ہے، وہ اس سلسلہ میں کچھ حرج محسوس نہیں کیا کرتے تھے (۴) ایک موقع پر رسول اللہ ﷺ نے حضرت ثوبان سے فرمایا تھا کہ اے ثوبان! فاطمہ کے لئے پٹھے کے ہار اور ہاتھی دانت کے دو کنگن خریدو۔ (۵)

(ب) مردار کی وہ کھال جسے دباغت دیدی گئی ہو، وہ بھی پاک ہوجاتی ہے، حضرت ابن عباس ؓ سے مروی ہے کہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: جب کھال کو دباغت دیدی جائے تو وہ پاک ہوجاتی ہے (۶) حضرت میمونہؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ کا گذر ایک مردہ بکری پر سے ہوا جسے لوگ کھینچ کر لے جارہے تھے، آپ ﷺ نے فرمایا تم اس کی کھال نکال لیتے تو اچھا ہوتا؟ لوگوں نے عرض کیا: یہ تو مردار ہے، اس پر آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا

---

(۱) دار قطنی :باب تطہیر الدباغ : ۱۲۱ حسن : فتح القدیر : فصل فی الغسل : ۹۷/۱

(۲) صحیح ابن حبان : ۱۱۸ حدیث نمبر ۳۹

(۳) بخاری تعلیقاً باب مایقع من النجاسات فی السمن والماء

(۴) بخاری تعلیقاً باب مایقع من النجاسات فی السمن والماء

(۵) ابوداؤد : باب الانتفاع بالعاج :۴۲۱۵. معتبر : نصب الرایة : ۱۱۹/۱

(۶) مسلم باب طہارة جلود المیتة :۸۳۸

پانی اور قرظ کی پتیوں سے اس کی صفائی اور طہارت ہو جاتی ہے(۱)(☆)

(ج) ایسے جانور جن میں بہتا خون نہیں ہوتا، وہ اگر کسی کھانے یا پانی میں گر کر مر جائیں تو وہ کھانا یا پانی ناپاک نہیں ہوتا، جیسے مچھر، مکھی، بھڑ، بچھو وغیرہ، اس لئے کہ ناپاک اور نجس تو بہتا خون ہے(۲) اور ان جانورں میں بہتا خون نہیں ہوتا ہے، رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے، اگر مکھی تم میں سے کسی کے برتن میں گر جائے تو پورے ہی کو ڈبو دو، پھر اس کو نکال کر پھینک دو، اس لئے کہ اس کے ایک پر میں شفاء ہے اور دوسرے میں بیماری(۳) نیز یہ بھی آپ ﷺ کا ارشاد ہے: اے سلمانؓ! ہر وہ کھانا اور پینا جس میں ایسا جانور گر جائے جس میں خون نہیں ہوتا اور وہ جانور اس میں مر جائے تو اس کا کھانا اور پینا اور اس سے وضو کرنا حلال ہے۔(۴)(☆)

(د) غسل جنابت کے دوران بدن سے کچھ پانی کے چھینٹے برتن میں گر جائیں تو برتن کا پانی ناپاک نہیں ہوتا، حضرت حسن بصریؒ وابن سیرینؒ سے اس شخص کے

---

(۱) ابوداؤد مع تعلیق الالبانی : باب فی اھب المیتة : ۴۱۲۶. صحیح

(☆) حنفیہ کے نزدیک خنزیر اور انسان کی کھال مستثنیٰ ہے کہ دباغت دینے کے باوجود ان کو استعمال میں لانا حرام اور ناجائز ہے امام شافعیؒ خنزیر کے ساتھ ساتھ کتے کا بھی استثناء کرتے ہیں جب کہ امام مالکؒ واحمدؒ کے نزدیک مردار کی کھال کی صفائی کی کوئی صورت نہیں ہے وہ دباغت کے بعد بھی علی حالہ ناپاک رہتی ہے۔الفقه الاسلامی : ۱/ ۲۵۱. ۲۵۳

(۲) الانعام : ۴۵

(۳) بخاری : باب اذا وقع الذباب : ۳۳۲۰

(۴) دارقطنی :باب کل طعام وقعت فیه دابةلیس لها دم :۸۷.حسن :فتح القدیر فصل فی الغسل : ۱/ ۸۳ .الجوهر النقی : ۱/ ۲۵۳

(☆) امام مالکؒ واحمدؒ کا بھی یہی مسلک ہے امام شافعیؒ کے نزدیک مردار مطلقاً ناپاک ہے خواہ اس میں بہتا خون موجود ہو یا نہ ہو تاہم حرج اور مشقت کا خیال رکھتے ہوئے شوافع نے بھی بہت ساری شکلوں میں جمہور سے موافقت کی ہے۔الفقه الاسلامی :۱/ ۳۰۷۔۳۳۶

بارے میں دریافت کیا گیا جو غسل کرتا ہے پھر دورانِ غسل استعمال شدہ پانی کی کچھ چھینٹیں برتن میں گر جاتی ہیں؟ تو حضرت حسن بصریؒ نے فرمایا: کون اس صورتحال سے مکمل احتیاط برت سکتا ہے؟ اور حضرت ابن سیرینؒ نے جواب دیا: ہم اللہ تعالیٰ سے اس کی رحمت کی توقع رکھتے ہیں جو اس سے کہیں زیادہ (یعنی ہماری اس بشری کوتاہی سے زیادہ) وسیع ہے(۱) امام بخاریؒ نے حضرت ابن عمرؓ وابن عباسؓ سے تعلیقاً روایت کیا ہے کہ: یہ دونوں حضرات غسل جنابت کرتے وقت جو چھینٹیں اِدھر اُدھر اڑ جایا کرتی تھیں، ان میں کوئی حرج نہیں سمجھتے تھے۔(۲)

---

(۱) مصنف ابن ابی شیبه باب فی الجنب یغتسل : ۷۹۶ صحیح او حسن : اعلاء السنن : ۱/۳۰۸

(۲) بخاری تعلیقاً . باب هل یدخل الجنب یده فی الاناء

استنجاء کا بیان

مذہب اسلام کی یہ خصوصیت ہے کہ اس میں زندگی کے ہر شعبہ سے متعلق رہنمائی موجود ہے، قضاء حاجت جو انسان کی ایک ناگزیر ضرورت ہے اور جس کا تذکرہ عام بول چال میں خلاف شان سمجھا جاتا ہے، اس کی بھی معمولی معمولی جزئیات کے بارے میں اسلامی ہدایات موجود ہیں۔

حضرت سلمان فارسی ﷛ سے بعض مشرکین نے مذاق کرتے ہوئے کہا: تمہارے نبی ﷺ نے تمہیں ہر چیز سکھادی ہے؛ حتی کہ پیشاب پاخانہ کرنا بھی! حضرت سلمان فارسیؓ نے بڑے پر اعتماد انداز میں جواب دیا: ہاں! ہمارے نبی ﷺ نے منع فرمایا کہ ہم پیشاب و پاخانہ کرتے وقت قبلہ کی طرف رخ یا پیٹھ کریں اور یہ کہ دائیں ہاتھ سے استنجاء کریں اور یہ کہ تم میں سے کوئی شخص تین سے کم پتھروں سے نجاست دور کرے اور یہ کہ لید یا ہڈی سے استنجاء کرے (۱) حضرت ابو ہریرہؓ سے مروی ہے، رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: بلاشبہ میں تمہارے لئے بمنزلہ باپ ہوں، تم کو (ہر چھوٹی بڑی چیز کی) تعلیم دیتا ہوں اتنی تمہید باندھ کر آپ ﷺ نے چند آداب استنجاء بیان فرمائے۔ (۲)

احادیث میں استنجاء سے متعلق تفصیلات بڑی وضاحت کے ساتھ آئی ہیں، استنجاء کا حکم کیا ہے؟ کن اشیاء سے استنجاء درست ہے کن سے مکروہ و ناجائز ہے صفائی کا طریقہ کار کیا ہے؟ بیت الخلاء میں داخل ہونے، نکلنے، اندرون بیت الخلاء کے آداب کیا ہیں؟ ذیل میں انہی تفصیلات کو بیان کیا جاتا ہے۔

---

(۱) مسلم باب الاستطابة : ۶۳۰

(۲) ابو داؤد تحقیق الالبانی : باب کراھیة استقبال القبلة : ۸۔حسن

استنجاء کا حکم

استنجاء کے معنی پیشاب پاخانہ کی جگہ سے یا تو نجاست کو مکمل طور پر دور کر دینا یہ صورت پانی یا پانی جیسی سیال چیز کے استعمال کرنے سے حاصل ہوتی ہے، یا نجاست کو بڑی حد تک گھٹانا اور کم کر دینا، یہ صورت پتھر وغیرہ سے استنجاء کرنے کے موقع پر پیش آتی ہے، رسول اللہ ﷺ سے پانی اور پتھر سے الگ الگ موقعوں پر استنجاء کرنا ثابت ہے (۱) البتہ نجاست اگر جائے پاخانہ سے بقدر درہم پھیلی نہیں ہے تو پتھر یا ڈھیلوں کا استعمال کافی ہے، پانی کا استعمال ضروری نہیں ہے، صرف مستحب اور بہتر ہے۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ جب سورۃ توبہ کی یہ آیت کہ: اس میں کچھ ایسے لوگ ہیں جو پاک ہونا پسند کرتے ہیں اور اللہ پاکی چاہنے والوں کو پسند کرتا ہے (۲) نازل ہوئی تو نبی ﷺ نے اہل قبا سے دریافت فرمایا: تمہارا کیا عمل ہے جس کی بناء پر تمہاری پاکیزگی کا تذکرہ قرآن میں آیا ہے؟ انہوں نے بتایا کہ ہر استنجاء میں پہلے پتھر استعمال کرتے ہیں اور اس کے بعد پانی (۳) اور اگر جائے پاخانہ سے نجاست بقدر درہم پھیل گئی ہے تو پانی کا استعمال کرنا ضروری ہے، پتھروں پر اکتفاء کرنا درست نہیں ہے۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ ارشاد فرماتے ہیں: تم سے پہلے جو لوگ گذرے ہیں یعنی حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم وہ (غذاؤں کی سادگی اور معیشت میں کفایت شعاری کی بناء پر) مینگنی جیسا پاخانہ کرتے تھے جس کی وجہ سے غلاظت اِدھر اُدھر پھیلا نہیں کرتی تھی اور تم لوگ ایسا پاخانہ کرتے ہو جو اِدھر اُدھر پھیل جاتا ہے، اس لئے تم لوگ (صرف پتھروں پر اکتفاء نہ کرو بلکہ) پتھر

---

(۱) بخاری: باب من حمل معه الماء لطهوره : ۱۵۱، ۱۵۲، بخاری : باب الاستنجاء بالحجارة : ۱۵۵

(۲) توبہ : ۱۰۸

(۳) کشف الاستار عن زوائد البزار : ۱/۱۰۵ . حسن : نصب الراية : ۱/۲۱۸

سے استنجاء کرنے کے بعد پانی کا بھی استعمال کرو(۱)

پیشاب سے فراغت کے بعد ڈھیلے یا پانی کا استعمال ضروری نہیں ہے بلکہ عضو مخصوص سے قطرات کو اچھی طرح نکال لینا کافی ہے، رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: جب تم میں سے کوئی پیشاب کرے تو اپنے عضو مخصوص کو تین دفعہ جھاڑ لے؛ کیوں کہ یہ اس کے لئے کافی ہے،(۲) ہاں! ڈھیلے یا پانی کا استعمال کرنا بہتر ہے، حضرت عمرؓ سے پیشاب سے فراغت کے بعد صرف پتھر سے استنجاء کرنا (۳) ایسے ہی پانی سے استنجاء کرنا (۴) دونوں ثابت ہے۔ حضرت ابن عمرؓ کے بارے میں منقول ہے کہ وہ پیشاب کے اثر کو دھویا کرتے تھے (۵) اور ڈھیلے اور پانی دونوں کو جمع کر لینا سب سے بہتر طریقہ ہے، اہل قباء کا یہی معمول تھا جن کی بناء پر قرآن پاک میں ان کی طہارت و پاکیزگی کی تعریف بیان ہوئی ہے۔(۶)

استنجاء کے آداب

رفع حاجت کے مندرجہ ذیل آداب حدیث سے ثابت ہیں:

۱) رفع حاجت کے لئے ایسی جگہ تلاش کرنی چاہئے جہاں انسان کی نظر نہ پڑے، گھر میں بیت الخلاء، پردہ دار ہونا چاہئے اور کھلے میدان میں ہو تو اسے چاہئے کہ دور

---

(۱) السنن الکبری للبیهقی باب فی الجمع فی الاستنجاء ۵۲۹، مصنف ابن ابی شیبه باب من کان یقول اذا خرج من الغائط فلیستنج بالماء ۱۶۳۵ . حسن : الدرایة ۷۹/۱

(۲) مسند احمد تحقیق شعیب ارنووط : ۱۹۰۵۴ . وفیه عیسی بن یزداد تکلم فیه انه مجهول وذکره ابن حبان فی الثقات : مجمع الزوائد : باب الاستنزاه من البول : ۱۰۲۴

(۳) السنن الکبری للبیهقی : باب ما ورد فی الاستنجاء بالتراب : ۵۵۲ . صحیح : امام بیهقی ۔

(۴) موطامالک باب الحمل فی الوضوء : ۳۷، موطا محمدباب الوضوء فی الاستنجاء : ۱۰

(۵) مصنف ابن ابی شیبه باب من کا ن یحب ان یغسل ذکره : ۵۹۸

(۶) کشف الاستار عن زوائد البزار : ۱۰۵/۱ . سند ضعیف سبل السلام : باب اداب قضاء الحاجة: ۸۳:۱

نکل جائے، حضرت جابر رضی اللہ عنہ بن عبداللہ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ رفع حاجت کے لئے دور تشریف لے جاتے، یہاں تک کہ کوئی شخص آپ ﷺ کو دیکھ نہیں پاتا۔(۱)

۲) رفع حاجت کے وقت اپنے پاس کوئی ایسی چیز نہیں رکھنی چاہئے جس پر اللہ تعالیٰ کا نام لکھا ہو، حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ کے ہاتھ میں ایک انگوٹھی ہوا کرتی تھی، جس پر محمد رسول اللہ، کندہ تھا(۲) جب آپ ﷺ بیت الخلاء جاتے تو اسے اتار دیتے۔(۳)

۳) رفع حاجت کے لئے بیت الخلاء میں داخل ہوتے وقت پہلے بایاں پاؤں رکھنا چاہئے اور پھر دایاں، اس کے بعد یہ دعا پڑھنی چاہئے "اَللّٰھُمَّ اِنِّی اَعُوْذُ بِکَ مِنَ الْخُبُثِ وَالْخَبَائِثِ "(۴) ترجمہ: اے اللہ میں نر اور مادہ ناپاک روحوں سے تیری پناہ مانگتا ہوں۔

۴) قضاء حاجت کے وقت رومال یا چادر وغیرہ سے سر ڈھنکا ہوا ہو تو اچھا ہے، رسول اللہ ﷺ: جب بیت الخلاء میں داخل ہوتے تو جوتے پہن لیتے اور سر ڈھانک لیتے،(۵) یہی حضرت ابوبکرؓ کا بھی معمول تھا(۶)

۵) بیت الخلاء میں نہ تو اللہ تعالیٰ کا ذکر کرنا چاہئے اور نہ کسی اور قسم کی بات چیت کرنی چاہئے، کوئی سلام کہے تو اس کا جواب بھی نہیں دینا چاہئے، حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ

---

(۱) ابو داؤد مع تعليق الالباني : باب التخلي عند قضاء الحاجة : ٢. صحيح

(٢) مسلم باب في طرح خاتم الذهب : ٥٥٩٨

(٣) ابوداؤدباب الخاتم تكون فيه ذكر الله : ١٩ ،ترمذى باب ماجاء في لبس الخاتم : ١٧٤٦. صحيح : خلاصة البدر المنير : ١٣١

(٤) بخارى باب ما يقول عند الخلاء : ١٤٢

(٥) السنن الكبرى للبيهقى باب تغطية الرأس عند دخول الخلاء : ٤٦٥ حسن لغيره : اعلاء السنن ١/٤٥٠

(٦) مصنف ابن ابى شيبه باب من كره ان ترى عورته : ١١٣٣)

سے روایت ہے کہ انہوں نے نبی ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا: دو آدمیوں کو رفع حاجت کے لئے اس طرح نہ نکلنا چاہئے کہ جب وہ اپنی شرمگاہیں کھولیں تو آپس میں بات چیت کریں، اس لئے کہ یہ چیز اللہ تعالی کو ناپسند ہے (۱) حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ پیشاب فرمارہے تھے، ایک صاحب آپ ﷺ کے پاس سے گذرے اور آپ ﷺ کو سلام کیا؛ لیکن آپ ﷺ نے اس کے سلام کا جواب نہیں دیا۔ (۲) بلکہ ایک روایت میں ہے کہ آپ ﷺ نے ایک آدمی کو اس حالت میں سلام کرنے سے منع فرمایا اور صاف کہد یا کہ ایسی حالت میں سلام کا جواب نہیں دوں گا، (۳)

۶) رفع حاجت کے وقت انسان کو نہ قبلہ کی طرف رخ کرنا چاہئے اور نہ پیٹھ (خواہ کھلے میدان میں ہو یا گھر کے بیت الخلاء میں) حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا: تم میں سے جب کوئی شخص رفع حاجت کے لئے بیٹھے تو وہ نہ قبلہ کی طرف رخ کرے اور نہ پیٹھ (کھلے میدان یا بیت الخلاء کی کوئی تخصیص نہیں ہے)۔ (۴)(☆)

۷) رفع حاجت کے لئے نرم اور پست زمین تلاش کرنی چاہئے؛ تا کہ پیشاب کی چھینٹیں کپڑوں پر نہ پڑسکیں، حضرت ابوموسی اشعری رضی اللہ عنہ سے راویت ہے کہ نبی ﷺ ایک دیوار کے قریب آئے اور نرم جگہ دیکھ کر پیشاب کیا، بعد میں فرمایا: جب تم میں سے کوئی شخص پیشاب کرے تو نرم زمین تلاش کرے۔ (۵)

---

(۱) المستدرک مع تعلیقات الذهبی کتاب الطهارة : ٥٦٠. صحیح

(۲) ابوداؤد تحقیق الالبانی : باب ایرد السلام وهو یبول : ١٦ . حسن

(۳) ابن ماجه تحقیق الالبانی باب الرجل مسلم وهو یبول ٣٥٢: صحیح

(۴) مسلم باب الاستطابة : ٦٣٣

(☆) مالکیہ وشافعیہ اور حنابلہ کے نزدیک یہ ممانعت کھلے میدان میں ہے آبادی اور گھروں کے بیت الخلاء میں قبلہ کی طرف رخ یا پشت منع نہیں بلکہ جائز ہے۔ الفقه الاسلامی : ١/٣٥٧

(۵) ابوداؤد باب الرجل یتبوأ لبوله : ٣ . حسن : اعلاء : ١/٣٤٦

۸) کسی سوراخ میں پیشاب نہ کرنا چاہیے، حضرت عبداللہ بن سرجسؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے منع فرمایا ہے کہ کسی جانور کے بل میں پیشاب کیا جائے (۱)

۹) ایسی جگہ رفع حاجت نہ کرنی چاہئے جہاں لوگ بیٹھتے یا گذرتے ہوں، حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا دولعنت کرنے والی چیزوں سے بچو صحابہؓ نے عرض کیا یا: رسول اللہ! دولعنت کرنے والی چیزیں کونسی ہیں؟ فرمایا: جو لوگوں کے بیٹھنے یا گذرنے کی جگہ میں رفع حاجت کرتا ہے۔

یعنی دوایسے اشخاص (میں سے ہونے) سے بچو جو (اپنی قبیح حرکت کے ذریعہ) لوگوں کی زبانوں سے اپنے لئے لعنت کے کلمات نکلواتے ہیں، ایک تو وہ جولوگوں کے بیٹھنے کی جگہ میں اور دوسرا وہ جولوگوں کے گذرنے کی جگہ میں رفع حاجت کرتا ہے۔(۲)

۱۰) غسل خانہ میں پیشاب نہ کرنا چاہئے، حضرت عبداللہ بن مغفلؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا: تم میں سے کوئی شخص غسل خانہ میں پیشاب نہ کرے پھر وہ اس میں غسل بھی کرے گا، کیوں کہ اس طرح کی حرکت سے وسوسہ کی بیماری پیدا ہوجاتی ہے(۳) البتہ غسل خانہ میں پانی وغیرہ کے نکلنے کا راستہ بنا ہوا ہو اور پیشاب کے چھینٹوں سے حفاظت رہتی ہو تو ممنوع نہیں؛ تاہم اس سے بھی احتیاط کرنا اچھا ہے۔(۴)

۱۱) بہتے یا ٹھہرے ہوئے پانی میں پیشاب نہیں کرنا چاہئے، رسول اللہ ﷺ نے مذکورہ دونوں طرح کے پانی میں پیشاب کرنے سے منع فرمایا ہے۔(۵)

---

(۱) ابو داؤد تحقیق الالبانی : باب النهی عن البول فی الجحر : ۲۹ . صحیح
(۲) مسلم باب النهی عن التخلی فی الطرق : ۶۴۱
(۳) ابو داؤد تحقیق الالبانی باب فی البول فی المستحم ۲۷ . صحیح
(۴) ابن ماجه باب كراهية البول فی المغتسل : ۳۰۴ .تحفة الاحوذی: ۱/ ۸۲
(۵) مسلم باب النهی عن البول فی الماء الراكد : ۶۸۱ . المعجم الاوسط : من اسمه یعقوب : ۹۴۷۱ رجاله ثقات : مجمع الزوائد : باب ماںهی عن التخلی فیه : ۹۹۸

۱۲) کھڑے ہوکر پیشاب نہیں کرنا چاہئے، کیوں کہ اس سے بدن پر چھینٹوں کے پڑنے کا اندیشہ ہے؛ لیکن جہاں مجبوری ہو اور چھینٹوں کے پڑنے کا اندیشہ نہ ہو، وہاں کھڑے ہوکر پیشاب کرنا جائز ہے۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ جو شخص تمہیں یہ بتاتا ہو کہ نبی ﷺ نے کھڑے ہوکر پیشاب کیا ہے تو اس کی بات نہ مانو، آپ ﷺ صرف بیٹھ کر پیشاب کیا کرتے تھے، (۱) لیکن یہ بات حضرت عائشہؓ نے آپ ﷺ کی عمومی عادت کے پیش نظر یا اپنے علم ومشاہدے کی بناء پر بیان فرمائی ہے، حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ گندگی کے ایک ڈھیر کے پاس گئے اور کھڑے ہوکر پیشاب کیا۔(۲)

۱۳) استنجاء کے لئے دایاں ہاتھ استعمال نہ کرنا چاہئے، رسول اللہ ﷺ نے دائیں ہاتھ سے استنجاء کرنے سے منع فرمایا۔(۳)

۱۴) استنجاء کے بعد اپنا ہاتھ زمین پر ملنا چاہئے یا صابن وغیرہ سے دھونا چاہئے، تاکہ اس کی بدبو دور ہوجائے، حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ جب نبی ﷺ بیت الخلاء جاتے تو میں ایک پیتل کے برتن میں آپ ﷺ کے پاس پانی لاتا، آپ ﷺ استنجاء فرماتے اور پھر زمین پر ہاتھ ملتے۔(۴)

۱۵) استنجاء اگر پتھر سے کیا جارہا ہے تو طاق عدد (تین، پانچ) استعمال کرنا چاہئے تاہم اگر تین سے کم پتھر استعمال کئے جاتے ہیں اور صفائی بھی ہوجاتی ہے تو تین کے عدد کی تکمیل ضروری نہیں، اس لئے کہ اصل مقصود جائے پاخانہ کی صفائی ہے، یہ الگ بات ہے

---

(۱) ترمذی مع تعلیق الالبانی باب النهی عن البول قائما : ۱۲ .صحیح

(۲) ترمذی مع تعلیق الالبانی باب الرخصة فی ذلک : ۱۳ :صحیح

(۳) مسلم باب الاستطابة : ۶۲۹

(۴) ابوداؤد مع تعلیق الالبانی : باب الرجل یدلک یده : ۴۵. حسن

کہ عموماً صفائی کے لئے تین عدد پتھر استعمال کرنے پڑتے ہیں، بعض احادیث میں اس عام صورتحال کے پیش نظر تین سے کم پتھر استعمال کرنے کی ممانعت وارد ہوئی ہے، رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے، تم میں سے کوئی آدمی پاخانہ جائے تو اپنے ساتھ تین پتھر لے جائے اور ان سے پاکی حاصل کرے، اس لئے کہ یہ تین پتھر پاکی حاصل کرنے کے لئے کافی ہے۔(۱) اس سے معلوم ہوا کہ تین پتھروں سے استنجاء کرنے کا حکم ان کے کافی ہونے کے پیش نظر ہے، ان کے مقصود ہونے کی بناء پر نہیں، ایسے ہی آپ ﷺ کا ارشاد ہے، جو شخص پتھر استعمال کرے اسے چاہئے کہ طاق پتھر استعمال کرے، جو شخص ایسا کرے بہتر ہے اور جو نہ کرے تو کوئی حرج نہیں۔(۲)

۱۶) بیت الخلاء سے نکلتے وقت دایاں پاؤں پہلے رکھنا چاہئے اور بایاں بعد میں، اس کے بعد یہ دعا پڑھنی چاہئے:" غُفْرَانَکَ " اے اللہ میں تیری بخشش چاہتا ہوں(۳) ایک دوسری حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ بیت الخلاء سے نکلنے کے بعد نبی ﷺ یہ دعا بھی پڑھا کرتے تھے:"اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ اَذْهَبَ عَنِّی الاَذٰی وَعَافَانِیْ " (۴)

ترجمہ: تعریف اس اللہ کے لئے جس نے مجھ سے گندگی دور کی اور اس نے عافیت بخشی۔

نجاست حکمیہ

نجاست کی دوسری قسم نجاست حکمیہ ہے، نجاست حکمیہ وہ نجاست کہلاتی ہے جس کی بناء پر شریعت انسان کو عبادات بالخصوص نماز کے انجام دینے کے معاملہ میں ناپاک قرار دیتی ہو،

---

(۱) ابوداؤد مع تعلیق الالبانی باب الاستنجاء بالحجارة : ۴۰. حسن

(۲) ابو داؤد : باب الاستتار فی الخلاء : ۳۵. وسکت عنه

(۳) ابوداؤد مع تعلیق الالبانی باب ما یقول الرجل اذا خرج من الخلاء : ۳۰. صحیح

(۴) ابن ماجه باب مایقول اذا خرج من الخلاء: ۳۰۱. حسن : مرقاة المفاتیح : ۷۹/۲

اگرچہ ظاہری اعتبار سے دیگر چیزوں کے حق میں اس کا بدن بالکل پاک ہوتا ہے، ایسی حالت کو حالت حدث بھی کہا جاتا ہے۔

حدث کی دو قسمیں ہیں:

۱) حدث اصغر چھوٹی ناپاکی یعنی بے وضو ہونا۔

۲) حدث اکبر بڑی ناپاکی یعنی حالت جنابت یا حیض و نفاس کی حالت میں ہونا۔

پانی کے استعمال پر قدرت ہونے کے صورت میں حدث اصغر کا ازالہ وضو اور حدث اکبر کا ازالہ غسل کے ذریعہ ہوتا ہے اور پانی کے استعمال پر قدرت نہ ہونے کی صورت میں ان دونوں ناپاکیوں کا ازالہ تیمّم کے ذریعہ ہوتا ہے۔ ذیل میں بالترتیب وضو، غسل اور تیمّم کے مسائل لکھے جاتے ہیں۔

وضو کا بیان

وضو کی فرضیت کتاب وسنت دونوں سے ثابت ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے اے ایمان والو! جب تم نماز کے لئے اٹھو تو چاہئے کہ اپنے منہ اور ہاتھ کہنیوں تک دھولو، سر پر مسح کرلو اور پاؤں ٹخنوں تک دھولو(۱)

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا: جب تم میں سے کسی کا وضوٹوٹ جائے (یا وضو نہ ہو) تو اللہ تعالیٰ اس کی نماز قبول نہیں کرتا؛ تاوقتیکہ وہ وضو نہ کرے۔(۲)

فرائض وضو

وضو کے فرائض چار ہیں، جن کا تذکرہ اوپر ذکر کردہ سورۃ مائدہ کی آیت:۶ میں موجود ہے۔

۱)چہرہ کا دھونا:

چہرہ کی حد لمبائی میں سر کے بالوں کے اگنے کی طبعی جگہ سے تھوڑی کے نیچے تک ہے (تھوڑی بھی چہرہ میں داخل ہے) اور چوڑائی میں ایک کان کی لو سے دوسرے کان کی لو تک ہے (کان چہرہ میں داخل نہیں ہے) ارشاد نبوی ہے: دونوں کان سر کا حصہ ہیں۔(۳)

دلیل: قرآن پاک میں ''وجوہ'' کے دھونے کا حکم ہے اور وجہ کا مصداق لغت میں چہرہ کے انہی حدود اربعہ پر ہوتا ہے، اہل لغت کے مطابق وجہ، چہرہ کا وہ حصہ کہلاتا ہے جس سے مواجہہ اور آمنا سامنا ہوتا ہے، اور آمنا سامنا چہرے کے انہی بیان کردہ حصوں سے ہوتا ہے

(۱) سورۃ مائدہ : ۶

(۲) مسلم باب وجوب الطهارة للصلوة : ۵۵۹

(۳) مصنف ابن ابی شیبه تحقیق محمد عوامه : باب الاذنان من الرأس : ۱۵۶ معتبرة یویده الاثار الکثیرة

بقیہ چہرے کے حصے مستور رہتے ہیں، رہے بدن کے وہ حصے جو آمنا سامنا ہونے کے موقع پر نمایاں رہتے ہیں، انہیں لغت میں وجہ (چہرہ) نہیں کہا جاتا ہے۔(۱)

۲) دونوں ہاتھ کہنیوں سمیت دھونا

ارشاد ربانی ہے: اور اپنے ہاتھوں کو کہنیوں تک دھوؤ(۲) تفسیر معالم التنزیل میں لکھا ہے کہ: یہاں "الی" بمعنی "مع" (ساتھ) ہے یعنی ہاتھوں کو کہنیوں کے ساتھ دھوؤ جیسے: سورۃ نساء کی آیت نمبر ۲ "اور تم ان کے (یتیموں کے) مال مت کھاؤ اپنے مالوں کے ساتھ" میں "الی" بمعنی "مع" ہے(۳)

حضرت جابر بن عبد اللہ ﷺ سے راویت ہے کہ رسول اللہ ﷺ جب وضو فرماتے تو اپنے کہنیوں پر بھی پانی بہاتے (۴) معروف نحوی قاعدہ ہے کہ اگر کوئی چیز اور اس کی حد وانتہاء دونوں کی جنس ایک ہو تو وہ حد شئ کے تحت داخل ہو جاتی ہے، یہاں یہی کیفیت ہے کہ کہنیاں ہاتھ کی جنس ہیں پس ہاتھوں کے دھونے کے حکم میں کہنیاں بھی داخل رہیں گی، نیز عبادات کے مسائل احتیاط کا تقاضا کرتے ہیں اور احتیاط اسی میں ہے کہ کہنیوں کا دھونا بھی ضروری ہو؛ تاکہ حکم خداوندی کی تعمیل سے مکلّف، یقینی طور پر عہدہ برآ ہوسکے۔

۳) چوتھائی سر کا مسح کرنا

ارشاد ربانی ہے: اور تم اپنے سروں پر مسح کرو۔(۵) لغت عربی کے لحاظ سے حرف

---

(۱) تاج العروس : ۱/۸۲۵۰

(۲) سورۃ مائدہ : ٦

(۳) ۳/ ۲۱

(۴) السنن الکبری للبیهقی باب ادخال المرفقين في الوضوء : ۲۵۹ . دار قطنی باب وضوء رسول الله : ۲۸۰ . صحیح : السلسلة الصحیحة : ۲۰٦۷

(۵) مائدہ : ٦

باءجس چیز پر بھی داخل ہوتا ہے، اس کو مکمل دائرہ فعل میں لانا ضروری نہیں ہوتا؛ بلکہ محض فعل کو اس شئ پر واقع کر دینا کافی ہوتا ہے، قرآن پاک میں مسح رأس کے بارے میں یہ الفاظ آئے ہیں: "وامسحوا برؤوسکم" یعنی اپنے ہاتھوں سے اپنے سروں کا مسح کرو یہاں "باء"، "رؤوس" پر داخل ہے، پس مکمل سر کو مسح کے دائرہ میں لانا ضروری نہیں بلکہ ہاتھوں کے ذریعہ فعل مسح کو سر پر واقع کر دینا کافی ہے، ظاہر ہے اس طریقہ پر مکمل سر کا مسح وجود میں نہیں آتا بلکہ چوتھائی سر کا مسح وجود میں آتا ہے اور یہی فرض ہے (۱) حضرت مغیرہؓ کی یہ روایت متعدد طرق سے مروی ہے کہ آپ ﷺ نے ایک موقع پر سر کا مسح مقدار ناصیہ (تقریباً چوتھائی سر) کے بقدر فرمایا تھا۔(۲)

سنن ابوداؤد میں حضرت انس ؓ سے مروی ہے کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو وضو فرماتے دیکھا، آپ ﷺ کے سر اقدس پر قطری عمامہ تھا...... دوران وضو آپ ﷺ نے اپنے ہاتھوں کو عمامہ کے نیچے داخل فرمایا، پھر اپنے سر کے اگلے حصہ کا مسح فرمایا اور عمامہ نہیں کھولا (۳) حضرت ابن عمر ؓ کے بارے میں منقول ہے کہ وہ سر کا مسح کرتے وقت اپنی ٹوپی کو کچھ اٹھاتے اور سر کے اگلے حصہ پر مسح کرتے تھے۔(۴)(☆)

---

(۱) السعایہ : ۱/۸۱. اعلاء السنن : ۱/۴۲

(۲) مسلم باب المسح علی الناصیة والعمامة : ۶۵۲. نسائی تحقیق الالبانی باب صفة الوضوء : ۸۲. صحیح

(۳) ابوداؤد:باب المسح علی العمامة :۱۴۷ . سکت عنه ابو داؤد والمنذری والحاکم . نصب الرایة : ۱/۳۸

(۴) مصنف ابن ابی شیبه باب فی مسح الرأس کیف هو :۱۵۴ دار قطنی : باب الاذنان من الرأس :۳۸۵

(☆) مالکیہ وحنابلہ کے نزدیک مکمل سر کا مسح فرض ہے شافعیہ کے نزدیک سر کے کسی بھی حصہ پر مسح کر لینے سے فرضیت ادا ہوجاتی ہے، خواہ وہ سر کا ایک بال ہی کیوں نہ ہو۔ الفقہ الاسلامی وادلتہ:۱/۳۷۲-۳۷۴

۴) پیروں کو ٹخنوں سمیت دھونا

ارشاد ربانی ہے: اور تم اپنے پیروں کو ٹخنوں تک دھوؤ(۱) انہی دلائل کی بنا پر ٹخنے بھی پیروں کے حکم میں داخل ہیں جن کی بناء پر کہنیاں ہاتھ دھونے کے تحت داخل ہیں، حضرت ابو ہریرہ ؓ نے ایک دفعہ عملاً وضو کر کے لوگوں کو دکھلایا، جس میں آپؓ نے دونوں پیروں کو پنڈلی تک دھویا پھر اخیر میں فرمایا، میں نے رسول اللہ ﷺ کو اسی طریقہ سے وضو کرتے دیکھا ہے(۲)

ایک روایت میں خود ابو ہریرہؓ کا عمل یہ نقل کیا گیا کہ وہ قریب نصف پنڈلی تک پاؤں دھویا کرتے تھے(۳) پیروں کو دھونے کے بجائے کوئی مسح پر اکتفاء کرے تو وضو درست نہ ہوگا اور نماز نہ ہوگی، بیشتر صحابہ نے رسول اللہ ﷺ کا طریقہ وضو نقل کیا ہے، جس میں پیروں کا فریضہ غسل یعنی دھونا نقل کیا گیا ہے، صحابہ کا عمل بھی پیروں کو دھونے ہی کا تھا، مسلم شریف کی روایت ہے: رسول اللہ ﷺ نے ایک شخص کو دیکھا جس نے ابھی ابھی وضو کیا تھا؛ مگر اس کے قدم کی پشت پر ناخن برابر جگہ خشک تھی، آپ ﷺ نے اس شخص سے فرمایا: جاؤ اچھا وضو کر آؤ، وہ گیا اور اچھی طرح وضو کیا، پھر آ کر نماز پڑھی(۴)

طحاوی میں ہے: صحابہ کرام کا بیان ہے کہ ہم ایک سفر میں تھے، عصر کی نماز کا وقت آیا تو ہم نے وضو کیا اور اپنے پیروں پر مسح کرنے لگے تو آپ ﷺ نے دو یا تین بار بآواز بلند فرمایا، ایڑیوں کے لئے بربادی ہے آگ سے(۵) اگر پیروں کا فریضہ مسح ہوتا تو آپ ﷺ اس

---

(۱) مائدہ : ۶

(۲) مسلم باب استحباب اطاعة الغرة : ۶۰۲

(۳) طحاوی باب فرض الرجلین فی وضوء الصلاة : ۲۱۶

(۴) مسلم باب وجوب استیعاب جمیع اجزاء محل الطھارة : ۵۹۹

(۵) بخاری باب غسل الرجلین : ۱۶۳

پر اس قدر شدید وعید بیان نہ فرماتے ۔ حضرت حکمؒ کہتے ہیں: دونوں قدم کا دھونا رسول اللہ ﷺ اور تمام مسلمانوں کا طریقہ رہا ہے۔(۱)

عمامہ پر مسح کا حکم

سر پر مسح کرنے کے بجائے صرف عمامے کے مسح پر اکتفاء کرنا درست نہیں؛ کیوں کہ سر کا مسح کرنا قرآن کریم کا قطعی اور یقینی حکم ہے، جسے اسی جیسی قوی دلیل کے بغیر نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ احادیث میں عمامہ پر مسح کا تذکرہ ہے، لیکن صحیح احادیث میں صراحت ہے کہ تنہاء عمامہ کے مسح پر اکتفاء نہیں کیا جاتا تھا بلکہ عمامہ کے ساتھ سر کے اگلے حصہ پر بھی مسح کرلیا جاتا تھا، لہٰذا جہاں صرف عمامہ پر مسح کا تذکرہ ہے وہ دراصل، راویوں کا اختصار ہے، پوری بات نہیں۔

چنانچہ مسلم شریف میں ہے: آپ ﷺ نے ایک موقع پر اپنے سر کے اگلے حصہ پر اور اپنے عمامہ پر مسح فرمایا تھا،(۲) حضرت سلمان رضی اللہ عنہ کے بارے میں منقول ہے کہ ایک دفعہ آپ رضی اللہ عنہ نے ایک شخص کو یہ حکم دیا کہ وہ عمامے کے ساتھ سر پر بھی مسح کرے۔(۳)

امام محمدؒ کا کہنا ہے کہ شروع زمانہ میں عمامہ پر مسح کا جواز تھا جو بعد ازاں منسوخ ہوگیا۔(۴)(☆)

---

(۱) مصنف ابن ابی شیبہ باب من کان یقول : اغسل قدمیہ: ۱۹۱

(۲) مسلم باب المسح علی الناصیۃ والعمامۃ : ۶۵۷

(۳) مصنف ابن ابی شیبہ باب من کان یری المسح علی العمامۃ : ۲۲۹ .صحیح : محمد عوامہ

(۴) مؤطا محمد باب المسح علی لعمامۃ :۵۳

☆ امام شافعیؒ بھی تنہا عمامہ پر مسح کو کافی نہیں سمجھتے امام احمدؒ چند شرائط کے ساتھ مرد کے لئے عمامہ پر مسح کو جائز قرار دیتے ہیں امام مالکؒ فرماتے ہیں کہ اگر عمامہ کے کھولنے میں سخت دشواری کا سامنا کرنا پڑتا ہو اور عمامہ کے نیچے ٹوپی پر اور سر پر مسح کرنا ممکن نہ ہو تو عمامہ پر مسح کرلینا کافی ہے۔ الفقہ الاسلامی : ۴۹۵/۱، ۴۹۷

وضو میں ڈاڑھی کا حکم

اہل لغت کے حوالے سے یہ بات بیان کی جا چکی ہے کہ آیت وضو میں مذکور لفظ وجہ سے مراد چہرہ ہے؛ کیونکہ اسی سے آمنا سامنا ہوتا ہے، اور جو ایک دوسرے کے مدمقابل ہونے کے موقع پر ظاہر و عیاں رہتا ہے، داڑھی ہلکی ہو تو آمنا سامنا ہونے کے موقع پر اندر کی کھال عیاں و نمایاں رہتی ہے اور داڑھی گھنی ہو تو اندر کی کھال بالکل نظر نہیں آتی؛ بلکہ کھال کے بجائے اس حصہ پر اگے بال عیاں رہتے ہیں، پس داڑھی ہلکی ہو تو وضو میں اندرونی کھال تک پانی پہنچانا ضروی ہے اور گھنی ہو تو صرف چہرہ کے دائرہ میں داڑھی کے جو بال موجود ہیں، بس ان ہی کو دھولینا کافی ہے۔(۱)

وضو کے سنن و مستحبات

وضو کے فرائض تو وہی چار چیزیں ہیں جن کا ذکر آیت مائدہ میں موجود ہے، باقی افعالِ وضو کا درجہ فرض کا نہیں ہے باقی افعال وضو کے فرض نہ ہونے کی ایک دلیل تو یہی ہے کہ آیت وضو میں ان کا تذکرہ نہیں ہے، دوسری دلیل یہ ہے کہ جن دلائل سے ان افعال کا ثبوت ہوتا ہے وہ قوت و بیان میں ایسے نہیں ہیں کہ ان سے فرضیت کا اثبات ہو سکے، لہذا ان کی حیثیت سنیت و مستحب کی ہوگی۔

وضو کی سنتیں درج ذیل ہیں

۱) نیت کرنا

وضو میں نیت فرض نہیں ہے؛ بلکہ مسنون ہے، ارشاد نبوی ہے: اعمال (پر ثواب ملنے) کا دارومدار نیت پر ہے،(۲) حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے قبول اسلام کے قصہ میں ہے کہ

---

(۱) اعلاء السنن ۱/ ۶۳. ۶۵

(۲) بخاری باب بدء الوحی : ۱

انہوں نے اپنی مسلمان بہن کے حکم پر بغرض پاکی وضو یا غسل کیا تھا پھر اوراق قرآنی ہاتھ میں لئے اور ان کی تلاوت کی اس وقت حضرت عمرؓ حالت کفر میں تھے اور حالت کفر میں نیت کی بھی جاتی ہے تو معتبر نہیں ہوتی، اس کے باوجود حضرت عمرؓ وضو کرتے ہیں اور ان کی مسلمان بہن انہیں پاک و باوضو تسلیم کرتے ہوئے اوراق قرآنی ان کے حوالے کر دیتی ہیں اور یہی ان کے قبول اسلام کا سبب بھی بن جاتا ہے۔(۱)

اس سے بظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ وضو میں نیت ضروری نہیں ہے اور حضرت عمرؓ کی بہن اور دیگر مسلمانوں کو اس حکم کی گویا تعلیم بھی مل چکی تھی، نیز پانی کا مزاج ہی پاکی بخش ہے، ارشاد ربانی ہے: اور ہم آسمان سے پانی برساتے ہیں جو پاک صاف کرنے کی چیز ہے(۲) اور ارشاد نبوی ہے: پانی، نہایت پاک شی ہے، کوئی چیز اس کو ناپاک و گندہ نہیں کرتی۔(۳) لہٰذا پانی پاکی فراہم کرنے میں کسی امر زائد پر موقوف نہیں، محض اس کے استعمال ہی سے پاکی وطہارت حاصل ہوجائے گی۔☆

۲)بسم اللہ کا پڑھنا

وضو کے شروع میں ’’بسم اللہ الرحمٰن الرحیم‘‘ پڑھنے کے متعلق متعدد احادیث آئی ہیں ایک حدیث میں ہے: بسم اللہ نہیں پڑھی اس کا وضو نہیں،(۴) لیکن چونکہ ان احادیث میں سے کوئی حدیث بھی سند کے لحاظ سے قوی نہیں ہے، اس لئے اکثریت سلف کے نزدیک

---

(۱) مستدرک حاکم ذکر فاطمة بنت خطاب:۶۸۹۷ . دلائل النبوة للبیهقی باب ذکر اسلام عمر بن الخطابؓ : ۵۱۹

(۲) سورہ الفرقان : ۴۸

(۳) مصنف ابن ابی شیبه باب من قال الماء طهور : ۱۵۳۳ . ۱۵۱۳

(☆) ائمہ ثلاثہ کے نزدیک وضو میں، ناپاکی کو دور کرنے کی یا بلا وضو درست نہ ہونے والی عبادت کے ادا کرنے کی نیت کرنا فرض ہے بغیر اس کے وضو معتبر نہیں ہوتا۔ الفقه الاسلامی : ۱/۳۷۹

(۴) مسند احمد: ۹۴۱۸ .حسن : نتائج الافکار : ۱/۲۳۱

وضو کے شروع میں بسم اللہ فرض تو نہیں لیکن سنت ہے، پھر بسم اللہ ہر کام کے شروع میں پڑھنا بہر حال مسنون ہے۔(۱)☆

۳) مسواک کرنا

مسواک کی تاکید اور فضیلت میں متعدد احادیث آئی ہیں، حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا: اگر میری امت پر دشوار نہ گزرتا تو میں ہر وضو کے وقت انہیں مسواک کرنے کا حکم دیتا۔(۲) مسواک موجود نہ ہو تو انگلیوں سے منہ صاف کرنا بھی کافی ہے، ارشاد نبوی ہے: مسواک دستیاب نہ ہو تو انگلیاں بھی مسواک کی قائم مقام ہیں (۳) نیز حضرت علی رضی اللہ عنہ سے بھی یہ طریقہ رسول اللہ ﷺ کی طرف منسوب کرتے ہوئے منقول ہے۔(۴)

طریقہ مسواک: دانتوں پر مسواک عرض میں کرنی چاہئے (۵) مسواک پیلو کی لکڑی کی ہونی چاہئے، حضرت ابن مسعود کا بیان ہے کہ میں رسول اللہ ﷺ کے لئے پیلو کے درخت کی مسواک لایا کرتا تھا، (۶) خود جناب رسالتمآب ﷺ نے بھی ایک وفد کو مسواک کرنے کے لئے پیلو کی لکڑی عنایت فرمائی تھی۔(۷)

---

(۱) نیل الاوطار : ۱/ ۳۵۱ .اعلاء السنن ۱/ ٦٧ . ٧٠

(☆) اکثریت سلف امام مالکؒ وشافعیؒ کے نزدیک وضو کے شروع میں بسم اللہ پڑھنا مسنون ہے امام احمدؒ کے نزدیک واجب ہے، بھول ہوگئی تو معاف ہے۔الفقہ الاسلامی: ۱/۳۹۴

(۲) موطامالک: باب ماجاء فی السواک : ۱۴٦

(۳) السنن الکبری للبیهقی باب الاستیاک بالاصابع ۱۷۹ .وقال الضیاء لا اری بسنده بأساً: التلخیص الحبیر : ۱/ ۲۴۷

(۴) مسند احمد، مسند علی : ۱۳۵۵ : صحیح : التلخیص الحبیر : ۱/ ۲۴۷

(۵) مراسیل ابو داؤد د : ۵ مرسل ضعیف له شاهد موصول : اعلاء : ۱/ ۷۵

(٦) مسند ابو یعلی مسند عبد الله بن مسعود :۵۳۱۵ .صحیح : مجمع الزائد باب ماجاء فی عبد الله بن مسعود : ۱۵۵٦۲

(۷) مجمع الزوائد باب بأی شیٔ یستاک : ۲۵۷۵ . حسن

۴) تین مرتبہ ہاتھوں کا کلائیوں تک دھونا

حضرت اوس بن ثقفی سے روایت ہے کہ میں نے نبی ﷺ کو دیکھا کہ آپ نے وضو کرتے وقت تین مرتبہ اپنے ہاتھوں کو دھویا۔(۱)

۵) تین تین دفعہ الگ الگ پانی سے کلی و ناک صاف کرنا

شقیق بن سلمہ سے مروی ہے کہ میں نے حضرت عثمانؓ و علیؓ کو تین تین دفعہ اعضاء وضو دھوتے ہوئے دیکھا نیز ان دونوں بزرگوں نے علیحدہ پانی سے کلی فرمائی اور علیحدہ پانی سے ناک صاف کی اخیر میں دونوں حضرات نے کہا: ہم نے رسول اللہ ﷺ کو ایسا ہی وضو کرتے دیکھا ہے۔(۲)

سنن ابوداؤد میں ہے کہ ایک موقع پر حضرت عثمانؓ نے عملاً نبی کریم ﷺ کا وضو کر کے لوگوں کو دکھلایا، اس وضو میں آپ نے تین دفعہ (الگ الگ پانی سے) کلی فرمائی اور تین دفعہ اسی طرح ناک کی صفائی کی (۳) کعب بن عمرو سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے وضو فرمایا تو تین دفعہ کلی فرمائی تین دفعہ ناک صاف کی اور ہر دفعہ نیا پانی لیا۔(۴)

ان روایات سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ کلی کرنے کے لئے اور ناک صاف کرنے کے لئے الگ الگ پانی لیا جائے۔(☆)

---

(۱) نسائی تحقیق الالبانی باب صفة الوضوء غسل الکفین :۸۳.صحیح

(۲) کنز العمال : فرائض الوضوء : ۲۶۸۶۸. صحیح : اثار السنن مع التعلیق الحسن : ۱/ ۳۱

(۳) (ابوداؤد مع تعلیق الالبانی باب صفة وضوء النبیؐ : ۱۰۸ .حسن صحیح)

(۴) المعجم الکبیر حدیث نمبر : ۱۵۷۴۱ رجاله ثقات .اعلاء: ۱/ ۸۲

(☆) امام شافعیؒ، امام احمد بن حنبلؒ کے نزدیک کلی اور ناک کے لئے ایک ہی پانی لینا افضل ہے امام ابوحنیفہؒ و امام مالکؒ کے الگ الگ پانی لینا بہتر ہے۔الفقه علی المذاهب الاربعه : ۱/ ۶۳. تحفة الاحوذی : ۱/ ۴۴. اوجز المسالک : ۱/ ۳۷

جو شخص روزے سے نہ ہو، اس کے لئے ناپاک میں خوب اچھی طرح پانی کا لینا اور اچھی طرح کلی کرنا مستحب ہے، حضرت لقیطؓ سے روایت ہے کہ میں نے نبی ﷺ کی خدمت میں عرض کیا: اے اللہ کے رسول ﷺ! مجھے وضو کے متعلق کچھ ارشاد فرمائیے، فرمایا: اچھی طرح وضو کرو، انگلیوں کے درمیان خلال کرو اور ناک میں اچھی پانی ڈالو الا یہ کہ تم روزے سے ہو(۱) ایک روایت میں ہے کہ روزے کی حالت میں نہ ہو تو کلی کرنے اور ناک صاف کرنے میں مبالغہ کرو۔(۲)

۶) ہاتھ اور پاؤں کی انگلیوں کا خلال کرنا

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا، جب تم وضو کرو تو اپنے ہاتھوں اور پاؤں کی انگلیوں کے درمیان خلال کرو۔(۳)

۷) داڑھی کا خلال کرنا

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ: نبی ﷺ داڑھی کا خلال فرمایا کرتے تھے۔(۴) حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ جب وضو کرتے تو ہتھیلی میں پانی لیکر اپنے حلق کے نیچے داخل کرتے پھر اس سے داڑھی مبارک کا خلال فرماتے۔(۵) حضرت عبداللہ بن مر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ جب وضو فرماتے تو اپنے رخسار کو رگڑتے، پھر داڑھی کے نیچے اور اندرونی حصے سے انگلیاں داڑھی مبارک کے بالوں میں گھسا دیتے یعنی خوب اچھی طرح داڑھی کا خلال کرتے۔(۶)

---

(۱) ابو داؤد مع تحقیق الالبانی باب فی الاستنثار : ۱۴۲. صحیح

(۲) اعلاء السنن : ۱/ ۷۸

(۳) ترمذی تحقیق الالبانی :باب ماجاء فی تخلیل الاصابع : ۳۰.حسن صحیح

(۴) ترمذی تحقیق الالبانی باب ماجاء فی تخلیل اللحیة : ۳۱ صحیح

(۵) ابو داؤد تحقیق الالبانی : باب تخلیل اللحیة :۱۴۵ صحیح

(۶) ابن ماجه : باب ماجاء فی تخلیل اللحیة ۴۳۲. حسن : البدر المنیر :۳۸

۸) تمام اعضاء کو تین تین بار دھونا

نبی ﷺ کا عام معمول یہی تھا کہ آپ ﷺ وضو میں تمام اعضاء کو تین تین مرتبہ دھویا کرتے تھے؛ لیکن کبھی کبھار آپ ﷺ نے جائز ہونے کو بیان کرنے کے لئے ایک یا دو بار اعضاء وضو کے دھونے پر بھی اکتفاء فرمایا، البتہ تین مرتبہ سے زیادہ، اعضاء کو وضو کی نیت سے دھونا درست نہیں ہے۔

ابی بن کعب ؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: جو شخص ایک ایک دفعہ اعضاء وضو کو دھوئے تو یہ وضو کا فریضہ ہے، جس کے بغیر چارہ کار نہیں اور جو شخص دو دو دفعہ دھوئے تو اس کے لئے اجر وثواب کے دو حصے ہیں اور جو تین تین دفعہ دھوئے تو در حقیقت یہ میرا وضو اور سابقہ انبیاء کا وضو ہے (ظاہر ہے کہ اس کی خوبی کے کیا کہنے)۔(۱)

ایک سائل کے طریقۂ وضو دریافت کرنے پر آپ ﷺ نے برتن میں پانی منگوا کر وضو فرمایا اور اس وضو میں تمام اعضاء کو تین تین دفعہ دھویا اور اخیر میں یہ ارشاد فرمایا: وضو کا طریقہ یہ ہے ، جو اس میں کمی یا بیشی کرتا ہے (یعنی کم از کم ایک دفعہ بھی اعضاء وضو کو صحیح طور سے نہیں دھوتا یا بے وجہ اعضاء وضو کو تین سے زائد بار دھوتا ہے) تو اس نے برا کام کیا اور زیادتی کردی۔(۲)

۹) مکمل سر کا مسح کرنا

تین بار اعضاء وضو کو دھونے کے حکم سے سر کا مسح مستثنیٰ ہے، کیوں کہ سر کے مسح میں تکرار مسنون نہیں ہے؛ بلکہ فرض مقدار (چوتھائی سر) کے مسح پر اکتفاء کرنے کے بجائے مکمل سر کا مسح کرنا مسنون ہے، رسول اللہ ﷺ اپنے وضو میں سر کا مسح ایک ہی بار فرمایا کرتے تھے۔(۳)

---

(۱) ابن ماجه : باب ماجاء فی الوضوء مرة ومرتين وثلاثا : ۴۵۵ ، معتبر: البدر المنير : ۳۰

(۲) ابوداؤد مع تعليق الالبانی باب الوضوء ثلاثاً ثلاثاً: ۱۳۵ . صحيح

(۳) بخاری : باب مسح الرأس مرة : ۱۹۲

حضرت علی ﷺ نے ایک دفعہ وضو فرمایا اور اپنے سر پر مسح ایک ہی بار کیا پھر ارشاد فرمایا: یہ رسول اللہ ﷺ کے طریقۂ وضو کے مطابق وضو ہے، جو چاہتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے طریقۂ وضو کو دیکھے وہ اس وضو کو دیکھے۔(۱)

ایک موقع پر حضرت عبداللہ بن زید رضی اللہ عنہ سے کسی نے رسول اللہ ﷺ کے طریقۂ وضو کے بارے میں دریافت کیا، تو حضرت عبداللہ بن زید رضی اللہ عنہ نے لوگوں کے سامنے عملاً وضوء نبی ﷺ کر کے دکھلایا، اس وضو میں انہوں نے اپنے ہاتھ آگے پیچھے کر کے مکمل سر کا مسح کیا اور ایک ہی بار کیا۔(۲)

۱۰) کانوں کا مسح کرنا

سر کے مسح کے لئے لئے گئے پانی سے کانوں کا مسح کرنا مسنون ہے۔حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ رسول اللہ ﷺ کے طریقہ وضو کو بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں: پھر آپ ﷺ نے ایک چلو پانی لیا پھر اس سے اپنے سر اور اپنے دونوں کانوں کا مسح کیا اندرونی حصہ کا (یعنی سوراخ والے حصہ کا) شہادت کی انگلیوں سے اور بیرونی حصہ کا انگوٹھوں سے۔(۳)(☆)

اسی طرح رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے، کان سر کا حصہ ہیں (پس جس طرح ایک دفعہ لئے ہوئے پانی ہی سے سر کے تمام حصوں پر مسح کیا جاتا ہے ایسے ہی اس پانی سے

(۱) ابوداؤد تحقیق الالبانی باب صفة وضوء النبی : ۱۱۲ ۔صحیح

(۲) بخاری باب مسح الرأس مرة : ۱۹۲

(۳) ابن ماجه : تحقیق الالبانی باب ماجاء فی مسح الاذنین : ۴۳۹. حسن . صحیح . صحیح ابن حبان : ذکر استحباب مسح المتوضی ظاهر اذنیه فی وضوءه : ۱۰۸۶

(☆) کانوں کا مسح کرنا امام مالکؒ وشافعیؒ کے نزدیک سنت ہے اور مسح کے لئے نیا پانی لینا بھی سنت ہے امام احمدؒ کے نزدیک کانوں کا مسح کرنا تو واجب ہے البتہ نیا پانی لینا مسنون ہے یہاں ائمہ کے درمیان ایک اور اختلاف یہ بھی ہے کہ امام ابو حنیفہؒ، امام مالکؒ، امام احمدؒ، کے نزدیک کانوں کا مسح صرف ایک بار ہی کرنا ہے اور امام شافعیؒ کے نزدیک سر اور کانوں کے مسح تین دفعہ کرنا مسنون ہے۔الفقه الاسلامی : ۱/۱ ۴۰۱. ۴۰۲

کانوں کا بھی مسح کیا جائے گا) یہ حدیث اگرچہ کمزور ہے لیکن اس کی اتنی سندیں ہیں کہ سب مل کر قابل حجت ہو جاتی ہیں۔(۱)

۱۱) گردن کا مسح کرنا

ابن عمر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا، جو شخص وضو کرے اور اپنی گردن پر اپنے ہاتھوں کے ذریعہ مسح کرے، وہ روز قیامت طوق پہنائے جانے سے محفوظ رہے گا۔(۲)

کعب بن عمرو سے مروی ہے کہ انہوں نے رسول اللہ ﷺ کو سر کا مسح کرتے ہوئے دیکھا؛ یہاں تک کہ آپ ﷺ نے گدی کا اور اس سے متصل حصہ کا بھی مسح فرمایا۔(۳)(☆)

۱۲) تمام اعضاء کامل کر دھونا

حضرت مستورد بن شداد فرماتے ہیں، میں نے رسول اللہ ﷺ کو دیکھا، جب آپ ﷺ وضو فرماتے تو اپنے دونوں پاؤں کی انگلیوں کو خنصر (ہاتھ کی چھوٹی انگلی) سے رگڑتے۔

(۴) حضرت عبداللہ بن زید رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے پاس دو تہائی مُد پانی لا گیا آپ ﷺ نے وضو فرمایا اور اپنے بازوؤں کو مل کر دھونے لگے۔(۵)

---

(۱) مصنف ابن ابی شیبہ : ۱۵۶ : تحقیق محمد عوامه تقدیم تحقیقه

(۲) التلخيص الحبير : ۲۸۸/۱. رواه ابو الحسن ابن الفارس وقال هذا ان شاء الله حديث صحيح

(۳) مسند احمد: حديث جد طلحة الايامي: تحقيق شعيب الارنووط : ۱۵۹۹۳. طحاوی : باب فرض مسح الرأس ۱۲۹ :حسن . اعلاء السنن : ۱۲۱/۱

(☆) امام احمدؒ اور بعض شوافع کے نزدیک بھی گردن کا مسح مستحب ہے امام اوزاعیؒ و امام بغویؒ بھی اسی کے قائل ہیں امام مالکؒ اور شافعیؒ کے قول جدید کے مطابق گردن کا مسح مسنون نہیں۔ بذل المجهود مع التعليقات للشيخ محمد زكريا الكاندهلوىؒ : ۷۹/۱

(۴) ترمذی تحقيق الالبانی : باب ماجاء فی تخليل الاصابع : ۴۰. صحيح .

(۵) المستدرک مع تعليقات الذهبی كتاب الطهارة : ۵۰۹. صحيح

حضرت ابن عمرؓ کا بیان ہے کہ رسول اللہ ﷺ دوران وضو اپنے رخساروں کو بھی ملا کرتے تھے۔(۱) رگڑنا فرض اس لئے نہیں ہے کہ آیت وضو میں اعضاء کے غسل (دھونے) کا حکم ہے اور لغۃً غسل کے مفہوم میں رگڑنا شامل نہیں ہے۔(☆)

۱۳) تیامُن

یعنی وضو میں جو اعضاء دو دو ہیں ان میں سے پہلے دایاں پھر بایاں عضو دھویا جائے، حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ نبی ﷺ جوتا پہننے، کنگھا کرنے، وضو کرنے اور دوسرے اچھے کاموں میں دائیں طرف سے شروع کرنا پسند فرماتے تھے۔(۲)

حضرت ابو ہریرہؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: جب تم وضو کروتو اپنی داہنی جانب سے آغاز کرو۔(۳)

۱۴) پے در پے اعضاء وضو کا دھونا

ایک عضو کے دھونے کے بعد دوسرے عضو کے دھونے میں اتنی تاخیر نہیں کرنی چاہئے کہ اتنی دیر میں پہلا عضو خشک ہو جائے، رسول اللہ ﷺ سے کہیں یہ عمل ثابت نہیں ہے کہ آپ ﷺ ایک ہی وضو کو متفرق اوقات میں پورا فرمایا کرتے تھے، تاہم لگا تار اعضاء وضو کو دھونا کوئی ضروری بھی نہیں، کوئی شخص متفرق اوقات میں وضو پورا کرے اور اس دوران کوئی ناقض وضو پیش نہ آئے تو اس کا وضو بھی معتبر ہوگا اور وہ شرعاً باوضو کہلائے گا۔

---

(۱) ابن ماجه : باب ماجاء في تخليل اللحية : ۴۳۲. حسن: البدر المنير : ۳۸

(☆) یہی امام شافعیؒ واحمدؒ کا مسلک ہے امام مالکؒ کے نزدیک اعضاء کو مل کر دھونا واجب ہے۔ الفقه الاسلامی : ۳۸۸،۳۸۷/۱.

(۲) بخاری حدیث نمبر: ۱۶۳

(۳) ابوداؤد مع تعليق الالباني باب في الانتعال : ۴۱۴۳. صحیح

ایک دفعہ کا واقعہ ہے کہ حضرت ابن عمرؓ نے پیشاب سے فارغ ہونے کے بعد وضو کیا، اپنے چہرہ اور ہاتھوں کو دھویا سر کا مسح کیا، (پیروں پر موزے تھے، غالباً بھول کی وجہ سے یا کسی اور سبب سے ان پر مسح نہیں کیا) جس وقت مسجد میں داخل ہوئے تو نماز جنازہ پڑھانے کے لئے انہیں مدعو کیا گیا، حضرت ابن عمرؓ نے پہلے اپنے موزوں پر مسح کیا پھر نماز جنازہ پڑھائی۔(۱)(☆)

۱۵)ترتیب سے وضو کرنا

جس ترتیب سے اعضاء وضو کے دھونے کا بیان آیت وضو میں آیا ہے (چہرہ، پھر ہاتھ، پھر سر کا مسح، پھر پیروں کا دھونا) اس کا خیال رکھنا چاہئے، رسول اللہ ﷺ نے، ترتیب سے وضو فرمایا ہے، تاہم اعضاء وضو میں ترتیب کو ملحوظ رکھنا فرض اور ضروری نہیں، اس لئے کہ آیت وضو میں اعضاء وضو کے دھونے اور مسح کرنے کا حکم، حرف ''واؤ'' کے ساتھ بیان ہوا ہے، جو لغت عرب کی رو سے ترتیب کا تقاضا نہیں کرتا، اسی بناء پر آیت تیمّم میں حرف ''واؤ'' کے ساتھ پہلے چہرے پھر ہاتھوں کے مسح کا حکم مذکور ہونے کے باوجود، رسول عربی ﷺ نے حضرت عمارؓ کو طریقہ تیمّم کی تعلیم دیتے ہوئے یوں فرمایا کہ تمہارے لئے اس طرح تیمّم کر لینا کافی ہے، پھر آپ ﷺ نے زمین پر ہاتھ مار کر پہلے پہنچوں کا (ہاتھوں کا) مسح فرمایا، پھر دوسری ضرب لگا کر چہرہ کا مسح فرمایا۔(۲)

ایک دفعہ رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں وضو کا پانی پیش کیا گیا، آپ ﷺ نے وضو فرمایا تو پہلے اپنی ہتھیلیوں کو تین بار دھویا، پھر اپنے چہرہ کو تین بار دھویا، پھر اپنے ہاتھوں کو تین

(۱) موطا مالک باب ما جاء فی المسح علی الخفین : ۷۴

(☆) پے در پے اعضاء وضوء کا دھونا امام ابوحنیفہؒ و امام شافعیؒ کے نزدیک سنت ہے امام مالکؒ و احمدؒ کے نزدیک واجب ہے۔الفقہ الاسلامی : ۱/۳۸۶

(۲) ابو داؤد مع تعلیق الالبانی باب التیمم : ۳۲۴. صحیح

بار دھویا، پھر کلی فرمائی اور ناک کی صفائی کی، پھر اپنے سر اور کانوں کا مسح فرمایا۔(۱) حضرت علیؓ فرماتے ہیں: مجھے اس کی کوئی فکر نہیں کہ کس عضو سے وضو کا آغاز کروں اور کس عضو پر اختتام کروں ۔(۲) حضرت عبد اللہ بن مسعودؓ ارشاد فرماتے ہیں: وضو میں ہاتھوں کو دھونے سے قبل پیروں کو دھو لینے میں کوئی حرج نہیں ۔(۳) ☆

۱۶) پانی کے استعمال میں احتیاط

حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ ایک مُد پانی سے وضو فرمایا کرتے تھے ۔(۴) حضرت سعدؓ وضو کر رہے تھے کہ ان کے پاس سے نبی ﷺ گذرے، فرمایا: اے سعد! یہ کیا فضول خرچی ہو رہی ہے؟ حضرت سعدؓ نے عرض کیا: کیا پانی میں بھی کوئی فضول خرچی ہے؟ فرمایا: ہاں اگر چہ تم بہتے ہوئے دریا پر بیٹھ کر وضو کیوں نہ کر رہے ہو۔(۵)

---

(۱) مسند احمد: حدیث المقدام بن معدیکرب : تحقیق شعیب الارنوط : ۱۷۲۲۶ . اسناده صالح: نیل الاوطار : باب ماجاء فی جواز تاخیر هما علی غسل الوجه والیدین : ۱/۱۷۸

(۲) دار قطنی : باب ماجاء فی جواز تقدیم غسل الیسری علی الیمنی :۳۰۴.بیهقی باب الرخصة فی البداية با ليسار: ۴۱۳. حسن: اعلاء : ۱/۱۱۵

(۳) مصنف ابن ابی شیبه : باب فی الرجل يتوضأ يبدأ برجلبه قبل يديه : ۴۲۳. السنن الكبرى للبيهقى : باب الرخصة فى البداية باليسار : ۴۱۴هذا مرسل لان مجاهداً لم يدرک عبد الله بن مسعودؓ : امام بیهقی

☆ وضو میں ترتیب امام ابو حنیفہؒ وامام مالکؒ کے نزدیک مسنون ہے امام شافعیؒ واحمدؒ کے نزدیک فرض ہے ۔الفقه الاسلامی: ۱/۳۸۳.۳۸۴

(۴) بخاری : باب الوضوء بالمد : ۲۰۱.

(۵) ابن ماجه : باب ماجاء فی القصد فی الوضوء : ۴۱۹. حسن : فتح الغفار: ۳۱۲

۱۷)وضو کے بعد اپنی شرمگاہ کی جگہ کپڑے پر چھینٹے دینا

حضرت حکم بن سفیان ﷜ کا بیان ہے کہ جب رسول اللہ ﷺ وضو فرمایا کرتے تھے تو پانی کا ایک چلو لیتے اور اس سے شرمگاہ کے حصہ پر چھینٹے دیتے ۔(۱) یہ عمل دراصل بغرض تعلیم آپ ﷺ اختیار فرمایا کرتے تھے، تعلیم یہ تھی کہ اس طرز عمل سے ایک طرف طہارت کے ٹوٹنے اور پیشاب کے قطرات کے نکلنے کے وسوسوں سے حفاظت رہتی ہے ، دوسری طرف اس میں پیشاب کے قطرات کے خطا ہو جانے کا علاج بھی ہے۔

۱۸)وضو کے بعد دعا پڑھنا

حضرت عمر ﷜ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا: تم میں سے جو شخص وضو کر کے یہ دعا پڑھے گا اس کے لئے جنت کے آٹھوں دروازے کھول دیئے جائیں گے، وہ جس دروازے سے چاہے داخل ہو جائے ، دعا یہ ہے " اَشْھَدُ اَنْ لَا اِلٰـہَ اِلَّا اللّٰـہُ وَحْدَہٗ لَا شَرِیْکَ لَہٗ وَاَشْھَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُہٗ وَرَسُوْلُہٗ "(۲) ترجمہ: میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں ، اس کا کوئی شریک نہیں اور یہ کہ محمد ﷺ اس کے بندے اور رسول ہیں۔

ترمذی کی روایت میں یہ الفاظ زیادہ ہیں "اَللّٰھُمَّ اجْعَلْنِیْ مِنَ التَّوَّابِیْنَ وَاجْعَلْنِیْ مِنَ الْمُتَطَھِّرِیْنَ (۳) ترجمہ: اے اللہ! مجھے توبہ کرنے والوں اور پاک ہونے والوں میں سے بنادے۔

---

(۱) ابو داؤد مع تعليق الالبانی باب فی الانتضاح : ١٦٦ . صحيح

(۲) مسلم باب الذكر المستحب عقب الوضوء : ٥٧٦

(۳) ترمذی مع تعليق الالبانی باب فيما يقال بعد الوضوء : ٥٥ . صحيح

۱۹)وضو کے بعد کم از کم دو رکعت نماز پڑھنا

حضرت ابو ہریرہ ؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے حضرت بلال ؓ سے فرمایا :اے بلال! مجھے بتاؤ تم نے مسلمان ہو کر سب سے زیادہ نیکی کا کام کونسا کیا ہے، کیوں کہ میں نے تمہارے جوتوں کی آواز اپنے سے آگے جنت میں سنی ہے؟ حضرت بلال ؓ نے عرض کیا، میں نے تو کوئی کام ایسا نہیں کیا ہے جو میرے نزدیک اس سے زیادہ نیکی کا ہو کہ میں دن اور رات کی کسی گھڑی میں جب بھی پاک ہوا (یعنی غسل یا وضو کیا) تو جتنی نماز مجھ سے ہو سکی، میں نے پڑھ لی۔(۱)

۲۰)وضو کے عمل میں کسی کا تعاون نہ لینا

رسول اللہ ﷺ کا معمول یہی تھا کہ عمل وضو (اعضاء پر پانی وغیرہ ڈالنے) میں کسی کا تعاون نہیں لیا کرتے تھے؛ بلکہ یہ کام آپ ﷺ خود انجام دیا کرتے تھے۔(۲) تاہم صحیح احادیث میں کبھی کبھار خدام سے پانی وغیرہ ڈالنے میں آپ ﷺ کا تعاون لینا بھی منقول ہے، چنانچہ مختلف اوقات میں حضرت مغیرہ بن شعبہ اور حضرت اسامہ سے پانی ڈالنے میں تعاون کرنا کتب احادیث میں منقول ہے۔(۳)

۲۱)انگوٹھی کو حرکت دینا

انگلی میں انگوٹھی ہو تو باوجود کشادہ ہونے کے اس کو حرکت دے لینا مستحب ہے، رسول اللہ ﷺ جب وضو فرماتے تو اپنی انگوٹھی کو حرکت دیا کرتے تھے۔(۴) البتہ

---

(۱) بخاری :باب فضل الطھور : ۱۱۴۹

(۲) ابن ماجہ باب لایکل طھورہ : ۳۵۶،لہ شاھدا تحاف الخیرۃ المھرۃ : ۸۶/۱، مصباح الزجاجۃ : ۵۵/۱

(۳) بخاری : باب الرجل یوضئ صاحبہ : ۱۸۱،۱۸۲

(۴) ابن ماجہ باب تخلیل الاصابع : ۴۴۹ . ضعیف والاعتماد فی ھذا الباب علی الاثر: مصباح الزجاجۃ : ۶۵/۱ ، مصنف ابن ابی شیبہ : ۴۲۳ تا ۴۳۴

انگوٹھی اگر تنگ ہو تو پھر انگوٹھی کو حرکت دے کر پانی کو انگلی تک پہنچانا ضروری ہے، اس کے بغیر فرض ادا نہیں ہوگا۔

۲۲) وضو یا غسل سے فارغ ہونے کے بعد تولیہ وغیرہ سے پانی کو خشک کرنا

حسب موقع ومزاج اعضاء بدن کو تولیہ وغیرہ سے خشک کرنا نہ کرنا، دونوں مباح ہے، دونوں طرح کا عمل رسول اللہ ﷺ سے ثابت ہے، حضرت میمونہؓ کی روایت میں ہے کہ غسل سے فراغت کے بعد انہوں نے رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں تولیہ پیش کیا، لیکن آپ ﷺ نے اس کو قبول نہیں کیا بلکہ ویسے ہی ہاتھ سے پانی پونچھتے ہوئے آپ ﷺ آگے چلے گئے۔(۱)

حضرت سلمان سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے وضو فرمایا، پھر جو جبہ آپ ﷺ کے بدن پر تھا، اسے الٹا اور اس سے اپنے چہرہ کو پونچھ لیا۔(۲) حضرت عائشہؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے لئے ایک خاص کپڑا تھا، جس سے آپ ﷺ وضو کے بعد اعضاء کو خشک کرتے تھے۔(۳)

۲۳) عورت کا مرد کے باقی ماندہ پانی کو استعمال کرنا اور اس کے برعکس

وہ برتن جس کے کچھ پانی کو عورت نے اپنے وضو کے لئے چلو سے لے لے کر استعمال کیا تھا، اس برتن کے بچے ہوئے پانی سے مرد وضو یا غسل بلا کراہت کرسکتا ہے، ایسے ہی عورت بھی مرد کے باقی ماندہ پانی سے وضو یا غسل بلا کراہت کرسکتی ہے، حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ حضرت میمونہؓ کے باقی ماندہ پانی سے غسل کیا کرتے تھے۔(۴)

---

(۱) بخاری باب نفض الیدین من الغسل : ۲۷۶

(۲) ابن ماجة :باب المنديل بعد الوضوء : تحقيق الالبانی :۴۶۸.حسن

(۳) ترمذی : مع تعليق احمد شاكر : باب ماجاء فی التمندل : ۴۸ . صحيح كنز العمال : ۱۱۷۸۴۴

(۴) مسلم باب القدر المستحب من الماء فی غسل الجنابة : ۷۶۰

حضرت ابن عباس ﷛ ہی سے مروی ہے کہ ایک لگن کے پانی سے کسی زوجہ مطہرہ نے غسل جنابت کیا تھا، لگن میں کچھ پانی بچ رہا تھا، آپ ﷺ تشریف لائے اور اس پانی سے وضو یا غسل کرنے کے لئے آگے بڑھے، اس زوجہ مطہرہ نے عرض کیا: یارسول اللہ! میں تو جنبی تھی؟ فرمایا تو کیا ہوا، پانی تو جنبی نہیں ہوتا (محض تمہارے ہاتھ ڈبونے اور استعمال کرنے سے)۔(۱)

۲۴) وضو سے بچا ہوا پانی پی لینا:

وضو مکمل کر لینے کے بعد برتن یا لوٹے میں پانی بچ گیا ہو تو اسے کھڑے ہو کر پی لینا مستحب ہے (بشرطیکہ پانی پینے کے قابل بھی ہو) حضرت علی ﷛ نے ایک بار حسین ﷛ بن علی ﷛ کے سامنے رسول اللہ ﷺ جیسا وضو فرمایا، وضو سے فارغ ہونے کے بعد برتن میں بچ گیا تو پانی کو نوش فرمایا، پھر کہا میں نے تمہارے نانا کو اسی طرح کرتے ہوئے دیکھا ہے، آپ ﷺ اسی طرح وضو فرماتے اور وضو کا باقی ماندہ پانی کھڑے ہو کر نوش فرماتے ۔(۲)

❁ ❁ ❁ ❁ ❁

(۱) ابو داؤد تحقیق الالبانی باب الماء لا یجنب : ۶۸ صحیح

(۲) نسائی تحقیق الالبانی باب صفة الوضوء : ۹۵ . صحیح

نواقض وضو کا بیان

وہ چیزیں جن سے وضوٹوٹ جاتا ہے درج ذیل ہیں:

۱) ہر وہ چیز جو اگلی یا پچھلی شرمگاہ سے نکلے، اس کے تحت درج ذیل چیزیں آتی ہیں:

(الف) پیشاب

(ب) پاخانہ

اللہ تعالی کا ارشاد ہے: یا تم میں سے کوئی رفع حاجت کر کے آئے (تو وضو کرے اور پانی کے استعمال پر قدرت نہ ہو تو تیمّم کرے)۔(۱)

حضرت صفوان بن عسالؓ فرماتے ہیں کہ: رسول اللہ ﷺ ہم کو حکم دیا کرتے تھے کہ اگر حالت سفر میں ہمارے پاؤں پر موزے چڑھے ہوئے ہوں تو صرف غسل جنابت کی ضرورت کے لئے ان کو اتارا جائے، باقی وہ مواقع جہاں وضو کی ضرورت پیش آتی ہو جیسے قضاء حاجت کرنے اور سو کر اٹھنے کے بعد تو وہاں موزوں کو اتارنے کے بجائے ان پر تین دن اور تین رات تک مسح کر لیا جائے۔(۲)

(ج) خروج ریح

حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے ارشاد فرمایا: جب تم میں سے کسی کا وضوٹوٹ جائے، تو اللہ اس کی نماز قبول نہیں کرتا، تاوقتیکہ وہ وضو نہ کرے، حضر موت کے ایک باشندہ نے حضرت ابو ہریرہؓ سے دریافت کیا: وضوٹوٹنے سے کیا مراد ہے؟ فرمایا:

---

(۱) سورة مائدة : ٦

(۲) ترمذی تحقیق الالبانی باب المسح علی الخفین : ٩٦ حسن

پیچھے کی راہ سے آواز کے ساتھ یا آواز کے بغیر ہوا کا خارج ہونا۔(۱)

لیکن اس بارے میں خواہ مخواہ شک صحیح نہیں، حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ ہی سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا، تم میں سے کوئی شخص اگر اپنے پیٹ میں کوئی چیز پائے اور اس کے لئے یہ سمجھنا مشکل ہو جائے کہ آیا اس کے پیٹ سے کوئی چیز نکلی ہے یا نہیں، تو اسے مسجد سے اس وقت تک نہیں نکلنا چاہئے جب تک وہ آواز نہ سنے یا بو نہ پائے۔(۲)

غرض جب خروج ریح کا یقین ہو جائے خواہ آواز سننے کی بناء پر یا بو محسوس ہونے کی بنا پر یا کسی اور ذریعہ سے تبھی وضو ٹوٹ جائے گا۔

(د) مذی کا نکلنا

حضرت علی رضی اللہ عنہ کو بکثرت مذی نکلنے کی شکایت تھی، اس بارے میں جب آپ ﷺ سے دریافت کیا گیا تو آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: وہ اپنے عضو مخصوص کو دھولیں اور وضو کر لیں۔(۳)

(ہ) ودی کا نکلنا

ودی رقیق مادہ کہلاتا ہے جو کبھی پیشاب سے قبل اور کبھی بعد میں نکلتا ہے، اس کے نکلنے سے بھی وضو ٹوٹ جاتا ہے، حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: مذی اور ودی کے نکلنے پر شرمگاہ کو دھولینا چاہئے اور وضو کرنا چاہئے۔(۴)

---

(۱) بخاری باب لا تقبل صلاة بغیر طهور : ۱۳۵

(۲) مسلم باب الدلیل علی ان من تیقن الطهارة ثم شک فی الحدث : ۸۳۱

(۳) بخاری :باب غسل المذی والوضوء منه : ۲۶۹

(۴) مصنف ابن ابی شیبه : باب فی المنی المذی والودی : ۹۸۲.۹۸۹. حسن : آثار السنن: ۱/ ۶۱.

۲) نیند

ایسی نیند جس کی وجہ سے اعضاء پر گرفت ڈھیلی پڑ جاتی ہو اور بحالت نیند پیچھے کی راہ سے ہوا کے نکلنے نہ نکلنے کا احساس نہ رہتا ہو، ناقض وضو ہے، جیسے ٹیک لگا کر گہری نیند سو جانا، چت یا کروٹ سو جانا اور وہ ہلکی نیند جس سے آدمی غافل اور بے حس نہیں ہوتا، ناقض وضو نہیں جیسے کھڑے کھڑے سو جانا، بحالت سجدہ نیند کی کیفیت کا طاری ہو جانا وغیرہ۔

حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا، آنکھیں سرین بند ہیں، (یعنی جب تک آنکھیں کھلی رہیں، آدمی کو ریح کے روکنے اور خارج کرنے پر قدرت واختیار رہتا ہے اور مقعد پر گویا ایک بند لگا رہتا ہے) تو جو شخص سو جائے تو چاہئے کہ اٹھنے پر وہ وضو کر لے (۱)

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا بحالت سجدہ سونے والے پر وضو نہیں؛ تا آنکہ وہ کروٹ پر سو جائے؛ اس لئے کہ جب وہ کروٹ پر سو جاتا ہے تو اس کے جوڑ ڈھیلے پڑ جاتے ہیں۔ (۲)

حضرت ابو ہریرہؓ فرماتے ہیں محض گوٹ مار کر بیٹھے بیٹھے سونے والے پر ایسے ہی کھڑے کھڑے سونے والے پر اور بحالت سجدہ سونے والے پر وضو نہیں ہے، یہاں تک کہ کروٹ سو جائے جب وہ کروٹ پر سو جائے تو وضو کرے۔ (۳)

نوٹ: بے ہوشی اور جنون کی حالت چوں کہ غفلت و بے حسی کے معاملے میں نیند سے بھی

---

(۱) ابوداؤد تحقیق الالبانی : باب الوضوء من النوم ، ۲۰۳ . حسن

(۲) مسند احمد:تحقیق شعیب ارنووط:۲۳۱۵ :رجاله موثقون:مجمع الزوائد:باب الوضوء من النوم:١٢٨٦

(۳) السنن الکبری للبیهقی : باب ما ورد فی نوم : ۶۱۴ .اسناده جید : التلخیص الحبیر : ۶۳ باب الاحداث

بڑھی ہوئی ہوتی ہے؛ اس لئے ان دونوں حالتوں کے طاری ہونے پر بھی وضوٹوٹ جائے گا۔

اسی طرح مباشرہ فاحشہ میں بھی بے شعوری کے عالم میں نہایت معمولی مقدار میں مذی وغیرہ کا نکلنا ممکن ہے؛ اس لئے احتیاطاً یہ شکل بھی ناقض وضوقرار دی گئی (۱)

۳) نکسیر اور منہ بھر قئے: ان دونوں سے بھی وضوٹوٹ جاتا ہے رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے: جس کونکسیر پھوٹی ہو یا قئے ہوئی ہو یا مذی نکلی ہو اس کو واپس جانا چاہئے اور وضو کرنا چاہئے پھر اپنی باقی رکعتیں پوری کرنی چاہئے، یہ اس وقت ہے کہ درمیان میں بات نہ کی ہو(۲) حضرت ابوالدرداء ؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے قئے فرمائی پھر وضو کیا (۳) منہ بھر ہونے کی قید حنفیہ نے حضرت نبی کریم ﷺ کے اس ارشاد گرامی کی بناء پر لگائی ہے کہ جس میں آنحضرت ﷺ نے نواقض وضو کا شمار کراتے ہوئے فرمایا تھا: یا وہ قئے جو منہ بھر ہو (یعنی یہ بھی ناقض وضو ہے(۴) حضرت حمادؒ سے منقول ہے کہ قئے جب زیادہ ہو تو اس میں وضو ہے اور تھوڑی ہے تو وضو نہیں ہے۔(۵)

۴) خون کا کسی حصہ بدن سے نکل کر بہہ پڑنا

خون، چاہے بدن کے کسی حصہ سے نکل کر بہہ پڑے ناقض وضو ہے، خواہ خون، نکسیر کا ہو یا استحاضہ کا ہو یا کوئی زخم وغیرہ کا ہو، نکسیر کے متعلق ناقض وضو ہونے کا ذکر مرفوع روایت کے علاوہ متعدد موقوف روایات یعنی صحابہؓ کے فتاوی سے بھی ثابت ہے، چنانچہ

(۱) اعلاء السنن : ۱/۱۵۷

(۲) ابن ماجه : باب ماجاء فى البناء على الصلوة ، ۱۲۱۱ وله شواهد مصباح الزجاجة

(۳) ترمذی تحقيق الالبانی : باب الوضوء من القئ : ۸۷.صحيح

(۴) جامع الكبير للسيوطى : ۱۱۴۱۰ . ضعيف : نصب الراية : ۱/۴۴. نواقض الوضوء

(۵) مصنف ابن ابی شيبه :من كان لا يرى فى القلس وضوء : ۴۴۵. رجال الصحيح.

حضرت ابن عمرؓ فرماتے ہیں، جب نماز میں کسی شخص کی نکسیر پھوٹ جائے یا قئی لاحق ہوجائے یا مذی کے نکلنے کا احساس ہوتو وہ نماز سے نکل جائے اور وضو کرے پھر واپس آکر مابقیہ رکعتوں کو پورا کرے بشرطیکہ اس درمیان میں بات چیت نہ کیا ہو۔(۱)

اسی قسم کا فتوی حضرت علیؓ سے بھی منقول ہے(۲) تابعین میں سے حضرت سالم بن عبداللہ، سعید بن المسیب، حضرت طاؤس، وغیرہ کا بھی یہی فتوی تھا۔(۳)

خون استحاضہ کے ناقضِ وضو ہونے کے بارے میں حضرت فاطمہ بنت ابی حبیشؓ کی یہ معروف روایت موجود ہے، حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں: فاطمہ بنت ابی حبیشؓ رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوکر عرض کرنے لگیں یارسول اللہ میں مستحاضہ عورت ہوں، کبھی بھی خون استحاضۃ سے پاک رہنے کی نوبت نہیں آتی، کیا میں نماز ترک کردوں؟ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: نہیں، وہ تو رگ کا خون ہے حیض کا خون نہیں ہے، نماز کی معافی تو حیض کے ایام میں ہے، اس لئے جب خون حیض آنے کے ایام ختم ہوجائیں تو غسل کرلو اور نماز پڑھنی شروع کردو، ہشام بن عروہ کہتے ہیں میرے والد نے (حدیث کا باقی حصہ بیان کرتے ہوئے) کہا: تم ہر نماز کے لئے وضو کرتے رہو(۴)

حضرت تمیم داریؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: وضو ہر بہنے والے خون سے ہے(۵) خون بہنے والا نہ ہوتو وہ ناقض وضو بھی نہیں، حضرت ابن عمرؓ نے ایک

---

(۱) مصنف عبدالرزاق باب الرجل یحدث ثم یرجع قبل ان یتکلم: ۳۶۰۹ صحیح: اثار السنن: ۱/۳۵

(۲) مصنف ابن ابی شیبہ: باب فی الذی یقئ او یرعف فی الصلاۃ: ۵۹۵۲. صحیح: الجوہر النقی: ۲/۲۵۶

(۳) مصنف عبد الرزاق: باب الرجل یحدث ثم یرجع: ۳۶۱۰، ۳۶۱۹

(۴) (بخاری باب غسل الدم: ۲۲۸)

(۵) دارقطنی باب ماجاء فی القئ والقلس فی الصلوۃ: ۵۹۰. حسن: موطا ممجد مع التعلیق الممجد بحثاً: باب الوضوء من الرعاف: ۳۹. فتح القدیر: باب نواقض الوضوء: ۱/۴۱

پھونسی کو دبایا تو اس سے خون نکلا تاہم حضرت ابن عمرؓ نے اس کی وجہ سے وضو نہیں فرمایا (۱) ارشاد نبوی ہے: خون کے ایک یا دو قطرے نکلنے پر وضو نہیں ہے ہاں مگر وہ بہنے والا ہو تب وضو ہے۔ (۲)

بکرؒ کہتے ہیں: میں نے ابن عمرؓ کو دیکھا، انہوں نے اپنے چہرے کی ایک پھونسی کو دبایا تو اس سے کچھ خون نکلا تو انہوں نے اس کو اپنی دونوں انگلیوں کے درمیان رگڑ دیا پھر وضو کئے بغیر نماز پڑھ لی (۳) حضرت ابن سرینؒ نے اس شخص کے بارے میں جسے تھوک میں خون غالب آجائے تو وضو کرنے کا حکم دیا۔ (۴)

نوٹ: پیپ اور کچے لہو بھی خون کی قسمیں ہیں اور خون ہی سے بنتے ہیں، اس لئے ان کا حکم بھی خون کے حکم جیسا ہوگا۔☆

۵) نماز میں قہقہہ مار کر ہنسنا

حضرت ابو موسی اشعریؓ سے مروی ہے: اس دوران کہ نبی ﷺ نماز پڑھ رہے تھے، ایک نابینا شخص مسجد میں داخل ہوا اور اچانک مسجد میں موجود ایک گڑھے میں گر پڑا، اس اچانک پیش آنے والے واقعے سے بہت سارے لوگ نماز ہی میں ہنس پڑے، بعد میں آپ ﷺ نے حکم دیا کہ جو بھی ہنسا ہو وہ وضو اور نماز کا اعادہ کر لے۔ (۵)

---

(۱) (بخاری تعلیقاً: باب من لم یر الوضوء الا من المخرجین من القبل والدبر: ۱/۳۱۸

(۲) دار قطنی باب ماجاء فی القئی والقلس: ۵۹۱ ضعیف: الدرایۃ ۱/۳۳

(۳) مصنف ابن ابی شیبہ باب اذا سال الدم او قطر: ۱۴۷۸ صحیح: البدر المنیر: ۴/۲۱۱

(۴) مصنف عبدالرزاق باب الرجل یبزق دما: ۵۶۰ صحیح: اعلاء السنن: ۱/۱۴۸

☆ امام ابوحنیفہؒ و احمدؒ کے نزدیک خون، پیپ، کچ لہو وغیرہ کا نکلنا ناقض وضو ہے جب کہ امام شافعیؒ و مالکؒ کے نزدیک ان چیزوں سے وضو نہیں ٹوٹتا۔ الفقہ الاسلامی: ۱/۴۲۱۔۴۲۲

(۵) مجمع الزوائد: باب الضحک والتبسم فی الصلوۃ: ۲۴۴۳۔ رجالہ موثقون مصنف عبد الرزاق باب الضحک والتبسم فی الصلوۃ: ۳۷۶۰ مرسل قوی: اثار السنن: ۱/۳۶

حضرت ابن شہاب سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: جو اپنی نماز میں قہقہہ لگا کر ہنسے وہ نماز و وضو کا اعادہ کرے (۱) عمران بن حصینؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک آدمی سے جو نماز میں ہنس پڑا تھا، یوں فرمایا تھا: اپنے وضو کا اعادہ کرو (۲)

وہ چیزیں جن سے وضو نہیں ٹوٹتا

۱) آگ پر پکی ہوئی چیز کا کھانا

حضرت جابرؓ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کا آخری عمل آگ پر پکی چیز کھانے کے بعد وضو نہ کرنے کا تھا (۳) عمرو بن امیہ ضمریؓ کا بیان ہے کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو بکری کے شانہ سے گوشت کاٹ کر تناول فرماتے ہوئے دیکھا، پھر نماز کا وقت آیا تو آپ ﷺ کھڑے ہوئے، چھری ایک طرف پھینک دی اور نماز پڑھی اور وضو نہیں فرمایا (۴)

۲) عورت کو چھونا

حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ میں نبی ﷺ کے سامنے سوئی ہوئی تھی، اور میرے پاؤں آپ ﷺ کے قبلہ کی طرف تھے، جب آپ ﷺ سجدہ میں جاتے تو مجھے (ہاتھ سے) ہٹا دیتے، اور میں پاؤں سکیڑ لیتی۔ (۵)

حضرت عائشہؓ ہی سے مروی ہے، رسول اللہ ﷺ (رات کے اوقات میں) نماز پڑھا کرتے تھے اور میں آپ ﷺ کے سامنے جنازہ کی طرح پڑی رہتی تھی، یہاں تک کہ اخیر

---

(۱) السنن الکبری للبیھقی باب ترک الوضوء من القھقھة : ۷۰۱. حسن اعلاء : ۱/ ۱۶۶

(۲) الدرایة : ۱/ ۳۶. حسن : اعلاء : ۱/ ۱۶۹) ائمہ ثلاثہؒ کے نزدیک اس سے وضو نہیں ٹوٹتا۔ الفقہ الاسلامی: ۱/ ۲۳۴

(۳) نسائی تحقیق الالبانی : باب ترک الوضو ومما غیرت النار : ۱۸۵. صحیح

(۴) بخاری باب من لم یتوضأ من لحم الشاة : ۲۰۸

(۵) بخاری باب الصلوة علی الفراش : ۳۸۲

شب میں جب آپ ﷺ کا ارادہ وتر پڑھنے کا ہوتا تو مجھے اپنے پاؤں سے مس کرتے، (تا کہ میں بھی جاگ کر وتر وغیرہ پڑھ لوں) (۱) حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں: رسول اللہ ﷺ اپنی بعض ازواج مطہرات کا بوسہ لیا کرتے تھے پھر وضو کئے بغیر نماز پڑھ لیتے۔ (۲) ☆

۳) شرمگاہ کو چھونا

حضرت طلق بن علیؓ سے مروی ہے کہ، رسول اللہ ﷺ سے دریافت کیا گیا کہ بسا اوقات آدمی اپنی شرمگاہ کو چھو لیتا ہے آیا اس پر وضو کرنا ضروری ہے؟ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: وہ تمہارے جسم ہی کا ایک حصہ اور ٹکڑا ہے (۳)

متعدد صحابہ کرام مثلاً: حضرت علیؓ، ابن مسعودؓ حضرت ابن عباسؓ، حضرت عمران بن حصین، حضرت ابوالدرداءؓ، حضرت حذیفہ بن یمانؓ وغیرہ سے بھی یہی فتوی منقول ہے۔ (۴)

---

(۱) نسائی تحقیق الالبانی : باب ترک الوضوء من مس الرجل امرأته : ۱۶۶. صحیح

(۲) نسائی مع تعلیق الالبانی باب ترک الوضوء من القبلة : ۱۷۰. صحیح

☆ امام مالک کے نزدیک عورت کا چھونا (مس المرأۃ) ناقض وضو ہے جب کہ لامس (چھونے والا) بالغ ہو، ملموس (جسے چھوا گیا ہے) شہوت ولذت کا احساس رکھنے والا ہو (مذکر ہو یا مونث، بالغ ہو یا نابالغ محرم ہو یا اجنبی یا بیوی ہو) اور لامس نے شہوت ولذت کے ارادہ سے ملموس کے بدن کے کسی جزء کو چھوا ہو یا چھونے پر لذت وشہوت پا رہا ہو۔ امام شافعیؒ واحمدؒ کے نزدیک ایسی عورت جو لذت وشہوت سے آشنا ہو اس کو بلا حائل چھونے پر وضو ٹوٹ جاتا ہے البتہ امام شافعیؒ عورت کے اجنبیہ ہونے کی قید لگاتے ہیں جب کہ امام احمدؒ کے نزدیک اجنبیہ ہونے کی شرط نہیں اس کے برخلاف امام احمدؒ عورت کو شہوت کے ساتھ چھونے کی شرط لگاتے ہیں جبکہ امام شافعیؒ کے نزدیک یہ شرط نہیں (الفقہ الاسلامی: ۱/ ۴۲۸-۴۳۰) یہاں لطف کی بات یہ ہے کہ وہ روایات جن سے کسی درجہ میں مس المرأۃ کے ناقض وضو ہونے کا علم ہوتا ہے ان میں ان شرائط وقیود کا کہیں تذکرہ نہیں ہر امام نے اپنے ذوق واجتہاد سے ان شرائط کا اضافہ کیا ہے اور مجتہد کو اس کے بغیر چارہ کار نہیں اور اس پر اس کے لئے اجر وثواب کا وعدہ بھی ہے۔

(۳) نسائی تحقیق الالبانی : باب ترک الوضوء من مس الذکر : ۱۶۵ صحیح

(۴) آثار السنن : ۱/ ۳۶-۳۷

بعض احادیث میں شرمگاہ کو چھونے پر وضو کرنے کا حکم موجود ہے، لیکن وہ روایات واضح نہیں ہے کہ کن کن شرائط اور نزاکتوں کے ساتھ شرمگاہ کو چھونا ناقض وضو ہوگا، ان کے تعلق سے یہ روایات خاموش ہیں یہ بھی ممکن ہے کہ ان روایات میں وضو کرنے کا حکم استحباب پر یا محض ہاتھ دھونے پر محمول ہو۔

عقل کا تقاضا بھی یہی ہے کہ شرمگاہ کے چھونے سے وضو نہ ٹوٹے اس لئے کہ نہ تو خود شرمگاہ بول و براز کی طرح کوئی ناپاک شئی ہے اور نہ ہی شرمگاہ کو چھونا کسی ناپاکی کے نکلنے کا سبب ہے پس شرمگاہ کو چھونا ایسا ہی ہے جیسے کوئی ناک کو چھوئے (۱) ☆

معذور کا وضو

وہ انسان جسے پیشاب کے قطرات گرتے رہنے کی شکایت ہو یا مسلسل خروج ریح کا عارضہ ہو یا عورت کو استحاضہ کی بیماری ہو، ایسے حضرات کے لئے شرعاً یہ سہولت حاصل ہے کہ وہ وقت کے آغاز پر وضو کر لیا کریں پھر اس وضو سے جتنی چاہیں وقت کے اندر نمازیں پڑھ لیں، اگر چہ دوران نماز عذر جاری رہا ہو پھر جب وقتِ نماز نکل جائے تو دوبارہ وضو کر لیں۔

---

(۱) بدائع الصنائع

☆ ائمہ ثلاثہ اس پر تو متفق ہیں کہ مس ذکر (عضو تناسل کو چھونا) بلا حائل ناقض وضو ہے البتہ امام مالک و شافعیؒ ہتھیلی سے چھونے کی قید لگاتے ہیں امام احمدؒ کے نزدیک خواہ ہتھیلی سے ہو یا ہتھیلی کی پشت سے، امام مالکؒ خود کے ذکر کی شرط لگائے ہیں جب کہ امام شافعیؒ و احمدؒ کے نزدیک نہ ہی خود کے ذکر کو چھونے کی شرط ہے نہ صرف ذکر کو چھونے کی، بلکہ ان دو ائمہ کے یہاں خواہ اپنے ذکر کو چھوا ہو یا کسی اور بالغ، نابالغ، زندہ یا مردہ کے ذکر کو اور خواہ ذکر (مرد کا آلہ تناسل) کو چھوا ہو یا فرج (عورت کا عضو تناسل) کو یا دبر (جائے پاخانہ) کو۔ یہاں بھی دلچسپ بات یہ ہے کہ وہ روایات جن سے کسی درجہ میں مس ذکر کا ناقض وضو ہونا معلوم ہوتا ہے ان میں شرائط و قیود کا کہیں ذکر نہیں ہر امام نے اپنے ذوق و اجتہاد سے ان شرائط کا اضافہ کیا ہے۔ الفقہ الاسلامی: ۱/ ۴۳۱۔ ۴۳۳

حضرت عائشہؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ سے مستحاضہ کے بارے میں دریافت کیا گیا تو آپ ﷺ نے فرمایا: وہ ہر نماز کے وقت وضو کرلیا کرے(۱)

فاطمہ بنت ابی حبیشؓ جنہیں استحاضہ کی بیماری تھی، ان سے آپ ﷺ نے فرمایا تھا: تم ہر نماز کے (وقت کے) لئے وضو کرلو (پھر بے تامل نماز پڑھ لیا کرو) چاہے چٹائی پر خون کے قطرات گرتے رہیں (۲) ایک اور روایت میں تصریح ہے کہ مستحاضہ عورت ہر نماز کے وقت کے لئے وضو کرے۔(۳) ☆

وہ چیزیں جن کے لئے وضو کرنا ضروری ہے

۱) نماز

خواہ فرض ہو یا سنت یا نفل، اس کے لئے وضو کرنا سب کے نزدیک ضروری ہے، ارشاد نبوی ہے: اللہ تعالیٰ پاکیزگی وضو کے بغیر کوئی نماز قبول نہیں کرتا۔(۴)

---

(۱) صحیح ابن حبان تحقیق شعیب ارنووط ذکر الامر للمستحاضة بتجدید الوضوء : ۱۳۵۵ .صحیح

(۲) ابن ماجه باب ماجاء فی المستحاضة التی قد عدت ایام اقرائها :۶۲۴ صحیح اعلاء : ۱/۱۷۰

(۳) قال بعضهم هذا غریب . قلت لیس کذلک بل روی هذا الحدیث بهذه اللفظة فی بعض الفاظ حدیث فاطمة بن حبیشؓ نصب الرایة : تحقیق محمد عوامه : ۱/۲۰۴

☆ یہی امام احمدؒ کا بھی مسلک ہے امام شافعیؒ کے نزدیک معذور کا وضو صرف وقت کے فریضہ (مع سنن ونوافل) کی ادائیگی کی حد تک معتبر ہے باقی کوئی اور فرض (جیسے قضاء نمازیں) پڑھنا ہو تو ہر ایک کے لئے علیحدہ وضو کرنا ضروری ہے اور امام مالکؒ کے نزدیک دم استحاضہ وغیرہ ناقض وضو نہیں اس لئے ان کے یہاں مستحاضہ اور دیگر معذورین کے لئے دوسری نماز کا وقت آنے پر وضو کا اعادہ کرلینا محض مستحب ہے۔ الفقه الاسلامی : ۱/۴۴۲. ۲۳۵ بذل المجهود مع تعلیقات الشیخ محمد زکریاؒ : ۱/۱۸۴

(۴) مسلم باب وجوب الطهارة للصلوة :۵۵۷

۲) قرآن پاک کا چھونا

ارشاد ربانی ہے: اس قرآن کو نہ چھوئیں مگر پاک لوگ یعنی باطہارت (۱) ارشاد نبوی ہے: قرآن کو صرف پاک آدمی ہی چھوئے۔ (۲)

۳) بیت اللہ کا طواف کرنا

ارشاد نبوی ہے: بیت اللہ کا طواف بھی نماز ہی ہے۔ (۳)

❁❁❁❁❁❁❁

(۱) سورۃ واقعہ : ۷۹

(۲) طبرانی عن ابن عمرؓ ۱۳۰۳۹ رجالہ موثقون،مجمع الزوائد باب فی المس القران : ۱۵۱۲

(۳) نسائی تحقیق الالبانی باب اباحۃ الکلام فی الطواف : ۲۹۲۲ صحیح

غسل کا بیان

سارے بدن پر پاک پانی کے بہانے کو شریعت میں غسل کہتے ہیں، غسل کا حکم سورہ مائدہ آیت نمبر:٦ سے ماخوذ ہے، ارشاد ربانی ہے: اگر تم جنابت کی حالت میں ہو تو سارا بدن پاک کرو۔

جنابت ایک ایسی حالت ہے جس کی بنا پر طبیعت میں ایک قسم کی پژمردگی چھا جاتی ہے، پورے بدن میں ایک طرح کی سستی و تاریکی کی کیفیت معلوم ہوتی ہے، ایسے موقع پر ایک انسان خود فطری طور پر غسل اور صفائی بدن کی ضرورت محسوس کرتا ہے، چاہتا ہے کہ جس قدر صفائی بدن اور جتنے اعضاء کی صفائی اس کے بس میں ہو، سب کچھ کر گذرے پھر ممکنہ حد تک صفائی بدن کے بعد انسان طبعی طور پر اپنے آپ کو ہشاش و بشاش محسوس کرتا ہے اور مزاج میں ایک قسم کی لطافت پاتا ہے، مزید برآں ایک شرعی حکم کی تعمیل کرنے کی بناء پر اخروی ثواب بھی پاتا ہے اور اپنی روحانیت کو جلا بھی بخشتا ہے(۱) رسول اللہ ﷺ کا برحق ارشاد ہے: صفائی وستھرائی، آدھا ایمان ہے(۲)

غسل کے فرائض

غسل کے فرائض تین ہیں:

(۱) کلی کرنا

(۲) ناک میں پانی ڈالنا

(۳) پورے بدن کو اس طور پر دھونا کہ بال برابر جگہ بھی خشک نہ رہنے پائے۔

---

(۱) مستفاد از حجة الله البالغة : ۱/۲۱۲، ۲۱۳

(۲) مسلم باب فضل الوضوء: ۵۵٦

حکم خداوندی ہے: اگر تم جنابت کی حالت میں ہو تو خوب خوب پاکی حاصل کرو (مائدہ:۶) اس حکم خداوندی کی تعمیل صحیح معنوں میں اسی وقت ہوگی جب کہ بدن کے ممکنہ حصوں کو پانی کے ذریعہ پاک کرلیا جائے، منہ کے اندرونی حصہ کو کلی کے ذریعہ اور ناک کے ابتدائی اندرونی حصہ کو پانی چڑھا کر پاک کرنے میں کوئی دشواری ومشقت نہیں ہوتی؛ بلکہ یہ عمل بآسانی ممکن ہے اس لئے آیت کریمہ کے حکم کے تحت کلی کرنا، اور ناک میں پانی چڑھانا بھی ضروری ہوا۔

حضرت علیؓ سے مروی ہے کہ نبی ﷺ نے ارشاد فرمایا: جس نے جنابت کا غسل کرتے ہوئے ایک بال کے برابر بھی کوئی جگہ خشک رہنے دی تو اللہ تعالی اس کو آگ سے اس طرح اس طرح عذاب دے گا (۱) حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے ارشاد فرمایا: ہر بال کے نیچے جنابت کا اثر ہوتا ہے، لہذا بالوں کو دھوؤ اور کھال کی بھی صفائی کرو (۲)

بدن کا مکمل حصہ کھال اور بال سے ڈھکا ہوا ہے، ناک کے ابتدائی اندرونی حصہ میں بھی کھال اور بال موجود ہوتے ہیں، منہ کا اندرونی حصہ بھی کھال سے ڈھکا ہوتا ہے، پس اس حکم نبوی کی بنا پر بدن کے ان تمام حصوں کا دھونا اور ان کی صفائی کرنا ضروری ہوا۔

حضرت ابن عباسؓ نے اس جنبی کے بارے میں جو غسل جنابت میں کلی کرنا اور ناک میں پانی چڑھانا بھول گیا تھا، یہ فتوی دیا تھا کہ وہ کلی کرے اور ناک میں پانی چڑھائے اور نماز بھی دہرائے۔ (۳)

فائدہ: اگر عورت اپنے سر کے بالوں کی چٹیا باندھی ہوئی ہو تو غسل کے لیئے چٹیا کھولنا ضروری نہیں بلکہ محض بالوں کی جڑوں تک پانی پہنچا دینا کافی ہے، البتہ اگر چٹیا اتنی کس کر

---

(۱) ابوداؤد باب الغسل من الجنابة: ۲۴۹. صحیح : التلخیص الحبیر : ۱/۳۸۲)

(۲) ابوداؤد: باب غسل من الجنابة : ۲۴۸حسن : الجوھر النقی ۱/۱۷۸

(۳) دار قطنی:۴۲۳:باب ماروی فی المضمضة والاستنشاق فی غسل الجنابة. حسن: اعلاء ۱/۲۰۷

باندھی ہوئی ہے کہ چٹیا کھولے بغیر پانی جڑوں تک نہیں پہنچ سکتا تو پھر اسے کھولنا ضروری ہے اور جب چٹیا کھول دی جائے تو اب صرف بالوں کی جڑوں کو تر کرنا کافی نہیں بلکہ سر کے مکمل بالوں کا دھونا ضروری ہے۔

حضرت ام سلمہؓ سے روایت ہے کہ انہوں نے رسول اللہ ﷺ سے عرض کیا: یارسول اللہ ﷺ! میں ایک ایسی عورت ہوں جو اپنے سر کی چٹیا کس کر باندھتی ہوں، کیا جنابت کے غسل میں اسے کھولوں؟ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: تمہارے لئے یہ کافی ہے کہ اس پر تین چلو پانی ڈالو، پھر پورے بدن پر پانی ڈالو تو اس طرح تم پاک ہو جاؤ گی (۱)۔

حضرت جابرؓ ارشاد فرماتے ہیں، جب عورت غسل جنابت کرے تو اپنے بالوں کو نہ کھولے بلکہ بالوں کی جڑوں پر پانی بہائے اور ان کو تر کرلے۔ (۲)

غسل کی سنتوں کا بیان

غسل کی سنتیں یہ ہیں (۱) غسل کرنے والا پہلے اپنے دونوں ہاتھوں کو دھوئے (۲) پھر اپنی شرمگاہ کو دھوئے (۳) اور نجاست کو زائل کرے اگر اس کے بدن پر ہو (۴) پھر نماز کے وضو کی طرح وضو کرے؛ مگر پاؤں ابھی نہ دھوئے (۵) پھر اپنے سر پر پانی بہائے (۶) اور پورے بدن پر تین مرتبہ پانی بہائے (۷) پھر اس جگہ سے الگ ہو جائے (۸) پھر دونوں پاؤں کو دھوئے۔

یہ آٹھ کام اسی ترتیب سے کرے، پاؤں پہلے اس لئے نہ دھوئے کہ غسل کا پانی پاؤں کے پاس جمع ہوگا، اور پاؤں کو آلودہ کردے گا اس لئے اس کو اخیر میں دھوئے؛ البتہ پانی

(۱) مسلم : باب حکم ضفائر المغتسلہ : ۷۷۰

(۲) دارمی :باب اغتسال الحائض ۱۲۰۶ صحیح : اعلاء ۱/۲۰۳

پاؤں کے پاس جمع نہ ہوتا ہو تو پہلے بھی پاؤں دھوسکتا ہے، حدیث شریف میں اسی ترتیب سے ان سنتوں کا ذکر ہے، حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ جب جنابت کا غسل فرماتے تو پہلے اپنے ہاتھ دھوتے پھر دائیں ہاتھ سے بائیں ہاتھ پر پانی ڈال کر اپنی شرمگاہ دھوتے پھر وضو فرماتے، جیسا کہ آپ ﷺ نماز کے لئے وضو فرمایا کرتے پھر پانی لیتے اور اپنے بالوں کی جڑوں میں انگلیاں ڈالتے جب محسوس فرماتے کہ پانی بالوں کی جڑ تک پہنچ گیا تو اپنے سر پر پانی کے تین چلو ڈالتے پھر پورے بدن پر پانی ڈالتے پھر دونوں پاؤں دھوتے (۱)

فائدہ: کھلے مقام پر جہاں لوگوں کی نگاہیں پڑسکتی ہوں، وہاں غسل کیا جارہا ہو تو ستر چھپا کر غسل کرنا واجب اور ضروری ہے، ارشاد نبوی ہے: جب تم میں سے کوئی کھلے مقام پر غسل کرے تو اپنے کپڑے سے پردہ کرے یا پھر اپنے اونٹ یا دیوار کے کسی حصہ کی اوٹ میں آجائے (۲) البتہ ایسی جگہ جہاں لوگوں کی نگاہیں پڑنے سے مکمل حفاظت ہو وہاں نہانے یا قضائے حاجت وغیرہ کی غرض سے برہنہ ہونا جائز ہے، احادیث میں حضرت ایوب علیہ السلام (۳) حضرت موسیٰ علیہ السلام (۴) اسی طرح ایک موقع پر خود رسالت مآب ﷺ (۵) سے غسل کی ضرورت سے مکمل بے لباس ہوجانے کی جانب اشارہ ملتا ہے، لیکن ایسے موقع پر بھی ستر ڈھکا رہنا بہتر ہے، ایک موقع پر آپؐ نے ارشاد فرمایا: جب تک ممکن ہوسکے تمہارے ستر کو کوئی نہ دیکھنے پائے، صحابی نے عرض کیا جب ہم تنہاء ہوں تو؟ ارشاد فرمایا: اللہ تعالی لوگوں سے زیادہ حیا کرنے کے حقدار ہیں۔ (۶)

---

(۱) مسلم : ۷۴۴ باب صفة غسل الجنابة

(۲) مسند بزار : ۷۹۹ ۴ صحیح :مجمع الزوائدباب التستر عند الاغتسال : ۱ / ۲۶۸

(۳) بخاری :باب من اغتسل عریا نا وحده : ۲۷۸ ، ۲۷۹

(۴) بخاری :باب من اغتسل عریا نا وحده : ۲۷۸ ، ۲۷۹

(۵) طبرانی کبیر : ۲۰۱۷۳ ،حسن : مجمع الزوائد :باب التستر عند الاغتسال : ۱۴۵۶ ، ۱۴۵۹

(۶) ترمذی :باب ماجاء فی حفظ العورة : ۲۷۶۹ ،حسن : امام ترمذیؒ

وہ چیزیں جن سے غسل واجب ہوتا ہے

۱) منی کا نکلنا

شہوت اور کودنے کی کیفیت کے ساتھ منی نکلے تو غسل واجب ہو جاتا ہے، خواہ مرد سے نکلے یا عورت سے، بحالت نیند نکلے یا بیداری میں، شہوت کی قید' منی کی اصل حقیقت کی طرف نظر کرتے ہوئے لگائی گئی ہے، منی اصل میں اس مادہ کو کہا جاتا ہے جو انسان کی شرمگاہ سے شہوت کے ساتھ نکلتا ہے۔

حضرت عائشہؓ سے منقول ہے: منی وہ بھاری بھر کم پانی کہلاتا ہے جو سرچشمہ شہوت ہوتا ہے، اور جس کے نکلنے پر غسل کا وجوب ہوتا ہے، (۱)

قرآن پاک نے جنبی ہو جانے پر پاکی حاصل کرنے کا حکم دیا ہے (۲) اور جنابت لغت میں اس حالت کو کہا جاتا ہے، جس میں انسان سے شہوت کے ساتھ منی کا خروج ہوا ہو، کود کر نکلنے کی قید بھی، منی کی اصل حقیقت ہی کے اعتبار سے ہے، ارشاد ربانی ہے، : وہ (انسان) ایک اچھلتے پانی سے پیدا کیا گیا ہے، (۳)

حضرت قتادہ وعکرمہؒ فرماتے ہیں: منی اس اچھلنے والے پانی کا نام ہے جس میں شہوت ہوتی ہے اور جس سے انسان کی پیدائش ہوتی ہے، (۴) نبی ﷺ نے حضرت علیؓ سے فرمایا تھا، جب تم سے منی اچھل کر نکلے تو غسل جنابت کرو اور اچھلے بغیر نکلے تو غسل کرنے کی ضرورت نہیں۔ (۵)

---

(۱) الاوسط لابن المنذر : جماع ابواب الاحداث : ۲۵

(۲) مائدہ:۶

(۳) سورہ طارق : ۶

(۴) مصنف عبدا لرزاق باب المذی: ۶۱۱ .لم یتعقب علیه الحافظؒ : الدرایة ۱/ ۵۲

(۵) مسند احمد : ۸۴۷ السند محتج به : اعلاء ۱/ ۲۱۱

سنن ابوداؤد میں ہے: رسول اللہ ﷺ نے حضرت علیؓ سے فرمایا کہ جب تم پانی کے اچھلنے کو دیکھو تو غسل کر لو(۱) منی جب اس کیفیت کے ساتھ نکلتی ہے تو شہوت ضرور موجود رہتی ہے۔

ایک شخص حضرت ابن عباسؓ کی مجلس میں حاضر ہوا اور اپنی مشکل سنائی کہ اسے ہر دفعہ پیشاب کے بعد کچھ نہ کچھ منی جیسا مادہ نکل جاتا ہے؟ حضرت ابن عباسؓ نماز میں مصروف تھے، ان کے شاگردوں نے اس شخص کو غسل کرنے کا فتویٰ دیا، وہ واپس لوٹنے لگا، اتنے میں حضرت ابن عباسؓ نماز سے فارغ ہوئے اپنے شاگردوں کی خوب سرزنش کی، پھر اس آدمی کو بلایا اور پوچھا کہ کیا تم اس مادہ کے نکلتے وقت اپنے دل میں شہوت محسوس کرتے ہو؟ اس نے جواب دیا نہیں، پھر آپؓ نے فرمایا: اس مادہ کا خروج تمہارے پیٹ کی کسی برودت کے سبب سے ہے، شہوت سے نہیں، تمہارے لئے وضو کافی ہے۔(۲)

ایک دفعہ حضرت ام سلیمؓ خدمت اقدس میں حاضر ہو کر عرض کیا: یارسول اللہؐ: مرد کی طرح عورت بھی جب کوئی شہوانی خواب دیکھے تو کیا اس پر غسل واجب ہو جاتا ہے؟ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: کیا شہوت محسوس ہوتی ہے، عرض کیا: شاید محسوس ہوتی ہے، ارشاد فرمایا: کیا تری بھی نظر آتی ہے؟ عرض کیا: شاید نظر آتی ہے، اس پر آپ ﷺ نے فرمایا: تو پھر غسل کر لے۔(۳)

منی کا اپنے مستقر و مرکز سے شہوت کے ساتھ اچھل کر علیحدہ ہو جانا وجوب غسل کے لئے کافی ہے، باہر نکلتے وقت شہوت کا پایا جانا شرط نہیں، احتیاط کا تقاضا یہی ہے، البتہ منی

(۱) ابو داؤد تحقیق الالبانی : باب فی المذی : ۲۰۶ صحیح

(۲) کنزالعمال:فصل فی نواقض الوضوء : ۲۷۰۸۳.حسن

(۳) کنز العمال موجب الغسل : ۲۷۳۳۵. مصنف ابن ابی شیبہ : باب فی المرأۃ تری فی منامھا مایر ی الرجل :۸۸۷ الحدیث متصل : محمد عوامہ

اپنے مستقر سے بھی بے شہوت نکلی ہے تو غسل واجب نہیں جیسے کسی وزنی چیز اٹھانے سے یا کسی بیماری کی بنا پر منی کا خروج ہوا ہو یا غسل جنابت سے فراغت کے بعد منی نکلی ہو؛ حالاں کہ احتلام اور غسل جنابت کے درمیان سونے کا وقفہ یا چہل قدمی کرنے کا عمل یا پیشاب کرنے کا معاملہ پیش آچکا تھا، تو ان تمام صورتوں میں باوجود خروج منی کے غسل واجب نہیں ہوگا، اس لئے کہ یہاں نہ شہوت کا وجود ہے نہ ہی اچھل کر نکلنے کا کوئی تصور ہے۔ ارشاد نبوی ہے: جب تم میں کوئی شخص غسل کرلے پھر اس کے عضو تناسل سے کوئی چیز (منی وغیرہ) نکلے تو وہ صرف وضو کرلے (غسل کی ضرورت نہیں)۔(۱)

کوئی انسان نیند سے بیدار ہوا اور اپنے کپڑے یا بدن وغیرہ پر تری دیکھا تو اس پر غسل کرنا ضروری ہے خواہ اسے بدخوابی یاد ہو یا نہ ہو، البتہ اگر تری منی کی نہ ہو؛ بلکہ پیشاب وغیرہ کی وجہ سے ہے تو غسل ضروری نہیں، حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ سے سوال کیا گیا: آدمی تری پاتا ہے؛ مگر بدخوابی اسے یاد نہیں، فرمایا: وہ غسل کرے گا، پوچھا گیا: آدمی سمجھتا ہے کہ اسے بدخوابی ہوئی ہے مگر وہ تری نہیں پاتا، فرمایا وہ غسل نہیں کرے گا۔(۲)

(۲) مرد اور عورت کے ختنہ کا آپس میں مل جانا یعنی یہ کہ آدمی کا حشفہ (عضو تناسل کا اوپری حصہ) عورت کی شرمگاہ میں داخل ہو جائے تو غسل واجب ہو جاتا ہے، خواہ انزال ہوا ہو یا نہ ہوا ہو، حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: جب آدمی اپنی بیوی کے چار شاخوں کے مابین بیٹھ جائے پھر زور لگائے تو غسل واجب ہو جاتا ہے خواہ انزال نہ ہوا ہو۔(۳)

---

(۱) (طبرانی معجم کبیر : ۳۱۱۳ له شاهد حسن : اعلاء ۱/۲۱۲

(۲) (ابوداؤد تحقيق البانى باب فى الرجل يجد البلة فى منامه : ۲۳۶ .صحيح

(۳) مسلم : باب نسخ الماء من الماء : ۸۰۹

بعض صحابہ کا خیال تھا کہ جماع سے بغیر انزال کے غسل واجب نہیں ہوتا، لیکن حضرت عمرؓ نے اپنے دور خلافت میں اس سلسلہ میں عمل نبوی معلوم کرنے کے لئے ازواج مطہرات سے رجوع فرمایا، حضرت عائشہؓ نے یہ بات کہلا بھیجیں کہ جب مرد اور عورت کا ختنہ باہم مل جائے تو بہر حال غسل واجب ہو جاتا ہے، (خواہ انزال ہو یا نہ ہو) اس پر حضرت عمرؓ نے عام اعلان کرادیا کہ آج کے بعد جو کوئی بھی ام المؤمنین کی اس رائے کے برخلاف رائے اختیار کرے گا میں اس کو سخت سزا دونگا۔ (۱)

۳) حیض اور نفاس کے بند ہونے کے بعد

ارشاد ربانی ہے: حیض میں عورتوں کے قریب نہ جاؤ، جب تک وہ پاک وصاف نہ ہوں پھر جب وہ پاک وصاف ہولیں تو ان کے قریب جاؤ۔ (۲) حیض کے بند ہونے پر غسل واجب نہ ہوتا تو پاک وصاف ہونے تک شوہروں کو ان کے جائز حق (جماع) سے نہ روکا جاتا۔ (۳)

حضرت فاطمہ بن ابی حبیشؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا: جتنے روز تمہیں پہلے حیض آیا کرتا تھا، اتنے روز نماز چھوڑ دو پھر غسل کر کے نماز پڑھو۔ (۴) بالاجماع نفساء کا حکم بھی وہی ہے جو حائضہ عورت کا ہے، حضرت معاذؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا، جب نفساء کے (مثال کے طور پر) سات دن گذر جائیں پھر وہ پاک ہو جائے تو وہ غسل کرلے اور نماز پڑھنا شروع کردے۔ (۵)

---

(۱) طحاوی : باب الذی یجامع ولا ینزل : ۳۳۵

(۲) سورۃ البقرۃ : ۲۲۲

(۳) (تبیین الحقائق : ۱/۱۷)

(۴) (بخاری :باب اذا حاضت فی شهر ثلاث حیض: ۳۲۵

(۵) (مستدرک حاکم :کتاب الطهارۃ : ۶۲۶ مقبول : الجوهر النقی : باب النفاس ۱/۳۴۳

۴) باجماع امت زندہ مسلمان پر اپنے مردہ بھائی کو غسل دینا فرض کفایہ ہے (البتہ وہ شہید جو بحالت پاکی شہادت کی موت مرا ہو وہ اس سے مستثنی ہے، اسے غسل نہیں دیا جاتا) ایک شخص سواری سے گر کر وفات پا گیا تھا آپ ﷺ نے اس کے لواحقین سے فرمایا: اسکو پانی اور بیری کے پتوں سے غسل دو اور دو کپڑوں میں کفن دو۔(۱) خود رسالت مآب ﷺ کو دنیا سے پردہ فرمانے کے بعد صحابہؓ نے غسل دیا تھا، حضرت ابوبکرؓ کو ان کی وفات پر غسل دیا گیا، غرض کسی مسلمان کو بے غسل دفن نہیں کیا گیا، یہ بجائے خود اس بات کی دلیل ہے کہ میت کو غسل دینا ضروری ہے۔

وہ چیزیں جن کا حالت جنابت میں کرنا ناجائز ہے

۱) نماز پڑھنا یا سجدۂ تلاوت کرنا

ارشاد ربانی ہے: اگر تم جنابت کی حالت میں ہو تو سارا بدن پاک کرو(۲)

ارشاد نبوی ہے: اللہ تعالی پاکیزگی کے بغیر کوئی نماز قبول نہیں کرتا۔(۳)

۲) بیت اللہ کا طواف کرنا

ارشاد نبوی ہے: بیت اللہ کا طواف بھی نماز ہی ہے۔(۴) بڑی ناپاکی کی حالت میں اگر کسی نے بیت اللہ کا طواف کر ہی لیا تو اعادہ ضروری ہے، طواف کا اعادہ نہ کیا تو دم دینا ضروری ہے۔

۳) قرآن پاک چھونا

ارشاد ربانی ہے: اس قرآن کو نہ چھوئیں مگر پاک لوگ۔(۵)

---

(۱) بخاری :باب الكفن في ثوبين : ۱۲۶۵

(۲) مائدہ : ۶

(۳) مسلم : باب وجوب الطهارة للصلاة : ۵۵۷

(۴) نسائی شریف تحقیق الالبانی: باب اباحة الكلام في الطواف : ۲۹۲۲ : صحيح

(۵) واقعہ : ۷۹

ارشاد نبوی ہے: قرآن پاک کو پاک آدمی ہی چھوئے۔(۱)

۴) قرآن پاک کی تلاوت کرنا:

رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: حائضہ اور جنبی کچھ بھی قرآن نہ پڑھیں۔(۲) حضرت علیؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ ہم کو حالت جنابت کے علاوہ ہر حالت میں قرآن پڑھایا کرتے تھے۔(۳)

عبداللہ بن رواحہؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ہم کو حالت جنابت میں قرآن پڑھنے سے منع فرمایا ہے۔(۴) البتہ بقصد ذکر بسملہ کا پڑھنا، سورۃ فاتحہ، آیت الکرسی وغیرہ کی تلاوت کرنا درست ہے، اسی طرح بطور دعا آیات قرآنی کا پڑھنا بھی ممنوع نہیں، حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ ہمہ وقت ذکر فرمایا کرتے تھے۔(۵)

۵) مسجد سے گذرنا یا مسجد میں اعتکاف کرنا

حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں: رسول اللہ ﷺ ایک دفعہ تشریف لائے تو دیکھا کہ صحابہ کے گھروں کے دروازے مسجد میں کھلے ہوئے ہیں، اس پر آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ان گھروں کے (یعنی ان کے دروازوں کے) رخ کو مسجد سے پھیر دو، اس لئے کہ میں کسی حائضہ اور جنبی کے لئے مسجد حلال نہیں سمجھتا۔(۶)

---

(۱) طبرانی عن ابن عمر : ۱۳۰۳۹ .رجاله موثقون : مجمع الزوائد : باب فی مس القرآن : ۱۵۱۲

(۲) ترمذی : باب ماجاء فی الجنب والحائض انهما لا یقران القران : ۱۲۱ .حسنه المنذریؒ :نهایة المحتاج : ۱/۲۲۱

(۳) ترمذی : باب الرجل یقرأ القران علی کل حال : ۱۳۶ .حسن صحیح : امام ترمذیؒ

(۴) دارقطنی : باب فی النهی للجنب والحائض عن قرأة القرآن: ۴۴۰. اسناده صالح : امام دارقطنیؒ

(۵) مسلم : باب ذکر الله تعالی فی حال الجنابة : ۸۵۲

(۶) ابوداؤد : باب فی الجنب یدخل المسجد : ۲۳۲ . صححه ابن خزیمه وحسنه ابن القطان فتح الغفار :۳/۱۰۰

مسجد کے رخ پر گھروں کے دروازے کھلتے ہوں تو ظاہر بات ہے کہ غسل جنابت یا غسل حیض کے لئے پانی لانے کی ضرورت سے اسی طرح دیگر گھریلو ضروریات سے حالت حیض و جنابت میں مسجد سے گذرنے کی نوبت آئے گی، جس سے مسجد کے احترام میں فرق پڑتا ہے، اس لئے آپ ﷺ نے دروازوں ہی کے رخ کو بدل دینے کا حکم فرمایا۔☆

حالت جنابت میں یہ امور ممنوع نہیں

سونا

رات یادن کے اوقات میں جنابت لاحق ہوجائے تو فوراً غسل جنابت کرنا ضروری نہیں ہے بلکہ بے غسل کیے سوئے رہنا بلا کراہت درست ہے، البتہ فوراً غسل کر لینا بہتر ضرور ہے، رسول اللہ ﷺ کبھی علی الفور غسل فرمالیا کرتے تھے اور کبھی صرف وضو پر اکتفاء فرمایا کرتے تھے، (۱) اور کبھی ویسے ہی بے غسل اور بے وضو کیے سورہتے تھے، نماز کے لئے جب بیدار ہوتے تب غسل فرمالیا کرتے۔ (۲)

کھانا پینا

حالت جنابت میں کھانے پینے کی ضرورت ہو تو وضو کرکے یا محض ہاتھ منہ دھوکر کھالینے میں کوئی حرج نہیں، دونوں ہی طریقے آپ ﷺ سے ثابت ہیں۔ (۳)

☆ یہی امام مالکؒ کا بھی مسلک ہے امام شافعیؒ واحمدؒ کے نزدیک صرف مسجد میں ٹھہرنا اور رکنا منع ہے مسجد سے ہوکر گذرنا جائز ہے۔ الفقہ الاسلامی: ۱/ ۵۳۹۔ ۶۲۶

(۱) مسلم :باب جواز. نوم الجنب : ۷۳۱

(۲) ابن ماجه تحقيق البانی :باب فی الجنب ينام : ۵۸۱. صحيح

(۳) مسلم :باب جواز نوم الجنب : ۷۲۶. دار قطنی : باب الجنب اذا اراد ان ينام او يا كل : ۴۶۵. صحيح : امام دار قطنی

دوبارہ جماع کرنا

کسی کے یہاں متعدد بیویاں ہوں اور وہ ایک ہی شب میں ان سب سے قربت کرنا چاہتا ہو تو ایسا بھی کیا جاسکتا ہے کہ ہر بیوی کے پاس سے فارغ ہونے کے بعد علیحدہ غسل کرے یا اخیر میں صرف ایک غسل پر اکتفاء کرے، دونوں عمل سنت سے ثابت ہیں (۱) ایسے ہی دو جماع کے درمیان وضو کر لینا، طبیعت کی چستی ونشاط کا باعث ہے (۲) ویسے وضو نہ بھی کرے تو کوئی مضائقہ نہیں۔ (۳)

مصافحہ ومعانقہ کرنا

جنابت ایک معنوی ناپاکی ہے، جنابت کی بنا پر جنبی کا ظاہری بدن ناپاک نہیں ہوجاتا، وہ بے جھجک مصافحہ ومعانقہ کرسکتا ہے، اس کے مصافحہ ومعانقہ کرنے سے دوسرے کا ہاتھ یا بدن ناپاک نہیں ہوتا۔ حضرت حذیفہؓ سے مروی ہے کہ ایک موقع پر ان کا رسول اللہ ﷺ سے آمنا سامنا ہوا، آپ ﷺ ان کی طرف (ملاقات کی غرض سے) متوجہ ہوئے، انہوں نے عرض: کیا یا رسول اللہ! میں جنبی ہوں، آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: مؤمن نجس نہیں ہوتا۔ (۴)

فائدہ: غسل جنابت میں بلاضرورت محض سستی وکاہلی کی بناء پر تاخیر کی عادت بنالینا اور نمازوں کے اوقات کی پرواہ نہ کرنا سخت مکروہ اور ملائکہ رحمت سے دوری کا سبب ہے، رسول اللہ ﷺ ارشاد فرماتے ہیں، ملائکہ اس گھر میں داخل نہیں ہوتے جس میں تصویر یا کتا یا جنبی ہو۔ (۵)

---

(۱) مسلم : باب جواز نوم الجنب : ۳۴۴ ابو داؤدتحقیق الالبانی : باب فیمن یغتسل عند کل واحدة غسلاً : ۵۹۰ حسن

(۲) مستدرک حاکم : کتاب الطهارة : ۵۴۲ . صحیح : امام حاکمؒ وذهبیؒ

(۳) طحاوی : باب الجنب یرید النوم او الاکل او الشرب اوالجماع : ۷۷۴

(۴) ابوداؤد : تحقیق الالبانی باب فی الجنب یصافح: ۲۳۰ . صحیح

(۵) ابوداؤد : باب فی الجنب یوخر الغسل : ۲۲۷ .صحیح :الترغیب والترهیب : کتاب الطهارة : ۱/ ۹۰

وہ چیزیں جن کے لئے غسل کرنا مسنون یا مستحب ہے

۱) جمعہ کے روز

جمعہ کے روز غسل کرنے کی نبی ﷺ نے تاکید فرمائی ہے، حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا، جب تم میں سے کوئی شخص جمعہ کے لئے آئے تو غسل کرے۔(۱) اس حدیث میں اگرچہ نبی ﷺ نے جمعہ کے روز غسل کرنے کا حکم دیا ہے بلکہ بخاری کی ایک حدیث میں نبی ﷺ کے یہ الفاظ بھی ہیں کہ جمعہ کا غسل ہر بالغ آدمی کے لئے واجب ہے۔(۲)

لیکن دوسری احادیث کی روشنی میں اس واجب کو سنت قرار دیا جائے گا، حضرت سمرہ بن جندبؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا: جس نے جمعہ کے لئے وضو کیا تو اس نے بہت اچھا کیا اور جس نے غسل کیا تو اس نے اور اچھا کیا،(۳) حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا جس نے وضو کیا اور اچھی طرح وضو کیا پھر وہ جمعہ کے لئے آیا اور خاموش رہ کر خطبہ سنتا رہا تو اس کے دونوں جمعوں کے درمیان اور تین مزید دنوں کے گناہ معاف کردئے جائیں گے۔(۴)

فائدہ: غسل جمعہ کے آغاز کے بارے میں حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں: صحابہ سخت محنت کش تھے، موٹے کپڑے پہنا کرتے تھے، اپنی پیٹھ پر بوجھ اٹھاتے تھے، اس زمانے میں مسجد نبوی نہایت تنگ اور نیچی چھتوں والی تھی، ایک جمعہ سخت گرمی کے موسم میں رسول پاک ﷺ

---

(۱) بخاری : باب فضل الغسل یوم الجمعة : ۸۷۷

(۲) بخاری : باب فضل الغسل یوم الجمعة : ۸۷۹)

(۳) ابوداؤد تحقیق الالبانی باب فی الرخصة فی ترک الغسل یوم الجمعة : ۳۵۴. حسن

(۴) مسلم : باب فضل من استمع وانصت فی الخطبة : ۲۰۲۴

مسجد تشریف لائے، لوگ پسینہ میں شرابور تھے اور ایک کریہہ قسم کی بو پوری مسجد میں پھیل گئی تھی، جس سے لوگوں کو تکلیف ہو رہی تھی، یہ صورتحال دیکھ کر رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: اے لوگو! جب یہ دن آئے تو نہا دھو کر آیا کرو۔(۱) اس حدیث کو سامنے رکھ کر فقہاء کرام نے ہر ایسی عبادت کے موقع سے جس میں لوگوں کا مجمع ہوتا ہے وہاں غسل کرنے کو مسنون قرار دیا ہے، جیسے کسوف وخسوف کا موقع، نماز استسقاء کا موقع اور عیدین کا موقع (۲)

۲) عیدین کے روز

حضرت ابن عباسؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ عید الفطر اور عید الاضحیٰ کے روز غسل فرمایا کرتے تھے۔(۳)

۳) احرام باندھنے کے وقت

حضرت زید بن ثابتؓ سے روایت ہے کہ انہوں نے نبی ﷺ کو دیکھا کہ آپ ﷺ نے احرام کے لئے کپڑے اتارے اور غسل فرمایا۔(۴)

۴) مکہ معظمہ میں داخل ہوتے وقت

حضرت ابن عمرؓ کے بارے میں مروی ہے کہ وہ جب بھی مکہ معظمہ تشریف لاتے تو ذی طوی میں رات گذارتے اور صبح کے وقت غسل فرماتے اور کہتے رسول اللہ ﷺ اسی طرح فرمایا کرتے تھے۔(۵)

---

(۱) ابو داؤد تحقیق الالبانی : باب فی الرخصة فی ترک الغسل یوم الجمعة : ۳۵۳ . حسن

(۲) البحر الرائق : ۱/ ۲۴۰. ۲۴۹

(۳) ابن ماجه : باب ماجاء فی الاغتسال فی العیدین : ۱۳۱۵ هذا الحدیث مروی من طرق : البدر المنیر :۵/ ۴۱

(۴) ترمذی تحقیق الالبانی : باب الاغتسال عند الاحرام : ۸۳۰. صحیح

(۵) بخاری : باب الاغتسال عند دخول مکة : ۱۵۷۳

۵)وقوف عرفات کے وقت

حضرت نافع سے روایت ہے کہ حضرت عبداللہ بن عمرؓ احرام باندھنے سے پہلے، مکہ معظّمہ میں داخل ہونے اور عرفات کی شام کو وقوف کرنے کے لئے غسل فرمایا کرتے تھے۔ (۱)

۶)میت کو غسل دینے کے بعد

جو شخص میت کو غسل دے اس کے لئے غسل کرنا مستحب ہے، حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا: جو میت کو غسل دے اسے غسل کرنا چاہئے اور جو شخص اٹھائے اسے وضو کرنا چاہئے۔(۲)

نبی ﷺ کے اس حکم کو استحباب پر محمول کیا گیا، کیوں کہ حضرت ابن عمرؓ سے روایت ہے کہ ہم میت کو غسل دیا کرتے تھے پھر ہم میں سے کچھ لوگ غسل کر لیتے تھے اور کچھ نہیں۔(۳) حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں: رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: جب تم کسی میت کو غسل دو تو غسل دینے کی وجہ سے تم پر غسل لازم نہیں، اس لئے کہ تمہارا میت (ظاہری لحاظ سے) پاک حالت میں مرتا ہے، تمہارے لئے اتنا کافی ہے کہ اپنے ہاتھ دھولو(۴)

حضرت ابوبکر صدیقؓ کا جب انتقال ہوا تو آپؓ کی بیوی حضرت اسماء بنت عمیسؓ نے آپؓ کو غسل دیا، غسل کے بعد وہ باہر آئیں اور جو مہاجرین صحابہ وہاں موجود تھے ان سے دریافت کیا، آج سخت سردی ہے اور میرا روزہ بھی ہے، کیا میرے لئے غسل کرنا ضروری ہے؟ انہوں نے کہا: نہیں۔(۵)

---

(۱) موطا مالک : باب الغسل للاھلال: ۷۱۰

(۲) صحیح ابن حبان مع حواشی الارنووط باب نواقض الوضوء : ۱۱۶۱. صحیح

(۳) السنن الکبری للبیھقی : باب الغسل من غسل المیت : ۱۵۲۱. صحیح : التلخیص الحبیر: ۱/۳۷۳

(۴) مستدرک مع تعلیقات الذھبی کتاب الجنائز: ۱۴۲۶. صحیح

(۵) موطا امام مالک : باب غسل المیت :۵۲۵

۷) قبول اسلام کے وقت

حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ ثمامہ بن اثال جب اسلام لائے تو آپ ﷺ نے صحابہ سے فرمایا: انہیں فلاں قبیلہ کے باغ میں لے جاؤ اور انہیں غسل دو۔(۱) حضرت قتادہؓ فرماتے ہیں: میں رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں اسلام لانے کی غرض سے حاضر ہوا، آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا، اے قتادہ پانی اور بیری کی پتیوں سے غسل کرلو اور اپنے سر سے کفر کے بالوں کو اتروالو، آپ ﷺ کا یہ بھی معمول رہا ہے کہ جو آدمی مسلمان ہوتا اسے آپ ﷺ ختنہ کروانے کا حکم دیتے اگرچہ وہ کتنا ہی معمر ہوتا۔(۲)

۸) بے ہوشی سے افاقہ پر

رسول اللہ ﷺ نے اپنے مرض الوفات میں ایک موقع پر بے ہوشی سے افاقہ ہونے پر بار بار تین دفعہ غسل فرمایا تھا۔(۳)

❁❁❁❁❁❁❁❁❁

(۱) احمد : ۸۰۲۴ حدیث قوی : تعلیق شعیب الارنووط

(۲) طبرانی کبیر : ۱۵۳۶۳ رجاله ثقات : مجمع الزوائد : باب غسل الکافر اذا اسلم :۱۵۶۳

(۳) بخاری : باب انما جعل الامام لیوتم به : ۶۸۷

تیمّم کا بیان

تیمّم کے لغوی معنی قصد وارادہ کے ہیں، اسی معنی میں لفظ تیمّم سورۃ بقرہ کی آیت: ۲۶۷ میں استعمال ہوا ہے، ارشاد باری تعالی ہے: اور اس میں سے (یعنی اس آمدنی میں سے) گندی اور خراب چیز کو خرچ کرنے کا قصد نہ کرو۔

تیمّم کے اصطلاحی معنی ہیں عبادت کی نیت سے پاک جنس زمین پر ہاتھ پھیر کر اپنے چہرے اور ہاتھوں کا کہنیوں سمیت مسح کرنا۔

تیمّم کی مشروعیت

غزوۂ بنو مصطلق ۶ ھ میں دوران سفر حضرت عائشہؓ کا ہار گم ہو گیا تھا، ہار تلاش کرنے کے لئے ایسی جگہ قیام کرنا پڑا جہاں پانی موجود نہ تھا، نماز کا وقت بھی ہو گیا تھا، (پریشانی کے عالم میں) بعض صحابہ نے وضو کئے بغیر ہی (جیسے تیسے) نماز پڑھ لی، پھر جب خدمت اقدس میں پہنچے تو اس صورتحال کی شکایت کی اس پر تیمّم کا حکم نازل ہوا۔(۱)

تیمّم، وضو اور غسل دونوں کی نیابت کرسکتا ہے

تیمّم حدث اصغر اور حدث اکبر دونوں کو دور کرنے کے لئے کیا جا سکتا ہے یعنی تیمّم وضو اور غسل کی نیابت کرسکتا ہے، اللہ تعالی نے پانی کی عدم دستیابی کی صورت میں قضاء حاجت ایسے ہی جماع کے بعد نماز پڑھنے کے لئے تیمّم کو کافی قرار دیا ہے۔(۲)

حضرت عمران بن حصینؓ سے مروی ہے کہ ہم رسول اللہؐ کے ساتھ ایک سفر میں تھے آپ ﷺ نے لوگوں کو نماز پڑھائی، نماز سے فراغت کے بعد یکایک آپ ﷺ کی نظر ایک

---

(۱) تفسیر ابن کثیر : ۲/۳۲۱

(۲) سورۃ نساء: ۴۳ سورہ مائدہ : ۶

شخص پر پڑی جو جماعت سے علیحدہ دور کھڑا تھا، آپ ﷺ نے اس سے دریافت کیا کہ کس چیز نے تمہیں نماز پڑھنے سے روکا ہے؟ کہا: مجھے جنابت لاحق ہوگئی ہے اور پانی موجود نہیں، آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: مٹی کو استعمال میں لاؤ تمہارے لئے وہ کافی ہوگی۔(۱)

ایک دیہاتی رسول اللہ ﷺ کے پاس آیا اور کہا کہ ہم لوگ ریتیلے میدان میں رہتے ہیں اور ہم میں حائضہ اور جنبی اور نفساء ہوتے ہیں اور ہم پر چار چار ماہ گذر جاتے ہیں اور پانی نہیں مل پاتا، آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: مٹی کو لازم پکڑلو یعنی مٹی سے تیمّم کرو۔(۲) حضرت ابوذرؓ سے مروی ہے: رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: پاک مٹی مسلمان کا وضو ہے چاہے دس سال تک (پانی میسر نہ ہو)۔(۳)

تیمّم کی حیثیت

پانی کے استعمال پر قدرت نہ ہونے کی صورت میں تیمّم کی حیثیت وہی ہے، جو وضو اور غسل کی ہے، یعنی جیسے وقت کے شروع ہونے سے پہلے وضو یا غسل کیا جا سکتا ہے ایسے ہی نماز کا وقت شروع ہونے سے پہلے اس نماز کے لئے تیمّم بھی کیا جا سکتا ہے، ایک تیمّم سے متعدد نمازیں پڑھی جا سکتی ہیں، تیمّم کیا ہوا آدمی باوضو حضرات کی امامت بھی کر سکتا ہے۔

اللہ تبارک وتعالیٰ نے سورہ مائدہ کی آیت:۶ میں یکے بعد دیگرے وضو، غسل اور تیمّم کے احکام بیان کئے ہیں پھر اخیر میں احسان جتلاتے ہوئے ارشاد فرمایا: اللہ تعالیٰ کو یہ منظور ہے کہ تم کو پاک وصاف رکھے اور یہ کہ تم پر اپنا انعام تام فرمادے تا کہ تم شکرادا کرو۔

اس آیت میں مساوی طور پر وضو، غسل اور تیمّم تینوں کو ذرائع طہارت قرار دیا گیا ہے، معلوم ہوا کہ ناپاکی کو دور کرنے میں سب اپنے اپنے دائرہ میں یکساں تاثیر رکھتے ہیں۔

---

(۱) بخاری: باب الصعید الطیب وضوء المسلم: ۳۴۴

(۲) مسند احمد: ۸۶۲۷ حسن: تعلیق شعیب الارنووط

(۳) ابوداؤد تحقیق الالبانی: باب الجنب یتیمم: ۳۳۲ :صحیح

حضرت ابوذرؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: پاک مٹی مسلمان کے لئے طہارت کا کام دیتی ہے خواہ دس سال کا عرصہ گذر جائے جب تک کہ وہ پانی نہ پائے۔(۱) اس روایت میں مٹی کو بڑی وسعت کے ساتھ طہارت کا ذریعہ بتایا گیا ہے اور اس کی اس حیثیت کو کسی خاص وقت کے ساتھ مقید نہیں کیا گیا، بلکہ پانی کو پانے تک اس کی یہی حیثیت برقرار رکھی گئی ہے، معلوم ہوا کہ نماز کے وقت کے آنے اور جانے سے تیمّم کی قوت پر کوئی اثر نہیں پڑتا؛ بلکہ پانی کے دستیاب ہونے سے اس کی ضرورت ختم ہو جاتی ہے۔

حضرت عمرو بن العاصؓ کو غزوہ ذات السلاسل کی ایک رات احتلام ہو گیا تھا، سخت سردی پڑ رہی تھی، غسل کرنے کی صورت میں جان کا خطرہ تھا، انہوں نے تیمّم کیا اور ساتھیوں کو صبح کی نماز پڑھا دی، ساتھیوں نے یہ خبر بارگاہ نبوی میں پہنچائی اور ادھر عمرو بن العاصؓ نے بھی اپنا عذر بیان کیا، مزید یہ کہا کہ میرے پیش نظر اللہ کا یہ ارشاد تھا: اپنے آپ کو قتل نہ کرو بے شک اللہ تم پر مہربان ہے۔(۲) یہ سن کر آپ ﷺ مسکرائے اور کچھ نہ فرمایا۔(۳) امام بخاریؒ نے تعلیقاً روایت کیا ہے کہ حضرت ابن عباسؓ نے ایک دفعہ تیمّم کی حالت میں امامت فرمائی تھی۔(۴) ان تفصیلات سے تیمّم کی قوت وحیثیت بالکل عیاں ہو جاتی ہے۔

کن حالات میں تیمّم کرنے کی اجازت ہے

۱) پانی کا موجود نہ ہونا

وضو یا غسل کے لئے جتنی مقدار میں پانی کی ضرورت پڑتی ہے، ایک میل کے اندر

---

(۱) ابوداؤد البانی باب الجنب یتیمم : ۳۳۳ . صحیح

(۲) نساء : ۲۹

(۳) ابوداؤد تحقیق الالبانی : باب اذا خاف الجنب البرد : ۳۳۴. صحیح

(۴) بخاری :باب الصعید الطیب وضو المسلم

اندر اس قدر پانی کا نام ونشان نہ ہو، پانی حاصل کرنے کے لئے پرخطر راستہ عبور کرنا پڑتا ہو یا ناواجبی قیمت دے کر پانی کو خریدنا پڑتا ہو تو یہ دونوں شکلیں بھی پانی کے موجود نہ ہونے کے حکم میں ہیں، ان دونوں حالات میں بھی تیمّم کی اجازت ہے۔

ارشاد ربانی ہے: پھر جب تم کو پانی نہ ملے تو تم پاک زمین سے تیمّم کرلیا کرو۔(۱) حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے مروی ہے کہ میں نے رسول اللہ کو ایک ایسی جگہ پر تیمّم کرتے دیکھا جسے ''مربد النعم'' کہا جاتا تھا، وہاں سے مدینہ کے گھر نظر آرہے تھے۔(۲) اور مربد نامی جگہ مدینہ سے ایک یا دو میل کے فاصلہ پر ہے (۳)، حضرت نافع فرماتے ہیں، حضرت ابن عمرؓ نے ایک دفعہ، مدینہ سے تقریباً ایک یا دو میل کے فاصلہ پر تیمّم فرمایا تھا۔(۴) ☆

اللہ تعالی نے تیمّم کا حکم جاری کرنے کی حکمت یہ بیان فرمائی کہ ''اللہ تعالی کو یہ منظور نہیں کہ تم پر کوئی تنگی ڈالیں''۔(۵) جان کا خطرہ مول لینا یا ناواجبی قیمت دے کر یا بہت دور جا کر پانی حاصل کرنے کا حکم دینا تنگی اور سخت مشقت کا باعث ہے، اس لئے انسان کو اس کا مکلّف نہیں کیا جاسکتا۔

---

(۱) مائدہ : ٦

(۲) حاکم مع تعلیقات الذھبی ۔ کتاب الطھارۃ : ٦٣٩ ۔صحیح

(۳) مشارق الانوار علی صحاح الاثار للقاضی عیاض : ۱/۳۹۴ دار التراث

(۴) مستدرک حاکم مع تعلیقات الذھبی : کتاب الطھارۃ : ٦٤٠ ۔ مؤطا مالک : باب العمل فی التیمم : ۱۲۲

☆ مالکیہ کے نزدیک اگر انسان کا خیال ہو کہ پانی دو میل یا اس سے دور ہے تو اس کے لئے تیمّم کرنا جائز ہے اور گر اس کا خیال ہو کہ پانی دو میل کے اندر اندر ہے تو اسے پانی تلاش کرنا چاہئے اگر اس کے لئے تلاش کرنے میں دقت نہ ہو شافعیہ کے نزدیک یہ مسافت ڈیڑھ میل ہے اور حنبلیہ کے نزدیک اتنی جسے عرف عام میں دوری کہا جاتا ہے۔ الفقه علی المذاھب الاربعه : ۱/۱۵٦ . الفقه الاسلامی : ۱/۵٧۱

(۵) مائدہ : ٦

اسی طرح وہ تمام مواقع جہاں پانی کے حصول کی خاطر غیر معمولی مشقت اٹھانی پڑتی ہو یا موجود پانی کو وضو یا غسل میں خرچ کر دینے سے آئندہ سخت دشواری پیش آنے کا اندیشہ ہو، وہاں تیمّم کی اجازت رہے گی۔

۲) پانی کے استعمال پر قادر نہ ہونا

پانی کے استعمال کرنے سے بیمار ہونے کا یا بیماری سے صحت یاب ہونے میں تاخیر ہونے کا یا زخم خراب ہونے کا قوی اندیشہ ہو یا جان لیوا وضرر رساں سردی کا عالم ہو تو ان تمام حالات میں تیمّم کرنا جائز ہے، ارشاد ربانی ہے: اللہ تعالی کو یہ منظور نہیں کہ تم پر کوئی تنگی ڈالیں۔(۱) غزوہ ذات السلاسل میں حضرت عمرو بن العاصؓ نے جان لیوا سردی کے موسم میں احتلام ہونے پر محض تیمّم کر کے ساتھیوں کو نماز پڑھا دی تھی، آپ ﷺ نے اطلاع ملنے پر ان کے اس عمل پر کسی قسم کی نکیر اور اعتراض نہیں فرمایا تھا۔(۲) حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں جب اللہ کے راستہ میں کسی کو زخم لگ جائے پھر اسے جنابت لاحق ہو جائے اور غسل کرنے پر موت کا اندیشہ ہو تو وہ تیمّم کر لے(۳)

۳) نماز جنازہ کے فوت ہونے کا اندیشہ ہونا

وضو کر کے نماز جنازہ میں شریک ہونے تک نماز جنازہ کے ختم ہو جانے کا خطرہ ہو تو تیمّم کر کے نماز جنازہ میں شرکت کر لینا درست ہے، حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں: جب تمہیں نماز جنازہ کے فوت ہونے کا اندیشہ ہو اور تم بے وضو ہو تو تیمّم کر کے نماز جنازہ پڑھ لو۔(۴)

---

(۱) مائدہ : ٦

(۲) ابوداؤد البانی : باب اذا خاف الجنب البرد : ۳۳۴. صحیح

(۳) سنن دارقطنی باب التیمم : ۲۹۰ . صححه ابن خزیمه والحاکم فتح الغفار : ۱/۴

(۴) مصنف ابن ابی شیبه باب فی الرجل یخاف ان تفوته الصلوة علی الجنازة وهو غیر متوضیء : ۱۱۵۸۲ . سکت علیه الحافظ وابن الهمام : فتح القدیر : ۱۳۸/۱ . الدرایة : ۶۹/۱

حضرت نافعؒ سے مروی ہے کہ حضرت ابن عمرؓ ایک جنازہ میں تشریف لائے باوضو نہ تھے تو محض تیمّم کیا اور نماز جنازہ پڑھ لی۔(۱)

کن چیزوں پر تیمّم کیا جاسکتا ہے؟

ہر وہ چیز جو زمین کی جنس سے ہو، جیسے مٹی، ریت، پتھر، گچ، چونا، سرمہ، ہڑتال وغیرہ، ان سب سے تیمّم کیا جاسکتا ہے، ارشاد خداوندی ہے: تم تیمّم کرلو صعید طیب، سے(۲) صعید کے معنی زمین کا اوپری حصہ کے ہیں، جس کے تحت یہ ساری چیزیں آجاتی ہیں، پس اس آیت کریمہ کے پیش نظر ان ساری اشیاء سے تیمّم درست ہوگا، نبی کریم ﷺ ارشاد فرماتے ہیں: زمین ہمارے لئے مسجد اور پاک کرنے کی چیز بنادی گئی ہے(۳) پس جیسے ان ساری اشیاء پر نماز پڑھنی درست ہے، ایسے ہی ان سے تیمّم کرنا درست ہے، امام بخاریؒ نقل فرماتے ہیں: شوریلی زمین (جو اناج اگانے کے قابل نہیں ہوتی) سے تیمّم کرنا اور اس پر نماز پڑھنا درست ہے(۴) حضرت حمادؒ فرماتے ہیں: مٹی، گچ پہاڑ، ریت ان سب سے تیمّم کیا جاسکتا ہے(۵)

فائدہ: جنس زمین سے تیمّم کرتے وقت اس پر گرد وغبار کا موجود رہنا ضروری نہیں۔

ایک موقع پر نبی کریم ﷺ نے حضرت عمارؓ کو تیمّم کا طریقہ سکھلاتے ہوئے ارشاد فرمایا تھا، تمہارے لئے یہ کافی ہے کہ اپنے دونوں ہاتھ زمین پر مارو، پھر (ہاتھوں پر) پھونک مارو پھر اپنے چہرہ کا مسح کرو۔(۶)

---

(۱) بیهقی: معرفة السنن والآثار: باب التيمم فی المصر للجنازة: ۴۵۸. سکت علیه الحافظ: الدراية فصل فی ذکر احاديث التيمم: ۶۹/۱

(۲) مائدہ: ۶،

(۳) بخاری: باب قول النبی ﷺ: جعلت لی الارض مسجداً و طهوراً: ۴۳۸

(۴) بخاری: باب الصعيد الطيب وضوء المسلم

(۵) مصنف ابن ابی شيبه: باب ما يجزئ الرجل فی تيممه: ۱۶۱۷

(۶) مسلم باب التيمم: ۸۴۶

ظاہر ہے پھونک مارنے کے بعد ہاتھوں پر گرد وغبار نہیں رہتا، الگ الگ مواقع پر نبی کریم ﷺ سے مدینہ کی دیوار (۱) ایسے ہی حجرہ مبارکہ کی دیوار سے تیمّم کرنا ثابت ہے (۲) شہر مدینہ کی دیواروں کے بارے میں مشہور ہے کہ وہ سیاہ پتھروں کی ہوا کرتی تھیں عموماً ایسی دیواروں پر قابل لحاظ غبار موجود نہیں ہوتی تھی، پھر بھی آپؐ نے ان سے تیمّم فرمایا۔ (۳)

نوٹ: ہر وہ چیز جو آگ میں جلانے سے نہ جلے اور نہ پگھلے وہ تمام چیزیں زمین کی جنس سے ہیں (۴) ☆

تیمّم کے فرائض

تیمّم میں تین فرائض ہیں

۱) نیت کرنا: نیت تیمّم کے مادہ ومفہوم میں داخل ہے اور عموماً معانی لغویہ، احکام شرعیہ میں ملحوظ ہوا کرتے ہیں۔ اسی کے ساتھ مٹی اپنی ذات میں پاکی بخش نہیں ہے؛ اس لئے شریعت نے دو شرائط کے ساتھ اسے پاکی بخش قرار دیا ہے، (۱) پانی کا موجود نہ ہونا (۲) نماز کا ارادہ ہونا، یہی نیت کے معنی ہیں۔ (۵)

۲) چہرہ کا مسح کرنا

---

(۱) بخاری باب التیمم فی الحضر: ۳۳۷

(۲) مجمع الزوائد باب التیمم علی الجدار: ۱۴۶۷۔ المعجم الاوسط: ۶۵۶ صحیح: صحیح وضعیف، الجامع الصغیر: ۸۹۲۶

(۳) اعلاء السنن: ۱/ ۳۳۵

(۴) فتح القدیر: ۱/ ۲۲۷

☆ یہی امام مالکؒ کا بھی مسلک ہے، امام شافعیؒ واحمدؒ کے نزدیک تیمّم صرف ایسی مٹی یا ریت پر درست ہے، جس سے تیمّم کرنے کی صورت میں ہاتھ پر غبار لگ جاتی ہو۔ الفقہ الاسلامی: ۱/ ۵۸۹

(۵) فتح القدیر مع الکفایۃ: ۱/ ۱۱۴، ۱۱۵

۳) ہاتھوں کا کہنیوں سمیت مسح کرنا، ارشاد خداوندی ہے: اپنے چہروں اور ہاتھوں کا اس (مٹی) سے مسح کرو۔(۱)

ارشاد نبوی ہے: تیمّم میں ایک ضرب چہرہ کے لئے ہے اور ایک ضرب کہنیوں تک ہاتھوں کے مسح کے لئے ہے (۲)، حضرت ابن عمرؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ نے ارشاد فرمایا: تیمّم میں دوضرب ہیں یعنی دو دفعہ ہاتھوں کو زمین پر مارنا ہے، ایک ضرب چہرہ کے مسح کے لئے اور ایک ضرب کہنیوں تک ہاتھوں کے مسح کے لئے۔ (۳) وضو کا نائب وقائم مقام ہونے کی حیثیت سے تیمّم کا آغاز بھی بسم اللہ الرحمٰن الرحیم سے کرنا، چہرے اور ہاتھوں کے مسح میں ترتیب کا لحاظ رکھنا نیز یکے بعد دیگرے پے در پے مسح کرنا مسنون ہے۔☆

تیمّم کو باطل کرنے والی چیزیں

وہ تمام چیزیں، جن سے وضو ٹوٹ جاتا ہے ان کے پیش آنے پر تیمّم بھی ٹوٹ جاتا ہے، کیونکہ تیمّم نائب ہے اور وضو اصل ہے، جو امور اصل پر اثر انداز ہوتے ہیں، نائب بھی ان سے متاثر ہو جاتا ہے۔ نیز جن اعذار کی بنا پر تیمّم کی اجازت تھی ان اعذار کے ختم ہونے پر تیمّم باطل ہو جاتا ہے، شریعت نے تیمّم کی اجازت مشروط طور پر دی تھی یعنی پانی کے استعمال پر

(۱) مائدہ : ۶

(۲) مستدرک حاکم مع تعلیقات الذهبي : كتاب الطهارة : ۶۳۴ . ۶۳۸ . صحيح

(۳) سنن دارقطني: باب التيمم : ۶۹۷. صحيح :مستدرک حاکم مع تعلیقات الذهبي : ۶۳۶

☆ تیمّم میں یہ تینوں چیزیں باقی ائمہ کے نزدیک بھی فرض ہیں البتہ امام مالکؒ واحمدؒ کے نزدیک ہاتھوں کا مسح صرف پہنچوں تک (گٹوں تک) فرض ہے اور بقیہ حصہ کا سنت ہے امام شافعیؒ کے نزدیک ہاتھوں کا مسح کہنیوں سمیت کرنا فرض ہے اسی طرح امام ابوحنیفہؒ وشافعیؒ کے نزدیک تیمّم میں دوضرب فرض ہیں اور امام مالکؒ واحمدؒ کے نزدیک ایک ضرب فرض ہے یعنی زمین پر ایک ہی دفعہ ہاتھ مار کر، چہرے اور ہاتھوں کا مسح کر لینے سے تیمّم صحیح ہو جاتا ہے، البتہ چہرے کے لئے الگ ضرب اور ہاتھوں کے مسح کے لئے الگ ضرب لگانا مسنون ہے۔ الفقہ الاسلامی: ۱/ ۵۸۶

قدرت نہ ہونے کی شرط پر، لہذا جب یہ شرط باقی نہ رہی تو تیمّم کی حاجت بھی نہ رہی۔(۱)

فائدہ: فی الحال پانی دستیاب نہ ہو؛ لیکن امید ہو کہ کچھ وقت کے بعد مل سکتا ہے تو نماز کو اول وقت میں نہ پڑھے؛ بلکہ بہتر یہ ہے کہ کچھ انتظار کرے، پھر پانی مل جائے تو وضو کر کے نماز پڑھے ورنہ تیمّم کر لے، حضرت علیؓ فرماتے ہیں: اگر آدمی سفر میں جنبی ہو جائے تو اول وقت اور آخر وقت کے درمیان کچھ انتظار کرے، پھر اگر پانی نہ پائے تو تیمّم کرے اور نماز پڑھے۔(۲) نہایت صحیح سند سے حضرت عمرؓ سے بھی اس قسم کی بات منقول ہے۔ (۳)

فائدہ: اگر کسی نے تیمّم سے نماز پڑھ لی پھر اسے پانی مل گیا یا نماز ختم کر لینے کے بعد وہ اپنے آپ کو وضو کرنے کے قابل پاتا ہے، تو اس پر نماز کا دہرانا ضروری نہیں، حضرت ابوسعید خدریؓ سے روایت ہے کہ دو آدمی سفر پر روانہ ہوئے جب نماز کا وقت ہوا تو دونوں کے پاس پانی نہیں تھا، دونوں نے پاک مٹی سے تیمّم کیا اور نماز پڑھ لی، پھر نماز کا وقت گذرنے سے پہلے پہلے انہیں پانی مل گیا، ایک نے دوبارہ وضو کر کے نماز پڑھ لی اور دوسرے نے ایسا نہیں کیا پھر جب دونوں نبی ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو آپ ﷺ سے اس واقعہ کا تذکرہ کیا، تو جس شخص نے نماز نہیں دہرائی تھی، اس سے نبی ﷺ نے فرمایا تم نے سنت کے مطابق عمل کیا (یعنی اصل مسئلہ اور شرعی حکم یہی ہے) اور تمہاری نماز ہوگئی، (لیکن دوسرے کو بھی آپ ﷺ نے مایوس نہیں فرمایا، اس نے بھی آخر اجتہاد سے کام لیا تھا، گو وہ صحیح نہ نکلا مگر مجتہد کو خطا پر بھی اجر و ثواب ملتا ہے؛ اس لئے آپ ﷺ نے) دوسرے سے فرمایا: تمہارے لئے دوہرا اجر ہے، (پہلی نماز کا الگ جسے تم نے تیمّم کر کے ادا کی تھی اور دوسری

---

(۱) الفقه الاسلامی: ۱/۵۳۲

(۲) السنن الکبری للبیهقی باب من تلوّم ما بینه و بین آخر الوقت: ۱۱۴۲۔

(۳) الثمر الدانی: باب من تلوم ما بینه وبین آخر الوقت: ۱۱۰۱)

باوضو نماز کا الگ)(۱)

فائدہ: وہ شخص جسے نہ پانی میسر نہ ہو مٹی، وہ فی الحال نماز نہ پڑھے؛ کیوں کہ رسول اللہ ﷺ ارشاد فرماتے ہیں: اللہ تعالی کوئی نماز طہارت کے بغیر قبول نہیں کرتا۔(۲) ہاں ایسا آدمی نمازیوں جیسی ادائیں اور ان جیسی حرکات کر گذرے اور بعد میں قضاء کرے۔

---

(۱) ابو داؤد مع تعلیق الالبانی باب التیمم: ۳۳۸.صحیح

(۲) مسلم :باب وجوب الطھارۃ للصلوۃ :۵۵۷

موزوں پر مسح کا بیان

موزوں پر مسح کرنا رخصت وسہولت پر مبنی ایک شرعی حکم ہے، جس سے مقیم ومسافر دونوں فائدہ اٹھاسکتے ہیں، موزے بار بار اتارنے چڑھانے میں چوں کہ ایک گونہ مشقت تھی، اس لئے شریعت نے اس زحمت سے بچانے کے لئے ایک خاص مدت کی تحدید کے ساتھ، موزوں پر مسح کرنے کو جائز رکھا، اگر کوئی اس سہولت سے بار بار فائدہ اٹھانا چاہے تو وہ مدت کے اختتام پر موزوں کو نکال کر پیروں کو دھولے اور کامل طہارت پر موزے دوبارہ پہن لے پھر اس خاص مدت تک مسح کرتا رہے۔

امام نوویؒ فرماتے ہیں بے شمار صحابہ سے مسح علی الخفین کی روایات منقول ہے، (۱) حفاظ حدیث کے مطابق مسح علی الخفین کی روایات متواتر ہیں۔ (۲) امام احمد بن حنبلؒ فرماتے ہیں اس بارے میں صحابہ سے چالیس احادیث منقول ہیں۔ (۳) حسن بصریؒ سے منقول ہے کہ مجھ سے ۷۰ صحابہ نے بیان کیا کہ رسول اللہ ﷺ مسح فرمایا کرتے تھے۔ (۴)

موزوں پر مسح کے جائز ہونے کے شرائط

۱) موزوں کو کامل پاکی کی حالت میں پہنا ہو، یعنی جب موزے پاؤں پر چڑھائے تو نہ صرف یہ کہ پاؤں کو دھوکر موزے پہنے ہوں؛ بلکہ وضو بھی اس انداز سے مکمل کیا ہو کہ دوران وضو کوئی ناقض وضو پیش نہ آیا ہو۔

حضرت مغیرہ بن شعبہؓ فرماتے ہیں کہ میں حضور ﷺ کے ساتھ سفر میں تھا تو آپ

(۱) شرح مسلم نووی : ۱/۴۳۳

(۲) فتح الباری : ۱/ ۳۲۰

(۳) نیل الاوطار : ۱/ ۴۶۵

(۴) شرح مسلم نووی : ۱/ ۴۳۳

ﷺ کے موزے اتارنے کے لئے جھکا تو آپ ﷺ نے فرمایا: ان کو چھوڑ دو؛ اس لئے کہ دونوں پاؤں کو طہارت کی حالت میں داخل کیا ہوں، پھر آپ ﷺ نے دونوں موزوں پر مسح فرمایا۔(۱)

۲) موزے پیروں کو ڈھانکے ہوئے ہوں، موزوں پر مسح پیروں کو دھونے کے قائم مقام ہے، جب پیر کھلے ہوئے ہوں تو وہاں دھونے کا حکم برقرار رہے گا، مسح کی سہولت نہیں ملے گی، البتہ موزے پیروں کو ڈھانکے ہوئے تو ہوں مگر ان میں معمولی پھٹن ہو جس کے بغیر چارہ کار نہیں تو کوئی مضائقہ نہیں ہے۔

ایک صحابی سے اس شخص کے بارے میں جو پہلے تو اپنے موزوں پر مسح کرے پھر ان دونوں کو اتار لے، یہ حکم منقول ہے کہ وہ اپنے پیروں کو دھوئے۔(۲)

حضرت معمرؒ سے موزے کی پھٹن کے بارے میں دریافت کیا گیا تو فرمایا: وضو میں پیروں کے جس حصہ کو دھویا جاتا ہے، اس میں سے کچھ (قابل لحاظ) حصہ ظاہر ہو جائے تو اب موزے پر مسح نہ کرو بلکہ اسے اتار ڈالو۔(۳)

۳) موزے اس قدر مضبوط ہوں کہ ایک فرلانگ تک بآسانی انہیں پہن کر چلا جا سکتا ہو، خواہ موزے مکمل چمڑے کے بنے ہوئے ہوں یا صرف قدم اور تلے پر چمڑا لگا ہوا ہو یا صرف تلے پر یا موزے مکمل طور پر بغیر چمڑے کے ہوں؛ مگر اس قدر موٹے و مضبوط ہوں کہ پانی ان میں سے نہ چھنتا ہو۔

---

(۱) بخاری باب اذا ادخل رجلیه وهما طاهرتان : ۲۰۶

(۲) سنن بیهقی باب من خلع خفیه بعد ما مسح : ۱۳۲۲. مصنف ابن ابی شیبه : ۱۹۷۰. قال البخاریؒ : ولا نعرف ان یحیی سمع من سعید ام لا ولا سعید من اصحاب النبی ﷺ : تحقیق محمد عوامه.

(۳) سنن بیهقی باب الخف الذی مسح علیه رسول الله ﷺ : ۱۳۹۶

کیوں کہ موزے جب اس نوعیت کے نہ ہوں گے بلکہ باریک کپڑے یا کسی ایسی چیز کے بنے ہوئے ہوں گے، جنہیں پہن کر چلنے کی ضرورت پوری نہ کی جاسکتی ہو تو یہ موزے پیروں کے لئے محض علامتی اور دکھاوے کے درجہ میں ہوں گے، ایسے موزے پہننے والے کے لئے شرعی رخصت حاصل نہ ہوگی۔

حضرت مغیرہ بن شعبہؓ سے مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے وضوفرمایا اور جرابوں اور نعلین پر مسح فرمایا، (۱) سوت کے موزوں کو جراب کہتے۔(۲) اور نعلین کی تشریح استاذ ابولولید راوی نے یہ کی ہے کہ ایسا سوت کا موزہ جس کے تلے پر چمڑا چڑھا ہوا ہو، راشد بن نجیح سے روایت ہے کہ میں نے انس بن مالکؓ کو دیکھا کہ بیت الخلاء میں داخل ہوئے اور آپؓ کے پاؤں میں دو سوت کے موزے تھے، دونوں کے نیچے کا حصہ چمڑے کا تھا اور اوپر کا حصہ ریشم کا تھا تو آپ نے دونوں پر مسح فرمایا۔(۳)

حضرت ابومسعود انصاریؓ کے بارے میں منقول ہے کہ وہ بالوں سے تیار کردہ جرابوں پر مسح فرمایا کرتے تھے۔(۴) حضرت سعید بن المسیبؒ اور حضرت حسن بصریؒ نے ارشاد فرمایا: جرابوں پر مسح کیا جاسکتا ہے جب کہ وہ موٹے ومضبوط ہوں۔(۵)

فائدہ: یہاں اخیر میں یہ امر واضح رہے کہ وضو میں پیروں کے دھونے کا حکم نص قطعی سے ثابت ہے اور دوسری جانب موزوں پر مسح کے جائز ہونے کی روایات بھی متواتر ہیں، جونص قطعی

---

(۱) ترمذی باب المسح علی الجوربین : ۹۹. حسن صحیح: امام ترمذی

(۲) عمدة القاری للعینی : ۳۲۶/۱

(۳) السنن الکبری للبیھقی باب مار ود فی المسح علی الجوربین : ۱۴۰۹ .وللمسح علی الجوربین شاھد صحیح : مسند احمد تحقیق : شعیب ارنووط:۱۸۲۰۶

(۴) مصنف عبدالرزاق :باب المسح علی الجوربین : ۷۷۴. صحیح : اعلاء السنن : ۳۴۹/۱

(۵) مصنف ابن ابی شیبه : باب المسح علی الجوربین ۱۹۸۸ . صحیح : اعلاء السنن : ۳۴۹/۱

۔کے درجہ میں ہوتی ہیں، ان دونوں قطعی دلائل کا تقاضا یہ ہے کہ دونوں پر عمل کیا جائے پس پیر موزے سے خالی ہوں تو انہیں دھویا جائے ورنہ موزوں پر مسح کرلیا جائے۔

وہ پاپوش جو موزوں کے ہم صفت نہ ہوں انہیں مسح علی الخفین کے قطعی دلائل کے تحت داخل نہیں کیا جاسکتا، پس ایسے موزوں کی بنا پر پیروں کے دھونے کے قطعی حکم کو بھی ترک نہیں کیا جاسکتا۔(۱)

موزوں کے کس حصہ پر مسح کیا جائے اور کیسے؟

موزوں پر مسح کا طریقہ یہ ہے کہ پاؤں کے اوپر کے حصہ پر مسح کیا جائے گا، نیچے کے حصہ پر نہیں کیا جائے گا، اور تین انگلیوں سے پاؤں کی انگلیوں کی جانب سے کھینچا جائے گا اور کھینچتے کھینچتے پنڈلی تک لے جایا جائے گا اور ہاتھ کی انگلیوں سے تین انگلیوں کی مقدار کھینچنا فرض ہے۔(۲)

پاؤں کے اوپر مسح کرنے کی دلیل یہ حدیث ہے، حضرت علیؓ فرماتے ہیں، اگر دین کی بنیاد رائے پر ہوتی تو موزے کا نچلا حصہ مسح کا زیادہ حق دار ہوتا اوپر کے حصے سے، حالانکہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو موزے کے اوپری حصہ پر مسح فرماتے دیکھا ہے(۳) اور تین انگلی سے پنڈلی تک کھینچنے کی دلیل یہ حدیث ہے، حضرت جابرؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اپنے ہاتھ سے اس طرح اشارہ کیا یعنی انگلیوں کے کنارے سے پنڈلی تک اور انگلیوں سے کھینچتے ہوئے۔(۴) اس حدیث میں اصابع (انگلیوں) سے پنڈلی تک کھینچنے کا تذکرہ ہے

---

(۱) اعلاء السنن : ۱/ ۳۴۹

(۲) هندیه : ۱/۴۴۸،۴۵۴

(۳) ابو داؤد مع تعلیق الالبانی باب کیف المسح : ۱۶۲. صحیح

(۴) ابن ماجه باب فی مسح اعلی الخف واسفله : ۵۵۱ . ورواه ابن الجوزی فی تحقیقه وعزاه الی ابن ماجه ولم یعقبه بتصحیح ولا تضعیف وقال فی اعلامه : انه حدیث العمل علیه . البدر المنیر ۳/۳۰:

اور اصابع جمع کا صیغہ ہے، جس کا مطلب یہ ہے کہ کم سے کم تین انگلیاں ہوں۔☆

مسح کی مدت

مسح کی مدت مقیم آدمی کے لئے ایک دن ایک رات ہے اور مسافر کے لئے تین دن اور تین رات ہے۔ اور مدت کا آغاز مسح کی ضرورت پیش آنے کے وقت سے ہوگا یعنی حدث لاحق ہونے کے وقت سے، حضرت علیؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے تین دن تین رات مسافر کے لئے اور ایک دن ایک رات مقیم کے لئے مسح کرنے کی مدت مقرر فرمائی۔ (۱)

عوف بن مالکؓ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے مسافر کے لئے تین دن تین رات اور مقیم کے لئے ایک دن ایک رات موزوں پر مسح کرنے کا حکم فرمایا۔ (۲) ☆

مسح کو توڑ دینے والی چیزیں

(۱) وہ چیزیں جن سے وضو ٹوٹ جاتا ہے، ان سے مسح علی الخفین بھی ختم ہو جاتا ہے، حضرت صفوان بن عسال فرماتے ہیں: ہم جب حالت سفر میں ہوتے (اور موزے پہنے ہوتے) تو رسول اللہ ﷺ ہم کو یہ حکم دیا کرتے تھے کہ تین دن تین رات تک موزے نہ اتاریں؛ بلکہ پیشاب، پاخانہ اور نیند سے بیدار ہونے کے بعد (وضو کرتے

☆ امام مالکؒ کے نزدیک موزے کے اوپری حصہ کا مکمل مسح کرنا ضروری ہے اور نچلے حصہ کا مسح کرنا مستحب ہے امام شافعیؒ کے نزدیک موزے کے اوپری حصہ کا اسی قدر مسح ضروری ہے جسے مسح کہا جاسکتا ہو باقی اوپری حصہ اور نچلے حصہ کا مسح مسنون ہے اور امام احمدؒ کے نزدیک موزے کے اوپری حصہ کا اکثر مسح ضروری ہے اور نچلے حصہ کا مسح کرنا شریعت میں نہیں ہے۔ الفقه الاسلامی : ۱/ ۴۷۶۔۴۷۷

(۱) مسلم : باب التوقیت فی المسح علی الخفین : ۶۶۱

(۲) مسند احمد تحقیق شعیب الارنووط : ۲۳۹۹۵۔ صحیح لغیرہ

☆ امام شافعیؒ واحمدؒ کا بھی مسلک ہے اور امام ملکؒ کے نزدیک موزوں پر مسح کی کوئی مدت مقرر نہیں بلکہ جب تک موزے پاؤں پر باقی ہوں یا جب تک آدمی جنبی نہ ہوا ہو مسح جائز ہے۔ الفقه الاسلامی: ۱/۴۸۹

وقت) موزوں پر محض مسح کرلیں، البتہ اگر جنابت لاحق ہو جائے تو موزوں کو اتار کر غسل کریں۔(۱)

(۲) کسی ایک پیر کا یا دو پیروں کا موزہ اتار دینا، ایک صحابی رسول سے اس شخص کے بارے میں جو پہلے تو اپنے موزوں پر مسح کرے پھر ان کو اتار لے یہ فتوی منقول ہے کہ وہ اپنے پیروں کو دھوئے گا۔(۲)

(۳) مسح کی مدت کا ختم ہو جانا، متعدد احادیث میں مقیم و مسافر کے لئے کہ مخصوص مدت مقرر کی گئی ہے، اس سے خود بخود یہ معلوم ہوتا ہے کہ مقررہ مدت کے گذر جانے کے بعد مسح علی الخفین کی گنجائش نہیں رہے گی۔

پٹی پر مسح کرنا

زخم پر کپڑے کی پٹی باندھ دی گئی ہو یا ہڈی ٹوٹنے کی بناء پر پلاسٹر وغیرہ چڑھا دیا گیا ہو، اور پٹی کھول کر دھونے یا مسح کرنے میں زخم کے بگڑ جانے کا اندیشہ ہو تو پٹی و پلاسٹر کے اوپر ہی اوپر مسح کرنا کافی ہے، پھر جب زخم ٹھیک ہو جائے تو یہ سہولت بھی ختم ہو جائے گی۔ رسول اللہ ﷺ نے ایک شخص کے بارے میں جس کا سر زخمی ہو گیا تھا اور غسل جنابت کرنے کی وجہ سے وہ فوت ہو گیا تھا، یہ ارشاد فرمایا، ان کے لئے یہ کافی تھا کہ تیمّم کر لیتے اور اپنے زخم پر پٹی باندھ لیتے پھر اس پر مسح کرتے اور باقی بدن کو دھو لیتے۔(۳)

حضرت علی رضی اللہ عنہ سے منقول ہے کہ انہوں نے رسول اللہ سے دریافت کیا: جب ٹوٹے اعضاء پر پٹیاں بندھی ہوئی ہوں تو آدمی کیسے وضو کرے اور جنبی ہو جائے تو کیسے غسل

---

(۱) ترمذی : باب المسح علی الخفین للمسافر : ۹۶ .حسن صحیح : امام ترمذی

(۲) السنن الکبری للبیهقی : باب من خلع خفیه بعد ما مسح : ۱۴۲۲ . تقدم تحقیقه

(۳) ابوداؤد تعلیق الالبانی : باب فی المجروح یتیمم : ۳۳۶. حسن

کرے؟ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: وہ ان پر مسح کرلے، (۱) حضرت علی سے مروی ہے
کہ میری ایک کلائی ٹوٹ گئی تھی میں نے اس تعلق سے نبی ﷺ سے سوال کیا تو رسول اللہ ﷺ
نے فرمایا کہ پٹیوں پر مسح کرو۔ (۲)

(۱) دار قطنی باب جواز المسح علی الجبائر : ۸۸۸ ۔ سند کے ایک راوی ضعیف ہیں۔ امام دار قطنیؒ

(۲) دار قطنی : باب جواز المسح علی الجبائر : ۸۹۰ سندہ حسن : کنز العمال : طہارۃ المعذور

حیض ونفاس اور استحاضہ کا بیان

حیض کی تعریف

وہ خون جو صحت مند بالغہ عورت کے رحم سے ایک خاص زمانہ میں کسی بیماری اور ولادت کے بغیر جاری ہو، عموماً اس کا رنگ سیاہی مائل اور بدبو ہوتا ہے نیز ایام حیض میں عورت کو تکلیف اور گرمی کا احساس بھی ہوتا ہے، رسول اللہ ﷺ ارشاد فرماتے ہیں یہ ایسی چیز ہے جسے اللہ تعالی نے آدم علیہ السلام کی بیٹیوں کے حق میں لکھ دیا ہے(۱)

حیض کس عمر سے کس عمر تک رہتا ہے؟

حیض کا آغاز کس عمر سے ہوتا ہے اور کب تک اس کا سلسلہ رہتا ہے، اس کا انحصار عورت کی صحت، غذا، قویٰ، اور موسم وزمانے پر ہے، تاہم تجربہ وتحقیق کی روشنی میں حیض کے آغاز کی عمر نوسال اور بند ہونے کی عمر پچپن سال مقرر کی گئی ہے۔

حنفی مسلک میں ایک قول حیض کے بند ہونے کی عمر کے بارے میں پچاس سال کا بھی ہے، حضرت عائشہؓ، سفیان ثوریؒ اور عبداللہ بن مبارکؒ سے بھی یہی منقول ہے، (۲) حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں: جب عورت پچاس سال کی عمر کو پہونچ جائے تو وہ حیض کی حد سے نکل جاتی ہے۔(۳)

حیض کے ساتھ ہی وہ تمام شرعی احکام کی مکلّف ہوجاتی ہے، رسول اللہ ﷺ ارشاد فرماتے ہیں: وہ عورت جسے حیض آنا شروع ہوگیا ہے (یعنی بالغہ ہوگئی ہے) اللہ تعالی اس کی

---

(۱) بخاری: باب الامر بالنفساء: ۲۹۴

(۲) کفایہ: ۱/۱۴۲

(۳) ذکرہ احمد ولعلہ فی بعض کتبہ الذی لم نقف علیھا۔ ارواء الغلیل: ۱۸۶، الفقہ الاسلامی: ۱/۴۱۲

نماز ڈوپٹہ اوڑھے بغیر قبول نہیں فرماتے ۔(۱) اس حدیث میں عورت پر حیض آنا شروع ہونے کی بناء پر نماز میں ڈوپٹہ اوڑھنے کو لازم کر دیا گیا ہے، معلوم ہوا کہ عورت حیض کے آغاز سے مکلّف ہو جاتی ہے۔

کیا حاملہ عورت کو حیض آ سکتا ہے؟

حاملہ عورت کو اگر خون آئے تو حیض کا خون نہیں کہلاتا؛ بلکہ استحاضہ کا خون ہوگا، عورت سے نماز وغیرہ ساقط و معاف نہیں ہوگی، حضرت ابن عمرؓ نے اپنی اہلیہ کو حالت حیض میں طلاق دے دی تھی، رسول اللہ ﷺ نے حضرت عمرؓ کے واسطے سے یہ حکم کہلا بھیجا کہ وہ فی الحال بیوی سے رجوع کرلیں، پھر پاک ہونے کی حالت میں یا حمل سے ہونے کی حالت میں چاہیں تو طلاق دے لیں۔(۲)

معلوم ہوا کہ جیسے پاکی کے ایام میں حیض نہیں آتا ایسے ہی حالت حمل میں بھی حیض نہیں آتا، اگر حالت حمل میں حیض آنا ممکن ہوتا تو حالت حیض میں دی ہوئی طلاق سے رجوع کر کے حالت حمل میں طلاق دینے کا حکم کوئی معنیٰ نہیں رکھتا۔ حضرت علیؓ اور حضرت ابن عباسؓ سے مروی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حاملہ عورتوں سے حیض کے معاملہ کو اٹھا رکھا ہے، (۳) حاملہ عورت جو خون دیکھتی ہے اس بارے میں حضرت عائشہؓ نے فرمایا کہ یہ چیز اسے نماز سے نہ روکنے پائے۔(۴)☆

---

(۱) ابوداؤد :مع تعليق الالبانی : باب المرأة تصلی بغير خمار : ۶۴۱. صحيح

(۲) مسلم شريف باب تحريم طلاق الحائض بغير رضاها: ۲۷۳۲

(۳) الجوهر النقی باب الحيض علی الحمل بحواله ابن شاهين :۷/۴۲۴

(۴) سنن دارمی : باب فی الحبلی اذا رأت الدم : تحقيق فواز احمد : ۹۳۳. لم يحكم عليه المحقق

☆ یہی امام احمدؒ کا بھی مسلک ہے امام شافعیؒ و مالکؒ کے نزدیک حاملہ کو بھی حیض آ سکتا ہے۔ الفقه الاسلامی : ۱/۶۱۲

خون حیض کے رنگ

حیض کے ایام میں سیاہ، سرخ، زرد، سبز، گدلا، مٹیالا، یہ سارے رنگ کے خون حیض ہی کے شمار ہوتے ہیں، ہاں جب سفید رنگ کی رطوبت نکلنے لگے تو یہ حیض نہیں، ایسے ہی زمانہ حیض کے بعد زرد اور گدلے رنگ کا خون، حیض نہیں شمار ہوگا، حضرت علقمہؒ اپنی والدہ سے روایت کرتے ہیں کہ عورتیں حضرت عائشہؓ کے یہاں مسئلہ معلوم کرنے کی غرض سے ڈبیہ میں روئی رکھ کر بھیجا کرتی تھیں، اور روئی زرد رنگ کے خون سے آلودہ ہوا کرتی تھیں، حضرت عائشہؓ اسے ملاحظہ کرنے کے بعد فرماتیں: جلدی مت کرو، یہاں تک کہ سفید دھاگے کی دھار نہ دیکھ لو۔(۱) حضرت ام عطیہؓ فرماتی تھیں، ہم پاک ہوجانے کے بعد گدلے اور زرد رنگ کے خون کو کچھ شمار نہیں کرتے تھے۔(۲)

حیض اور پاکی کی مدت

حیض کی کم از کم مدت تین دن اور زیادہ سے زیادہ دس دن ہے، تین سے کم اور دس دن سے زیادہ کا خون، خون استحاضہ کہلائے گا۔ حضرت واثلہ بن اسقع سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا حیض کی کم سے کم مدت تین دن اور زیادہ سے زیادہ مدت دس دن ہے۔(۳)

اس مضمون کی احادیث متعدد طرق سے مرفوعاً اور موقوفاً مروی ہیں، جس کی بناء پر یہ حدیث ضعیف کے درجہ سے حسن کے درجہ کو پہونچ جاتی ہے،(۴) طہر کی کم از کم مدت پندرہ دن ہے، زیادہ کی کوئی تحدید نہیں، اس سلسلہ میں ایک حدیث ابن جوزی کی **العلل المتناهية**

---

(۱) بخاری :تعليقا باب اقبال المحيض و ادباره

(۲) سنن ابو داؤد : مع تعليق الالبانی : باب فی المرأة ترى الكدرة والصفرة :۳۰۷، صحيح

(۳) دارقطنی كتاب الحيض : ۸۵۸

(۴) فتح القدير : ۱/۱۴۳، اعلاء السنن : ۱/۳۵۱، ۳۵۴

میں اس مضمون کی منقول ہے کہ دو حیضوں کے درمیان کم از کم مدت پندرہ یوم ہے۔(۱) جو حد درجہ ضعیف ہے، تاہم یہ موقف اجماع امت، فتاوائے سلف اور قیاس کے مطابق ہونے کی وجہ سے مضبوط و قابل قبول ہے۔

ابوبکر جصاص رازیؒ کہتے ہیں: فقہاء سلف اس پر متفق ہیں کہ پندرہ یوم کی مدت طہر صحیح ہے(۲) قاضی ابوالطیبؒ کہتے ہیں: لوگوں کا اس پر اجماع ہے کہ طہر کی کم از کم مدت پندرہ دن ہے،(۳) حضرت سفیانؒ فرماتے ہیں: طہر پندرہ یوم ہوتا ہے یہی حضرت عطاؒ سے بھی منقول ہے(۴)

شریعت کی رو سے مسافر پندرہ دن کے قیام کی نیت سے مقیم بن جاتا ہے، حضرت ابن عمرؓ فرماتے ہیں: جب تم مسافر ہو پھر کسی جگہ پندرہ دن ٹھہرنے پر اپنے آپ کو جمالو تو نماز مکمل پڑھنی شروع کردو ۔(۵) حالت طہر کو حالت اقامت سے مناسبت ہے، حالت حیض تو سفر کی طرح ایک عبوری، عارضی اور ضعف و تھکن کا زمانہ ہے، پس طہر کا اقل ترین زمانہ بھی اقامت کے اقل ترین زمانے کی طرح پندرہ یوم ہوگا۔(۶) ☆

---

(۱) العلل المتناهية : ۶۴۰

(۲) احكام القرآن : ۱/۴۱۷، ۴۱۹

(۳) عمدة القاری : ۶/۶

(۴) دارمی : باب فی اقل الطهر : ۸۵۳. اسناده صحيح : تحقيق فواز احمد وحسن سليم۔احكام القرآن : ۱/۴۱۷، ۴۱۸

(۵) نصب الراية زيلعی : ۲/۱۸۴

(۶) بدائع الصنائع : ۱/۴۰

☆ امام شافعیؒ و احمدؒ کے نزدیک حیض کی کم از کم مدت ایک دن رات ہے اور زیادہ مدت پندرہ دن رات ہے امام مالک کا مسلک تفصیل طلب ہے، طہر کی کم از کم مدت امام شافعیؒ و مالک کے نزدیک بھی پندرہ دن ہے امام احمدؒ کے نزدیک تیرہ دن ہے، طہر کی زیادہ سے زیادہ مدت بالاتفاق مقرر نہیں، الفقہ الاسلامی ۱/۶۱۴ ـ ۶۱۷

دوخون کے درمیان پاکی کا وقفہ

وہ پاکی جو حیض کی مدت میں دوخون کے درمیان ہو وہ بالاتفاق جاری خون کی طرح ہے، اس کی دو دلیلیں ہیں: ایک طبعی دلیل، دوسری قیاسی دلیل، طبعی مشاہداتی دلیل تو یہ ہے کہ عموماً زمانہ حیض میں خون مسلسل بہتا نہیں رہتا؛ اس لئے بہتے رہنے کی شرط لگانا فطرت وطبیعت کے خلاف ہے۔

قیاسی دلیل یہ ہے کہ جس طرح نصاب زکوۃ میں شروع سال اور اخیر سال میں نصاب پورا ہوجانا کافی ہے، اسی طرح حیض کا خون شروع دن اور اخیر دن آجائے تو تمام دن حیض ہی شمار کیا جائے گا، چاہے درمیان میں خون نہ آیا ہو۔

فائدہ: امام ابو یوسفؒ کے نزدیک (جو امام ابوحنیفہؒ کی بھی ایک روایت بلکہ امام صاحب کا اخیر قول اور اکثر متاخرین کے یہاں مفتی بہ ہے) دوخونوں کے درمیان پندرہ روز سے کم کا وقفہ ہو تو ضابطہ (عورت کی عادت، حیض کی شرعی مدت) کی رعایت کرتے ہوئے اس وقفہ کو بھی جاری خون کی طرح یعنی حیض شمار کیا جائے گا، کیونکہ شریعت کی رو سے طہر صحیح کی کم از کم مدت پندرہ یوم ہے، اور دونوں خون کے درمیان پندرہ یوم سے کم پاکی کا وقفہ ہو تو اسے شرعی طہر قرار دینا ممکن نہیں ہے، جب شرعی طہر قرار دینا اسے ممکن نہیں تو دیگر قواعد شریعت کا لحاظ کرتے ہوئے اسے زمانہ حیض قرار دیا جائے گا۔

مثلاً کسی عورت کو ایام عادت دس روز ہو یا کوئی عورت ابھی بالغہ ہوئی ہو اور اسے دو دن خون آیا پھر پانچ دن پاکی دکھائی دی پھر ایک دن خون پھر دو دن پاکی اور پھر ایک دن خون تو ان گیارہ ایام میں سے دس یوم حیض کے قرار دیئے جائیں گے، اس لئے کہ یہاں دوخون کے درمیان پاکی کا وقفہ پندرہ پندرہ یوم سے کم ہے، پس جو عورت معتادہ

(عادت والی) ہے، اس کے حق میں حسب عادت دس ایام کو حیض قرار دینا اس کی عادت کے خلاف نہیں اور جو مبتدئہ (نو بالغہ) ہے اس کے حق میں زیادہ سے زیادہ دس روز حیض کے شمار کرنا شریعت کے بیان کردہ مدت کے مطابق ہے۔

عورت کے ایام عادت دس روز سے کم ہوں اور خون مثال کے طور پر پہلے تین دن کے بعد گیارہویں دن آیا تو اس کے ایام عادت ہی ایام حیض رہیں گے، اور باقی دن استحاضہ کے کہلائیں گے اور اسی صورت میں اگر خون دسویں روز آیا تو یہ پورا زمانہ حیض کا کہلائے گا، اور کہا جائے گا کہ عورت کی عادت بدل گئی (۱) حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں: میں نے دیکھا کہ امّ حبیبہؓ بنت جحش کا برتن خون سے بھرا ہوا تھا تو ان سے حضور ﷺ نے فرمایا اتنی مدت ٹھہری رہو، (نماز وغیرہ سے باز رہو) جتنی مدت تمہارا حیض تم کو روکے رکھتا تھا پھر غسل کرو اور نماز پڑھو۔ (۲)

نفاس کی تعریف

نفاس وہ خون ہے جو بچہ پیدا ہونے کے بعد عورت کی شرمگاہ سے نکلتا ہے۔

نفاس کی مدت

نفاس کی اقل ترین مدت متعین نہیں، ولادت کے ایک لحظہ بعد خون بند ہو گیا پھر بالکل نہ آیا، تو عورت پاک وصاف ہو گئی، اور اس کے حق میں وہ ایک لحظہ ہی نفاس کا زمانہ ہوگا، البتہ نفاس کی زیادہ سے زیادہ مدت چالیس دن ہے، چالیس دن بعد بھی خون آئے تو وہ نفاس کا نہیں، استحاضہ کا خون کہلائے گا، حضرت انسؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے

---

(۱) تبيين الحقائق : ۱/ ۶۰. فتح القدير : ۱/ ۱۵۳ . ۱۵۴. كفاية : ۱/ ۱۵۴

(۲) مسلم شريف : باب المستحاضه و غسلها : ۷۸۵

ارشاد فرمایا: نفاس کا زمانہ چالیس یوم ہے، الا یہ کہ عورت اس سے قبل ہی پاکی دیکھ لے۔ (تو پہلے بھی پاک ہو جائے گی)۔(۱)☆

حیض سے تعلق رکھنے والے احکام

۱) حیض و نفاس کے بند ہو جانے کے بعد غسل کرنا عورت پر واجب ہو جاتا ہے، ارشاد ربانی ہے: اور لوگ آپ سے حیض کا حکم پوچھتے ہیں آپ فرما دیجئے کہ وہ گندی چیز ہے تو حیض میں تم عورتوں سے علیحدہ رہا کرو اور ان سے قربت مت کیا کرو جب تک کہ وہ پاک نہ ہو جائیں۔(۲)

رسول اللہ ﷺ نے حضرت فاطمہ بنت حبیش سے فرمایا: جس قدر ایام میں تم کو حیض آیا کرتا تھا ان میں تم نماز پڑھنی چھوڑ دو پھر (ان ایام کے بعد) غسل کرو اور نماز پڑھو۔(۳)

۲) حیض کے آغاز کے ساتھ ہی لڑکی شرعاً بالغہ کہلاتی ہے اور احکام شرعیہ کی مکلّف ہو جاتی ہے، رسول اللہ ﷺ ارشاد فرماتے ہیں: وہ عورت جسے حیض آنا شروع ہو گیا ہے، اللہ تعالیٰ اس کی نماز ڈوپٹہ اوڑھے بغیر قبول نہیں فرماتے۔(۴) اس حدیث میں عورت پر، حیض کے آنے پر نماز میں ڈوپٹہ اوڑھنے کو لازم کر دیا گیا ہے، معلوم ہوا کہ عورت حیض کے آغاز سے مکلّف ہو جاتی ہے۔

---

(۱) سنن دارقطنی باب الحیض : ۸۶۳ صالح ومتعبر : نیل الاوطار باب اکثر النفاس : ۱/۳۵۷

☆ یہی امام احمد بن حنبلؒ کا مسلک ہے امام مالکؒ وشافعیؒ کے نزدیک نفاس کی زیادہ سے زیادہ مدت ساٹھ دن ہے ۔الفقہ الاسلامی: ۱/۲۲۲)

(۲) البقرہ: ۲۲۲

(۳) بخاری باب اذا حاضت فی شهر ثلاث حیض :۳۲۵

(۴) ابو داؤد مع تعلیق الالبانی :باب المرأة تصلی بغیر خمار : ۶۴۱ صحیح

۳) حیض کا آنا عورت کے رحم کے حمل سے خالی ہونے کی دلیل ہے۔ غزوۂ اوطاس کی گرفتار شدہ باندیوں کے بارے میں آپ ﷺ نے صحابہ سے یہ فرمایا تھا کہ ان میں جو حاملہ ہیں، ان سے وضع حمل تک وطی نہ کی جائے اور جو غیر حاملہ ہیں ان سے حیض آنے تک قربت نہ کی جائے (۱) اس اخیر جملے میں آپ ﷺ نے حیض کے آنے کو حمل کے خالی ہونے کی علامت مقرر فرمایا ہے۔

۴) عدت کا گذارنا حیض کے ذریعہ ہوگا، ارشاد ربانی ہے: اور طلاق دی ہوئی عورتیں اپنے آپ کو روکے رکھیں تین حیض تک (۲)

۵) حالت حیض میں مباشرت کا حرام ہونا، ارشاد ربانی ہے: اور ان سے قربت (جماع) نہ کیا کرو جب تک کہ وہ پاک نہ ہو جاویں (۳) اگر کسی نے حالت حیض میں بیوی سے جماع کرلیا تو وہ اپنے اس فعل پر استغفار کرے، اس لئے کہ اس سے حکم خداوندی کی خلاف ورزی ہوئی ہے، بعض روایات میں کفارہ کے طور پر کچھ مال صدقہ کرنے کا حکم بھی مذکور ہے، حضرت ابن عباسؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اس شخص کے بارے میں جو حالت حیض میں اپنی بیوی سے جماع کرے یہ فرمایا کہ وہ ایک دینار یا آدھا دینار صدقہ دیدے (۴)

البتہ حالت حیض میں ناف سے گھٹنے تک کے حصہ کو چھوڑ کر بیوی کے باقی حصۂ بدن سے لذت اندوز ہوسکتا ہے، ایک صحابیؓ نے رسول اللہ ﷺ سے دریافت کیا: یا رسول اللہ:

---

(۱) ابوداؤد مع تعلیق الالبانی : باب فی وطء السبایا: ۲۱۵۹. صحیح

(۲) سورہ بقرہ : ۲۲۸

(۳) البقرہ : ۲۲۲

(۴) ابوداؤد مع تعلیق الالبانی : باب فی اتیان الحائض ۲۶۴. صحیح

میری بیوی حالت حیض میں ہے تو اس کے بدن کا کس قدر حصہ میرے لئے حلال ہے؟ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: تمہارے لئے تہبند کے اوپر والا حصہ حلال ہے (۱)

وہ امور جن کا انجام دینا حالت حیض ونفاس میں ممنوع ہے

۱) نماز پڑھنا

حالت حیض ونفاس میں نماز پڑھنا عورت پر حرام ہے، حیض ونفاس سے پاک ہوجانے کے بعد ان ایام کی نمازوں کی قضا بھی عورت کے ذمہ لازم نہیں، حضرت فاطمہ بنت ابی جیشؓ سے رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: جب تمہیں حیض آنے لگے تو نماز پڑھنی چھوڑ دو (۲) حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں رسول اللہ ﷺ کے زمانہ میں ہم حائضہ ہوجایا کرتی تھیں؛ مگر ہمیں روزوں کی قضا کا تو حکم دیا جاتا تھا؛ لیکن نمازوں کی قضا کا حکم نہیں دیا جاتا تھا۔ (۳)

۲) روزہ رہنا

حالت حیض ونفاس میں تو روزہ رہنا درست نہیں، تاہم بعد میں ان روزوں کی قضا لازم وضروری ہے، ایک موقع پر رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: کیا یہ بات نہیں ہے کہ عورت جب حائضہ ہوجاتی ہے تو نماز وروزہ کے قابل نہیں رہتی (۴) حضرت عائشہؓ کی روایت گذر چکی ہے کہ روزوں کی قضا کی جائے گی۔

۳) طواف کرنا

رسول اللہ ﷺ نے حضرت عائشہؓ سے فرمایا تھا، جب تمہیں حیض آجائے تو

(۱) ابوداؤد مع تعلیق الالبانی باب فی مباشرۃ الحائض : ۲۱۲ صحیح

(۲) بخاری : باب اذا حاضت فی شھر ثلاث حیض : ۳۲۵

(۳) مسلم : باب وجوب قضاء الصوم علی الحائض : ۷۸۹

(۴) بخاری : باب ترک الحائض الصوم : ۳۰۴

سارے مناسک حج ادا کرلو سوائے بیت اللہ کے طواف کے کیوں کہ پاک ہونے تک تم اسے انجام نہیں دے سکتی ہو۔(۱)

۴)قرآن پاک کا پڑھنا اور چھونا

ارشاد ربانی ہے: اس قرآن کو نہ چھوئیں مگر پاک لوگ (واقعہ:۷۹) اور ارشاد نبوی ہے: حائضہ اور جنبی کچھ بھی قرآن نہ پڑھیں (۲)

۵)مسجد سے گذرنا یا مسجد میں اعتکاف کرنا

حضرت عائشہؓ فرماتی رسول اللہ ﷺ ایک دفعہ تشریف لائے تو دیکھا کہ صحابہ کے گھروں کے دروازے مسجد میں کھلے ہوئے ہیں، اس پر آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ان گھروں کے (ان کے دروازوں کے) رخ کو مسجد سے پھیر دو؛ اس لئے کہ کسی حائضہ اور جنبی کے لئے مسجد حلال نہیں ہے۔(۳)

فائدہ: خون حیض دس دن کے مکمل ہونے پر بند ہوا ہو تو عورت کے غسل کرنے سے پہلے بھی وطی کی جاسکتی ہے اور اگر خون حیض عادت کے پورا ہونے پر مگر دس دن سے کم میں بند ہوا ہو تو جب تک عورت غسل نہ کرے یا اس پر ایک نماز کا وقت نہ گزر جائے تب تک اس سے صحبت درست نہیں، اس کی وجہ یہ ہیکہ ارشاد باری تعالیٰ: **ولا تقربوهن حتى يطهرن** (۴) میں دو قرأتیں ثابت ہیں، ایک بلاتشدید اور ایک تشدید کے ساتھ بلاتشدید والی قرأت

(۱) بخاری : باب تقضی الحائض المناسک : ۳۰۵

(۲) ترمذی عن ابن عمرؓ باب ماجاء فی الجنب والحائض انها لا يقرأن القرآن : ۱۳۱. صالح للاحتجاج : تحفة الاحوذی : ۱/۳۴۷

(۳) ابوداؤد باب فی الجنب يدخل المسجد : ۲۳۲. صحیح : نیل الاوطار : باب الرخصة فی اجتیاز الجنب : ۱/۲۸۷

(۴) البقرة ۲۲۲

کا ترجمہ: اور عورتوں سے قربت مت کیا کرو جب تک کہ وہ پاک نہ ہو جائیں (یعنی جب تک کہ ان کا خون بند نہ ہو جائے) اور تشدید والی قرأت کا ترجمہ یہ ہے: اور عورتوں سے قربت مت کیا کرو، جب تک کہ وہ خوب پاک وصاف نہ ہو جائیں (یعنی خون بند ہونے کے بعد غسل وغیرہ نہ کرلیں)

بلا تشدید والی قرأت کو احناف نے پہلی صورت پر محمول کیا ہے اور تشدید والی قرأت کو دوسری صورت پر۔ بعض صحابہ وتابعین کے فتاوی سے بھی اس موقف کی تائید ہوتی ہے، حضرت عطاء اور حضرت طاؤس سے مروی ہے کہ ان دونوں حضرات نے فرمایا: جب عورت خون سے پاک ہو جائے اور آدمی کو شدت شہوت لاحق ہو تو وہ عورت کو وضو کرنے کا حکم دے پھر اگر چاہے تو اس سے صحبت کرلے(۱)

ان دونوں حضرات کے ان فتوؤں کو پہلی صورت پر محمول کیا جاسکتا ہے۔ حضرت عمر بن خطاب وحضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے مروی ہے کہ جب عورت کا خون حیض بند ہو جائے تو جب تک وہ غسل نہ کرلے حائضہ ہی کے حکم میں ہے(۲)

حضرت حسنؒ سے بھی یہی منقول ہے کہ ایسی عورت حائضہ ہی کے حکم میں ہے، جب تک کہ وہ غسل نہ کرلے۔(۳)

اس کو دوسری صورت پر محمول کیا جاسکتا ہے، دوسری صورت میں عورت کے اوپر اگر ایک نماز کا وقت گذر جائے تو غسل کئے بغیر بھی اس سے صحبت کی جاسکتی ہے، اس لئے کہ اس

---

(۱) کنز العمال :فصل فی الحیض و النفاس ۲۷۷۲۹. مصنف ابن ابی شیبه فی المرأة ینقطع عنها الدم : ۱۰۳۲ اسناده حسن : سنن دارمی تحقیق حسین سلیم اسد : باب مجامعة الحیض : ۱۰۸۸. ۱۰۸۹

(۲) کنز العمال :فصل فی الحیض والنفاس ۲۷۷۰۵

(۳) سنن دارمی :باب مجامعة الحائض :۱۰۸۴ . اسناده صحیح : محقق حسین سلیم اسد

موقع پر شریعت نے عورت کے ذمہ اس نماز کی قضا لازم کر رکھی ہے اور قضا کا لازم ہونا پاک عورتوں کے احکام میں سے ہے، پس ایسی عورت سے غسل کیے بغیر وطی کرنا درست ہے۔

اور اگر عورت کا خون عادت کے پورا ہونے سے پہلے بند ہو گیا تو عادت کے دن پورے ہونے تک اس سے وطی درست نہیں خواہ وہ غسل ہی کر لے، اس لئے کہ سابق میں یہ بات دلائل کے ذریعہ واضح کی جا چکی ہے کہ خون کا ایام میں مسلسل آتے رہنا ضروری نہیں، پس خون کے نظر نہ آنے کے باوجود عادت کے دن پورے نہ ہونے کی بناء پر یہ عورت حائضہ ہی کے حکم میں ہے، اور حائضہ سے وطی جائز نہیں خواہ وہ غسل کر لے۔

استحاضہ کا بیان

استحاضہ وہ خون کہلاتا ہے جو عورت کے رحم کے قریب کسی رگ کے پھٹ پڑنے کی کی وجہ سے آتا ہے یا اندرونِ رحم ہی سے کسی بیماری و بگاڑ کی وجہ سے آتا ہے، وہ خون جو حیض کی اقل مدت یعنی تین دن سے کم آئے یا حیض و نفاس کی اکثر مدت یعنی دس دن اور چالیس دن سے زیادہ آئے، اسی طرح وہ خون جو حاملہ کو دکھائی دے، ایسے ہی وہ خون جو عادت والی خاتون کے ایام عادت سے تجاوز کر کے دس دن سے بھی زیادہ ہو جائے، یہ سارے خون استحاضہ کے حکم میں ہے۔(۱)

مستحاضہ کا حکم

استحاضہ کی وجہ سے عورت سے کوئی عبادت ساقط اور معاف نہیں ہوتی، وہ بدستور نماز و روزہ اور دیگر عبادات کی ادائیگی کی پابند رہے گی، اسی طرح استحاضہ کی بنا پر وطی حرام نہیں ہوگی، آدمی اپنی مستحاضہ بیوی سے استحاضہ کے ایام میں بلا رکاوٹ وطی کر سکتا ہے۔

---

(۱) الفقه الاسلامي وادلته : ۱/ ٦٣٣

رسول اللہ ﷺ نے مستحاضہ کے بارے میں ارشاد فرمایا: وہ اپنے ان ایام میں جن میں اسے حیض آیا کرتا تھا، نماز کو چھوڑ دے گی پھر اس کے بعد غسل کرے گی اور ہر نماز کے وقت وضو کرے گی اور نماز و روزہ رکھے گی (۱) حضرت عکرمہؒ فرماتے ہیں: ام حبیبہؓ مستحاضہ تھیں اور ان کے شوہر ان سے وطی کرتے تھے۔(۲)

مستحاضہ کا وضو

مستحاضہ عورت وقت کے آغاز پر وضو کرلے پھر وقت کے اندر اندر اس وضو سے جتنی چاہے نمازیں پڑھ لے، خواہ نفل یا فرض، چاہے دوران نماز استحاضہ کا خون بہہ رہا ہو پھر جب نماز کا وقت نکل جائے تو دوبارہ وضو کرے، حضرت عائشہؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ سے مستحاضہ کے بارے میں دریافت کیا گیا تو آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: وہ ہر نماز کے وقت وضو کرلیا کرے۔(۳)

فاطمہ بنت حبیشؓ جنہیں استحاضہ کی بیماری تھی ان سے آپ ﷺ نے فرمایا تھا: تم ہر نماز کے (وقت کے) لئے وضو کرلو (پھر بے تامل نماز پڑھ لیا کرو) چاہے چٹائی پر خون کے قطرات گرتے رہیں (۴) ایک اور روایت میں تصریح ہے کہ: مستحاضہ عورت ہر نماز کے وقت کے لئے وضو کرے۔(۵)

---

(۱) ترمذی مع تعلیق الالبانی: باب ماجاء ان المستحاضة تتوضأ لکل صلوة : ۱۲۶ صحیح

(۲) ابوداؤد مع تعلیق الالبانی: باب المستحاضة یغشاها زوجها : ۳۰۹ صحیح

(۳) ابن حبان : ذکر الامر للمستحاضة بتجدید الوضوء : ۱۳۵۵ صحیح : اعلاء ۱/ ۳۶۹

(۴) مسند احمد تحقیق شعیب الارنووط: ۲۵۶۸۱ .مسند عائشةؓ . صحیح

(۵) قال الزیلعی : غریب جدا وقال العلامة العینیؒ لیس کذلک بل روی هذا الحدیث بهذه الملفظة فی بعض الفاظ حدیث فاطمة بنت ابی حبیشؓ نصب الرایة مع حاشیه بغیة الالمعی ۱/ ۲۰۲ باب الحیض

طہارت اور نماز کے مسائل

کتاب الطھارة

نماز کا بیان

نماز کے لغوی معنی دعا کے ہیں، ارشاد ربانی ہے بلاشبہ آپ کی دعا ان کے لئے موجب اطمینان (قلب) ہے۔ سورۃ توبہ:۱۰۳

اصطلاحی معنی: وہ عبادت جو مخصوص اقوال وافعال پر مشتمل ہو، جس کا آغاز تکبیر سے اور اختتام سلام پر ہوتا ہے۔

نماز کی اہمیت

نماز اسلام کا اہم ترین رکن ہے، یہ اسلام کا وہ ستون ہے جس کے بغیر وہ قائم نہیں رہ سکتا، قیامت کے روز بندوں کے اعمال میں سب سے پہلے نماز ہی کے متعلق باز پرس ہوگی۔

حضرت انس بن مالکؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا: سب سے پہلی چیز جس کے متعلق بندے سے قیامت کے روز باز پرس ہوگی وہ نماز ہے، اگر وہ درست ہوگی تو بقیہ تمام اعمال درست ہوں گے، اور اگر وہ غلط ہوگی تو اس کے بقیہ تمام اعمال غلط ہوں گے۔(۱)

نمازوں کی تعداد

فرض نمازوں کی تعداد پانچ ہے، حضرت انسؓ فرماتے ہیں کہ معراج کی رات نبی ﷺ پر پچاس نمازیں فرض کی گئیں، پھر انہیں کم کر کے پانچ کر دیا گیا، پھر آواز آئی: اے محمدؐ! میرا قول

(۱) طبرانی اوسط عن انسؓ : ۱۸۵۹ صحیح :صحیح و ضعیف الجامع الصغیر : ۴۳۳۸

اٹل ہے، آپؐ کے لئے ان پانچ نمازوں میں پچاس نمازوں کا ثواب ہے(۱)

نماز کن پر فرض ہے؟

ہر عاقل وبالغ مسلمان پر نماز موت کے آنے تک فرض ہے، حضرت علیؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا: تین اشخاص غیر مکلّف ہیں، ایک سویا ہوا آدمی؛ یہاں تک کہ وہ بیدار ہوجائے، دوسرا بچہ؛ یہاں تک کہ وہ بالغ ہوجائے، تیسرا پاگل؛ یہاں تک کہ وہ باہوش ہوجائے۔(۲)

ارشاد ربانی ہے: اور اپنے رب کی عبادت کرتے رہیے؛ یہاں تک کہ آپ (ﷺ) کو موت آجائے۔(سورۃ الحجر:۹۹)

نماز کی مشروعیت کے فوائد وحکم

بندوں کے درمیان نماز کو جاری کرنے میں بے شمار روحانی وجسمانی، شخصی واجتماعی، فوائد وحکمتیں پوشیدہ ہیں۔ روحانی فوائد تو یہ ہیں کہ نماز کے واسطے سے بندہ کا اپنے رب سے رشتہ استوار ہوتا ہے، اس کی رحمت ومغفرت کا وہ امیدوار اور اس کے الطاف وعنایات، کا طلب گار ہوتا ہے، اپنے مالک ومولی سے بندہ کا یہ جذباتی تعلق اس کی کامیابی وفلاح کا ضامن ہے، ارشاد ربانی ہے: بالتحقیق ان مسلمانوں نے فلاح پائی جو اپنی نماز میں خشوع کرنے والے ہیں۔(سورۃ مومنون:۱۔۲)

جسمانی فوائد یہ ہیں کہ نماز ایک بہترین ورزش ہے، سستی، کاہلی اور بے عملی کے اس دور میں صرف نماز ہی ایک ایسی ورزش ہے کہ اگر اس کو صحیح طرز پر پڑھا جائے تو دنیا کے تمام دکھوں کا مداوا بن سکتی ہے، نماز کی ورزشیں جہاں بیرونی اعضاء کی خوشنمائی وخوبصورتی کا

(۱) بخاری: باب کیف فرضت الصلوات: ۳۴۹

(۲) ترمذی مع تعلیق الالبانی: باب فیمن لایجب علیه الحد ۱۴۲۳ صحیح

ذریعہ ہیں وہاں اندرونی اعضاء مثلاً دل، گردے، جگر، پھیپھڑے، دماغ، آنتیں، معدہ، ریڑھ کی ہڈی، گردن، سینہ، اور تمام قسم کے (GIANDS) کی نشو نما کرتی ہیں بلکہ؛ جسم کو سڈول اور خوبصورت بناتی ہیں۔

یہ ورزشیں ایسی ہیں جن سے عمر میں اضافہ ہوتا ہے اور آدمی غیر معمولی طاقت کا مالک بن جاتا ہے اور ان سے چہرے کے نقش ونگار خوبصورت اور حسین نظر آتے ہیں۔(۱)

یوگا کے ماہرین نے نماز کو سانس کی مشق کا بالکل آسان طریقہ قرار دیا ہے، اس میں وہ تین مقام کو خاص طور پر بیان کرتے ہیں، ایک قیام اور اس میں سجدہ کی جگہ نگاہ کا ارتکاز، دوسرا رکوع اور اس میں پاؤں کی جگہ نگاہ کا ارتکاز اور سجدہ میں سانس کی مشق اور سانس کا ارتکاز۔(۲)

شخصی طور پر نماز کے ذریعہ سے انسان کو یہ فائدہ ہوتا ہے کہ اس کے دل ودماغ پراگندہ خیالات اور تشویش کن افکار سے پاک وصاف رہتے ہیں، ایک نمایاں قسم کا چین وسکون وہ اپنی زندگی میں محسوس کرتا ہے، بلند ہمتی، عالی حوصلگی، اعتماد ویقین، وقار ومتانت، دانائی وبردباری، اوقات کی تنظیم وقدردانی، فواحش ومنکرات سے دوری جیسی اونچی اور کامیابی کی کلید صفات سے اپنے آپ کو مالا مال پاتا ہے۔

رسول پاک ﷺ فرماتے ہیں: میری آنکھوں کی ٹھنڈک کا سامان نماز میں رکھا گیا ہے۔(۳) ارشاد خداوندی ہے: بے شک نماز بے حیائی اور ناشائستہ کاموں سے روک ٹوک کرتی رہتی ہے۔(۴)

---

(۱) سنت نبوی اور جدید سائنس: ۲/ ۴۰

(۲) سنت نبوی: ۲/ ۴۵

(۳) نسائی مع تعلیق الالبانی: باب حب النساء: ۳۹۴۰ صحیح

(۴) سورۃ عنکبوت: ۴۵

اجتماعی طور پر نماز (باجماعت) اتحاد ومساوات، نظم وضبط، ربط وتعلق جیسے اہم انسانی اقدار کا کھلا سبق دیتی ہے، نماز باجماعت کے واسطے سے ایک مسلمان کو دوسرے مسلمان کے حالات سے آگاہی ہوتی ہے، ایک دوسرے کے دکھ درد میں شریک ہونے کا موقع ملتا ہے، عبادت کے ذوق وشوق، خیر کی جانب مسابقت اور پاکیزہ ماحول کے قیام میں تعاون ملتا ہے، نمازیوں کا اجتماع، خدا کی رحمت کو جوش میں لانے کا بھی نہایت موثر ذریعہ ہے، ایسے پاکیزہ مجمع پر رحمت خداوندی متوجہ ہوتی ہے، بسااوقات مجمع میں کوئی ایسا فرد بشر ہوتا ہے، جس کے صدق واخلاص اور انابت وتوجہ کی برکت سے پورے مجمع کی قسمت سنور جاتی ہے، ایسے اہل اخلاص اور اہل دل کے متعلق حدیث میں آیا ہے کہ: یہ وہ لوگ ہیں جن کے پاس بیٹھنے والے کبھی محروم نہیں رہتے۔(۱)

تارک نماز کا حکم

جو شخص نماز کی فرضیت کا منکر ہو وہ تو کافر اور خارج از اسلام ہے؛ اس لئے کہ نماز کی فرضیت کتاب وسنت اور اجماع امت کے قطعی دلائل سے ثابت ہے، جو شخص محض کاہلی وسستی کی بنا پر نماز کو ترک کرتا ہے وہ فاسق وگنہگار ہے، ایسا آدمی اخروی ودنیوی دونوں قسم کی سزا کا مستحق ہے، بے نمازیوں کو کل قیامت کے دن نماز کو ترک کرنے کی وجہ سے دوزخ کی دہکتی آگ کا مزہ چکھنا پڑے گا۔

سورہ مدثر: ۴۲۔۴۳ میں ہے: تم کو دوزخ میں کس بات نے داخل کیا وہ کہیں گے ہم نماز نہیں پڑھا کرتے تھے، سورۃ ماعون: ۴۔۵، میں ہے: تو ایسے نمازیوں کے لئے بڑی خرابی ہے، جو اپنی نماز کو بھلا بیٹھتے ہیں (یعنی ترک کردیتے ہیں)، بے نمازی کی دنیوی سزا کیا ہوگی؟

---

(۱) بخاری باب فضل ذکر الله عزوجل حدیث ۶۴۰۸

اس بارے میں ائمہ کے درمیان اختلاف ہے، حنفیہ کے نزدیک ایسے آدمی کو قتل تو نہیں کیا جائے گا؛ البتہ قید و بند میں ڈالدیا جائے گا، اور سخت تادیب کی جائے گی؛ یہاں تک کہ وہ تائب ہوکر نماز کا عادی ہو جائے یا اس حالت میں مرجائے۔

ارشاد نبوی ہے: کسی مسلمان کا خون صرف تین صورتوں میں حلال ہوتا ہے:

۱) شادی شدہ ہو اور زنا کیا ہو۔

۲) ناحق کسی جان کو قتل کیا ہو۔

۳) اپنے دین کو چھوڑ کر مسلمانوں کی جماعت سے الگ ہو گیا ہو۔(۱)

معلوم ہوا کہ محض نماز کو ترک کرنے سے کسی مسلمان کا خون حلال نہیں ہوجاتا؛ تا آنکہ وہ نماز کی فرضیت کا انکار کرکے دین ہی سے نکل جائے، تب اس کا قتل جائز رہتا ہے۔☆

(۱) بخاری : باب قول الله تعالی ان النفس بالنفس: ۶۸۷۸

☆ ائمہ ثلاثہ (امام مالکؒ، شافعیؒ اور احمدؒ) کے یہاں جو شخص بلا عذر کسی ایک نماز کو ترک کردے تو اسے تین دن توبہ کی مہلت دی جائے گی مرتد کی طرح، تین دن کے اندر توبہ نہ کرے تو پھر اسے قتل کردیا جائے گا؛ البتہ امام مالکؒ و امام شافعیؒ کے یہاں قتل بطور سزا کے ہے اور امام احمدؒ کے یہاں کفر کے سبب سے ہے۔ الفقه الاسلامی ۱/۵۷۸ . ۵۷۹

اوقات نماز کا بیان

ارشاد خدوندی ہے: نماز اہل ایمان پر وقت معینہ کے ساتھ فرض ہے (سورۃ نساء: ۱۰۳) احادیث وآثار کی روشنی میں ہر وقت صلوۃ کو دو حصوں میں بانٹا جاسکتا ہے، ایک وقت جائز: یعنی وہ مکمل وقت جس کے اندر اندر نماز پڑھ لی جائے تو شرعاً وہ نماز ادا کہلاتی ہے، اور گر وہ وقت فوت ہوجائے تو نماز ذمہ میں قضاء ہوجاتی ہے، دوسرا وقت مستحب: یعنی کسی نماز کے مکمل وقت کا وہ حصہ جس میں نماز کا پڑھنا افضل اور شرعاً پسندیدہ قرار پاتا ہے۔

ذیل میں ہر وقتِ نماز کے بارے میں انہی دو حیثیتوں سے گفتگو کی جائے گی۔

نماز فجر

نماز فجر کا وقت جائز: صبح صادق (۱) سے طلوع آفتاب تک ہے۔

حضرت عبداللہ بن عمروؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: صبح کی نماز کا وقت صبح صادق سے طلوع آفتاب تک رہتا ہے، (۲)

وقت مستحب: کسی قدر اجالا پھیل جانے کے بعد نماز فجر کا پڑھنا مستحب ہے (۳)

حضرت رافع بن خدیج سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا، فجر کو اجالے میں

---

(۱) واضح ہو کہ صبح کی دو قسمیں ہیں۔ (الف) صبح کاذب (ب) صبح صادق۔ صبح کاذب: مشرق میں افق پر بھیڑیے کی دم کی طرح لمبی سی روشنی ہوتی ہے جو بہت مشکل سے نظر آتی ہے، اس کے تھوڑی دیر بعد محرابی شکل میں پھیلی ہوئی روشنی ہوتی ہے جن کو صبح صادق کہتے ہیں، بعض ماہرین فلکیات اس کو اٹھارہ ڈگری پر بتاتے ہیں اور بعض پندرہ ڈگری پر، اسی صبح صادق کے وقت فجر کی نماز واجب ہوتی ہے، حدیث میں اس کی دلیل یہ ہے: آپ ﷺ نے صحابہ سے فرمایا: آپ کو دھوکے میں نہ ڈالے بلال کی اذان اور نہ یہ صبح کی لمبی سفیدی یہاں تک کہ روشنی پھیل جائے۔ مسلم شریف: باب بیان ان الدخول فی الصوم یحصل بطلوع الفجر: ۲۵۹۷ الشرح الثمیری: ۲/۱۰۸

(۲) مسلم: باب أوقات الصلوات الخمس ۱۴۱۹

(۳) ائمہ ثلاثہ کے نزدیک فجر کی نماز اندھیرے میں پڑھنا مستحب ہے

پڑھو اس لئے کہ اس میں اجر و ثواب زیادہ ہے (۱)

حضرت رافع بن خدیج ہی سے ایک اور روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے حضرت بلالؓ سے فرمایا: صبح کی نماز کو اتنی روشن کر کے پڑھو کہ لوگ اجالے کی وجہ سے اپنے نیزے کے گرنے کی جگہوں کو دیکھ سکیں۔ (۲)

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ فرماتے ہیں: میں نے دو نمازوں کے سوا کبھی آپ ﷺ کو اپنے معمول کے وقت کے علاوہ پڑھتے نہیں دیکھا، ایک تو یہ کہ آپ ﷺ نے مزدلفہ میں مغرب وعشاء کو جمع فرمایا اور دوسرے یہ کہ آپ ﷺ نے فجر کی نماز اس کے معمول کے وقتسے پہلے، اندھیرے میں پڑھ لی۔ (۳)

ان تفصیلات سے معلوم ہوا کہ معمول نبوی فجر کی نماز روشنی میں پڑھنے کا تھا، البتہ نماز فجر میں اتنی تاخیر کر دینا کہ کسی وجہ سے اعادہ کی صورت پیش آ جائے تو مسنون قرأت کی رعایت کے ساتھ وقت کے اندر اندر نماز کا اعادہ مشکل ہو جائے، مناسب نہیں (۴)

نماز ظہر

نماز ظہر کا وقت جائز: زوال آفتاب سے عصر کا وقت آنے تک ہے۔

حضرت عبداللہ بن عمروؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ظہر کی نماز کا اول وقت، زوال آفتاب ہے اور آخر وقت، عصر کی نماز کا وقت شروع ہونے تک ہے (۵)
امام ابو حنیفہؒ کے یہاں عصر کی نماز کا وقت دو مثل کے بعد سے شروع ہوتا ہے، پس اس سے

---

(۱) ترمذی: باب ماجاء فی الاسفار: ۱۵۴ حسن صحیح: امام ترمذیؒ

(۲) مجمع الزوائد: باب وقت صلاۃ الصبح ۱۷۷۶ صحیح

(۳) مسلم باب استحباب زیادۃ التغلیس: ۳۱۷۶

(۴) فتح القدیر ۱/۱۹۹

(۵) مسلم باب اوقات الصلوات الخمس: ۱۴۲۰

پہلے تک کا وقت ظہر کا رہے گا۔☆

امام ابو حنیفہؒ کی دلیل یہ روایت ہے: حضرت ابو ذرؓ فرماتے ہیں کہ ہم حضور ﷺ کے ساتھ سفر میں تھے تو مؤذن نے ظہر کی اذان دینے کا ارادہ کیا تو آپ ﷺ نے فرمایا: ٹھنڈا ہونے دو، پھر اذان دینے کا ارادہ کیا تو آپ ﷺ نے فرمایا: ٹھنڈا ہونے دو؛ یہاں تک کہ ہم نے ٹیلے کا سایہ دیکھا، پھر آپ ﷺ نے فرمایا: سخت گرمی، جہنم کے سانس لینے کی وجہ سے ہوتی ہے: پس جب سخت گرمی ہو تو نماز کو ٹھنڈا کر کے پڑھو۔(۱)

بخاری ہی کی ایک اور روایت میں ہے کہ آپ ﷺ نے اس موقع پر نماز ظہر میں اس قدر تاخیر فرمائی کہ ٹیلے کا سایہ ٹیلے کے مساوی ہو گیا تھا،(۲)

ٹیلہ کا سایہ علانیہ دکھائی دینے لگے یا اس کے برابر ہو جائے تو اس کے بالمقابل اونچی اور بلند چیزوں کا سایہ ایک مثل سے خاصا زیادہ ہو جاتا ہے، معلوم ہوا کہ ایک مثل کے نکل جانے کے باوجود ظہر کا وقت باقی رہتا ہے، اور آپ ﷺ نے بڑے اہتمام کے ساتھ اس وقت میں نماز ظہر ادا فرمائی تھی۔

ائمہ کی اختلاف کی وجہ سے احتیاط اس میں ہے کہ نماز ظہر مثل اول سے پہلے اور نماز عصر مثل ثانی کے بعد پڑھی جائے۔(۳)☆

☆ امام مالکؒ وشافعیؒ واحمد بن حنبل، امام ابو یوسف وامام محمدؒ کے یہاں عصر کی نماز کا وقت مثل اول کے بعد ہی شروع ہو جاتا ہے، پس ان حضرات کے پاس نماز ظہر کا وقت اس سے پہلے پہلے تک ہے۔

(۱) بخاری شریف باب الابراد بالظھر فی السفر: ۵۳۹

(۲) بخاری باب الاذان للمسافر : ۶۲۹

(۳) رد المحتار ۳۷۲/۱

☆ ٹھیک دوپہر کے وقت جب سورج سر پر ہو تو اس وقت جو تھوڑا سا سایہ ہوتا ہے اس کو سایہ اصلی اور فی الزوال کہتے ہیں، اس کو چھوڑ کر ہر چیز کا سایہ اس کے قد کے برابر ہو تو وہ ایک مثل سایہ کہلاتا ہے، مثلاً ایک آدمی کا قد ساڑھے پانچ فٹ ہے تو سایہ اصلی کے علاوہ، سایہ ساڑھے پانچ فٹ تک چلا جائے تو ایک مثل ہو گیا اور سایہ اصلی کے علاوہ گیارہ فٹ تک سایہ لمبا ہو گیا تو دو مثل ہو گیا۔ الشرح الثمیری: ۱۱۰/۱

وقت مستحب: گرمی کے زمانہ میں ظہر کو ٹھنڈے وقت میں پڑھنا اور سردی کے زمانہ میں جلد پڑھ لینا مستحب ہے، حضرت انس بن مالکؓ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کا معمول یہ تھا کہ جب سخت سردی پڑتی تو نماز کو جلد ادا کر لیتے اور جب سخت گرمی ہوتی تو نماز ٹھنڈے وقت میں پڑھا کرتے۔(۱)

نماز عصر

نماز عصر کا وقت جائز ظہر کا وقت ختم ہونے سے غروب آفتاب تک رہتا ہے رسول اللہ ﷺ ارشاد فرماتے ہیں: عصر کا اول وقت اس کے آغاز سے سورج کے زرد پڑنے تک رہتا ہے (۲) عبداللہ بن عمرؓ سے مروی ہے کہ عصر کا وقت مغرب کے آنے تک رہتا ہے (۳) رسول اللہ ﷺ ارشاد فرماتے ہیں: جس شخص نے آفتاب کے غروب ہونے سے پہلے پہلے عصر کی ایک رکعت پڑھ لی اسے عصر کی نماز مل گئی۔(۴)

وقت مستحب: عصر کی نماز کو قدرے تاخیر سے پڑھنا مستحب ہے؛ لیکن اتنی تاخیر بھی مناسب نہیں کہ آفتاب زرد پڑ جائے، حدیث میں ایسی نماز کو منافق کی نماز قرار دیا گیا ہے،(۵)

حضرت ابو مسعود انصاریؓ فرماتے ہیں کہ میں نے حضور ﷺ کو دیکھا کہ عصر کی نماز پڑھتے ہیں اس حال میں کہ سورج بلند رہتا ہے اور سفید رہتا ہے اس میں زردی آنے سے پہلے (۶) علی ابن شیبانؓ فرماتے ہیں کہ ہم حضور ﷺ کے پاس مدینہ آئے تو آپ ﷺ عصر کو

---

(۱) بخاری باب اذا اشتد الحر یوم الجمعۃ : ۹۰۶

(۲) مسلم : باب اوقات الصلوات الخمس: ۱۴۲۰

(۳) مجمع الزوائد :باب وقت صلوۃ العصر : ۱/۱۷۱۴ صحیح

(۴) بخاری : باب من ادرک من الفجر رکعۃ : ۵۷۹

(۵) مسلم : باب استحباب التبکیر بالعصر : ۱۴۴۳

(۶) ابو داؤد مع تعلیق الالبانی : باب فی المواقیت : ۳۹۴ حسن

مؤخر کرتے تھے، جب تک سورج سفید ہوتا۔(۱)

نماز مغرب

نماز مغرب کا جائز وقت غروب آفتاب سے شفق کے غائب ہونے تک رہتا ہے، شفق وہ سفید روشنی ہے جو افق میں سرخی کے بعد دیکھی جاتی ہے۔☆ رسول اللہ ﷺ ارشاد فرماتے ہیں: مغرب کا اول وقت غروب آفتاب سے شروع ہوتا ہے اور آخر وقت شفق کے غائب ہونے تک رہتا ہے(۲)

اوقات صلوۃ کو بیان کرنے والی ایک روایت میں دن کی سفیدی پر جو آفتاب کے غروب ہونے کے بعد بھی افق پر نظر آتی ہے، شفق کا لفظ بولا گیا ہے(۳) جس سے معلوم ہوتا ہے کہ شفق سفید روشنی ہی کا نام ہے۔ حضرت صدیق اکبرؓ، حضرت معاذ بن جبلؓ اور حضرت عائشہؓ سے بھی اسی طرح منقول ہے(۴)

حضرت عمرؓ نے یہ سرکاری فرمان تحریر فرمایا تھا کہ: نماز عشاء افق کی سفیدی کے غائب ہونے کے بعد سے تہائی رات تک پڑھی جائے (۵) اس اثر سے معلوم ہوا کہ افق کی سفیدی ختم ہو جانے یعنی شفق ابیض کے ڈوبنے کے بعد نماز عشاء کا وقت شروع ہوتا ہے، اور اس سے پہلے پہلے مغرب ہی کا وقت ہے۔

---

(۱) ابوداؤد:باب فی وقت صلاۃ العصر : ۴۰۸ باب تعجیل العصر سکت عنه : الثمر الدانی ۲۱۳/۱

☆ ائمہ ثلاثہ اور صاحبین کے نزدیک شفق سے مراد وہ سرخی ہے جو سفید روشنی سے پہلے تک نظر آتی ہے، پس ان کے یہاں سرخی کے غائب ہونے تک مغرب کا وقت رہتا ہے اور سفید روشنی کے ظاہر ہوتے ہی عشاء کا وقت شروع ہو جاتا ہے (الفقه علی المذاهب الاربعه ۱۸۴/۱)

(۲) مسلم : باب اوقات الصلوات الخمس : ۱۴۱۹، ۱۴۲۰

(۳) المعجم الاوسط : ۶۷۸۷. مجمع الزوائد : ۱۶۸۶. حسن

(۴) منحة الخالق ۲۴۶/۱

(۵) مصنف عبدالرزاق :باب وقت العشاء الاخرة رجاله رجال الشیخین ۲۱۰۸. السلسلة الضعیفه ۱۴۰/۱۴

وقت مستحب: نماز مغرب کو غروب آفتاب کے ساتھ ہی پڑھ لینا مستحب ہے خواہ گرمی کا موسم ہو یا سردی کا۔ حضرت سلمہ ؓ فرماتے ہیں: ہم رسول اللہ ﷺ کے ساتھ نماز مغرب غروب آفتاب کے ساتھ ہی پڑھ لیا کرتے تھے(۱)

حضور اکرم ﷺ فرمایا کرتے تھے، میری امت ہمیشہ خیر میں رہے گی یا فطرت پر رہے گی جب تک وہ ستارے چمکنے تک مغرب کی نماز کو مؤخر نہ کرے(۲)☆

نماز عشاء:

نماز عشاء کا جائز وقت شفق کے غائب ہونے کے وقت سے صبح صادق (نماز فجر کے شروع ہونے) تک ہے، متعدد احادیث میں ہے کہ عشاء کا وقت شفق کے غائب ہونے کے بعد سے شروع ہوتا ہے(۳)

اسی طرح حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ ایک رات نبی کریم ﷺ رات دیر گئے مسجد تشریف لئے گئے، رات کا اکثر حصہ گذر چکا تھا، حاضرین مسجد پر بھی نیند کی کیفیت طاری ہوگئی تھی، آپ ﷺ نے نماز پڑھائی، پھر فرمایا یہی اس نماز کا وقت ہے(۴) حضرت ابو ہریرہؓ سے پوچھا گیا کہ عشاء کی نماز کا زیادہ سے زیادہ وقت کیا ہے، فرمایا: صبح صادق کا طلوع ہونا(۵)☆

---

(۱) بخاری :باب وقت المغرب ۵۶۱

(۲) ابوداؤد :مع تعليق الالبانی باب فی وقت المغرب : ۴۱۸. حسن صحيح

☆ امام احمدؒ اور امام شافعیؒ کا قول قدیم بھی یہی ہے البتہ امام شافعیؒ کا قول جدید اور امام مالکؒ کا مسلک یہ ہے کہ مغرب کا وقت صرف اس قدر رہتا ہے، جتنے وقت میں، وضو، ستر پوشی، اذان واقامت اور پانچ رکعتوں کو انجام دیا جاسکتا ہے ۔الفقہ الاسلامی:۱/۶۶۸

(۳) ترمذی تحقيق الالبانی باب ماجاء فی مواقيت الصلوة : ۱۵۱ صحيح .. صحيح ابن خزيمه : باب كراهية تسمية العشاء عتمة : ۳۵۲

(۴) مسلم :وقت العشاء وتاخير ها : ۱۴۷۷،

(۵) السنن الكبرى للبيهقی باب اخر وقت الجواز لصلاة العشاء : ۱۶۳۸ .صحيح : اثار السنن : ۱/۴۴

☆ یہی ائمہ ثلاثہ کا بھی مسلک ہے البتہ امام شافعیؒ کی ایک روایت کے مطابق عشاء کا وقت بس آدھی رات تک رہتا ہے اعلاء السنن ۲/۱۶

وقت مستحب: عشاء کی نماز کو تہائی رات تک مؤخر کرنا مستحب ہے، رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: میری امت پر مشقت کا اندیشہ نہ ہوتا تو میں ان کو عشاء کی نماز تہائی رات یا آدھی رات تک موخر کرنے کا حکم دیتا(۱)☆

نماز وتر

نماز وتر کا جائز وقت عشاء کے بعد ہے اور آخر وقت صبح صادق کے طلوع ہونے تک ہے، حضرت خارجہ بن حذافہ کہتے ہیں: ہمارے پاس رسول اللہ ﷺ تشریف لائے اور فرمایا: اللہ نے تمہارے لئے ایک نماز کا اضافہ کیا ہے، جو تمہارے لئے سرخ اونٹوں سے بھی بہتر ہے، اس کو اللہ تعالی نے تمہارے لئے، نماز عشاء اور صبح صادق کے درمیانی وقت میں مقرر فرمایا ہے(۲)

وقت مستحب: جس کو تہجد پڑھنے کا شوق اور عادت ہو اور اسے یہ قوی امید ہو کہ وہ آخری رات میں بیدار ضرور ہو جائے گا تو اس کو آخری رات میں وتر پڑھنا چاہئے اس لئے کہ آخری رات کی نماز مقبول بارگاہ خداوندی ہوتی ہے اور یہ افضل ہے(۳)

فائدہ: ابر آلود دنوں میں نماز ظہر کو تاخیر سے اور نماز عصر کو اول وقت میں، اسی طرح مغرب کی نماز کو تاخیر سے اور نماز عشاء کو اول وقت میں پڑھ لینا مستحب ہے۔

---

(۱) ترمذی مع البانی : باب تاخیر صلاۃ العشاء والأخرۃ : ۱۶۷ صحیح

☆ امام مالکؒ کے نزدیک ہر نماز کو اول وقت میں پڑھ لینا مستحب ہے البتہ سخت گرمی میں ظہر کی نماز قدرے ٹھنڈک پڑنے پر پڑھنا بہتر ہے امام شافعیؒ کی بھی یہی رائے ہے البتہ ظہر کی نماز کو گرم علاقوں میں ٹھنڈے وقت میں پڑھنا مستحب ہے، اسی طرح گرمی کے زمانے میں مسجد و مدرسہ کی وہ جماعت جس میں لوگ دور دور سے آکر شریک ہوتے ہیں کچھ تاخیر سے کھڑی کرنا مستحب ہے، امام احمدؒ کا بھی تقریبا یہی مسلک ہے البتہ ان کے یہاں عشاء کی نماز میں بھی مصلیوں کی بشاشت کا خیال رکھتے ہوئے تہائی رات تک تاخیر کرنا مستحب ہے۔ الفقہ الاسلامی وادلتہ ۱/۶۷۲، ۶۷۳

(۲) المستدرک علی الصحیحین مع تعلیقات الذھبی : کتاب الوتر : ۱۱۴۸ صحیح

(۳) مسلم :باب من خاف ان لایقوم من اخر اللیل : ۱۸۰۲)

حضرت بریدہ اسلمی ؓ سے مروی ہے کہ ہم رسول اللہ ﷺ کے ساتھ ایک غزوہ میں تھے، آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ابرآلود دنوں میں نماز جلد پڑھ لیا کرو، اس لئے کہ جس کی نماز عصر فوت ہوگئی تو اس کا عمل اکارت گیا(۱)

حضرت عبدالعزیز بن رفیع سے مروی ہے کہ ہمیں یہ بات پہنچی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: بدلی کے دن نماز عصر کو جلد پڑھ لیا کرو۔(۲) ایک اور روایت میں ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: بدلی کے دن میں دن کی نماز جلد پڑھ لیا کرو، اور مغرب کی نماز میں تاخیر کرو۔(۳)

حضرت عمرؓ سے مروی ہے کہ جب ابرآلود دن ہو تو ظہر کی نماز میں تاخیر کرو اور عصر کی نماز میں عجلت کرو(۴) حضرت ابراہیم نخعیؒ سے مروی ہے: ابرآلود دن میں ظہر کی نماز تاخیر سے پڑھو اور عصر کی نماز جلد پڑھ لو اور مغرب کی نماز میں تاخیر کرو(۵) اس طریقہ کار میں لوگوں کو سہولت بھی ہے کہ ایک ہی دفعہ مسجد حاضر ہو کر تھوڑے تھوڑے وقفہ سے دو دو نمازوں سے فارغ ہو کر مسجد سے روانہ ہو سکتے ہیں۔ حضرت علیؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نماز کھڑی ہونے کے وقت مسجد میں ہوتے تو جب آپ ﷺ لوگوں کی تعداد کم دیکھتے تو بیٹھ جاتے پھر (لوگوں کے جمع ہونے کے بعد) نماز پڑھتے اور جب یہ دیکھتے کہ لوگ (پہلے ہی سے) جمع ہیں تو فوراً نماز پڑھتے۔(۶)

---

(۱) ابن ماجه :باب ميقات الصلوة فى الغيم : ۶۹۱ صحيح : .نيل الاوطار : باب ماجاء فى تعجيلها ۱/۳۹۲

(۲) (فتح البارى: باب التبكير بالصلوة ۲/۶۶ مرسل قوى : حافظؒ)

(۳) مراسيل ابوداؤد : ۱۳

(۴) فتح البارى :باب التبكير بالصلوة ۲/۶۶

(۵) كتاب الأثار لابى يوسفؒ: باب افتتاح الصلوة : ۹۵

(۶) مستدرك مع تعليقات الذهبى : باب فضل الصلوات الخمسة : ۷۲۴. صحيح

وہ اوقات جن میں ہر قسم کی نماز پڑھنا ممنوع ہے

تین اوقات ایسے ہیں جن میں کسی قسم کی نماز پڑھنا جائز نہیں۔(۱) طلوع آفتاب کے وقت (۲) غروب آفتاب کے وقت (۳) استواء کے وقت یعنی جب سورج آسمان کے بیچوں بیچ ہو، ان اوقات میں نہ کوئی فرض نماز کی قضا جائز ہے نہ سنت نماز نہ نفل نماز۔

حضرت عقبہ بن عامرؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے ہمیں تین اوقات میں نماز پڑھنے اور میت کو دفن کرنے سے منع فرمایا ہے: ایک جب سورج طلوع ہو رہا ہو، یہاں تک کہ وہ بلند ہو جائے، دوسرے جب کہ وہ نصف النہار پر ہو اور تیسرے جب کہ وہ غروب ہونے کے لئے جھکے، یہاں تک کہ غروب ہو جائے۔(۱)

میت کو دفن کرنے سے مراد میت کی نماز جنازہ پڑھنا ہے، جیسا کہ بعض روایات میں اس کی تصریح ہے(۲) بعض روایات سے جمعہ کے روز استواء شمس کے وقت نفل نماز کے پڑھنے کا جواز معلوم ہوتا ہے لیکن وہ سنداً کمزور ہیں، اس لئے یہ روایات، عمومی طور پر ان اوقات میں نماز پڑھنے سے ممانعت کرنے والی روایات کے معارض نہیں ہوسکتیں۔(۳)

فائدہ:

غروب آفتاب کے وقت اسی دن کی نماز عصر پڑھنی جائز ہے، ارشاد گرامی ہے: جس شخص نے غروب آفتاب سے قبل عصر کی ایک رکعت پڑھ لی اس نے نماز عصر کو پالیا۔(۴)

ان اوقات ممنوعہ میں جنازہ حاضر ہو جائے تو میت پر نماز جنازہ پڑھنا جائز ہے۔

---

(۱) مسلم : باب الاوقات التی نهی عن الصلوة فیها : ۱۹۶۶

(۲) نصب الرایة : فصل فی الاوقات المکروهة ۱/۲۵۰

(۳) اعلاء السنن : ۲/۶۰

(۴) بخاری : باب من ادرک من الفجر رکعة : ۵۷۹

رسول اللہ ﷺ نے حضرت علیؓ سے فرمایا: اے علیؓ تین چیزوں میں تاخیر نہ کرو (۱) نماز جب اس کا وقت آجائے (۲) جنازہ جب حاضر ہو جائے (۳) غیر شادی شدہ عورت جب اس کا مناسب جوڑا مل جائے (۱) ہاں جنازہ ان اوقات ممنوعہ سے پہلے ہی حاضر ہو چکا تھا مگر اس کے باوجود نماز جنازہ ان اوقات ممنوعہ میں پڑھی تو یہ جائز نہیں ہے، جیسا کہ اوپر بیان ہوا۔

وہ اوقات جن میں نوافل پڑھنا مکروہ ہے

(۱) نماز فجر کے بعد آفتاب کے بلند ہونے تک۔

(۲) نماز عصر کے بعد آفتاب کے غروب ہونے تک۔

حضرت ابوسعید خدریؓ سے مروی ہے کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ: صبح کی نماز کے بعد سورج کے بلند ہونے تک کوئی نماز نہیں اور عصر کے بعد آفتاب کے غائب ہونے تک کوئی نماز نہیں (۲) یہ روایت اگر چہ نوافل وفرائض دونوں کے سلسلہ میں عام ہے؛ مگر حضرت علیؓ کی ایک روایت کے پیش نظر اس ممانعت کو صرف نوافل کے ساتھ خاص مانا گیا ہے، باقی ان دو اوقات میں کوئی قضا نمازیں پڑھنا چاہتا ہے تو حضرت علیؓ کی روایت کی بنا پر جائز ہے۔

حضرت علیؓ سے مروی ہے کہ نبی ﷺ نے ارشاد فرمایا: عصر کی نماز کے بعد نماز نہ پڑھو؛ مگر یہ کہ سورج چمک رہا ہو (۳) اس سے مراد قضا نمازوں کی اجازت ہے البتہ نوافل کی نہیں، ورنہ تو اس روایت اور ابوسعید خدریؓ کی روایت بالا میں خواہ مخواہ تعارض پیدا ہو جائے گا۔

عصر اور فجر کی نماز کے بعد طواف کے دوگانے (دو رکعت واجب) پڑھنا بھی مکروہ ہے،

---

(۱) مستدرک حاکم مع تعلیقات الذهبی : کتاب النکاح : ۲۶۸۶ صحیح

(۲) بخاری : باب لایتحری الصلوۃ قبل غروب الشمس: ۵۸۶

(۳) ابو داؤد : مع تعلیق الالبانی : باب الصلاۃ بعد العصر : ۱۲۷۴ صحیح

حضرت معاذ بن عفراءؓ کے بارے میں مروی ہے کہ انہوں نے نماز عصر یا فجر کے بعد طواف فرمایا؛ مگر دوگانہ طواف نہیں پڑھی، جب اس کے بارے میں ان سے سوال کیا گیا تو انہوں نے فرمایا: رسول اللہ ﷺ نے نماز پڑھنے سے منع فرمایا ہے (۱)

حضرت عمرؓ کے بارے میں بھی یہی منقول ہے کہ آپؓ نے نماز صبح کے بعد طواف کیا تو فوراً دوگانہ طواف نہیں پڑھی؛ بلکہ سواری پر سوار ہوگئے، پھر مقام ذی طوی پہنچ کر ان دو رکعتوں کو ادا کیا (۲) ☆

(۳) مغرب سے قبل دو رکعت نماز پڑھنا

حضرت ابن عمرؓ سے غروب آفتاب کے بعد نماز مغرب پڑھنے سے پہلے دو رکعت نفل نماز کے بارے میں دریافت کیا گیا، تو انہوں نے فرمایا: میں نے رسول اللہ ﷺ کے زمانہ میں کسی کو یہ دو رکعتیں پڑھتے نہیں دیکھا۔ (۳)

مغرب کی نماز کی ادائیگی میں عجلت مطلوب ہے، رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: مغرب کی نماز غروب آفتاب کے ساتھ ہی پڑھ لو (۴) ابراہیم نخعی سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ،

---

(۱) طحاوی :باب الرکعتین بعد العصر ۱۸۱۷ صحیح : اعلاء السنن ۶۶/۲

(۲) مؤطا مالک : باب الصلوۃ بعد الصبح ۸۲۱. طحاوی :باب الصلوۃ للطواف بعد الصبح ۳۸۶۳)

☆ امام مالکؒ کے نزدیک ان پانچوں اوقات میں (غروب آفتاب، طلوع آفتاب، کھڑی دوپہر، بعد فجر، بعد عصر) صرف نوافل ممنوع ہیں (فرائض ممنوع نہیں) پھر پہلے تین اوقات میں ممانعت تحریمی ہے بعد کے دو اوقات میں تنزیہی ہے ،امام شافعیؒ کا بھی یہی مسلک ہے البتہ امام شافعیؒ اس بات کے قائل ہیں کہ جمعہ کے دن استواء شمس (کھڑی دوپہر) کے وقت نفل پڑھنا بلا کراہیت درست ہے، اسی طرح ان اوقات میں حرم مکہ میں بھی نفل نماز مکروہ نہیں ایسے ہی وہ نوافل جو کسی سابقہ سبب سے متعلق ہوں انہیں بھی ان اوقات میں ادا کرنا بلا کراہیت درست ہے جیسے نماز استسقاء وکسوف، تحیۃ المسجد، تحیۃ الوضو، نماز جنازہ، دوگانہ طواف ، امام احمدؒ کے نزدیک ان تمام اوقات میں فرض نمازیں نیز دوگانہ طواف بھی جائز ہے (الفقہ الاسلامی ۶۸۳/۱-۶۸۵)

(۳) ابوداؤد :باب الصلوۃ قبل المغرب : ۱۲۸۶ .حسن .البدر المنیر ۲۹۲/۴

(۴) (طبرانی کبیر : ۳۹۵۲صحیح .صحیح و ضعیف الجامع الصغیر : ۲۲۸)

حضرت صدیق اکبرؓ ،حضرت عمر فاروقؓ مغرب سے قبل کوئی نماز نہیں پڑھتے تھے۔(۱)

جب تمام لوگ مغرب کی نماز سے قبل نوافل پڑھنے کا اہتمام کرنے لگیں گے تو نماز مغرب کی ادائیگی میں تاخیر یقینی ہے، اسی طرح غیر معمولی اہتمام کی وجہ سے لوگوں کو اس کے مسنون ہونے کی غلط فہمی ہوسکتی ہے، اس لئے یہ شکل کراہت تنزیہی سے خالی نہیں۔

ہاں ان دو رکعتوں کو سنت سمجھے بغیر اور نماز مغرب میں تاخیر کئے بغیر دو چار لوگ ان کو ادا کر لیتے ہیں تو کوئی قباحت نہیں، چنانچہ بعض صحابہؓ کا اس پر عمل رہا ہے۔ بخاری کی روایت ہے کہ آپ ﷺ نے تین دفعہ فرمایا: مغرب سے قبل نماز پڑھو، تیسری دفعہ میں یہ اضافہ فرمایا کہ جس کا جی چاہے اور یہ اضافہ اس لئے فرمایا تا کہ لوگ اسے سنت نہ بنالیں۔(۲)☆

(۴) خطیب جب خطبہ جمعہ کے لئے منبر پر آجائے تو سنت جمعہ یا تحیۃ المسجد وغیرہ پڑھنا ممنوع ومکروہ ہے۔

حضرت ابن عمر نے فرمایا: میں نے رسول اللہ ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا کہ جب تم میں سے کوئی مسجد میں داخل ہو اور امام منبر پر ہو تو امام کے فارغ ہونے تک نہ کوئی نماز ہے نہ کوئی بات چیت ہے۔(۳)

حضرت ابو ہریرۃؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: جب تم نے جمعہ کے دن امام کے خطبہ کے دوران اپنے ساتھی کو خاموش رہنے کا حکم دیا (اور توجہ سے جمعہ کا

---

(۱) امام محمد کتاب الآثار : ۱۴۴

(۲) بخاری :باب الصلوۃ قبل المغرب ۱۱۸۳

☆ امام مالکؒ کا بھی یہی مسلک ہے امام شافعیؒ کے نزدیک مغرب سے قبل دو رکعتوں کا پڑھنا مستحب (سنت غیر مؤکدہ) ہے امام احمدؒ کے نزدیک محض جائز ہے سنت نہیں۔ الفقه الاسلامی ۱ / ۶۸۶

(۳) مجمع الزوائد :باب فیمن یدخل المسجد والامام یخطب : ۳۱۲۰.حسن . اعلاء السنن ۷۸/۲

خطبہ سننے کی تعلیم کی) تب بھی تم نے لغو کام کیا(۱)

حالاں کہ ایک شرعی حکم کی طرف کسی کو توجہ دلانا اور شرعی حکم کی خلاف ورزی سے روکنا نہایت اہم چیز ہے، پھر یہ چند لمحوں کا کام ہے، جب جمعہ کے خطبہ کے دوران یہ بھی درست نہیں تو دیگر نوافل وسنن جو پہلے کام کے مقابلہ میں کم درجہ کے اور زیادہ دیر طلب ہیں، وہ کیوں کر درست رہیں گے۔

عبداللہ بن بسرؓ کہتے ہیں: ایک شخص جمعہ کے روز لوگوں کی گردن پھلانگتے ہوئے آرہا تھا؛ حالاں کہ آپ ﷺ خطبہ دے رہے تھے، یہ صورتحال دیکھ کر آپ ﷺ نے اس سے فرمایا: بیٹھ جا، تو نے تکلیف دی اور دیر کردی (۲) یہاں اس روایت میں آپ ﷺ نے آنے والے کو تحیۃ المسجد یا سنت جمعہ پڑھنے کا حکم نہیں دیا؛ بلکہ بیٹھ جانے کو کہا ہے، معلوم ہوا کہ خطبہ کے دوران یہ امور درست نہیں ہیں۔

صحاح میں ایک روایت اس کے برخلاف بھی ملتی ہے، حضرت سلیک غطفانیؓ ایک غریب صحابی تھے، وہ ایک دفعہ ایسے وقت مسجد میں داخل ہوئے کہ آپ ﷺ منبر پر تشریف فرما ہو گئے تھے اور خطبہ کے لئے مکمل تیار تھے، وہ آکر بیٹھ گئے تو آپ ﷺ نے ان سے فرمایا: اے سلیکؓ! کھڑے ہو جا اور دو رکعت مختصر طریقہ پر پڑھ لے(۳)

نسائی کی روایت میں ہے کہ ایک شخص نہایت خستہ حال جمعہ کے دن مسجد میں آیا آپ ﷺ خطبہ دے رہے تھے، آپ ﷺ نے ان صاحب سے پوچھا کیا تم نے دو رکعتیں پڑھ لی ہیں؟ انہوں نے عرض کیا کہ نہیں، آپ ﷺ نے فرمایا: دو رکعتیں پڑھ لو پھر آپ ﷺ نے لوگوں کو ان کیلئے صدقہ اکٹھا کرنے کی ترغیب دی تو لوگ انہیں کپڑے دینے لگے۔(۴)

---

(۱) بخاری: باب الانصات یوم الجمعہ : ۹۳

(۲) المستدرک مع تعلیقات الذهبی : کتاب الجمعة : ۱۰۶۱ صحیح

(۳) مسلم : باب التحیة والامام یخطب : ۲۰۶۱

(۴) نسائی مع تعلیق الالبانی : باب حث الامام علی الصدقة یوم الجمعة فی خطبته : ۱۴۰۸ ۔ حسن

یہ واقعہ اس وقت کا ہے جب کہ دوران خطبہ بات چیت یا دیگر افعال کے کرنے کی گنجائش تھی، اس گنجائش کا قرینہ یہ ہے کہ مذکورہ واقعہ میں نہ صرف اس خستہ حال صحابی کا دو رکعت پڑھنا مذکور ہے بلکہ لوگوں کی جانب سے ان پر صدقہ کرنا بھی مذکور ہے؛ حالانکہ دوران خطبہ اس طرح کے عمل کو کوئی جائز نہیں کہتا، معلوم ہوا کہ یہ شروع زمانہ کا واقعہ ہے، بعد میں متعدد ارشادات کے ذریعہ یہ گنجائش ختم کر دی گئی۔

بعض روایات میں حضرت سلیکؓ کے واقعہ میں یہ بات بھی بیان ہوئی ہے کہ جتنی دیر وہ دو رکعت کی ادائیگی میں مشغول رہے، آپ ﷺ خطبہ دینے سے رکے رہے، ان کے نماز پڑھنے کے بعد ہی آپ ﷺ نے خطبہ کا آغاز فرمایا (۱) ظاہر ہے یہ ایک غیر معمولی قسم کا واقعہ ہے؛ اس لئے اس سے کسی خاص حکم کو ثابت کرنا مناسب نہیں ہے۔ (۲)

---

(۱) اعلاء السنن: ۲/ ۸۸۔۹۱

(۲) امام مالکؒ کا بھی مسلک حنفیہ کے مطابق ہے امام شافعیؒ و احمدؒ کے نزدیک دورانِ خطبہ صرف دو رکعت تحیۃ المسجد ہلکے پھلکے طور پر پڑھنا بلا کراہیت درست ہے اور اگر جمعہ سے پہلے کی سنتیں بھی نہ پڑھی ہوں تو تحیۃ المسجد ہی کے ضمن بھی ان کی بھی نیت کر لی جائے. الفقہ الاسلامی ۱/ ۲۸۷

اذان واقامت کا بیان

اذان کے لغوی معنی اعلان کرنا کے ہیں ،اور اصطلاح معنی مخصوص الفاظ کے ذریعہ نماز کے وقت کا اعلان کرنا ہے،راجح قول کے مطابق اذان کی مشروعیت ۱ ھ میں ہوئی ہے۔

اذان کا آغاز

حضرت عبداللہ بن زید بن عبدربہ سے مروی ہے کہ جس وقت رسول اللہ ﷺ نے لوگوں کونماز کے لئے جمع کرنے کے طریقہ پرغوروفکر کیا تو بحالت نیند (خواب میں) میرے پاس میں ایک شخص ہاتھ میں ناقوس لئے گھوم رہا تھا، میں نے اسے آواز دی اور کہا اے اللہ کے بندے کیا تم ناقوس بیچوگے،اس نے کہا تم اسے لے کر کیا کروگے؟ میں نے کہا: ہم اس کے ذریعہ سے لوگوں کونماز کی طرف بلائیں گے،اس نے کہا: کیا میں تمہیں اس سے بہتر چیز کی رہنمائی نہ کروں؟ میں نے اس سے کہا: کیوں نہیں (ضرور کرو) اس پر اس نے کہا: تم یوں کہو''اللہ اکبر اللہ اکبر'' پھر اس نے اذان واقامت کے پورے کلمات بیان کیے،صبح ہوئی تو میں بارگاہ اقدس میں حاضر ہوا اور جو کچھ میں نے (خواب میں) دیکھا تھا آپ ﷺ کو بتایا، آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: اللہ نے چاہا تو یہ بالکل سچا خواب ہوگا! تم بلال ؓ کے ساتھ اٹھ کھڑے ہو، میں انہیں وہ کلمات سنانے لگا اور وہ اذان دینے لگے۔حضرت عمرؓ نے اس اذان کو سنا اپنے گھر میں تو اپنی چادر گھسیٹے ہوئے پھرتی کے ساتھ نکلے اور سرکار دوعالم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کرنے لگے: یارسول اللہ ﷺ اس ذات کی قسم! جس نے آپ کو حق کے ساتھ بھیجا ہے، میں نے بھی اسی طرح کا خواب دیکھا ہے،آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ساری تعریفیں اور خوبیاں اللہ ہی کے لئے ہیں۔(۱)

(۱) (ابوداؤد :تحقیق الالبانی : باب کیف الاذان : ۴۹۹ صحیح)

اذان کا حکم

اس روایت سے اذان کے آغاز کے پس منظر پر روشنی پڑتی ہے اور نمازوں کے لئے اس کا مسنون ہونا ثابت ہوتا ہے، البتہ سنت اذان اور دیگر سنتوں کے درمیان ایک اہم فرق ہے، اذان سنت ہونے کے علاوہ مذہب اسلام کی ایک پہچان اور کسی بستی کے مسلمان ہونے کا ایک بنیادی ذریعہ شناخت ہے۔ حضرت انسؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ صبح تڑکے دشمن پر حملہ فرماتے تھے اور اس موقع پر اذان کی آواز پر خاص توجہ فرماتے اگر اذان کی آواز سنائی دیتی تو حملہ روک دیتے ورنہ حملہ آور ہوجاتے (۱) اسی بنا پر فقہاء کہتے ہیں: اگر کسی بستی والے اجتماعی طور پر اذان ترک کر بیٹھیں تو مسلمانوں کا حاکم ان سے قتال و جنگ کرے گا (۲)

اذان کی فضیلت

حضرت ابو ہریرہؓ سے مروی ہے کہ: نبی ﷺ نے فرمایا اگر لوگوں کو معلوم ہوتا کہ اذان اور پہلی صف، میں کیا ثواب ہے اور وہ قرعہ ڈالنے کے سواء کوئی چارہ نہ پاتے تو ضرور قرعہ ڈالا کرتے (۳)

حضرت ابوسعید خدریؓ سے مروی ہے، نبی ﷺ نے ارشاد فرمایا: جب تم اپنی بکریوں کے ریوڑ میں ہو یا اپنے کھیت اور جنگل میں ہو پھر نماز کے لئے اذان کہو تو اذان دیتے وقت اپنی آواز بلند رکھو؛ اس لئے کہ جو بھی موذن کی آواز کو سنے گا چاہے وہ انسان ہو یا جن ہو یا کوئی اور مخلوق ہو وہ قیامت کے دن موذن کے حق میں گواہی دے گا۔ (۴)

---

(۱) مسلم باب الامساک عن الاغارہ : ۸۷۳. حجة الله البالغة : ۲/۱۷

(۲) سعاية : ۲/۸

(۳) بخاری باب الاستهام فی الاذان : ۶۱۵

(۴) بخاری باب رفع الصوت بالنداء: ۶۰۹

ایک اور حدیث میں ہے، قیامت کے دن موذن حضرات سب سے اونچی گردن والے ہوں گے، یعنی نہایت سرخروی و سر بلندی سے سرفراز ہوں گے۔(۱)

کن نمازوں کے لئے اذان واقامت مسنون ہے اور کن کے لئے نہیں

مردوں کے حق میں پانچوں فرض نمازوں اور نماز جمعہ کے لئے اذان واقامت کہنی مسنون ہے، زمانۂ رسالت سے آج تک امت کا عمل اس پر ہے، بقیہ نمازوں یعنی سنن، نوافل، وتر، عیدین، کسوف، استسقاء، جنازہ، تراویح وغیرہ کے لئے اذان واقامت نہیں ہے، اس لئے کہ ان نمازوں سے متعلق بے شمار احادیث وآثار موجود ہیں اوران میں سے کسی میں بھی ان نمازوں کے لئے اذان واقامت کا کہنا منقول نہیں، بلکہ سنن ابوداؤد اور دیگر کتب احادیث میں حضرت جابرؓ سے روایت ہے کہ میں نے متعدد دفعہ رسول اللہ ﷺ کے ساتھ عیدین کی نماز اذان واقامت کے بغیر پڑھی ہے۔(۲)

فرض نمازوں کے لئے اذان واقامت کی تفصیلات

ادا نمازوں کے لئے اذان واقامت کہنا

ادا نماز پڑھنے کی چار صورتیں ہوسکتی ہے، (الف) باجماعت اور مسجد میں (ب) باجماعت غیر مسجد (گھر یا بازار وغیرہ ہیں) (ج) تنہا مسجد میں (د) تنہا غیر مسجد میں۔

الف: مسجد والے حضرات اپنی مسجد میں اذان واقامت کے ساتھ باجماعت نمازوں کا اہتمام رکھیں، اگر اذان واقامت کو ترک کیا جاتا ہے تو وہ تارک سنت ٹھہریں گے۔ رسول اللہ ﷺ کے زمانے سے آج تک مسلمانوں کا اس پر عمل ہے، کہیں اس بات کا ثبوت نہیں ملتا کہ مسجد میں اذان واقامت کے بغیر ہی جماعت کرلی گئی ہو، حضرت ابن مسعودؓ فرماتے ہیں کہ

---

(۱) مسلم : باب فضل الاذان : ۸۷۸

(۲) ابوداؤد مع تعلیق الالبانی : باب ترک الاذان فی العید : ۱۱۵۰ . حسن صحیح

رسول اللہ ﷺ نے ہمیں ہدایت سے بھرپور سنتیں سکھلائی ہیں، ان میں سے ایک سنت مسجد میں نماز (باجماعت) پڑھنا ہے جس میں اذان دی جاتی ہے۔(۱)

ب، ج، د: ان تینوں صورتوں میں اذان واقامت کا حکم اتنا تاکیدی نہیں ہے مسجدِ محلّہ کی اذان واقامت بھی کافی ہوسکتی ہے، تاہم اذان واقامت یا صرف اقامت کہہ لی جائے تو اچھا ہے؛ البتہ مسجد میں اپنی تنہاء نماز پڑھنے والا اذان واقامت کہنا چاہے تو آہستہ آواز سے اپنے آپ کہہ لے ورنہ تشویش کا ماحول پیدا ہوسکتا ہے، ذخیرہ نامی کتاب میں ہے کوئی شخص ایسی مسجد میں داخل ہو جس میں مسجد والے جماعت کر چکے ہوں تو ایسا شخص بغیر جماعت کے تنہاء اذان واقامت کہے بغیر نماز پڑھ لے۔(۲)

حضرت اسودؒ وعلقمہؒ سے مروی ہے کہ ہم عبداللہ بن مسعودؓ کے گھر حاضر ہوئے، حضرت ابن مسعودؓ نے حاضرین سے فرمایا: کیا تمہارے ساتھیوں نے نماز پڑھ لی ہے؟ ہم نے عرض کیا نہیں، اس پر حضرت ابن مسعودؓ نے فرمایا: کھڑے ہوجاؤ اور نماز پڑھ لو، اس موقع پر ان حضرات نے اذان واقامت کے بغیر ہی نماز پڑھی (۳) حضرت علقمہؒ فرماتے ہیں: ایک موقع پر حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے مجھے اور اسودؒ کو اذان واقامت کے بغیر نماز پڑھائی، بسا اوقات وہ فرماتے: ہمارے لئے محلّہ کی اذان واقامت کافی ہے(۴) سفیان کہتے ہیں: ان حضرات کے لئے شہر کی اقامت کافی تھی ایک اور روایت میں خود ابن مسعودؓ کا فرمان ہے: شہر کی اقامت کافی ہوجاتی ہے۔(۵)

(۱)مسلم : باب صلاۃ الجماعۃ من سنن الھدی : ۱۵۱۹)
(۲)السعایہ ۲/ ۳۴،۳۵
(۳)مصنف ابن ابی شیبہ : باب من کان یقول یجزئہ ان یصلی بغیر اذان و لا اقامۃ : ۲۳۰۳ صحیح: اثار السنن ۱/۵۷
(۴) السنن الکبیر للبیھقی : باب الاکتفاء باذان الجماعۃ : ۱۹۸۶
(۵) مجمع الزوائد :باب فیمن صلی بغیر اذان : ۱۹۱۳ . مرسل صحیح : اعلاء السنن ۲/۱۳۷

اسی طرح قضاء نمازوں کی بھی یہی چار صورتیں ہوسکتی ہیں:

(الف): باجماعت اور مسجد میں (ب) باجماعت غیر مسجد میں (یعنی گھر یا کھلے میدان میں) (ج) تنہاء مسجد میں (د) تنہاء غیر مسجد میں

یہاں یہ بات واضح رہے کہ نمازوں کا قضاء ہونا کوئی اچھی بات نہیں ہے؛ اس لئے علی الاعلان اذان واقامت کہہ کر اس کو انجام دینا مناسب نہیں کیوں کہ اس راہ سے نمازوں کو قضا کرنے کی بُری مثالیں روز بروز قائم ہوتی چلی جائیں گی، ہاں اگر ایسا کوئی غیر معمولی عذر پیش آگیا، جس کی بناء پر چارو ناچار پوری جماعت ہی کی نمازِ قضا ہوگئی تو اسے علی الاعلان ادا کرنا سنت سے ثابت ہے چاہے مسجد میں ہو یا غیر مسجد میں (۱)

رسول اللہ ﷺ کی حیات میں ایک دو موقع نمازوں کے قضاء ہوجانے کے بھی پیش آئے ہیں، حضرت عمران بن حصینؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ ایک سفر میں تھے اتفاقی طور پر تمام رفقاء نماز فجر میں سو گئے پھر سورج کی گرمی کی تپش سے بیدار ہوئے اور اس مقام سے کچھ آگے بڑھے؛ یہاں تک کہ سورج اچھی طرح طلوع ہوگیا، آپ ﷺ نے موذن کو حکم فرمایا تو اس نے اذان کہی، پھر آپ ﷺ نے فرض سے قبل دو رکعت سنت ادا فرمائی پھر موذن نے اقامت کہی تو آپ ﷺ نے فجر کی نماز پڑھائی۔ (۲)

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے مروی ہے کہ غزوہ خندق کے دن مشرکین نے رسول اللہ ﷺ کو چار نمازوں سے روکے رکھا؛ یہاں تک اللہ کی مشیت کے مطابق رات کا کچھ حصہ بھی گذر گیا، پھر آپ ﷺ نے اس وقت حضرت بلال ؓ کو حکم دیا تو انہوں نے اذان کہی، پھر آپ ﷺ نے نماز ظہر پڑھائی، پھر اقامت کہی تو آپ ﷺ نے نماز عصر پڑھائی، پھر

---

(۱) سعایہ : ۲/۱۰

(۲) ابو داؤد مع تعلیق الالبانی : باب فی من نام عن الصلوۃ : ۴۳۷ صحیح

اقامت کہی تو آپ ﷺ نے مغرب کی نماز پڑھائی، پھر حضرت بلالؓ نے اقامت کہی تو آپ ﷺ نے نماز عشاء پڑھائی۔(۱)

ان روایات سے معلوم ہوا کہ قضاء نمازوں کے لئے بھی اذان واقامت مسنون ہے، ایسے ہی یہ بھی معلوم ہوا کہ متعدد نمازیں اگر قضاء ہوگئی ہوں توان میں سے پہلی قضاء نماز کے لئے اذان واقامت دونوں کہنی چاہئے اور بقیہ قضاء نمازوں میں محض اقامت پر اکتفاء کرلینا بھی درست ہے۔

قضاء نماز تنہا پڑھی جارہی ہوتو اسے بھی ادا نماز کے طریقہ پر اذان واقامت کہہ کر پڑھنا اچھا ہے تاہم یہ خیال ضرور رہے؛ کہ اگر مسجد میں تنہا قضاء نماز پڑھنی ہوتو اذان واقامت دل ہی دل میں چپکے چپکے کہہ لے۔

رسول اللہ ﷺ ارشاد فرماتے ہیں کہ تم میں سے کوئی شخص نماز سے سوجائے یا نماز پڑھنی بھول جائے پھر گھبرا کر نماز کی طرف کھڑا ہوجائے تو وہ اسے اسی طریقہ پر پڑھے، جیسے وہ اسے اپنے وقت میں پڑھا کرتا تھا(۲) علامہ زیلعیؒ شرح کنز میں فرماتے ہیں: ضابطہ یہ ہے کہ ہر فرض ادا ہو یا قضاء اس کے لئے اذان واقامت کہنی چاہئے خواہ تنہا پڑھے یا جماعت کے ساتھ۔(۳)

مسافر کے لئے اذان واقامت کا حکم

مسافر خواہ تنہا ہو یا مسافرین کی جماعت ہو، ان کے لئے اذان واقامت کہنا مسنون ومستحب ہے اور اذان واقامت ہر دو کو ترک کردینا مکروہ ہے، ہاں اذان ترک کرکے

---

(۱)نسائی تحقیق الالبانی : باب الاجتزاء لذلک کله باذان واحدة والاقامة لکل واحد ةمنهما : ٦٦٢ .صحیح لغیره. ترمذی : باب ماجاء فی الرجل تفوته الصلوات : ١٧٩ .اسناد لابأس به : نیل الاوطار :باب بیان انها الوسطی : ٣٩٧/١

(۲)موطا امام مالک :باب النوم عن الصلوة : ٢٦

(۳)السعایه : ٣١/٢

صرف اقامت پر اکتفاء کرنا بلا کراہت درست ہے، اس لئے کہ اذان کا مقصد اعلان اور غیر موجود لوگوں کو جمع کرنا ہے، حالت سفر میں چوں کہ تمام رفقاء حاضر ہی رہتے ہیں؛ اس لئے اذان ترک کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں (۱)

حضرت مالک بن حویرث فرماتے ہیں: میں اپنے ایک ساتھی کے ہمراہ بارگاہ نبوی میں حاضر ہوا ہم آپ ﷺ کے یہاں مقیم رہے، جب واپسی کا ارادہ ہوا تو نبی ﷺ نے ہم سے فرمایا: جب نماز کا وقت آجائے تو اذان واقامت کہو پھر تم میں کا بڑا شخص امامت کرے۔ (۲)

عقبہ بن عامرؓ سے مروی ہے: رسول اللہ نے ارشاد فرمایا: پروردگار عالم اس چرواہے سے اظہار پسندیدگی فرماتے ہیں جو پہاڑ کی چوٹی کے آس پاس بکریاں چراتا ہے (پھر نماز کا وقت آنے پر) اذان کہتا ہے اور نماز پڑھتا ہے، پروردگار ارشاد فرماتے ہیں: میرے اس بندے کو دیکھو نماز کے لئے اذان واقامت کہتا ہے، وہ میرا خوف رکھتا ہے، میں نے میرے بندے کی مغفرت کردی اور اسے جنت میں داخل کیا۔ (۳)

ان روایات سے معلوم ہوا کہ مسافر چاہے تنہاء ہو یا متعدد ہوں، ان کے لئے اذان واقامت کہنا پسندیدہ اور اچھا ہے۔

فائدہ

عورتوں پر اذان واقامت نہیں ہے، اسماء بنت بریدؓ کہتی ہیں: میں نے رسول پاک ﷺ کو فرماتے سنا: عورتوں پر نہ اذان ہے اور نہ اقامت ہے۔ (۴)

(۱) سعایہ: ۲/ ۳۳

(۲) بخاری: باب من قال لیؤذن فی السفر موذن واحد: ۶۲۸۔ ۶۳۰

(۳) ابو داؤد تحقیق الالبانی: باب الاذان فی السفر: ۱۲۰۵

(۴) بیهقی: السنن الکبری للبیهقی وفی ذیله الجوهر النقی: باب لیس علی النساء اذان: ۱۹۹۷۔ رفعه ضعیف۔ مطبع دائرة المعارف حیدرآباد۔ موقوف بسند صحیح: التلخیص الحبیر: باب الاذان: ۳۱۲

اذان واقامت کے شرائط وآداب

الف: وقت کا داخل ہونا

باتفاق فقہاء وقت سے پہلے اذان دینا درست نہیں کہ یہ چیز مقصد اذان کے خلاف ہے اذان کا مقصد وقت کے آغاز کی خبر دینا ہے اور وقت سے قبل اذان دینا مغالطہ کا باعث ہے؛ اس لئے وقت سے پہلے اذان دینا منع ہے، اگر قبل از وقت اذان دے دی گئی ہے تو اعادہ ضروری ہے۔

البتہ اذان فجر کے بارے میں ائمہ ثلاثہ وامام ابو یوسفؒ کا کہنا ہے کہ وہ وقت سے قبل بھی (رات کے اخیر نصف حصہ میں) درست ہے، ان بزرگان کا استدلال بعض ان روایات سے ہے، جن میں حضرت بلالؓ کا سحر کے وقت اذان فجر دینا منقول ہے، لیکن حق بات یہ ہے کہ اس اذان کا تعلق نماز فجر سے نہ تھا؛ بلکہ یہ اذان وقت تہجد وسحر کی اطلاع کے لئے ہوا کرتی تھی جیسا کہ بعض روایات میں اس کی تصریح ہے کہ: بلالؓ کی اذان تمہیں سحری کھانے سے نہ روکے؛ اس لئے کہ وہ رات کو اذان اس غرض سے دیتے ہیں کہ عبادت گذار حضرات لوٹ جائیں (یعنی کچھ دیر استراحت کرلیں تا کہ نماز فجر میں نشاط وچستی رہے) اور سونے والے حضرات بیدار ہو جائیں (اور تہجد ادا کرلیں یا روزہ کا ارادہ ہو تو سحری کھالیں) (۱) اذانِ مذکور فجر کے لئے نہ ہوا کرتی تھی اس کا ایک قرینہ یہ بھی ہے کہ اس اذان کے علاوہ نماز فجر کے لئے علیحدہ طور پر اذان کہی جاتی تھی؛ بلکہ جس زمانے میں حضرت بلالؓ نماز فجر کے لئے جو اذان کہا کرتے تھے اس کے بارے میں انہیں رسالت مآب ﷺ کی جانب سے سخت تاکید تھی کہ وہ صبح صادق سے قبل اذان بالکل نہ کہیں۔

متعدد روایات میں ہے کہ سرور عالم ﷺ نے حضرت بلالؓ سے یہ فرمایا تھا کہ اے بلالؓ صبح صادق سے قبل اذان نہ کہنا۔ (۲)

---

(۱) بخاری باب الاذان قبل الفجر: ۶۲۱

(۲) صحیح و ضعیف ابو داؤد تحقیق الالبانی باب فی الاذان قبل دخول الوقت : ۵۳۴. حسن

ایک دفعہ حضرت بلالؓ نے غلط فہمی سے اذان فجر وقت سے پہلے ہی دے دی تھی تو آپ ﷺ نے بتاکید ان سے فرمایا کہ اسی اذان کے مقام پر جاکر اپنی غلطی کا اعلان کرو کہ بندہ نیند میں تھا۔(جس کی وجہ سے اذان قبل از وقت کہہ دیا تھا)(۱)

ب: عربی زبان میں ہونا

الفاظ قرآنی کی طرح کلمات اذان واقامت بھی خدائی انتظام کے تحت پورے ضبط واحتیاط کے ساتھ بزبان عربی امت تک پہونچے ہیں۔عبداللہ بن زید ؓ کو خواب میں فرشتے نے مکمل متوجہ کر کے کلمات اذان واقامت سنائے تھے اور عبداللہ بن زیدؓ نے بارگاہ نبوی ﷺ میں بعینہ یہی کلمات دہرائے تھے، پھر آپ ﷺ کے حکم سے انہوں نے حضرت بلالؓ کے سامنے یہی کلمات سنانے شروع کئے اور حضرت بلالؓ ان کلمات کو سن سن کر اذان کہتے رہے۔(۲)

اس اہتمام سے معلوم ہوتا کہ اذان حقیقت میں وہی کہلاتی ہے جو مخصوص کلمات پر مشتمل ہو اگر ان کلمات میں ردوبدل کیا جاتا ہے یا ان کو فارسی یا کسی اور زبان میں ڈھالا جاتا ہے تو وہ شرعاً اذان نہیں کہی جاسکتی ہے۔(۳)

ج: اذان واقامت کے کلمات منقول ترتیب کے مطابق کہے جائیں، کلمات میں تقدیم وتاخیر ہو جائے تو دوبارہ ترتیب وار کہا جائے گا،اذان واقامت کے شروع ہونے سے آج تک ان کلمات میں ترتیب کو ملحوظ رکھا گیا ہے۔

د: موذن مسلمان ہو، عاقل وباتمیز ہو

کافر اور بے عقل بچے کی اذان کا کوئی اعتبار نہیں، اس لئے کہ اذان کا مقصود وقت نماز کے شروع ہونے کی خبر دینا ہے، روایت میں ہے: اذان کے جاری ہونے سے قبل لوگ

---

(۱)ابوداؤد تحقیق الالبانی : باب فی الاذان قبل دخول الوقت : ۵۳۲ صحیح

(۲) ابوداؤد تحقیق الالبانی : باب کیف الاذان : ۴۹۹ صحیح

(۳)السعایہ : ۱/۲

نماز کا کوئی خاص وقت مقرر کر کے جمع ہو جایا کرتے تھے (۱) بعدازاں، اس کی جگہ اذان نے لے لی، معلوم ہوا کہ اذان کا بنیادی مقصد اوقات نماز کے آغاز کی خبر دینا ہے، اور یہ لوگ (کافر و بے عقل بچہ) ایسے ہیں، جن کی خبر شرعاً نا قابل قبول ہے، پس ان کی اذان کا بھی کوئی اعتبار نہیں۔

ہ: فاسق اور دیگر غیر معتبر لوگوں کی اذان مکروہ ہے: ارشاد نبوی ہے: چاہئے کہ تمہارے بھلے لوگ تمہارے لئے اذان کہیں۔ (۲) ایک اور ارشاد نبوی ہے، امام ضامن ہوتا ہے اور موذن بھروسہ مند ہوتا ہے، (کہ لوگ اوقات نماز کے معاملے میں اس پر بھروسہ کرتے ہیں) (۳)

عورت کا اذان کہنا بھی مکروہ ہے کیوں کہ عورت کو اپنی آواز بلند کرنی پڑے گی جو شرعاً ممنوع و ناپسندیدہ ہے، اسماء بنت بریدؓ کہتی ہیں: میں نے رسول اللہ ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا کہ عورتوں پر نہ اذان ہے اور نہ اقامت (۴)

و: کلمات اذان کے حرکات وسکنات اور مدات میں بے قاعدگی کمی بیشی، اور گلوکاری کا سا طرز اختیار کرنا مکروہ ہے، حضرت ابن عمرؓ نے ایک موذن سے فرمایا تھا کہ قسم بخدا! میں تجھ سے خدا کے واسطے بغض رکھتا ہوں؛ اس لئے کہ تو اذان میں گلوکاری کرتا ہے (۵) ہاں خالص خوش آوازی اور آواز میں عمدگی اذان اور قرأت قرآن میں مطلوب ہے۔

ز: اذان کے بعد مسجد سے نماز پڑھے بغیر بلا عذر نکل جانا ممنوع ہے، حضرت ابوہریرہؓ

---

(۱) بخاری: باب بدء الاذان: ۶۰۴

(۲) ابوداؤد: باب من احق بالامامة: ۵۹۰. سکت عنه

(۳) ترمذی باب ان الامام ضامن والموذن مؤتمن: ۲۰۷ سنده صحیح البانی

(۴) السنن الکبری للبیهقی ۱۹۹۷ تقدم تحقیقه

(۵) طبرانی کبیر: ۱۲۸۸۳. حسن: مجمع الزوائد: باب اجر المؤذن: ۱۹۰۹

ؓ کی موجودگی میں ایک شخص نے اس طرح کی حرکت کی تھی تو حضرت ابو ہریرہؓ نے فرمایا: اس نے ابوالقاسم ﷺ کی نافرمانی کی ہے۔(۱)

ح: دوران اذان گفتگو نہ کرنا

اذان کے درمیان گفتگو وکلام میں مشغول ہو جانا، اذان کے مقصد میں خلل پیدا کرتا ہے، اس لئے یہ طرز عمل درست نہیں، البتہ اگر کوئی ناگہانی صورت پیش آئی تو دوران اذان مختصراً گفتگو کرنے میں کچھ حرج نہیں۔

عبداللہ بن حارث سے روایت ہے کہ حضرت عبداللہ بن عباسؓ نے ایک بارش والے دن اپنے موذن سے فرمایا: جب تم "اشھد ان محمداً رسول الله" کہہ چکو تو "حی علی الفلاح" نہ کہو بلکہ یوں کہو، لوگو! اپنے گھروں میں نماز پڑھ لو، بعض لوگوں کو حضرت ابن عباسؓ کے اس طریقۂ عمل پر حیرت ہوئی تو حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا: اس طرح کا حکم مجھ سے بہترین شخصیت نے بھی دیا تھا، (میں نے دوران اذان یہ اعلان محض اس لئے کرایا کہ) مجھے یہ ناپسند معلوم ہوا کہ تم اس قدر بارش میں پانی اور کیچڑ میں چل کر آؤ۔(۲)

ابراہیم نخعیؒ سے منقول ہے کہ انہوں نے موذن کے دوران اذان گفتگو کرنے کے بارے میں ارشاد فرمایا: نہ میں اس کو اس کا حکم دوں گا نہ منع کروں گا، امام محمدؒ فرماتے ہیں کہ: ہم تو یہی مناسب سمجھتے ہیں کہ موذن اذان کے دوران گفتگو نہ کرے، لیکن وہ کچھ کلام کر لیتا ہے تو اس کی اذان میں نقص پیدا نہیں ہوگا، یہی امام ابوحنیفہؒ کا قول ہے۔(۳)

---

(۱) مسلم: باب النهي عن الخروج من المسجد اذا اذّن المؤذن : ۱۵۲۱

(۲) ابوداؤد تحقیق الالبانی : باب التخلف عن الجماعة في الليلة الباردة: ۱۰۶۸ صحیح

(۳) کتاب الآثار امام محمد المؤذن يتكلم في اذانه ۵۸

کلمات اذان

اذان کے کلمات کی تعداد پندرہ ہے، کیونکہ دربار رسول کے ہمہ وقتی موذن حضرت بلالؓ اور حضرت عبداللہ بن زیدؓ (جن کے خواب ہی کے ذریعہ اذان کا آغاز ہوا تھا) کی اذان کے کلمات پندرہ ہی ہیں،☆ البتہ فجر کی اذان میں "حی علی الفلاح" کے بعد دو دفعہ "الصلوۃ خیر من النوم" کا اضافہ کرنا چاہئے۔(۱)

فائدہ: اذان واقامت کی تکبیرات اور بقیہ کلمات کو ساکن پڑھنا چاہئے۔

روایت میں ہے کہ اذان جزم ہے اور اقامت بھی جزم ہے (۲) تکبیرات پر زبر بھی پڑھا جاسکتا ہے؛ اس لئے کہ زبر پڑھنے کی صورت میں اگر چہ اخیر کلمہ یعنی راء پر حقیقت میں سکون نہیں پڑھا جارہا ہے؛ مگر اس صورت میں بھی اخیر کلمہ کو سکون کے حکم میں رکھا گیا ہے۔

وہ اس طور پر کہ اللہ اکبر کی راء کو ساکن مان کر ملا کر پڑھنے کی صورت میں اس پر بعد والے حرف کی حرکت (دوسرے اللہ اکبر کے ہمزہ کی حرکت) منتقل کی گئی ہے، گویا پہلے اللہ اکبر کی راء حکماً ساکن ہے۔(۳)

اذان کی سنتیں

(۱) موذن بلند وخوش آواز ہو، رسول پاک ﷺ نے اسلام کی پہلی اذان کے لئے حضرت

☆ امام احمدؒ کا بھی یہی مسلک ہے امام شافعیؒ وامام مالکؒ کے نزدیک اذان میں ترجیع سنت ہے ترجیع کا مطلب شہادتین کو پہلے پست آواز سے کہنا پھر بلند آواز سے دہرانا البتہ امام مالکؒ اس کے قائل ہیں کہ اذان کے شروع میں تکبیر چار دفعہ نہیں بلکہ دو ہی بار ہے اس اعتبار سے کلماتِ اذان امام مالکؒ کے نزدیک ۱۷ ہوں گے اور امام شافعیؒ کے نزدیک ۱۹ ہوجائیں گے (الفقہ الاسلامی ۱/۷۰۲ سبل السلام ۱/۱۸۵)

(۱) ابو داؤد تحقیق الالبانی : باب کیف الاذن : ۵۰۰ صحیح

(۲) مصنف ابن ابی شیبہ : التطریب فی الاذان : ۲۳۹۰

(۳) سعایہ : ۲/۱۴ . ۱۵

بلالؓ کا انتخاب کرتے ہوئے حضرت عبداللہ بن زیدؓ فرمایا تھا، بلالؓ تم سے زیادہ بلند آواز ہیں (۱) حضرت ابومحذورہؓ کو رسول اللہ ﷺ نے ان کی خوش آوازی کی بناء پر موذن مقرر فرمادیا تھا۔(۲)

(۲) بینا آدمی ہو، نابینا آدمی چوں کہ اوقات کے ضبط و پہچان سے معذور ہوتا ہے، اس لئے اس کو موذن بنانا مناسب نہیں، حضرت ابن مسعودؓ فرماتے ہیں: مجھے پسند نہیں کہ نابینا لوگ تمہارے موذن ہوں۔(۳)

البتہ نابینا آدمی اگر ایسا ہے جس کو نمازوں کے اوقات سے مطلع کرنے کے لئے افراد موجود ہوں تو پھر کوئی مضائقہ نہیں۔ حضرت عبداللہ بن ام مکتومؓ موذن رسول تھے اور نابینا تھے، وہ اذان اسی وقت کہتے تھے جب لوگ انہیں آگاہ کرتے کہ وقت ہو چکا ہے۔(۴)

(۳) موذن باوضو و باطہارت ہو، ارشاد نبوی ہے: باوضو آدمی ہی اذان دے(۵) ابن عباسؓ کی حدیث میں ہے کہ اذان چوں کہ نماز سے متصل ہوا کرتی ہے؛ اس لئے آدمی باطہارت ہو کر ہی اذان کہے۔(۶)

معلوم ہوا کہ بے وضو ہونے کی حالت میں اذان کہنا مناسب نہیں، اور بے وضوا قامت کہنا تو اور زیادہ نامناسب عمل ہے اور بے غسل اذان واقامت کہنا تو سخت معیوب ہے۔(۷)

(۴) قبلہ رخ ہو کر اذان کہی جائے، حضرت عبداللہ بن زیدؓ کو خواب میں فرشتے کے واسطے

---

(۱)ابوداؤد :باب کیف الاذان : ۴۹۹ حسن صحیح

(۲)نسائی تحقیق الالبانی : الاذان فی السفر : ۶۳۳ **صحیح**

(۳)مصنف ابن ابی شیبه :باب فی اذان الاعمی:۲۲۶۶ رجاله ثقات : مجمع الزوائد : باب اذان الاعمی : ۱۹۰۶

(۴)بخاری : باب اذان الاعمی اذا کان له من یخبره : ۶۱۷

(۵)ترمذی : کراهیة الاذان بغیر وضوء : ۲۰۰ مرفوعاً ضعیف موقوفا صحیح البدر المنیر ۳/۳۹۱

(۶) کنزالعمال : فی الاذان و الاقامة : ۲۰۹۷۶

(۷) مراقی الفلاح : ۸۴/۱

سے جو اذان سکھلائی گئی تھی اس میں قبلہ رخ ہو کر ہی اذان کہنے کا تذکرہ ہے(۱) اور یہی معمول شروع زمانے سے آج تک چلا آ رہا ہے۔

(۵) اذان حالت قیام میں دی جائے، رسول اللہ ﷺ نے بلالؓ سے فرمایا: کھڑے ہو جاؤ اور اذان کہو(۲) حضرت عطاء فرماتے ہیں: بے عذر بیٹھ کر اذان دینا مکروہ ہے(۳)

(۶) دوران اذان انگلیاں کانوں میں دی جائیں، رسول اللہ ﷺ نے حضرت بلالؓ کو کانوں میں انگلیاں رکھنے کا حکم دیا اور فرمایا یہ طریقہ بلند آوازی میں معاون ہے۔(۴)

(۷) کلمات اذان ٹھہر ٹھہر کر کہے جائیں اور ہر دو کلمات کے درمیان فصل کیا جائے،

رسول اللہ ﷺ نے حضرت بلالؓ سے فرمایا: جب تم اذان کہو تو ٹھہر ٹھہر کر کہو اور اقامت کہو تو جلد جلد کہو۔(۵)

(۸) حی علی الصلوۃ، حی علی الصلوۃ میں چہرے کو دائیں جانب اور حی علی الفلاح، حی علی الفلاح میں چہرے کو بائیں جانب گھمایا جائے۔(۶)

(۹) اذان و اقامت کے درمیان نماز کے وقت مستحب کی رعایت رکھتے ہوئے اتنا فاصلہ رکھا جائے کہ مصلیان مسجد اپنی ضروریات سے نمٹ کر جماعت میں حاضر ہو سکیں، رسول اللہ ﷺ نے حضرت بلالؓ سے فرمایا: اپنی اذان و اقامت کے درمیان اتنا وقفہ رکھو کہ کھانے والا کسی

---

(۱) ابو داؤد تحقیق الالبانی : باب کیف الاذان : ۵۰۷ صحیح

(۲) بخاری : باب بدء الاذان : ۶۰۴

(۳) السنن الکبری للبیھقی : باب الاذان راکبا و جالسا: ۱۹۱۷

(۴) السنن الکبری للبیھقی باب وضع الاصبعین فی الاذنین : ۱۹۳۰ صحیح : امام حاکم تغلیق التعلیق : باب ھل یتتبع المؤذن فاہ ھا ھنا ۲۶۸/۲

(۵) ترمذی : باب الترسل فی الاذان : ۱۹۵ . المستدرک مع تعلیقات الذھبی : باب فضل الصلوات الخمسۃ : ۷۳۲ صرف ایک راوی مطعون ہے۔

(۶) مسلم : باب سترۃ المصلی : ۱۱۴۷)

عجلت کے بغیر اپنے کھانے سے فارغ ہو جائے اور ضرورتمند باطمینان اپنی ضرورت پوری کر لے۔(۱)

(۱۰) اذان پر اجرت نہ لی جائے، رسول اللہ ﷺ نے حضرت عثمان بن العاصؓ سے فرمایا تھا: ایسے موذن کا تقرر کرو جو اذان پر اجرت نہ لیتا ہو۔(۲)

تاہم اگر موذن ایسا ہو کہ دیگر ذرائع سے ہونے والی آمدنی اس کے گذارہ کے لئے ناکافی ہو جس کی بنا پر وہ اذان پر اجرت لیتا ہے اور اس کا احساس یہ ہو کہ اگر اس کی آمدنی کفایت کے بقدر ہوتی تو وہ اذان پر اجرت نہ لیتا تو ایسے موذن کے بارے میں علماء کا خیال ہے کہ اس نے ایک عمل میں دو عبادتیں یکجا کر لی ہے، ایک تو اذان کی عبادت اور دوسرے اس کے ضمن میں اہل وعیال کی پرورش کی سعی ومحنت، ارشاد نبوی ہے: اعمال کا دارومدار نیتوں پر ہے۔(۳)

(۱۱) بہتر یہ ہے کہ جس نے اذان کہی وہی اقامت بھی کہے، زیاد بن حارث صدائیؓ کہتے ہیں: مجھے آپ ﷺ نے فجر کی اذان کہنے کا حکم فرمایا: میں نے اذان کہی، پھر بلالؓ نے اقامت کہنی چاہی تو آپ ﷺ نے فرمایا: ان صدائی بھائی نے اذان کہی ہے اور جو اذان کہے وہی اقامت بھی بولے(۴) تاہم اذان کوئی اور کہتا ہے اور اقامت کوئی اور تو اس میں بھی کوئی مضائقہ نہیں، اسلام کی اذان اول حکم نبوی ﷺ سے حضرت بلالؓ نے کہی تھی اور اقامت خود صاحب خواب عبداللہ بن زیدؓ نے کہی تھی۔(۵)

---

(۱) المستدرک : باب فضل الصلوات الخمسة : ۷۳۲

(۲) ابو داؤد تحقیق الالبانی :باب اخذ الاجر علی التاذین : ۵۳۱ صحیح

(۳) شامی :۲/۳ ۲۱۲

(۴) ابن ماجه تحقیق محمد فواد الباقی : باب السنة فی الاذان : ۷۱۷ صالح . سکت علیه ابو داودؒ

(۵) الدرایة : ۱/۱۱۵

اذان واقامت کا جواب دینا

اذان واقامت کے کلمات سن کران کواسی طرح دہرانا مسنون ہے؛ البتہ " حی علی الصلوۃ " اور " حی علی الفلاح " کے جواب میں " لا حول ولا قوۃ الا باللہ " کہنا چاہئے، محقق ابن ہمامؒ کا رجحان اس جانب ہے کہ " حی علی الصلوۃ " " حی علی الفلاح " کے جواب میں انہی کلمات کو دہرانے کے بعد " لاحول لا قوۃ الا باللہ " پڑھنا چاہئے کہ اس صورت میں دونوں طرح کی احادیث پر عمل ہو جاتا ہے، کیوں کہ بعض احایث میں یہ مضمون ہے کہ جب تم موذن کواذان کہتے ہوئے سنو تو جیسے وہ کہہ رہا ہے تم بھی اسی طرح کہو(۱) جس کا تقاضا یہ ہے کہ " حی علی الصلاۃ، حی علی الفلاح " کے جواب میں انہی کلمات کو دہرالینا چاہئے، اس کے برخلاف حضرت عمرؓ کی روایت میں تصریح ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے " حی علی الصلاۃ اور حی علی الفلاح " کے جواب میں "لاحول ولا قوۃ الا باللہ " کا تذکرہ فرمایا(۲) اقامت میں " قد قامت الصلوۃ " کے جواب میں سننے والا " أَقَامَهَا اللّٰهُ وَاَدَامَهَا " کہے۔(۳) اذان کے بعد رسول اللہ ﷺ پر درود پڑھے پھر یہ دعا پڑھے۔

اَللّٰهُمَّ رَبَّ هٰذِهِ الدَّعْوَةِ التَّامَّةِ وَالصَّلٰوةِ الْقَائِمَةِ اٰتِ مُحَمَّدًاالوَسِيْلَةَ وَالْفَضِيْلَةَ وَابْعَثْهُ مَقَاماً مَحْمُوْدًاالَّذِیْ وَعَدْ تَّهٗ(۴) اِنَّکَ لَا تُخْلِفُ الْمِیْعَادَ.(۵)	اے اللہ! اے اس مکمل پکار اور کھڑی ہونے والی نماز کے رب ! محمد ﷺ کو وسیلہ اور فضیلت عطا فرما اور انہیں مقام محمود عطا فرما جس کا تو نے ان سے وعدہ کیا ہے، بے شک تو وعدہ کی خلاف ورزی نہیں کرتا۔

---

(۱)بخاری باب مایقول اذا سمع المنادی : ۶۱۱ (۲)مسلم: باب استحباب القول مثل قول المؤذن: ۸۷۶

(۳)ابو داؤد : باب ما یقول اذا سمع الاقامة : ۵۲۸.سکت عنه

(۴) بخاری : باب الدعاء عند النداء: ۶۱۴ (۵)السنن الکبری للبیهقی : باب مایقول اذا فرغ من ذلک : ۲۰۰۹ : تفرد بها محمد بن عوف الطائی وهو ثقة : مسند احمد تحقیق شعیب ارانؤوط : ۱۴۸۱۷

احادیث میں اس درود و دعا کا فائدہ عظیمہ یہ بتلایا گیا ہے کہ اس عمل کی برکت سے روز قیامت رسالت مآب ﷺ کی شفاعت نصیب ہوگی۔

اقامت کا بیان

اقامت کے کلمات کی تعداد سترہ ہے، حضرت ابومحذورہؓ فرماتے ہیں: رسول اللہ نے مجھ کو اقامت کے سترہ کلمات سکھلائے (۱) موذن رسول اللہ ﷺ حضرت بلالؓ نیز عبداللہ بن زید کی اذان و اقامت دو دو کلمات پر مشتمل ہوا کرتے تھے یعنی ایک ہی جیسی ہوا کرتی تھی (۲) ☆

دوران اقامت قوم کب کھڑی ہو؟

احادیث سے اتنی بات معلوم ہوتی ہے کہ قوم کو امام کی آمد سے قبل کھڑے نہیں ہونا چاہئے، چنانچہ ارشادِ نبوی ہے: جب نماز قائم کی جانے لگے تو جب تک مجھے دیکھ نہ لو کھڑے مت ہو (۳)

ایک دفعہ حضرت علیؓ مسجد کی طرف نکلے، دیکھا کہ لوگ کھڑے ہو کر آپؓ کا انتظار کر رہے ہیں، اس پر آپؓ نے ارشاد فرمایا: کیا بات ہے؟ میں تم کو حیرت زدہ کھڑے ہوئے دیکھ رہا ہوں۔ (۴)

---

(۱) ترمذی تحقیق الالبانی : الترجیع فی الاذان : ۱۹۲ . صحیح

(۲) مصنف ابن ابی شیبه :من كا ن يشفع الاقامة: ۲۱۵۱ . طحاوی : باب الاقامة كيف هو : ۸۲۴ صحیح : آثار السنن ۱ / ۵۲

☆ کلماتِ اقامت امام مالکؒ کے نزدیک ۱۰ ہیں، ان کے نزدیک سوائے تکبیر کے ہر کلمہ کو، اقامت میں ایک بار کہنا ہے اور امام شافعیؒ واحمدؒ کے نزدیک کلماتِ اقامت کی تعداد گیارہ ہے ان کے یہاں تکبیر کے علاوہ قد قامت الصلوۃ کے کلمات کو بھی دو بار کہنا ہے اور باقی کلمات کو ایک بار۔ الفقه الاسلامی ۱ / ۶۹۱ وما بعدها

(۳) بخاری : باب متی یقوم الناس : ۶۳۷

(۴) مصنف ابن ابی شیبه : باب فی القوم یقومون اذا اقیمت الصلوة : ۴۱۱۷

فقہاء حنفیہ نے اس بارے میں جو تفصیل لکھی ہے، وہ یہ ہے کہ اگر امام و موذن اور مصلی حضرات مسجد میں صف بندی کئے بیٹھے ہوئے ہیں تو مستحب یہ ہے کہ مکبر جب حی علی الصلوۃ حی علی الفلاح پر پہنچے تو امام اور قوم کھڑی ہو جائے پھر جب مکبر قد قامت الصلوۃ کہنے لگے تو امام رکعت باندھ کر نماز شروع کر دے، اس لئے کہ مکبر نماز کھڑی ہو چکنے کی خبر دے رہا ہے اور یہ خبر مکمل معنوں میں سچی اسی صورت میں کہلائے گی جب کہ امام نے واقعۃً اس بول کے ختم ہونے سے پہلے پہلے نماز شروع کر دی ہو اور اگر اقامت کے موقع پر امام موجود نہیں اور وہ مصلیوں کے پیچھے سے آ رہا ہے تو مسئلہ یہ ہے کہ وہ جیسے جیسے صفوں سے آگے بڑھ رہا ہے ویسے ویسے وہ صف والے کھڑے ہوتے چلے جائیں۔(۱)

جمعہ کی اذان ثانی کا جواب دینا

جمعہ کی اذان ثانی کے بارے میں عام حنفیہ کا رجحان یہ ہے کہ دل ہی دل میں جواب دیا جائے، زبان سے نہ کہے، کیوں کہ حدیث میں ہے: جب امام خطبہ کے لئے نکل جائے تو نہ کوئی نماز کی گنجائش ہے نہ کلام کی۔

تاہم اگر زبان سے جمعہ کی اذان ثانی کا جواب دے دیا جائے تب بھی کوئی حرج نہیں، حضرت معاویہؓ کے بارے میں منقول ہے کہ آپؓ نے جمعہ کے روز منبر پر بیٹھ کر اذان ثانی کا جواب کہا تھا۔(۲)

---

(۱) سعایه : ۲/ ۳٦

(۲) بخاری :باب یؤذن الامام علی المنبر اذا سمع النداء: ۹۱۴

شرائط نماز

شرائط نماز چھ ہیں:

۱) بدن کا پاک ہونا نجاست حکمی سے اور نجاست حقیقی سے، نجاست حکمی سے بدن کے پاک ہونے کا مطلب بے وضو اور جنبی نہ ہونا ہے، ارشاد ربانی ہے: اے ایمان والو! جب تم نماز کے لئے اٹھو تو اپنے منہ اور ہاتھ کہنیوں تک دھولو اور سر پر مسح کرلو اور پاؤں ٹخنوں تک دھولو اور اگر تم جنابت کی حالت میں ہو تو غسل کر کے پاک ہو جاؤ۔(۱)

حضرت ابو بکرہؓ سے مروی ہے کہ ایک دفعہ رسول اللہ ﷺ نماز فجر شروع کر رہے تھے اچانک اپنے دست مبارک سے لوگوں کو اشارہ فرمایا کہ اپنی جگہ پر رہو (اتنا اشارہ کر کے آپ ﷺ تشریف لے گئے) پھر اس حال میں آئے کہ آپ ﷺ کے سر سے پانی کے قطرے ٹپک رہے تھے، آپ ﷺ نے لوگوں کو نماز پڑھائی اخیر میں فرمایا: میں بھی انسان ہوں، مجھے جنابت لاحق ہو گئی تھی (۲)

ارشاد نبوی ہے کہ اللہ تعالی اس شخص کی نماز قبول نہیں کرتا جسے حدث لاحق ہو گیا ہو یہاں تک کہ وہ وضو کر لے (۳) بدن کے ایک حصہ یعنی عضو مخصوص پر مذی کے لگ جانے کی صورت میں رسول اللہ ﷺ کا یہ فرمان موجود ہے، کہ عضو مخصوص کو دھو لیا جائے اور وضو کر لیا جائے (۴) مستحاضہ کے بارے میں فرمان نبوی ہے: خون کو دھولے پھر اس کے بعد نماز پڑھے۔(۵)

---

(۱) مائدہ : ۶

(۲)ابو داؤد تحقیق الالبانی : باب فی الجنب یصلی بالقوم : ۲۳۴صحیح

(۳)مسلم باب وجوب الطهارة للصلوة : ۵۵۹

(۴)بخاری باب غسل المذی و الوضوء منه : ۲۶۹

(۵)(بخاری :باب غسل الدم : ۲۲۸)

۲) کپڑے کا پاک ہونا اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اور اپنے کپڑوں کو پاک کرو۔(۱)
حضرت جابر بن سمرہؓ سے روایت ہے کہ ایک آدمی نے نبی ﷺ سے دریافت کیا: کیا میں ان ہی کپڑوں میں نماز پڑھ لوں جن سے اپنی بیوی کے پاس جاتا ہوں؟ فرمایا: ہاں! مگر یہ کہ تم ان میں کوئی نجاست پاؤ تو اسے صاف کرلو(۲) خون حیض کے بارے میں رسول اللہ ﷺ ارشاد فرماتے ہیں: جب تم عورتوں میں سے کسی کے کپڑے کو خون حیض لگ جائے تو وہ اس کو ناخن وغیرہ کے ذریعہ صاف کرے پھر اس کو پانی کے ذریعہ دھوئے پھر اس میں نماز پڑھ لے(۳)

فقہاء نے اس شرط کے بہت سے ذیلی مسائل مستنبط کیے ہیں، ہر مسئلہ کی روح یہی ہے کہ نمازی کا کپڑا پاک رہے، اور ناپاک کپڑا پہن کر نماز نہ پڑھے، یہاں بغرض وضاحت چند فروعی مسائل ذکر کیے جاتے ہیں:

الف: نمازی کے بدن کے کپڑے کا کوئی کنارہ یا اس کے عمامہ کا کوئی گوشہ نجاست وگندگی پر پڑا ہوا ہو تو حکم یہ ہے کہ اگر اس کنارہ یا گوشے کا تعلق مصلی کے بدن اور سر سے اتنا قوی ہے کہ اس کے حرکت کرنے سے وہ کنارہ وگوشہ بھی حرکت کرنے لگتا ہے تو ایسا مصلی ناپاک کپڑے کو پہن کر نماز پڑھنے والا قرار پائے گا۔ (۴)

ب: ناپاک کپڑا نمازی کے سر کے اوپر لٹکا ہوا ہے، اس طور پر کہ وہ جب کھڑا ہوتا ہے تو وہ لٹکا ہوا کپڑا اس کے کندھے پر آجاتا ہے تو ایسا آدمی ناپاک کپڑے کو اپنے کندھے پر ڈال کر نماز پڑھنے والا کہلائے گا۔(۵)

---

(۱)مدثر : ۴
(۲)ابن ماجه تحقيق الالباني : باب الصلاة في الثوب: ۵۴۲
(۳)بخاري باب غسل الدم ۲۲۷
(۴)هنديه : ۱/ ۶۰
(۵)هنديه ۱/ ۶۳

ج: کوئی گدّا ایسا ہے جس میں ناپاک روئی بھری ہوئی ہے، البتہ اوپر کا کپڑا دونوں جانب سے پاک ہے تو امام محمدؒ کے نزدیک ایسے کپڑے میں نماز درست ہے اور امام ابو یوسفؒ کے یہاں درست نہیں۔(۱)

۳) جگہ کا پاک ہونا: کپڑوں کی طرح جگہ کا بھی نمازی سے قوی تعلق ہوتا ہے، جب کپڑوں کی پاکی کا حکم سورۃ مدثر کی آیت:۴ سے ثابت ہوا تو جگہ کی پاکی کا حکم بھی اس کے ذریعہ معلوم ہوگیا، رسول اللہ نے گوبر خانے میں، جانوروں کی ذبح گاہ اور اونٹوں کے باڑ میں نماز پڑھنے سے منع فرمایا ہے(۲) فقہاء کرام نے اس شرط کی روشنی میں بہت سارے مسائل اخذ کیے ہیں: جن میں سے چند یہ ہیں:

الف: کوئی شخص ایک ایسے فرش یا چادر پر نماز پڑھ رہا ہے جس کے ایک حصہ پر نجاست لگی ہوئی ہے تو حکم یہ ہے کہ اگر اس کے قدموں اور سجدوں کی جگہ پاک ہے تو نماز ہوجائے گی ورنہ نہیں۔(۳)

ب: کوئی شخص باریک کپڑا ناپاک زمین پر بچھا کر نماز پڑھتا ہے تو حکم یہ ہے کہ اگر وہ کپڑا ستر پوشی کے لائق ہے کہ اگر اسے پہن لیا جائے تو اعضاء مستورہ نظر نہیں آئیں گے، تو ایسے کپڑے کو ناپاک زمین پر بچھا کر نماز پڑھنے والا ناپاک جگہ پر نماز پڑھنے والا نہیں کہلائے گا۔(۴)

ج: کوئی شخص جوتے چپل پہن کر ناپاک جگہ پر نماز پڑھتا ہے تو حکم یہ ہے کہ اگر وہ انہیں اتارے بغیر ہی ناپاک جگہ پر ٹھہر کر نماز پڑھتا ہے تو اس کی نماز نہیں ہوگی کیونکہ وہ براہ

---

(۱)فتاوی خانیه : ۲۴/۱

(۲) ابن ماجه تحقيق الالباني : باب المواضع التى تكره فيها الصلاة : ۷۴۶. ضعيف. صحح الحديث ابن السكن و امام الحرمين فينظر فى تصحيحهما . فتح الغفار كتاب الصلاة ۸۴/۵

(۳) هنديه : ۶۲/۱

(۴)سعايه : ۶۱/۲

راست ناپاک جگہ پر اپنے قدموں کو رکھنے والا قرار پائے گا اور اگر وہ جوتے چپل اتار دے پھر ان پر اپنے قدموں کو رکھے تو اس کی نماز درست ہوگی اور یہ اس طرح ہے کہ جیسے کوئی پاک کپڑے کو ناپاک زمین پر بچھا کر نماز پڑھ رہا ہو(۱)

۴) ستر عورت ہونا: نماز میں اعضاء مستورہ کا چھپانا مرد و عورت کے ذمہ فرض ہے بلا عذر برہنہ ہونے کی حالت میں نماز درست ہی نہیں ہوتی، اللہ تبارک وتعالی ارشاد فرماتے ہیں: اے بنی آدم! ہر نماز کے وقت زینت اختیار کرو(۲) باتفاق مفسرین یہاں زینت سے مراد کپڑے اور ستر پوشی کی غرض سے ان کا پہننا ہے۔ رسول اللہ ﷺ ارشاد فرماتے ہیں کہ بالغہ عورت کی نماز ڈوپٹہ اوڑھے بغیر قبول نہیں کی جاتی (۳)

ستر پوشی کے حدود

الف: مرد کا ستر ناف کے نیچے سے گھٹنے تک ہے، یعنی گھٹنا تو ستر میں داخل ہے ناف داخل نہیں، حضرت علیؓ سے منقول ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: گھٹنا ستر میں سے ہے(۴) رسول اللہ ﷺ کا ارشاد گرامی ہے کہ ناف کے نیچے سے گھٹنے تک کا حصہ آدمی کے ستر میں سے ہے(۵)

حدیث اول سے معلوم ہوا کہ گھٹنا ستر کا حصہ ہے اور حدیث ثانی سے معلوم ہوا کہ ناف ستر کا حصہ نہیں۔ مرد کے لئے نماز میں اس کے علاوہ باقی حصہ بدن کا چھپانا فرض اور ضروری نہیں ہے، تاہم پیٹ اور مونڈھوں کے کھلے ہوئے ہونے کی حالت میں نماز پڑھنا شائستگی اور آداب نماز کے خلاف ہے اس سے احتیاط کرنی چاہئے۔

(۱) السعایہ : ۲/۲۱

(۲) اعراف : ۳۱

(۳)ترمذی باب ماجاء لاتقبل صلوۃ المرأۃ الا بخمار ۳۷۷. حسن امام ترمذی

(۴)(دارقطنی :باب حد العورۃ التی یجب سترھا ۹۰۱.ضعیف صالح للاعتضاد . اعلاء ۲/۱۵۸)

(۵) دارقطنی:باب حد العورۃ : ۸۹۹.۹۰۰ مسند احمد : مسند عبد اللہ بن عمروؓ تحقیق شعیب الارنؤوط:۶۷۵۶. حسن

رسول اللہ ﷺ نے ارشادفرمایا: آدمی ایک کپڑے میں نماز نہ پڑھے (اس طور پر کہ) اس کے کندھے پر کپڑا کا کوئی حصہ نہ ہو(۱) ایک جگہ اور ارشاد ہے: جب کپڑا کشادہ ہوتو اسے بدن پر خوب اچھی طرح لپیٹ لو اور اگر تنگ اور چھوٹا ہوتو اس کوتہبند کے طور پر پہن لو(۲) آزادعورت کا مکمل بدن سوائے چہرے اور ہتھیلیوں کے ستر میں داخل ہے۔

ارشادخداوندی ہے: عورتیں اپنی زینت نہ ظاہر کریں، مگر جو خود بخود ظاہر ہوجائے (یعنی چہرہ اور ہتھیلی)(۳) رئیس المفسرین حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں: چہرہ اور ہاتھ خود بخود ظاہر ہوجاتے ہیں اس لئے وہ عورت میں داخل نہیں ہے،(۴)

رسول اللہ ﷺ نے ایک موقع پر حضرت اسماء بنت ابی بکرؓ سے فرمایا: اے اسماء! عورت جب بالغہ ہوجائے تو اس کے لئے زیب نہیں دیتا کہ اس (کے جسم) سے سوائے اس کے اور اس کے کوئی اور چیز نظر آئے اور آپ ﷺ نے اپنے چہرے اور ہتھیلیوں کی طرف اشارہ فرمایا۔(۵)

راجح قول کے مطابق عورت کا قدم بھی ستر میں داخل نہیں ہے، اسلئے کہ قدم بھی چہرے اور ہتھیلیوں کی طرح چلنے پھرنے کے دوران خود بخود ظاہر ہوجاتے ہیں، ان کو چھپانے کا حکم مشقت کا باعث ہے اور مشقت میں ڈالنا شریعت کا مزاج نہیں، ارشادربانی ہے: اور اس نے تم پر دین میں کوئی مشقت اور تنگی نہیں رکھی۔(۶)

---

(۱) بخاری : باب اذا صلی فی الثوب الواحد فلیجعل علی عاتقیه: ۳۵۹

(۲) بخاری :باب اذا کان الثوب ضیقا : ۳۶۱

(۳) سورۃ النور : ۳۱

(۴) السنن الکبری للبیهقی : باب ماتبدی المرأة من زینتها : ۱۳۹۲۱ . مصنف ابن ابی شیبه : باب فی قوله تعالی ولایبدین زینتهن : ۱۷۲۸۱ صحیح . سلسلة الاثار الصحیحه : ۴۱۷

(۵) ابوداؤد تحقیق الالبانی : باب فیما تبدی المرأة من زینتها : ۴۱۰۴. صحیح

(۶) سوره حج : ۷۸

ہاں نماز کی حالت میں قدم بھی ڈھنکے رہیں تو بہتر اور مستحب ہے، حضرت ام سلمہؓ نے رسول اللہ ﷺ سے دریافت کیا کہ: کیا عورت تہبند کے بغیر محض کرتے اور ڈوپٹے میں نماز پڑھ سکتی ہے تو آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ہاں جب کہ کرتا اتنا لمبا ہو کہ دونوں قدموں کی پشت کو ڈھانک لے۔(۱)(۲)

اعضاء ستر میں سے کسی عضو کا چوتھائی حصہ نماز میں کھلا رہا تو نماز درست نہیں ہوتی جیسے مرد کے عضو مخصوص کا، یا ران کا یا عورت کے پیٹ یا پیٹھ کا چوتھائی حصہ کھلا رہ گیا ہو تو نماز درست نہ ہوگی، کیوں کہ شریعت کے بہت سارے احکام میں چوتھائی حصہ کو مکمل حصہ کے قائم مقام رکھا گیا ہے مثلاً سر کے چوتھائی حصہ پر مسح کرنے والا شرعاً سر کا مسح کرنے والا کہلاتا ہے، حالت احرام میں کسی نے سر کا چوتھائی حصہ مونڈ لیا تو اس پر مکمل سر کے بال مونڈنے کا جرمانہ لازم ہوتا ہے، حالت احرام سے باہر نکلنے کے لئے مناسک حج و عمرہ کی تکمیل کے بعد کوئی شخص بجائے مکمل سر کے بال مونڈنے کے چوتھائی حصہ کے بال مونڈ لیتا ہے تو وہ شرعاً احرام سے باہر آجاتا ہے اور حلال ہو جاتا ہے، ان نظائر کی روشنی میں فقہاء نے یہ بات کہی ہے کہ اعضاء ستر میں سے کسی عضو کا چوتھائی حصہ کھلا رہ گیا تو گویا مکمل عضو برہنہ رہ گیا اور ستر پوشی کے خدائی اور نبوی حکم پر عمل نہیں ہوسکا، پس نماز نہیں ہوگی، البتہ اگر کسی کے پاس کپڑا بالکل موجود نہیں ہے اور نہ وہ اس کی فراہمی پر قادر ہے تو ایسا شخص برہنہ ہی نماز پڑھ لے گا، ہاں بہتر یہ ہے کہ بیٹھ کہ اشارہ سے نماز کی ادائیگی کرے، حضرت ابن عباسؓ ارشاد فرماتے ہیں: جو آدمی کشتی میں نماز پڑھے یا جو ننگا نماز پڑھے وہ بیٹھ کر نماز پڑھے۔(۳)

---

(۱)المستدرک مع تعلیقات الذهبی :باب التامین : ۹۱۵ .صحیح

(۲)نوٹ: عورت کے ستر کی یہ تفصیل نماز کے اعتبار سے ہے، غیر نماز میں فقہاء کرام نے زمانہ کے بگاڑ کے وجہ سے عورت کے چہرے اور ہتھیلیوں کو بھی چھپانے کا حکم دیا ہے۔ معارف القرآن: سورۃ نور و سورہ احزاب

(۳)مصنف عبد الرزاق :باب صلاۃ العریان : ۴۵۶۵ صالح ومعتبر : اعلاء السنن ۱۶۲/۲

فائدہ: بیرون نماز جس طرح انسان کا اپنے جسم سے کوئی پردہ نہیں اسی طرح اندرون نماز بھی انسان کے بدن کا کوئی حصہ اس کے حق میں ستر نہیں، پس اگر دوران نماز نمازی کی نگاہ کرتے یا جبہ کے شگاف سے خود اپنے ستر پر پڑ جائے تو اس کی نماز فاسد نہ ہوگی، البتہ بہتر یہ ہے کہ ایک کپڑے میں نماز پڑھنے کی صورت میں آدمی اچھی طرح گھنڈی یا کانٹا لگالے تا کہ یہ نوبت پیش نہ آئے اور نماز کا خشوع متاثر نہ ہو، حضرت سلمہ بن اکوع سے مروی ہے کہ میں نے کہا یا رسول اللہ میں ایک شکاری آدمی ہوں تو میں ایک ہی کپڑے میں نماز پڑھ سکتا ہوں؟ ارشاد فرمایا: ہاں اس کو گھنڈی لگا لو اگر چہ کانٹے کے ذریعہ کیوں نہ ہو(۱) اسی طرح ستر پوشی کے باوجود اٹھنے کے وقت یا بیٹھنے کے وقت نیچے کی جانب سے ستر کا کوئی حصہ کسی کو نظر آجائے تو اس سے بھی نمازی کی نماز فاسد نہیں ہوتی ہے۔

سہل بن سعد الساعدی سے مروی ہے کہ لوگ نبی کریم ﷺ کے ساتھ نماز پڑھا کرتے تھے اور لباس وگذارہ کی تنگی کی وجہ سے جیسے تیسے تہبند باندھ لیا کرتے تھے، (اس صورتحال کی بنا پر نماز میں شریک ہونے والی) عورتوں سے کہدیا گیا کہ اپنے سروں کو اس وقت تک نہ اٹھاؤ جب تک کہ مرد سیدھے نہ بیٹھ جائیں۔(۲)

اسماء بنت ابی بکرؓ سے مروی ہے کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ جو عورت اللہ اور یوم آخرت پہ ایمان رکھتی ہے وہ اپنے سر کو، مردوں کے اپنے سروں کو اٹھانے تک نہ اٹھائے، کہیں ایسا نہ ہو کہ ان عورتوں کی نظر مردوں کے اعضاء مستورہ پر پڑ جائے۔(۳)

۵) قبلہ رخ ہونا، ارشاد ربانی ہے: جہاں کہیں ہو اپنا چہرہ بیت اللہ کی طرف نماز میں کرو۔(۴)

---

(۱) مستدرک حاکم مع تعلیقات الذھبی باب التامین : ۹۱۳ صحیح

(۲) بخاری: باب اذا کان الثوب ضیقا : ۳۶۲

(۳) ابو داؤد تحقیق الالبانی : باب رفع النساء اذا کن مع الرجال رؤو سھن من السجدة : ۸۵۱ صحیح

(۴) البقرہ : ۱۱۵

جو شخص کعبۃ اللہ کے روبرو نماز پڑھ رہا ہے اس کے لئے کعبۃ اللہ ہی کی طرف رخ کرنا ضروری ہے اور جو شخص کعبۃ اللہ کا براہ راست مشاہدہ کرنے والا نہیں ہے اس کے لئے کعبۃ اللہ کی سمت کی طرف رخ کر لینا کافی ہے۔

حضرت ابن عباسؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: مسجد حرام میں نماز پڑھنے والوں کا قبلہ کعبۃ اللہ ہے اور حدود حرم میں رہنے والوں کا قبلہ مسجد الحرام ہے اور حرم قبلہ ہے مشرق ومغرب میں بسنے والی میری امت کے تمام اہل زمین کا۔(۱)

قبلہ کی طرف رخ کرنے میں کوئی خطرہ وخوف ہو یا قدرت نہ ہو تو پھر جس رخ پر قدرت حاصل ہو اسی طرف رخ کر کے نماز پڑھ لی جائے، اسی طرح کی مجبوری کی صورت میں یہ آیت نازل ہوئی: اللہ ہی کے لئے مشرق ومغرب ہے تو جدھر بھی چہرہ کرو وہاں اللہ ہے۔(۲)

نافع کہتے ہیں کہ حضرت ابن عمرؓ سے جب نماز خوف کے بارے میں دریافت کیا جاتا تو وہ اس کا طریقہ بیان کرتے پھر کہتے اگر خوف بے حد زیادہ ہو تو پیروں پر کھڑے یا سواری کی حالت ہی میں نماز پڑھ لو، قبلہ کی طرف رخ کر کے یا کسی اور جانب رخ کر کے، نافع کہتے ہیں کہ میرا خیال یہ ہے کہ ابن عمرؓ نے رسول اللہ ﷺ سے سن کر ہی اس کو کہا ہے۔(۳)

قبلہ کا پتہ نہ چلے اور کوئی آدمی بھی نہ ہو جس سے قبلہ معلوم کیا جا سکے تو وہ اندازہ قائم کرے گا اور جدھر دل کا رجحان ہو اسی طرف رخ کر کے نماز پڑھ لیگا، پھر بالفرض نماز کے بعد معلوم ہوا کہ غلط رخ پر نماز پڑھی ہے تب بھی نماز لوٹانے کی ضرورت نہیں، نماز ہوگئی، اس لئے کہ اس کی وسعت میں جتنا تھا وہ کر گزرا ہے۔

حضرت جابرؓ سے روایت ہے کہ ہم حضور ﷺ کے ساتھ کسی سفر میں تھے، ہم لوگوں پر بادل

---

(۱) السنن الکبری للبیھقی : باب من طلب باجتهاده جهة الكعبة : ۲۳۲۴ ضعیف: امام بیہقیؒ

(۲) سورۃ البقرۃ : ۱۱۵ . تفسیر طبری ۲/۵۳۰

(۳) بخاری : باب قوله فان خفتم فرجالا او ركبانا : ۴۵۳۵

چھا گئے، ہم نے قبلہ معلوم کرنے کی غرض سے اندازہ قائم کیا اور قبلہ کے سلسلہ میں ہم مختلف ہو گئے، ہم میں سے ہر آدمی نے علیحدہ رخ پر نماز پڑھی، ہر ایک نے اپنے سامنے ایک خط کھینچی تا کہ اپنی جگہیں اور سمتیں معلوم رہیں، صبح ہوئی تو ہم نے ان جگہوں پر نظر کی، پتہ چلا کہ ہم نے قبلہ کے علاوہ رخ پر نماز پڑھی ہے، پھر ہم نے اس کا آپ ﷺ سے تذکرہ کیا تو آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: تمہاری نمازیں جائز ہو گئی ہیں (۱)

اندازہ قائم کر کے نماز پڑھنے کی صورت میں دوران نماز اندازہ بدل گیا اور کسی اور سمت پر قبلہ ہونا ظاہر ہوا تو نماز ہی میں اس سمت کی طرف اپنا رخ پھیر لیا جائے اور اسی حالت میں نماز مکمل کر لی جائے۔ صحابہ کرام ؓ نے بیت المقدس سے بیت اللہ کی طرف قبلہ بدل جانے کی صورت میں یہی طریقہ اختیار فرمایا تھا (۲)

۶) نیت کرنا

نبی کریم ﷺ ارشاد فرماتے ہیں کہ اعمال کا دارومدار نیتوں پر ہے (۳) رسول اللہ ﷺ کے زمانے سے آج تک تمام امت کا اس بات پر اجماع ہے کہ عبادات مقصودہ میں نیت ضروری ہے۔ (۴)

مقتدی ہو تو اسے امام کی اقتداء کی نیت کرنا بھی ضروری ہے، حضرت ابو ہریرہ ؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: امام بنایا گیا ہے تا کہ اس کی اقتداء کی جائے تو تم اس کے خلاف نہ کرو۔ (۵) اس حدیث سے معلوم ہوا کہ مقتدی کو امام کی مکمل اقتداء کرنی چاہئے اور اس کی مخالفت نہ کرنی چاہئے، اقتداء کی نیت میں یہی ہوتا ہے کہ مقتدی اپنے امام کی اتباع کا عہد کرتا ہے۔

---

(۱) السنن الکبری للبیهقی : باب الاختلاف فی القبلة عند التحری : ۲۳۲۵. حسن : ارواء الغلیل : ۲۹۱ . ۱/۳۲۳)

(۲) بخاری : باب التوجه نحو القبلة : ۳۹۹

(۳) بخاری: باب کیف کان بدء الوحی : ۱

(۴) السعایه : ۲/ ۷۰

(۵) مسلم : باب ائتمام الماموم بالامام : ۹۵۷

نماز کے فرائض

(۱) تکبیر تحریمہ کہنا:

تکبیر تحریمہ کے فرض ہونے کے درج ذیل تین دلائل ہیں:

(الف) ارشاد خداوندی ہے: اور آپ اپنے پروردگار کی تکبیر کہئے (۱) اس آیت میں تکبیر کہنے کا حکم ہے اور حکم خداوندی وجوب وفرضیت کو ثابت کرتا ہے، نماز کے باہر بالاتفاق تکبیر کے واجب ہونے کا کوئی قائل نہیں، اس لئے اس تکبیر سے تکبیر تحریمہ مراد ہے۔ (۲)

ارشاد نبوی ہے: نماز کا تحریمہ تکبیر کہنا ہے۔ (۳)

(ب) نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز کے شروع میں تکبیر تحریمہ کہنے پر عمر تمام پابندی فرمائی ہے، کبھی کسی ایک نماز میں اس کو ترک نہیں فرمایا، ایسی پابندی اہل اصول کے نزدیک فرضیت اور وجوب کو ثابت کرتی ہے۔

(ج) تکبیر تحریمہ کے ضروری ہونے پر تمام امت کا اجماع ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ تکبیر تحریمہ کہے بغیر نماز میں داخل ہونا ممکن نہیں اور یہ درجہ فرض کا ہے۔

فائدہ: حنفیہ کے نزدیک اللہ اکبر کے علاوہ ہر ایسے ذکر سے جو تعظیم خداوندی پر دلالت کرتا ہے، نماز کا آغاز کرنا درست ہے گو کراہت سے خالی نہیں۔

---

(۱) مدثر: ۳

(۲) السعایہ ۲/۱۰۵

(۳) ترمذی تحقیق الالبانی: باب ما جاء أن مفتاح الصلاۃ الطہور: ۳ – حسن صحیح

دلیل: ارشادِ ربانی: اور اس نے اپنے پروردگار کے نام کا ذکر کیا پھر نماز پڑھی (۱) اس آیت میں ذکر اسم خداوندی سے مراد، نماز میں داخل ہونے سے قبل اللہ کا نام لینا ہے، پس جیسے لفظ اللہ اکبر کہنے والے کو اللہ کا نام لینے والا کہا جاتا ہے، اللہ اجل یا اللہ اعظم جیسے تعظیمی اسماء کہنے والے کو بھی اللہ کا نام لینے والا کہا جاتا ہے؛ لہٰذا ان جیسے الفاظ سے بھی تکبیر تحریمہ معتبر ہو جائے گا۔

حضرت ابوالعالیہؒ سے پوچھا گیا کہ سابقہ انبیاء اپنی نمازوں کا آغاز کن کلمات سے کیا کرتے تھے تو جواب دیا کہ توحید، تسبیح و تہلیل کے ذریعہ۔ (۲)

امام شعبیؒ سے منقول ہے اللہ کے جس نام کے ذریعہ بھی تو نماز کو شروع کردے تیرے لئے کافی ہے۔ (۳) ☆

(۴) قیام کرنا

نماز میں قیام کے فرض ہونے پر اجماع امت ہے۔

ارشادِ ربانی ہے: اور تم اللہ کے لئے خشوع وخضوع کے ساتھ کھڑے رہو (۴) اس آیت میں قیام کا حکم ہے اور حکم خداوندی وجوب وفرضیت کو ثابت کرتا ہے، نماز کے باہر کسی موقع پر قیام فرض نہیں، معلوم ہوا کہ یہ حکم نماز ہی میں قیام کے واجب ہونے کو ثابت کرنے کے لئے ہے۔

(۱) سورۃ الاعلی : ۱۵

(۲) مصنف ابن ابی شیبہ : باب ما یجزئ من افتتاح الصلاۃ : ۲۴۷۸- سکت علیہ المحقق محمد عوامہ

(۳) مصنف ابن ابی شیبہ : باب ما یجزئ من افتتاح الصلاۃ : ۲۴۷۹- سکت علیہ المحقق محمد عوامہ

☆امام مالکؒ وامام احمدؒ کے نزدیک اللہ اکبر کے علاوہ کسی اور ذکر کے ذریعہ نماز منعقد نہیں ہوتی اور امام شافعیؒ کے نزدیک اللہ اکبر کے علاوہ "اللہ الاکبر" "اللہ الجلیل الاکبر" کے ذریعہ بھی نماز کا آغاز کیا جاسکتا ہے، امام ابو یوسفؒ کے نزدیک "اللہ الاکبر" اور "اللہ الکبیر" کے ذریعہ بھی نماز کو شروع کیا جاسکتا ہے۔ (المغنی : ۳۰۸/۲، الفقہ علی المذاہب الاربعۃ : ۲۳۲/۱، الفقہ الاسلامی وادلتہ : ۱۰/۲، بدائع الصنائع : ۲۲/۲ ، کتاب میں مذکور مسلک امام ابوحنیفہ وامام محمدؒ کا ہے۔

(۴) سورۃ البقرۃ : ۲۳۸

حضرت عمران بن حصینؓ سے روایت ہے کہ مجھے بواسیر کا مرض تھا، میں نے نبی ﷺ سے نماز کے متعلق دریافت کیا تو آپ ﷺ نے فرمایا، کھڑے ہو کر نماز ادا کرو، اگر کھڑے نہ ہو سکتے ہو تو بیٹھ کر پڑھو اور اگر بیٹھ نہ سکتے ہو تو لیٹ کر پہلو پر نماز پڑھو۔(۱) ☆

(۳) قرأت کرنا

ارشاد ربانی ہے: ﴿فَاقْرَؤُوا مَا تَيَسَّرَ مِنَ الْقُرْآنِ﴾ ''اب پڑھو جتنا تم کو آسان ہو قرآن سے''(۲) یہاں اصولی اعتبار سے لفظ ''مَا'' عام ہے، جو ہر آسان حصۂ قرآن کو اپنے عموم کے تحت شامل کر رہا ہے چاہے وہ سورۃ فاتحہ ہو یا کوئی اور حصۂ قرآن ہو؛ لہٰذا اس قرآنی حکم کی رو سے نماز میں مطلق قرأت کرنا (مکمل قرآن میں سے جہاں سے آسان معلوم ہو) فرض قرار پایا۔

ایک صحابیؓ کو نماز سکھلاتے ہوئے آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: جب تم نماز کے لئے کھڑے ہو جائے تو تکبیر کہو پھر قرآن میں سے جو بآسانی تمہارے ساتھ ہو (تمھیں یاد ہو) وہ پڑھ لو پھر رکوع کرو۔(۳)

اس حدیث میں قابلِ لحاظ بات یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے نماز کی تعلیم کے موقع پر بجائے سورۃ فاتحہ یا کوئی اور خاص سورت پڑھنے کا حکم دینے کے، قرأت کے معاملہ کو مصلی کی سہولت وصوابدید پر چھوڑ دیا اور مصلی کو جو آسانی لگے وہ پڑھنے کا حکم دیا، اس طرز تلقین وتعلیم سے پتہ چلتا ہے کہ اصل فرض یہی ہے، باقی سورۃ فاتحہ کو پڑھنا فرض نہیں؛ بلکہ اس کا درجہ فرض سے کم تر ہے۔

---

(۱) بخاری : باب إذا لم يطق قاعدا صلى على جنب : ۱۱۱۷

(۲) المزمل : ۲۰

(۳) بخاری : باب وجوب القراءة للإمام : ۷۵۷

☆ ائمہ ثلاثہ کے نزدیک تکبیر تحریمہ اور سورۃ فاتحہ کے پڑھنے تک ہی قیام فرض ہے اور اس سے زیادہ مقدار مسنون ہے۔ (موسوعة فقهية: ۳۴/۱۰۷)

نماز میں مطلق قرأت کے فرض ہونے کے مضمون کو ایک حدیث میں یوں بیان کیا گیا ہے قرأت کئے بغیر نماز نہیں ہوتی۔(۱)☆

فائدہ: جس شخص کو کچھ قرآن یاد نہیں اور نہ وہ فی الحال کوئی آیت یاد کرنے پر قادر ہے جیسے کافر تھا ابھی ابھی مسلمان ہوا ہے یا نابالغ تھا اور ابھی ابھی بالغ ہوا ہے اور ادھر نماز کا وقت ختم ہونے جا رہا ہے تو ایسا آدمی قرأت کے بجائے تسبیح اور تحمید وغیرہ پر اکتفاء کر سکتا ہے۔

حضرت عبداللہ بن ابی اوفی ﷛ سے مروی ہے: ایک شخص نبی ﷺ کے پاس آیا اور کہنے لگا میں قرآن کے کسی حصہ کو بھی یاد رکھنے کی استطاعت نہیں رکھتا؛ اس لئے آپ ﷺ مجھے کوئی متبادل چیز سکھلایئے؟ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

" سبحان الله والحمد لله ولاالٰه الّا الله والله اكبر ولا حول ولا قوة الا بالله العلى العظيم کہہ لیا کرو" (۲)

(۴) رکوع کرنا:

رکوع کے فرض ہونے پر اجماع ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اے ایمان والو! رکوع کرو۔(۳)

رکوع کے لغوی معنی محض جھکنے کے ہیں، شرعاً کسی قدر سر اور پشت جھکانے کا نام رکوع ہے، ارشاد ربانی ہے: ''اور رکوع کرو اور رکوع کرنے والوں کے ساتھ'' (۴)، نیز ارشاد ہے: ''اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ جھکو تو نہیں جھکتے'' (۵) پس رکوع کا فرض تو محض قیام سے کسی قدر جھکنے کے ذریعہ ادا ہو جاتا ہے؛ البتہ جھکانے کا کمال یہ ہے کہ ہاتھ

(۱) مسلم شریف :باب وجوب قراءة الفاتحة : ۹۰۸
(۲) أبوداؤد : تحقيق الالبانى : باب ما يجزئ الأمي : ۸۳۲ – حسن
(۳) الحج : ۷۷
(۴) البقرة : ۴۳
(۵) المرسلت : ۴۸

☆یہی امام احمدؒ سے بھی ایک روایت ہے اور بعض اہل علم کا مسلک بھی یہی ہے۔(المغنی : ۳۳۶/۲ ، نووی شرح مسلم : ۱۲۸/۲)

گھٹنوں تک پہنچ جائیں، اور کامل رکوع کی کیفیت یہ ہے کہ سر، پشت اور سرین ایک سیدھ میں ہوں، پنڈلیاں اور ران سیدھے ہوں، کہنیاں، پہلووں سے علیحدہ ہوں، ہتھلیاں ،گھٹنوں کو مظبوطی سے پکڑے ہوئے ہوں اور انگلیاں کھلی ہوئی ہوں۔(۱)

(۵) ہر رکعت میں دو سجدے کرنا:

ہر کعت میں دو سجدے کرنا بالا جماع فرض ہے، اللہ تعالی کا ارشاد ہے: ''اے ایمان والو! رکوع کرو اور سجدہ کرو'' (۲)

سجدہ کے لغوی معنی: عاجزی وانکساری کی آخری حد اختیار کرنا۔

سجدہ کے شرعی معنی: ماتھے کو زمین پر ٹیک دینا۔

سجدہ کا طریقہ یہ ہے کہ سجدہ میں پیشانی اور ناک دونوں زمین سے لگ جائیں۔

نبی ﷺ کا سجدہ اسی انداز کا ہوا کرتا تھا، روایت ہے کہ: جب آپ ﷺ سجدہ فرماتے تو اپنی ناک اور پیشانی زمین سے لگا دیتے۔(۳)

سجدہ کا یہ طریقہ کہ صرف پیشانی زمین سے لگائی جائے ناک نہ لگائی جائے، جائز تو ہے مگر پسندیدہ نہیں۔

حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ کو سات ہڈیوں پر سجدہ کرنے کا حکم دیا گیا، پیشانی، دونوں ہاتھ، دونوں گھٹنے، دونوں پیر (۴) اس سے معلوم ہوا کہ ناک لگائے بغیر صرف پیشانی پر سجدہ کرنے سے بھی سجدہ ادا ہو جاتا ہے؛ البتہ بے عذر ایسا کرنا مکروہ ہے، حضرت عائشہؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اپنے خاندان کی کسی خاتون کو دیکھا کہ وہ نماز پڑھ رہی ہیں (مگر سجدہ میں) اپنی ناک زمین پر نہیں رکھتی ہیں،

(۱) السعایہ : ۲/۱۱۳ ، الفقہ الاسلامی وادلتہ: ۲/ ۸۴۱

(۲) سورۃ الحج : ۷۷

(۳) ترمذی : باب السجود علی الجبھۃ والأنف : ۲۷۰ – حسن صحیح امام ترمذی

(۴) بخاری : باب السجود علی سبعۃ أعظم : ۸۰۹

آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: اے اللہ کی بندی! اپنی ناک زمین پر رکھ؛ اس لئے کہ اس کی نماز نہیں ہوتی جو اپنی پیشانی کے ساتھ اپنی ناک کو زمین پر نہیں رکھتا (۱)

حضرت حسنؒ فرماتے ہیں: اگر تم چاہو تو سجدہ میں اپنی ناک بھی لگا دو اور اگر نہ چاہو تو نہ لگاؤ، حضرت عامرؒ سے اس شخص کے بارے میں جو سجدہ میں ناک نہیں لگاتا، یہ منقول ہے کہ اس کا سجدہ درست ہو جاتا ہے۔(۲)

بلا عذر صرف ناک پر سجدہ کرنے سے سجدہ ادا نہیں ہوتا، احادیث سے پیشانی اور ناک پر یا صرف پیشانی پر سجدہ کا جواز تو معلوم ہوتا ہے، مگر صرف ناک پر اکتفاء کرنے کا کہیں ذکر نہیں ملتا، تاہم چوں کہ ناک بھی چہرہ ہی کا ایک حصہ ہے اور بعض احادیث میں چہرہ کو اعضاءِ سجدہ سے شمار کیا گیا۔(۳) اس لئے بوقت مجبوری سجدہ کی یہ شکل اختیار کی جاسکتی ہے۔

حضرت محمد بن سرینؒ سے ایک ایسے آدمی کے بارے میں پوچھا گیا جو ناک پر سجدہ کرتا ہے؟ ابن سرینؒ نے جواب دیا: کیا تم قرآن میں یہ آیت پڑھتے نہیں کہ وہ سجدہ میں تھوڑیوں کے بل گر پڑتے ہیں (بنی اسرائیل:۱۰۹)۔(۴)

حضرت طاؤسؒ سے ناک پر سجدہ کرنے کے بارے میں سوال کیا گیا تو فرمایا: کیا وہ چہرہ کا معزز ترین جزو نہیں ہے؟(۵)

احادیث کی رو سے سجدہ میں دو قدموں، دو گھٹنوں اور دونوں ہتھیلیوں کو بھی زمین سے لگا دینا کامل طور پر سجدہ ادا ہونے کے لئے ضروری ہے؛ البتہ گھٹنوں اور ہتھیلیوں کے مقابلہ میں قدموں کا بحالت سجدہ زمین سے لگائے رکھنا زیادہ ضروری ہے کہ اس کے بغیر سجدہ

---

(۱)سننِ دار قطنی :باب وجوب وضع الجبهة والأنف : ۱۳۳۳ ، ضعیف : امام دار قطنی ، مصنف عبد الرزاق : باب سجود الأنف : ۲۹۸۱ – صحیح

(۲)مصنف ابن أبي شيبة : من رخص في ترک السجود على الأنف : ۲۷۱۳ – ۲۷۱۵ ، سکت علیه المحقق محمد عوامه .

(۳)نسائی تحقیقی الالبانی : باب علی کم السجود : ۱۰۹۴ – صحیح

(۴)تهذیب الآثار للطبری : ۲۲۴۲

(۵)مصنف ابن أبي شيبة : فی السجود علی الجبهة والأنف : ۲۷۰۷ – سکت علیه المحقق محمد عوامه

نہیں کہلاتا، کھیل تماشہ اور کرتب بن جاتا ہے؛ حالاں کہ حکم سجدہ کرنے کا ہے۔(۱)☆

(۶) قعدہ اخیرہ کرنا:

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کو ایک موقع پر رسول اللہ ﷺ نے تشہد سکھلانے کے بعد ارشاد فرمایا: جب تم یہ کہہ لو یا اس کو (قعدہ کو) پورا کرلو تو تم نے اپنی نماز پوری کرلی، اب اگر کھڑے ہونا چاہو تو کھڑے ہو جاؤ اور اگر یوں ہی بیٹھے رہنا چاہو تو بیٹھے رہو۔(۲)

واضح ہو کہ تشہد کا پڑھنا بالاجماع قعدہ ہی میں مشروع ہے، قعدہ کے علاوہ نماز کے اندر کوئی اور جگہ تشہد پڑھنے کا محل نہیں؟ اس لئے حدیث پاک کا مفہوم یہ ہے کہ اگر تم نے قعدہ میں تشہد بھی پڑھ لیا یا صرف قعدہ ہی کیا تو دونوں صورتوں میں تمہاری نماز ہوگئی، اس لحاظ سے قعدہ اخیرہ کا اصل ہونا اور نماز کی تکمیل کا اس پر موقوف ہونا معلوم ہوتا ہے۔

حضرت علیؓ کے ایک اثر سے بھی اس مفہوم کی تائید ہوتی ہے، حضرت علیؓ فرماتے ہیں: جب آدمی تشہد کے بقدر بیٹھ جائے پھر وضو توڑ دے تو اس کی نماز ہوگئی۔(۳) پس اس مرفوع اور موقوف روایت کو ارشاد خداوندی: ''اقیموا الصلوۃ''(۴) تم نماز قائم کرو، کے اجمال کی تشریح مان کر قعدہ اخیرہ کو فرض قرار دیا جائے گا۔☆

---

(۱) السعایہ : ۲/ ۱۱۷ – ۱۲۰

☆ سجدہ میں ناک، دونوں قدم، دونوں گھٹنوں اور دونوں ہتھیلیوں کا رکھنا امام مالکؒ کے نزدیک سنت ہے، امام شافعیؒ وامام احمدؒ کے نزدیک واجب اور رکن ہے (، موسوعة فقهية : ۲۷/ ۶۶ . ۶۹)

(۲) ابوداؤد : باب التشهد : ۹۷۲ ، مسند أحمد : مسند عبد الله بن مسعود : تحقيق شعيب الارنؤوط : ۴۰۰۶ – اسناده صحيح رجاله ثقات رجال الصحيح

(۳) السنن الكبرى للبيهقي : باب فرض التشهد : ۲۹۳۸ – صالح معتبر : مرقاة المفاتيح : باب التشهد : ۲/۵۷۷

(۴) البقرة : ۴۳

☆ امام مالکؒ کے نزدیک صرف ایک جانب سلام پھرنے کے لئے بیٹھنا فرض ہے اس سے زیادہ بیٹھنا سنت ہے اور امام شافعیؒ واحمدؒ کے نزدیک قعدہ اخیرہ میں تشہد پڑھنا اور کم از کم ''اللهم صل علی محمد'' پڑھنا اور اتنی دیر بیٹھنا رکن ہے۔

(الفقه الاسلامي وادلته : ۲/ ۸۵۰ ، الموسوعة : ۲۷/ ۶۹ . ۷۰)

واجبات نماز

(۱) سورۃ فاتحہ کا پڑھنا:

حضرت عائشہؓ سے مروی ہے: رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ہر وہ نماز جس میں سورہ فاتحہ نہ پڑھی جائے تو وہ نماز ناقص ہے۔(۱) حضرت ابو ہریرہؓ سے مروی ہے، رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: جس شخص نے نماز پڑھی اور اس میں سورہ فاتحہ کی قرأت نہیں کی تو وہ ناقص ہے ناقص ہے ناقص ہے۔(۲)

یہاں ان دو روایات میں قابل غور بات یہ ہے کہ سورۃ فاتحہ کے نہ پڑھنے پر نماز کو باطل و فاسد نہیں قرار دیا گیا، معلوم ہوا کہ سورہ فاتحہ کی قرأت کا درجہ فرضیت ورکنیت سے کم کا ہے اور وہ درجہ وجوب کا ہے۔

سورہ فاتحہ کو فرض قرار دینے کی صورت میں ایک خرابی یہ بھی پیدا ہوتی ہے کہ اس سے کتاب اللہ کے حکم کی خلاف ورزی لازم آتی ہے کہ کتاب اللہ میں مطلق قرأت کو فرض بتلایا گیا ہے، سورۃ فاتحہ کی تخصیص نہیں کی گئی ہے، اب اگر ان احادیث سے سورۃ فاتحہ کے پڑھنے کو فرض ثابت کیا جاتا ہے تو قرآنی حکم نظر انداز ہو جاتا ہے، اس لئے سورۃ فاتحہ کو فرض تو نہیں واجب کہا جائے گا اور مطلق قرأت فرض رہے گی۔

ائمہ ثلاثہ کے نزدیک سورۃ فاتحہ کا پڑھنا فرض ہے، ان حضرات کا استدلال ان احادیث سے ہے جن میں یہ مضمون بیان ہوا کہ ہے: اس شخص کی نماز نہیں ہوتی جس نے سورۃ فاتحہ نہیں پڑھی۔

(۱) ابن ماجه تحقيق الالباني: باب القرأة خلف الامام: ۸۴۰. حسن صحيح

(۲) مسلم: باب وجوب القرأة في كل ركعة: ۹۰۷

حنفیہ اوپر بیان ہوئی تفصیل کی روشنی میں کہتے ہیں کہ اس قسم کی احادیث میں نماز کے نہ ہونے سے مراد کامل طریقہ پر نماز کا نہ ہونا ہے یہ مطلب نہیں کہ بالکل ہی نماز نہیں ہوتی، جیسے یہی مفہوم تمام حضرات ائمہ ان درج ذیل احادیث کا لیتے ہیں: مسجد کے پڑوس میں رہنے اولے کی نماز نہیں ہوتی، مگر مسجد ہی میں، اس شخص کا وضو نہیں ہوتا جس نے (وضو کے شروع میں) اللہ کا نام نہ لیا ہو، اس کی تائید اس سے بھی ہوتی ہے کہ ایک موقع پر نبی ﷺ نے حضرت ابو ہریرہ کے ذریعہ مدینہ منورہ میں یہ منادی کروائی کہ قرآن کے بغیر نماز نہیں ہوتی، (یعنی نماز میں قرآن کا پڑھنا ضروری ہے) خواہ سورۂ فاتحہ اور کچھ زائد ہی ہو۔(۱)

حدیث مذکور کا طرزِ بیان، اس جانب مشیر ہے کہ نماز میں اصل مطلوب تو قرآن کا پڑھنا ہی ہے، باقی سورۂ فاتحہ اور مزید کچھ آیات (ضم سورہ) کا پڑھنا اصل حکم پر عمل کرنے کی ایک شکل ہے، خود اصل حکم نہیں، یہی وجہ ہے کہ ضم سورہ کے پڑھنے کو کوئی بھی فرض اور رکنِ اصلی کا درجہ نہیں دیتا، اس کا تقاضہ یہ ہے کہ سورۂ فاتحہ کا بھی یہ درجہ نہ ہو؛ کیوں کہ سورۂ فاتحہ اور ضم سورہ دونوں ایک ہی سلسلۂ کلام میں واقع ہوئے ہیں، اس سے ثابت ہوا کہ نہ ہی سورۂ فاتحہ اصل رکن ہے اور نہ ہی ضم سورہ؛ بلکہ رکنِ اصلی اور فرضِ حقیقی کہیں سے بھی قرآن کی چند آیات پڑھ لینا ہے۔(۲) ☆

(۲) سورۃ فاتحہ کے ساتھ کوئی اور سورت کا ملانا:

رسول اللہ ﷺ ارشاد فرماتے ہیں: اس شخص کی نماز نہیں ہوتی (کامل طریقہ پر) جس

---

(۱) أبو داؤد: باب من ترك القراءة في صلاته: ۸۱۹ – حسن: فتح الملهم: ۲۰/۲

(۲) فتح الملهم: باب وجوب قراءة الفاتحة: ۲۰/۲

☆ یہی امام احمدؒ سے بھی ایک روایت ہے اور بعض اہل علم کا مسلک بھی یہی ہے۔(المغنی: ۳۳۶/۲، نووی شرح مسلم: ۱۲۸/۲)

نے سورہ فاتحہ اور (اس کے ساتھ) کوئی سورۃ نہ پڑھی ہو۔(۱) حضرت ابوسعید خدریؓ سے مروی ہے: ہم کو حکم دیا گیا کہ ہم سورۃ فاتحہ پڑھیں اور جو آسان ہو (وہ بھی پڑھیں)۔(۲)

فائدہ: فرض نمازوں کی صرف پہلی دو رکعتوں میں سورۃ فاتحہ پڑھنا اور ضم سورۃ کرنا واجب ہے، باقی رکعتوں میں نہ سورۃ فاتحہ کا پڑھنا واجب نہ ضم سورۃ کرنا' فرض نمازوں کے علاوہ باقی نمازوں کی تمام رکعتوں میں سورۃ فاتحہ اور ضم سورۃ کا پڑھنا واجب ہے۔

حضرت ابوقتادہؓ سے مروی ہے: رسول اللہ ﷺ پہلی دو رکعتوں میں سورۃ فاتحہ اور کوئی سورت پڑھا کرتے تھے اور اخیر کی دو رکعتوں میں صرف سورۃ فاتحہ پڑھتے تھے۔(۳)

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ اور حضرت علیؓ سے منقول ہے کہ ان دونوں حضرات نے ارشاد فرمایا: پہلی دو رکعتوں میں قرأت کرو اور بعد کی دو رکعتوں میں تسبیح پڑھ لیا کرو۔(۴)☆

(۳) قعدہ اولی میں بیٹھنا اور اس میں تشہد پڑھنا:

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے مروی ہے: رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: تم لوگ (قعدہ میں) التحیات الخ پڑھو۔(۵)

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ ہی سے ایک اور روایت ہے: رسول اللہ ﷺ نے اس حال میں کہ میرا ہاتھ آپ ﷺ کی دونوں ہتھیلیوں کے درمیان تھا، تشہد ایسے سکھلایا جیسے آپ ﷺ مجھے قرآن کی کوئی سورت سکھلا رہے ہوں، پس فرمایا: جب تم میں سے کوئی نماز میں بیٹھ جائے

---

(۱) أبو داؤد : تحقيق الالباني : باب من ترك القراءة في صلاته : ۸۲۰ – صحيح

(۲) أبو داؤد : تحقيق الالباني : ۸۱۸ – صحيح

(۳) بخاري : باب يقرأ في الأخريين بفاتحة الكتاب : ۷۷۶

(۴) مصنف ابن أبي شيبة : من كان يقول : سبح في الأخريين ولا تقرأ : ۳۷۶۳ – ۳۷۶۴ – سكت عليه المحقق محمد عوامه ، مصنف عبد الرزاق : باب كيف القراءة في الصلاة : ۲۶۵۶ – صحيح ، إعلاء السنن : ۱۳۴/۴

☆ائمہ ثلاثہ کے نزدیک سورۃ فاتحہ کے بعد ضم سورۃ کا پڑھنا مسنون ہے: الفقہ الاسلامی: ۸۸۲/۲

(۵) بخاري : باب التشهد في الآخرة : ۸۳۱

تو چاہئے کہ کہے التحیات للہ الخ۔(۱)

ان دو روایتوں میں نبی ﷺ نے حکم کے طور پر تشہد پڑھنے کو فرمایا اور نبی ﷺ جس چیز کا حکم فرمادیں اس پر عمل واجب ہو جاتا ہے؛ اس لئے تشہد کا پڑھنا واجب اور ضروری ہے۔ تشہد کے واجب ہونے کی تائید آنحضرت ﷺ کے اس فرمان سے بھی ہوتی ہے کہ: تم لوگ تشہد کو سیکھو کیوں کہ تشہد کے بغیر نماز (مکمل) نہیں ہوتی، (۲) پھر تشہد پڑھنے کی جگہ چوں کہ قعدہ ہی ہے اس لئے تشہد پڑھنے کی خاطر قعدہ اولی میں بیٹھنا بھی واجب ٹھہرا۔☆

(۴) قعدہ اخیرہ میں تشہد پڑھنا:

وہ روایات جن میں تشہد پڑھنے کا حکم موجود ہے ان میں قعدہ اولی اور قعدہ اخیرہ کے درمیان کوئی فرق نہیں کیا گیا؛ اس لئے ہر دو قعدوں میں تشہد کا پڑھنا واجب ہوا ۔ البتہ قعدہ اخیرہ کو ہر صورت میں ضروری قرار دیا گیا اور نماز کے پورا ہونے کو اس پر موقوف رکھا گیا ہے، جب کہ قعدہ اولی کو بھولے سے ترک کرنے پر بنی ﷺ نے صرف سجدہ سہو پر اکتفاء فرمایا تھا، نماز دہرائی نہیں تھی۔ (۳) معلوم ہوا کہ قعدہ اولی کے مقابلے میں قعدہ اخیرہ کا درجہ بڑھا ہوا ہے۔☆

---

(۱)مسلم : باب التشهد في الصلاة : ۹۲۸

(۲)مسند البزار : مسند عبد الله بن مسعود : ۱۵۷۱ – حسن ، مجمع الزوائد : باب التشهد والجلوس : ۲۸۴۹

☆ قعدہ اولی کرنا اور اس میں تشہد پڑھنا امام احمدؒ کے نزدیک واجب ہے، امام مالکؒ کے نزدیک سنت ہے اور امام شافعیؒ کے نزدیک ایسی سنت ہے جس کے ترک سے سجدہ سہو لازم ہوتا ہے (الفقه علی المذاهب الاربعة : ۱/۳۶۲،۳۶۶)

(۳)بخاری : باب ما جاء في السهو إذا قام من ركعتي الفريضة : ۱۲۲۴

☆ قعدہ اخیرہ میں تشہد پڑھنا امام مالکؒ کے نزدیک سنت ہے اور امام شافعیؒ و احمدؒ کے نزدیک فرض ہے۔ (الفقه علی المذاهب الاربعة : ۱/۳۵۵،۳۵۶،۳۶۵ ، الموسوعة ۲۷/۶۹)

(۵) لفظ سلام کے ذریعہ نماز کو ختم کرنا:

حضرت عبداللہ بن عمروؓ سے مروی ہے: رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: جب کبھی آدمی کو سلام پھیرنے سے قبل حدث آ گیا ہو؛ حالاں کہ وہ اپنی نماز کے آخر (قعدہ) میں بیٹھ چکا ہے تو اس کی نماز درست ہوگئی۔(۱) طحاوی کی روایت میں ہے کہ: اس کی نماز مکمل ہوگئی پھر وہ نماز کی طرف نہ لوٹے۔(۲)

حضرت علیؓ سے مروی ہے: جب آدمی تشہد کے بقدر بیٹھ جائے پھر وضو توڑ دے تو اس کی نماز پوری ہوگئی (۳) حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: جب تم یہ کہہ لو (قعدہ میں بیٹھ کر تشہد پڑھ لو) یا اس کو (قعدہ کو) پورا کر لو تو تم نے اپنی نماز پوری کر لی۔(۴)

ان روایات سے پتہ چلتا ہے کہ قعدہ اخیرہ میں بقدر تشہد بیٹھنے کے بعد لفظ سلام بولے بغیر محض اپنے اختیار سے نماز سے باہر ہو جانے کے عمل سے نماز پوری ہو جاتی ہے، تاہم بعض دوسری روایات میں نماز سے باہر آنے کا ذریعہ سلام کو قرار دیا گیا ہے،(۵) اس لئے حنفیہ نے لفظِ سلام کے ذریعہ نماز سے خارج ہونے کو واجب بتلایا ہے۔(۶)☆

(۱) ترمذی: الرجل يحدث في التشهد: ۴۰۸ – حسن، مرقاة المفاتيح: ۱۰۰۸ – ۳/۷۷

(۲) طحاوی: باب السلام في الصلاة هل هو من فرضها أو من سننها: ۱۶۳۸، لهٰذا الحديث طرق، مرقاة المفاتيح: ۱۰۰۸

(۳) السنن الكبرى للبيهقي: باب فرض التشهد: ۲۹۳۸ – صالح معتبر: مرقاة المفاتيح: باب التشهد: ۲/۵۷۷

(۴) مسند أحمد: تحقيق شعيب الأرنؤوط: ۴۰۰۶ – صحيح

(۵) ترمذی: باب ما جاء في تحريم الصلاة و تحليلها: ۲۳۸ – حسن: امام ترمذی

(۶) طحطاوی علی المراقی: ۲۵۱

☆ ائمہ ثلاثہ کے نزدیک لفظ سلام کے ذریعہ نماز کو ختم کرنا فرض ہے ورنہ نماز باطل ہو جائے گی (الفقه على المذاهب الاربعة: ۱/۳۵۷)، پھر امام شافعیؒ و مالکؒ کے نزدیک ایک ہی سلام ضروری ہے، دوسرا سنت اور امام احمدؒ کے نزدیک دونوں ضروری ہے۔(الموسوعة ۲۷/۷۱)

(٦) نمازِ وتر میں دعائے قنوت پڑھنا:

رسول اللہ ﷺ نے نماز وتر میں دعائے قنوت پڑھنے کے عمل پر خاص پابندی فرمائی ہے، متعدد روایات میں نبی ﷺ کے اس معمول کا ثبوت ملتا ہے۔(۱)

حضرت ابراہیم نخعیؒ فرماتے ہیں کہ دعائے قنوت کے بغیر نماز وتر نہیں ہوتی، (۲) انہی کا ایک اور ارشاد ہے کہ رکوع سے قبل دعائے قنوت کا پڑھنا نماز وتر میں رمضان اور غیر رمضان میں واجب ہے۔(۳) نماز کے باقی اذکار مثلاً: تعوذ وثنا کے مقابلے میں دعائے قنوت کو نماز سے خاص ربط و تعلق ہے یہی وجہ ہے کہ دعائے قنوت کو مکمل نماز وتر کی طرف منسوب کر کے کہا جاتا ہے: ''قنوت وتر'' اس تعلقِ خاص کا تقاضا یہ ہے کہ دعائے قنوت کا درجہ اور اذکارِ نماز کے مقابلہ میں کچھ بڑھا ہوا ہو پس تعوذ وثناء کا درجہ نماز میں سنت ہونے کا ہے تو دعائے قنوت کا درجہ وجوب کا ہوگا۔(۴) ☆

---

(۱) ان روایات کی تفصیل اور ان کا درجۂ صحت معلوم کرنے کے لئے ملاحظہ ہو : (فتح القدیر : ۱/۳۷۴، ۳۷۵)

(۲) مصنف ابن أبي شيبة : باب من قال لا وتر إلا بقنوت : ۷۰۳۳ – صحيح : الأحاديث والآثار الواردة فی قنوت الوتر : ۱/۳۷

(۲) كتاب الآثار لامام محمد: باب القنوت في الصلاة : ۲۱۰ – صحيح : آثار السنن : ۲/۱۷

(۳) تبيين الحقائق : ۱/۱۰۶

☆ فجر کی نماز کے قومہ میں اور ماہ رمضان کے نصف اخیر میں وتر کی نماز میں قنوت پڑھنا امام شافعیؒ کے نزدیک ایسی سنت ہے جس کے ترک سے سجدہ سہو لازم ہوتا ہے اور سال کے باقی ایام میں نماز وتر کے اندر قنوت پڑھنا صرف جائز ہے (الفقه على المذاهب الاربعة : ۱/۳۶۶، الموسوعة: ۳۴/ ۶۴) امام مالکؒ کے نزدیک نماز فجر میں قنوت پڑھنا مستحب ہے اور وتر میں قنوت پڑھنا مشروع نہیں ہے (الموسوعة : ۳۴/ ۵۸، ۶۴) امام احمدؒ کے نزدیک نماز فجر میں قنوت مشروع نہیں اور نماز وتر میں مسنون ہے۔ (الموسوعة: ۳۴/۵۸، ۶۴)

(۷) قرأت کے لئے فرض کی پہلی دو رکعتوں کو متعین کرنا:

حضرت علیؓ سے منقول ہے: (فرض کی) پہلی دو رکعتوں میں قرأت کرنا (گویا) بعد کی دو رکعتوں میں قرأت کرنا ہے۔(۱)

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ اور حضرت علیؓ کے فتوی سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ قرأت کے لحاظ سے بعد کی دو رکعتیں اصیل نہیں؛ چنانچہ ان حضرات نے بعد کی دو رکعتوں میں مصلی کو اختیار دیا کہ اگر وہ چاہے تو قرأت کرے اور اگر چاہے تو تسبیح پڑھ لے۔(۲)☆

(۸) رکوع اور سجدہ میں کسی قدر اطمینان کا مظاہرہ کرنا (تعدیل ارکان کرنا):

ارشاد خداوندی ہے: اے ایمان والو رکوع کرو اور سجدہ کرو۔(۳)

رکوع کے معنی ہیں: جھکنا اور سجدہ کے معنی ہیں: پست ہونا یا ماتھے کو زمین پر ٹیک دینا، حکم خداوندی اسی قدر ہے؛ اس لئے محض جھکنے اور ماتھا زمین پر ٹیک دینے سے حکم خداوندی پر عمل ہو جائے گا اور فرض کی ادائیگی ہو جائے گی؛ البتہ رکوع اور سجدہ میں کم از کم ایک تسبیح کے بقدر رکے رہنا واجب اور ضروری ہے۔

دلیل: حضرت ابو ہریرہؓ سے مروی ہے: رسول اللہ ﷺ مسجد میں تشریف لائے، کچھ دیر بعد ایک اور صاحب داخل ہوئے اور جلد جلد نماز پڑھ لی، پھر رسول اللہ ﷺ کو

---

(۱) تبيين الحقائق : ۱۰۵/۱

(۲) مصنف ابن أبي شيبه : ۳۷۶۳، تقدم تحقيقه قريباً

(۳) الحج : ۷۷

☆امام سفیان ثوریؒ اور امام اوزاعیؒ کے نزدیک فرض کی اخیر دو رکعتوں میں قرأت فاتحہ واجب نہیں جمہور علماء وائمہ ثلاثہ کے نزدیک ہر رکعت میں سورۃ فاتحہ کا پڑھنا واجب ہے اس کے بغیر نماز نہیں ہوتی۔(شرح مسلم للنووی : ۲/ ۱۲۸، التمهيد الابن عبد البر : ۲۰ / ۱۹۳. ۱۹۴) (الفقه على المذاهب الاربعة : ۳۴۵/۱)

سلام کیا، آپ ﷺ نے جواب دیا اور فرمایا: جاؤ جاؤ پھر نماز پڑھو؛ کیوں کہ تم نے نماز نہیں پڑھی، وہ صاحب واپس اپنی جگہ پر آئے اور پہلے جیسی نماز پڑھے تھے ویسی ہی نماز پڑھی پھر نماز ختم کر کے آئے اور آپ ﷺ کو سلام کیا، آپ ﷺ نے فرمایا: لوٹ جاؤ پھر نماز پڑھو کیوں کہ تم نے نماز نہیں پڑھی، تین دفعہ یہی صورت پیش آتی رہی، بالآخر ان صاحب نے عرض کیا: اس ذات کی قسم! جس نے آپ کو حق کے ساتھ بھیجا ہے، میں اس سے اچھی نماز نہیں پڑھ سکتا، براہ کرم آپ ﷺ مجھ کو (نماز کے درست و مکمل طریقہ کی) تعلیم کیجئے، اس پر آپ ﷺ نے فرمایا: جب تم نماز کے لئے کھڑے ہو تو تکبیر کہو پھر قرآن میں سے جو تم کو آسان لگے وہ پڑھ لو پھر رکوع کرو یہاں تک کہ خوب اطمینان سے رکوع کرو پھر رکوع سے اٹھ جاؤ، یہاں تک کہ سیدھے کھڑے ہو جاؤ پھر سجدہ کرو یہاں تک کہ سجدہ میں خوب اطمینان کر لو پھر سجدہ سے سر اٹھاؤ تو اطمینان کے ساتھ بیٹھ جاؤ اور اپنی پوری نماز میں یہی کیفیت برقرار رکھو۔(۱)

طحاوی اور ابوداؤد وغیرہ کی روایت میں یہ اضافہ بھی ہے کہ: آپ ﷺ نے اخیر میں یوں فرمایا: تم جب اس طریقہ کے مطابق نماز پڑھ لو تو تمہاری نماز مکمل ہوگئی اور اگر تم نے کچھ کمی کی تو تم نے وہ کمی اپنی نماز سے کر لی۔(۲)☆

(۹) قومہ اور جلسہ کرنا:

رکوع سے اٹھنے کے بعد سیدھے کھڑے ہونا اور سجدہ سے اٹھنے کے بعد سیدھے بیٹھ جانا بھی واجب ہے۔(۳)

(۱) بخاری : باب أمر النبي صلى الله عليه وسلم الذي لا يتم ركوعه بالإعادة : ۷۹۳

(۲) ابوداؤد : تحقيق الالباني : باب صلاة من لا يقيم صلبه : ۸۵۶ – صحيح –

(۳) طحطاوی علی المراقي ، ص : ۲۴۹

☆ اس راویت کی بنا پر دو وجہوں کے پیش نظر تعدیل ارکان کو فرض نہیں قرار دیا جا سکتا: (الف): یہ خبر واحد ہے اگر اس سے تعدیل ارکان کو فرض قرار دیا جاتا ہے تو کتاب اللہ کے حکم کو نظر انداز کرنا لازم آتا ہے جو مناسب اور درست بات نہیں، مناسب طریقہ یہ ہے کہ کتاب اللہ کے حکم کی رو سے مطلق رکوع اور سجدہ کو فرض رکھا جائے اور تعدیل ارکان کو واجب! (ب): خود روایت کا اخیر حصہ یہ بتلاتا ہے کہ تعدیل ارکان کا درجہ فرض اور رکن کا نہیں اس لئے کہ آپ ﷺ نے اس حصہ =

حضرت ابوہریرہؓ سے راویت ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا: اللہ تعالی اس آدمی کی نماز کی طرف نہیں دیکھتا جو اپنے رکوع اور سجدے کے درمیان اپنی کمر سیدھی نہیں کرتا۔ (۱) قومہ اور جلسہ پر نبی ﷺ نے مکمل پابندی فرمائی ہے۔(۲)☆

(۱۰) جہری نمازوں میں جہری اور سری نمازوں میں سری قرأت کرنا:

زمانۂ رسالت سے آج تک اسی طریقہ پر پوری امت کا عمل چلا آرہا ہے، گویا یہ چیز اجماع امت سے ثابت ہے، علامہ ابن ہمامؒ فرماتے ہیں: یہ چیز ایسی ہے جس میں کسی متعین نص کے نقل کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔(۳)

علامہ اکمل الدین بابرتیؒ تائید میں حضرت ابوہریرہؓ کا یہ قول نقل فرماتے ہیں کہ: آپ رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ہر نماز میں قرأت کرنی ہے، تو جہاں رسول اللہ ﷺ نے ہم کو سنایا ہے، ہم نے بھی تم کو سنایا اور جہاں آپ ﷺ نے ہم سے چھپایا ہم نے بھی تم سے چھپایا(۴)۔(۵)☆

= میں یہ فرمایا کہ اگر تم نے کچھ کمی کی تو تم نے وہ کمی اپنی نماز سے کی، یہاں قابل توجہ بات یہ ہے کہ آپ ﷺ نے تعدیل ارکان میں کمی کوتاہی کے ساتھ پڑھی جانے والی نماز کو بھی نماز کا نام دیا ہے، اگر تعدیل ارکان کا درجہ فرضیت کا ہوتا تو ایسے عمل پر سرے سے نماز کا لفظ ہی بولا نہ جاتا۔(فتح القدیر:۱/۲۶۲)

(۱)مسند احمد : تحقیق شعیب الأرنؤوط : ۱۰۸۱۲ – حسن

(۲) فتح القدیر : ۱/ ۲۶۲

☆ائمہ ثلاثہ وامام ابو یوسف کے نزدیک تعدیل ارکان اور قومہ وجلسہ کرنا فرض ہے۔ الفقہ علی المذاہب الاربعۃ: ۱/۳۵۲۔۳۵۹

(۳)فتح القدیر : ۱/ ۲۸۳

(۴)بخاری : باب القراءۃ في الفجر : ۷۷۲

(۵)عنایه : ۱/۲۸۳

☆ائمہ ثلاثہ کے نزدیک یہ سنت ہے، اس کی خلاف ورزی کرنے سے سجدہ سہو بھی لازم نہیں ہوتا، البتہ امام مالکؒ سے سجدہ سہو لازم ہونا منقول ہے۔ الفقہ علی المذاہب الاربعۃ: ۱/۳۶۵

(۱۱) ارکان کی ادائیگی میں ترتیب کو ملحوظ رکھنا

نبی ﷺ نے ہمیشہ ترتیب وار ارکان کو ادا فرمایا ہے اور آپ ﷺ کا ارشاد ہے: تم اس طرح نماز پڑھو جیسے تم مجھے نماز پڑھتا ہوا دیکھتے ہو۔(۱)

فائدہ: اعمال کی درجہ بندی میں واجب کی اصطلاح حنفیہ کی اپنی قائم کردہ ہے، بقیہ ائمہ کے(۲) یہاں فرض اور نفل کے درمیان کوئی اور درجہ نہیں؛ لیکن حنفیہ اس کے درمیان واجب کا درجہ دیتے ہیں، یعنی: جس کا ثبوت ایسی دلیل سے ہوا ہو جس کا رتبہ، فرضیت کو ثابت کرنے والی دلیل سے فروتر ہو، فرضیت کا ثبوت تو ایسی دلیل سے ہوتا ہے جو اپنے ثبوت وسند کے اعتبار سے بھی قطعی ویقینی ہو اور اپنے معنی ومدلول پر دلالت کرنے کے اعتبار سے بھی قطعی اور بے غبار ہو، اگر ان دو اعتبارات میں سے کسی ایک میں خلل ہو، یعنی یا تو دلیل کے ثبوت وسند میں خلل ہو یا دلیل کے اپنے معنی ومفہوم پر دلالت کرنے میں کچھ قصور ہو تو وجوب کا درجہ نکل آتا ہے اور اگر مذکورہ دونوں اعتبارات میں سے ہر ایک میں کمی اور خلل ہے تو پھر سنیت واستحباب کا درجہ سامنے آتا ہے۔(۳)

حضرت شیخ شعرانی شافعیؒ فرطِ عقیدت سے کہتے ہیں: امام ابوحنیفہؒ پر اللہ کی رحمت ہو انہوں نے فرض اور واجب کے درمیان اصطلاحی فرق قائم کر کے بڑی اہم گتھی کو سلجھایا ہے، اور ہر دلیل کو اس کا مناسب مقام دیا ہے، یہ حضرت امامؒ کا ایسا کارنامہ ہے جس پر خود صاحب شریعت علیہ الصلاۃ والتسلیم آفرین فرماتے۔(۴)

نماز کے باب میں بھی احناف کے یہاں فرائض، واجبات اور سنن ومستحبات تینوں کا تصور ملتا ہے جب کہ دیگر ائمہ کے یہاں فرائض کے علاوہ صرف سنن ومستحبات کا، واجبات کی ان کے پاس کوئی مستقل اصطلاح نہیں پائی جاتی ہے۔

(۱) الموسوعة: ۷۲/۲۷

(۲) البتہ صرف حج کے باب میں شوافع اور مالکیہ واجب کا درجہ تسلیم کرتے ہیں اور حنابلہ حنفیہ کی طرح نماز کے باب میں بھی واجبات کے قائل ہیں، اس فرق کے ساتھ کہ حنابلہ کے یہاں واجب کا عمداً ترک نماز کو باطل کر دیتا اور بھول کر ترک سجدہ سہو کو واجب کرتا ہے۔(الفقه على المذاهب الاربعة: ۱/۳۶۰-۳۶۲)

(۳) فتح الملهم: ۲/۲۹۹ (۴) فتح الملهم: ۲/۱۹

سنن نماز

تکبیر تحریمہ کی سنتیں

(الف) تکبیر کے اعراب وحرکات میں مدنہ کرنا:

حضرت ابراہیم نخعیؒ سے منقول ہے کہ تکبیر میں جزم ہے(۱) جزم کے معنی فقہاء ومحدثین کے بیان کے مطابق مدنہ کرنا ہے۔(۲)

(ب) پہلے ہاتھ اٹھانا پھر تکبیر تحریمہ کہنا

رسول اللہ ﷺ جب نماز کے لئے کھڑے ہوتے تو اپنے دونوں ہاتھوں کو اٹھاتے پھر تکبیر کہتے۔(۳)☆

اکثر مشائخ احناف نے اسی طریقے کو اختیار کیا اور وجہ یہ بیان کی کہ ہاتھ اٹھانا گویا ماسوی اللہ سے دستبرداری اور غیر اللہ کی نفی کا اشارہ ہے اور اللہ اکبر کہنا، اللہ تعالی کی بڑائی وکبریائی کو ثابت کرنا ہے اور اصولاً نفی، اثبات پر مقدم ہوتی ہے؛ اس لئے پہلے ہاتھ اٹھالئے

---

(۱) مصنف عبد الرزاق : باب متى يكبر الإمام : ۲۵۵۳ ، ترمذی : باب ما جاء إن حذف السلام سنة : ۲۹۷

(۲) تحفة الاحوذی: ۳۲۹/۱

(۳) مسلم : باب استحباب رفع اليدين : ۸۸۹

☆ ویسے تو رسول اللہ ﷺ سے اس بارے میں مزید دو طریقے ثابت ہیں:

اول: رسول اللہ ﷺ تکبیر تحریمہ کے ساتھ اپنے ہاتھ اٹھایا کرتے تھے ابوداؤد :تحقيق الالباني : باب رفع اليدين في الصلاة : ۷۲۵ – صحيح

یعنی تکبیر تحریمہ کہنے اور ہاتھ اٹھانے کے عمل کا آغاز واختتام ساتھ ساتھ ہوا کرتا تھا۔ البحر الرائق: ۲۱۱/۳

دوم: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب نماز پڑھتے تو تکبیر کہتے پھر اپنے دونوں ہاتھوں کو اٹھاتے۔ ابوداؤد :تحقيق الالباني : باب رفع اليدين في الصلاة : ۷۲۶ – صحيح

جائیں پھر تکبیر تحریمہ کہی جائے۔(۱)

فائدہ: تکبیر تحریمہ کے علاوہ کسی اور موقع پر رفع یدین کرنا احناف کے یہاں مسنون نہیں، حضرت ابن مسعودؓ نے فرمایا: کیا میں تم لوگوں کو حضورؐ کی طرح نماز پڑھاؤں؟ پھر نماز پڑھائی تو صرف پہلی بار (آغاز نماز میں) رفع یدین کیا (۲) براء بن عازبؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ جب آغاز نماز کے لئے تکبیر کہتے تو ہاتھ اٹھاتے پھر دوبارہ ہاتھ نہیں اٹھاتے (۳) حضرت علقمہؒ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے نقل کرتے ہیں: میں نے رسول اللہ ﷺ اور حضرت ابوبکرؓ و عمرؓ کے ساتھ نماز پڑھی یہ حضرات صرف آغاز نماز ہی میں رفع یدین کرتے تھے (۴) حضرت مجاہدؒ کہتے ہیں: میں حضرت ابن عمرؓ کے پیچھے نماز پڑھی تو انہوں نے نماز میں تکبیر تحریمہ کے علاوہ کہیں رفع یدین نہیں کیا، (۵) حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے مروی ہے کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو دیکھا کہ جب آپؐ نماز شروع کرتے تو مونڈھوں تک اپنے ہاتھ اٹھاتے اور جب رکوع میں جانا چاہتے اور رکوع کے بعد سر اٹھاتے تو رفع یدین نہ کرتے اور نہ سجدوں کے درمیان رفع یدین کرتے۔(۶)

---

(۱) الهداية : ۴۷/۱

(۲) ترمذی : تحقيق الالبانی : باب ما جاء أن النبي صلى الله عليه وسلم لم يرفع إلا في أول مرة :۲۵۷ – حسن امام ترمذی ، صحيح – البانی

(۳) أبو داؤد : باب من لم يذكر الرفع عند الركوع : ۷۵۰ – حسن: إعلاء السنن : ۸۵/۳

(۴) سنن الكبرى للبيهقي : باب من لم يذكر الرفع إلا عند الافتتاح : ۲۶۳۶، مسند أبي يعلى : ۵۰۳۹ – إسناده جيد : إعلاء : ۶۸/۳

(۵) طحاوی : باب التكبير للركوع : ۱۲۵۵ – صحيح – آثار السنن : ۱۰۸/۱

(۶) مسند حميدی : ۶۱۴ ، سنده هكذا : حدثنا الحميدی : قال ثنا الزهري قال : أخبرني سالم بن عبد الله عن أبيه قال : وهو سلسلة الذهب : نخبة الفكر : ۳۶

حضرت ابوبکرؓ و عمرؓ و علیؓ و عبداللہ بن مسعودؓ، اہل مدینہ واہل کوفہ صرف تکبیر تحریمہ کے موقع پر ہی رفع یدین کیا کرتے تھے باقی کسی اور جگہ نہیں کرتے تھے۔(۱) ابو اسحاق کہتے ہیں: حضرت عبداللہ بن مسعودؓ اور حضرت علیؓ کے اصحاب صرف تکبیر تحریمہ میں رفع یدین کیا کرتے تھے، پھر دوبارہ کہیں رفع یدین نہ کرتے۔(۲)☆

تکبیر تحریمہ کے علاوہ دیگر مواقع پر رفع یدین کرنا بھی صحیح و مستند روایات سے ثابت ہے، مثلاً:

۱) آغاز نماز اور رکوع کے بعد۔(۳)

۲) آغازِ نماز، رکوع سے پہلے، رکوع کے بعد۔(۴)

۳) آغازِ نماز، رکوع سے پہلے، رکوع کے بعد دوسری رکعت کے بعد۔(۵)

۴) آغازِ نماز، رکوع کے وقت، رکوع سے سر اٹھانے کے وقت، سجدے کے وقت، سجدے سے سر اٹھانے کے وقت۔(۶)

۵) اوپر سے نیچے اور نیچے سے اوپر جاتے ہوئے۔(۷)

---

(۱) التعليق الممجد مع موطا محمد : باب افتتاح الصلاة : ۱۰۴ ، نيل الفرقدين : ۲۲

(۲) مصنف ابن أبي شيبة : باب من كان يرفع يديه : ۲۴۵۶۱ – صحيح : آثار السنن : ۱/۱۰۹

☆ امام مالکؒ کا بھی یہی مسلک ہے امام احمدؒ کے نزدیک تکبیر تحریمہ کے علاوہ رکوع میں جاتے وقت اور رکوع سے اٹھنے کے بعد بھی رفع یدین کرنا مسنون ہے امام شافعیؒ کے نزدیک ان مواقع کے علاوہ قعدہ اولی سے کھڑے ہونے کے بعد بھی رفع یدین کرنا مسنون ہے۔ الفقہ الاسلامی : ۲/ ۸۷۱، فتح الملہم : ۲/ ۱۱

(۳) موطا امام مالک : باب افتتاح الصلوة : ۱۶۸

(۴) بخاری : باب رفع اليدين إذا كبر وإذا ركع وإذا رفع : ۷۳۵ – ۷۳۶

(۵) بخاری : باب رفع اليدين إذا قام من الركعتين : ۷۳۹

(۶) نسائی تحقيق الالبانی : باب رفع اليدين للسجود : ۱۰۸۵ – صحيح

(۷) ابن ماجة تحقيق البانی : باب رفع اليدين إذا ركع وإذا رفع رأسه من الركوع : ۸۶۵ صحيح

۶) دو سجدوں کے درمیان۔(۱)

تاہم مجموعی روایات کو پیش نظر رکھنے سے اتنا ضرور تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ رفع یدین کے عمل میں بتدریج نسخ واقع ہوتا رہا ہے؛ البتہ کسی صحیح روایت سے یہ معلوم نہیں ہوتا کہ نسخ کا سلسلہ کہاں تک چلتا رہا، امام بیہقیؒ کی ایک روایت اگرچہ یہ بیان کرتی ہے کہ تکبیر تحریمہ اور رکوع سے پہلے و بعد میں رفع یدین کا عمل رسالتمآب صلی اللہ علیہ وسلم کے دنیا سے پردہ فرمانے تک باقی رہا،(۲) مگر یہ روایت حد درجہ ضعیف؛ بلکہ موضوع ہے اور اس کی سند کے بعض رواۃ جھوٹے اور من گھڑت احادیث بنانے والے ہیں؛(۳) اس لئے اس مسئلہ میں کسی حتمی اور صحیح نتیجہ تک پہنچنے کے لئے سوائے اس کے کوئی راستہ نہیں کہ تعاملِ صحابہ بالخصوص حضراتِ خلفاء راشدین کے طرزِ عمل کو دیکھا جائے، اور سابقہ تفصیل سے یہ عیاں ہو چکا ہے کہ صحابہ کرام بالخصوص حضرت ابوبکرؓ، حضرت عمرؓ، حضرت علیؓ، حضرت عبداللہ بن مسعودؓ اور ان کے اصحاب کا عمل ترک رفع یدین پر تھا اور یہ حضرات کرام صرف تکبیر تحریمہ کے موقع پر ہی رفع یدین کیا کرتے تھے، پس تکبیر تحریمہ کے علاوہ نماز کے دیگر مقامات میں رفع یدین کرنا بہتر و پسندیدہ نہیں۔

(ج) دونوں ہاتھوں کی انگلیوں کو اپنی طبعی حالت پر رکھنا:

یعنی انگلیوں کو نہ موڑے ہوئے رکھنا نہ انگلیوں کو باہم ملائے رکھنا اور نہ ہی انگلیوں کے درمیان فاصلہ رکھنے کا اہتمام کرنا بلکہ ان کو اپنی فطری حالت پر رہنے دینا۔

حضرت ابو ہریرہؓ سے مروی ہے کہ: رسول اللہ ﷺ جب نماز میں داخل ہوتے تو

(۱) جزء رفع اليدين للبخاري : ١٠١ – صحيح : آثار السنن : ١٠٣/١

(۲) معرفة السنن والآثار : رفع اليدبن عند الافتتاح والركوع ورفع الرأس من الركوع : ٨١٣

(۳) آثار السنن مع التعليق الحسن : ١٠٠/١ – ١٠١

اپنے دونوں ہاتھوں (کی انگلیوں) کو دراز کرتے ہوئے اٹھاتے۔(۱) ملا علی قاریؒ کہتے ہیں: صرف رکوع کی حالت میں انگلیاں گھٹنے پر کھلی رکھنا اور اس کے برخلاف صرف سجدہ کی حالت میں انگلیاں باہم ملائے رکھنا مستحب ہے، باقی صورتوں میں (تکبیر تحریمہ میں ہاتھوں کے اٹھانے کے وقت اسی طرح قعدہ میں ہاتھوں کو زانو پر رکھنے کے وقت) انگلیاں اپنی طبعی حالت پر رہنی چاہئے (۲) حضرت وائل بن حجرؓ سے مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ جب رکوع فرماتے تو ہاتھوں کی انگلیاں کھلی رکھتے اور جب سجدہ فرماتے تو انگلیاں ملا لیتے۔(۳)

(د) دونوں ہاتھ کانوں تک اٹھانا:

حضرت وائل بن حجرؓ سے مروی ہے کہ انہوں نے رسول اللہ ﷺ کو دیکھا کہ آپ ﷺ نے اپنے دونوں ہاتھوں کو اٹھایا اور انہیں کانوں کے مقابل میں رکھا۔(۴) حضرت مالک بن حویرثؓ فرماتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم جب تکبیر کہتے تو اپنے دونوں ہاتھوں کو کانوں کی لَو تک اٹھاتے۔(۵) حضرت براء بن عازبؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ جب نماز پڑھتے تو اپنے دونوں ہاتھوں کو اس قدر اٹھاتے کہ آپ ﷺ کے انگوٹھے کانوں کے برابر میں آجاتے۔(۶)

---

(۱) ترمذی : تحقیق الالبانی : باب فی نشر الأصابع عند التکبیر : ۲۴۰ – صحیح

(۲) مرقاۃ المفاتیح : باب صفة الصلاۃ : ۸۰۱

(۳) المعجم الکبیر للطبرانی : ۱۷۴۹۵ – مجمع الزوائد : باب صفة الصلاۃ والتکبیر فیها : ۲۸۰۷ – اسنادہ حسن

(۴) مسلم : باب وضع یدہ الیمنی علی الیسری : ۹۲۳

(۵) مسلم : باب استحباب رفع الیدین حذو المنکبین : ۸۹۲

(۶) مسند أحمد : ۱۸۷۰۲ –سند کے صرف ایک راوی میں ضعف ہے اور باقی رواۃ ثقه هیں اور بخاری و مسلم کے رجال ہیں–تحقیق شعیب الأرنؤوط .

حضرت انسؓ سے مروی ہے کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو دیکھا آپ ﷺ نے تکبیر کہی پھر اپنے دونوں انگوٹھوں کو اپنے کانوں کے مقابل میں کیا، (۱) بعض روایات میں کندھوں تک ہاتھ اٹھانے کا تذکرہ بھی ملتا ہے، مگر اس کی شکل یہ ہوتی تھی کہ پہنچے یا ہتھیلیاں کندھوں کے برابر میں ہوتے، انگوٹھے کانوں کی لَو کے مقابل میں ہوتے اور انگلیوں کے سرے کانوں کے اوپری حصے کے برابر میں ہوتے، چنانچہ حضرت وائل بن حجرؓ فرماتے ہیں: میں نے رسول اللہ ﷺ کو نماز کے لئے کھڑے ہوتے دیکھا تو آپ ﷺ نے اپنے ہاتھوں کو اٹھایا یہاں تک کہ وہ کندھوں کے برابر میں آگئے اور اپنے انگوٹھوں کو کانوں کے برابر میں فرمایا۔ (۲) فقہاء شافعیہ میں سے امام نوویؒ اور فقہاء حنفیہ میں سے علامہ ابن ہمامؒ نے اس طریقہ کی تائید کی ہے۔ (۳)

کسی عذر کی وجہ سے کانوں تک ہاتھ اٹھانا دشوار ہو جائے مثلاً: سردی کی وجہ سے ہاتھ لحاف کے اندر ہوں اور لحاف سے باہر ہاتھ نکالنا دشوار ہو تو لحاف کے اندر ہی اندر سے کندھوں تک ہاتھ اٹھالئے جاسکتے ہیں؛ چنانچہ حضرت وائل بن حجرؓ سے مروی ہے کہ میں رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں پہنچا، (نماز کے موقع پر) میں نے آپ ﷺ کو تکبیر تحریمہ کے وقت کانوں تک ہاتھ اٹھاتے دیکھا پھر آئندہ سال جب میں آیا تو صحابہ کرام کے جسموں پر چادریں اور لمبی لمبی ٹوپیاں تھیں تو وہ اپنے ہاتھ سینوں (کندھوں) تک ہی اٹھا رہے تھے۔ (۴)

---

(۱) المستدرک مع تعلیقات الذهبي: باب التامين : ۸۲۲ – صحيح

(۲) ابوداؤد: باب رفع اليدين في الصلاة :۷۲۴–معتبر ومقبول: إعلاء:۱۸۲/۲

(۳) نووی شرح مسلم : ۱۱۹/۲، فتح القدير : ۲۸۲/۱

(۴) طحاوی :باب رفع اليدين في افتتاح الصلاة : ۱۱۷۰، ابوداؤد: تحقيق الالباني : باب رفع اليدين في الصلاة : ۷۲۸ – صحيح

قیام کی سنتیں:

(الف) دونوں قدموں کے درمیان مناسب وموزوں فاصلہ رکھنا، نہ وہ ایک دوسرے سے چپکے ہوئے ہوں نہ دونوں کے درمیان اتنا زیادہ فاصلہ ہو کہ بھدا پن معلوم ہو، حضرت ابن عمرؓ کا عمل یہ تھا کہ وہ اپنے قدموں کے درمیان نہ بہت زیادہ فاصلہ رکھتے تھے نہ ایک دوسرے کو ملاتے تھے بلکہ دونوں کے درمیان اور معتدل فاصلہ رکھتے تھے۔(۱)

حضرت عبداللہ بن زبیرؓ فرماتے ہیں: دونوں قدموں کو صف بستہ قریب قریب اور سلیقہ سے رکھنا سنت ہے۔(۲)

علامہ عینیؒ فرماتے ہیں بہتر یہ ہے کہ نمازی کے دونوں قدموں کے مابین ہاتھ کی چار انگلیوں کے بقدر فاصلہ ہو کہ یہ حالت خشوع سے زیادہ قریب ہے۔(۳)

(ب) ناف کے نیچے ہاتھ باندھنا:

قیام میں ہاتھ باندھنا اور ناف کے نیچے باندھنا دو الگ الگ سنتیں ہیں:

پہلی سنت (مطلق ہاتھ باندھنا) درج ذیل صحیح ومستند احادیث سے ثابت ہے اور سوائے امام مالکؒ کے اس میں کسی امام کا اختلاف بھی نہیں ہے۔

حضرت سہل بن سعدؓ کہتے ہیں: صحابہ کرامؓ کو یہ حکم دیا جاتا تھا کہ وہ نماز میں اپنے سیدھے ہاتھ کو بائیں ہاتھ پر رکھیں۔(۴)

---

(۱) مصنف عبدالرزاق: باب التحریک في الصلاۃ: ۳۳۰۰- صحیح

(۲) أبوداؤد: باب وضع الیمنی علی الیسری: ۷۵۴ – حسن: خلاصة الأحکام: ۱/۳۵۷

(۳) شرح ابوداؤد للعینی: باب وضع الیمنی علی الیسری: ۳/۳۵۴

(۴) بخاری: باب وضع الیمنی علی الیسری: ۷۴۰

حضرت ابن مسعودؓ فرماتے ہیں کہ وہ ایک دفعہ قیام میں بائیں ہاتھ کو دائیں ہاتھ پر رکھ کر نماز پڑھ رہے تھے رسول اللہ ﷺ نے انہیں دیکھا تو آپ ﷺ نے ان کے داہنے ہاتھ کو بائیں ہاتھ پر رکھ دیا۔(۱)

دوسری سنت (ناف کے نیچے باندھنا) کے تعلق سے نہ اس درجہ کی صحیح ومستند احادیث موجود ہیں اور نہ ہی ائمہ کے مابین اس مسئلہ میں اتفاق آراء پایا جاتا ہے، حنفیہ نے مندرجہ ذیل روایات کے پیش نظر ناف کے نیچے ہاتھ باندھنے کو مسنون قرار دیا ہے۔

حضرت علیؓ فرماتے ہیں: نماز میں (دائیں) ہتھیلی کو (بائیں) ہتھیلی پر ناف کے نیچے رکھنا سنت ہے،(۲) علامہ سیوطیؒ فرماتے ہیں صحابی جب کسی بات کو سنت کہیں تو اس سے حضور ﷺ کی سنت مراد ہوتی ہے۔(۳)

حضرت وائل بن حجرؓ فرماتے ہیں: میں نے رسول اللہ ﷺ کو دیکھا کہ نماز میں اپنے دائیں ہاتھ کو بائیں ہاتھ پر ناف کے نیچے رکھے ہوئے ہیں۔(۴)

حضرت ابراہیم نخعیؒ فرماتے ہیں: آدمی نماز میں اپنے سیدھے ہاتھ کو بائیں ہاتھ پر ناف کے نیچے رکھے۔(۱)

---

(۱) ابوداؤد:تحقیق الالبانی : باب وضع الیمنی علی الیسری : ۷۵۵ – حسن

(۲) أبوداؤد: باب وضع الیمنی علی الیسری : ۷۵۴ – حسن: إعلاء السنن : ۱۹۳/۲ ، مصنف ابن أبي شيبة تحقيق محمد عوامه : باب وضع اليمين على الشمال : ۳۹۶۶ – له شاهد صحيح

(۳) تدريب الراوي : النوع السابع الموقوف : ۱۸۸/۱

(۴) مصنف ابن ابی شیبه مع تعلیقات شیخ عوامه :باب وضع الیمین علی الشمال : ۳۹۵۹ – وهذا إسناد صحيح

(۵) مصنف ابن ابی شیبه :باب وضع الیمین علی الشمال : ۳۹۶۰ – إسناد حسن – آثار السنن : ۷۱/۱

علامہ ابن ہمامؒ فرماتے ہیں: قیام میں ناف کے نیچے یا سینہ پر ہاتھ باندھنے کے سلسلہ میں کوئی قوی حدیث موجود نہیں ہے اس لئے اس معاملہ میں عرف وعادت کو معیار بنایا جائے گا اور عرف وعادت یہی ہے کہ شاہان دنیا کے سامنے ادب کے ساتھ کھڑے ہونے کے وقت ہاتھ ناف کے نیچے ہی باندھے جاتے ہیں پس احکم الحاکمین کے دربار میں تعظیم کی یہ روش اختیار کرنا عین مصلحت وادب ہوگا۔(۱)

ناف کے نیچے ہاتھ باندھنے کا طریقہ یہ ہے کہ سیدھے ہاتھ کو بائیں ہاتھ کی ہتھیلی کی پشت، پہنچے اور کلائی پر رکھے پھر سیدھے ہاتھ کی چھوٹی انگلی اور انگوٹھے کے ذریعہ بائیں ہاتھ کی کلائی کو حلقہ بنا کر پکڑ لے۔ حضرت وائل بن حجرؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے دائیں ہاتھ کو بائیں ہاتھ کی ہتھیلی، پہنچے اور کلائی پر رکھا۔(۲)

قبیصہ بن ہلبؒ اپنے والد سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ ہم کو نماز پڑھاتے تو اپنے بائیں ہاتھ کو دائیں ہاتھ سے پکڑ لیتے۔(۳)

ان دونوں روایتوں کے ملانے سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ سیدھے ہاتھ کو بائیں ہاتھ کی ہتھیلی پہنچے، کلائی پر رکھنا اور پکڑنا مکمل سنت طریقہ ہے۔☆

---

(۱) فتح القدير : ۱/۲۴۹

(۲) نسائی : تحقیق الالبانی : باب موضع اليمين من الشمال في الصلاة :۸۸۹-صحيح

(۳) ترمذی : باب وضع اليمين على الشمال :۲۵۲-حسن – امام ترمذیؒ

☆ امام احمد بن حنبلؒ کے نزدیک بھی ناف کے نیچے ہاتھ باندھنا مسنون ہے، امام شافعیؒ کے نزدیک سینے سے کسی قدر نیچے، بائیں جانب (قلب کی طرف) قدرے مائل کر کے ہاتھ باندھ مسنون ہے، امام مالکؒ کے نزدیک قیام میں ہاتھ نہ باندھنا افضل ہے لیکن اگر کوئی باندھنا چاہے تو اسی طریقہ پر باندھے جو امام شافعیؒ کے یہاں ہے۔(الفقہ الاسلامی : ۲/۸۷۴، اعلاء السنن:۲/۱۹۳)

(ج) ثنا پڑھنا:

حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ جب رسول اللہ ﷺ نماز شروع کرتے تو یوں پڑھتے:

"سُبْحَانَکَ اللّٰھُمَّ وَبِحَمْدِکَ وَتَبَارَکَ اسْمُکَ وَتَعَالٰی جَدُّکَ وَلاَ اِلٰہَ غَیْرُکَ۔" (۱)

بعض روایات میں "وَتَعَالٰی جَدُّکَ" کے بعد "وَجَلَّ ثَنَاءُ کَ" کے الفاظ بھی منقول ہیں، (۲) ایسے ہی متعدد احادیث میں تکبیر تحریمہ کے بعد سورہ فاتحہ شروع کرنے سے قبل، ثنا کے علاوہ اور بھی بہت سے اوراد وادعیہ وارد ہوئے ہیں تاہم فقہاء حنفیہ نے اُنہیں دو وجوہات کے پیش نظر نوافل اور نماز تہجد پر محمول کیا ہے (i) نماز سے متعلق معروف ومشہور روایات میں ان دعاؤں کا ذکر موجود نہیں (ii) نیز بعض روایات میں یہ تصریح ہے کہ رسول اللہ کا ان دعاؤں کو نوافل میں پڑھنے کا معمول تھا۔ (۳)

فائدہ: نماز جنازہ چوں کہ حمد وثنا اور درود ودعا ہی پر مشتمل ہوتی ہے؛ اس لئے "وجل ثناء ک" کا اضافہ کرنا، اس میں مناسب اور پسندیدہ ہے۔ (۴)

(د) تعوذ پڑھنا:

حضرت ابو سعید خدریؓ سے روایت ہے کہ سول اللہ ﷺ قرأت سے قبل

---

(۱) أبوداؤد :تحقيق الالباني : باب من رأى الاستفتاح بسبحانک اللهم : ۷۷۶ صحيح

(۲) مسند الفردوس : لأبي شجاع الديلمي : ۸۱۹ – سكت عليه ابن الهمام في فتح القدير : ۲۹۰/۱

(۳) نسائی تحقيق الالبانی : نوع آخر من الذکر والدعاء بين التكبير والقراءة : ۸۹۸– صحيح – السعاية : ۱۶۳/۲

(۴) طحطاوی علی المراقی :۳۰۷

" اعوذ باللہ من الشیطان الرجیم" پڑھا کرتے تھے۔(۱)

حضرت اسودؒ سے منقول ہے کہ حضرت عمرؓ نے نماز شروع کی تو تکبیر کہی پھر ثنا پڑھی پھر"اعوذ باللہ من الشیطان الرجیم" پڑھا۔(۲)

حضرت ابو سعید خدریؓ سے مروی ہے: رسول اللہ ﷺ جب رات کو اٹھتے اور نماز شروع کرتے تو فرماتے:"سُبْحَانَکَ اللّٰھُمَّ وَبِحَمْدِکَ وَتَبَارَکَ اسْمُکَ وَتَعَالٰی جَدُّکَ وَلَااِلٰهَ غَیْرُکَ " پھر کہتے"اَعُوْذُ بِاللّٰہِ السَّمِیْعِ الْعَلِیْمِ مِنَ الشَّیْطَانِ الرَّجِیْمِ مِنْ هَمْزِهٖ وَنَفْخِهٖ وَنَفْثِهٖ "(۳) معلوم ہوا کہ رات کی نمازوں اور نوافل میں اس طرح کے اضافے مسنون ہیں۔

(ہ) تسمیہ پڑھنا:

حضرت نعیم المجمر کہتے ہیں میں نے حضرت ابو ہریرہؓ کے پیچھے نماز پڑھی تو انہوں نے"بسم اللہ الرحمٰن الرحیم" پڑھا پھر سورۃ فاتحہ پڑھی، فاتحہ کے ختم پر آمین کہی، لوگوں نے بھی آمین کہا، پھر جب سجدہ کیا تو اللہ اکبر کہا قعدہ اولی سے کھڑے ہونے کے وقت بھی اللہ اکبر کہا اور جب سلام پھیرا تو یوں فرمایا کہ قسم بخدا میری نماز تم میں سب سے زیادہ رسول اللہ ﷺ کی نماز کے مشابہ ہے۔(۴)

---

(۱) مصنف عبد الرزاق: باب متی یستعیذ : ۲۵۸۹ – وللحدیث شواھد یقوی بعضھا بعضا : فتح الغفار : ۱۰۹/۵ – صحیح : مختصر أرواء الغلیل : ۶۹/۱

(۲) مصنف ابن ابی شیبہ : باب في التعویذ کیف ھو ؟ ۲۴۷۰ – صحیح – أرواء الغلیل : ۴۹/۲

(۳) ترمذی تحقیق الالبانی : باب ما یقول عند افتتاح الصلاۃ : ۲۴۲ – صحیح

(۴) السنن الکبری للبیھقي : باب افتتاح القراء ۃ في الصلاۃ ببسم اللہ الرحمن الرحیم : ۲۴۹۱ – إسنادہ صحیح ولہ شواھد – ناشر : دائرۃ المعارف

اس روایت سے اتنی بات ضرور معلوم ہوئی کہ سورۃ فاتحہ سے قبل تسمیہ مسنون ہے، اور کئی روایات سے یہ بات بھی سامنے آتی ہے کہ امام کے حق میں تسمیہ آہستہ پڑھنا مسنون ہے، چنانچہ حضرت انسؓ فرماتے ہیں: میں نے سرور دو عالم ﷺ، حضرت ابوبکرؓ، حضرت عمرؓ اور حضرت عثمانؓ کی اقتداء میں نماز پڑھی ہے، ان بزرگوں میں سے کسی سے میں نے بآواز بلند بسم اللہ نہیں سنی؛ (۱) اس لئے سابقہ روایت کے اس جملہ: کہ حضرت ابوہریرہؓ نے ''بسم اللہ الرحمٰن الرحیم پڑھا'' کی محدثین نے یہ تاویل کی ہے کہ نعیم راوی شاید حضرت ابوہریرہؓ کے بالکل نزدیک کھڑے ہو کر اقتداء کر رہے تھے جس کی بناء پر انہوں نے حضرتؓ کے بسم اللہ پڑھنے کو باوجود پست آواز ہونے کے سن لیا یا ممکن ہے حضرت ابوہریرہؓ نے بآواز بلند ہی بسم اللہ پڑھا تھا؛ لیکن اس غرض سے کہ لوگوں کو یہ پتہ چلے کہ نماز میں سورۃ فاتحہ سے قبل بسم اللہ پڑھنا بھی سنت ہے کیوں کہ اس زمانے کے امراء نے سستی اور اپنی سہولت کی خاطر نماز کے بعض اذکار و افعال میں تخفیف کر دی تھی۔ (۲)

فائدہ: تعوذ و تسمیہ قرأت قرآن کے تابع ہے اللہ تعالی کا ارشاد ہے، جب تم قرآن پڑھنے لگو تو اللہ کی پناہ مانگ لیا کرو شیطان مردود سے (۳) مقتدی کے لئے چوں کہ قرأت کرنا ممنوع ہے اس لئے وہ تعوذ و تسمیہ بھی نہیں پڑھے گا۔☆

---

(۱) نسائی : تحقیق الالبانی : باب ترک الجهر ببسم الله الرحمن الرحيم : ۹۰۷ – صحيح

(۱) فتح الملهم : ۳۶/۲

(۲) سورۃالنحل:۹۸

☆ امام مالکؒ کے نزدیک تکبیر تحریمہ کے فوری بعد ثنا اور تعوذ و تسمیہ پڑھے بغیر سورۃ فاتحہ کا آغاز کرنا مسنون ہے بقیہ ائمہ کے یہاں سراً ان کا پڑھنا مسنون ہے البتہ امام شافعیؒ کے نزدیک جہری نمازوں میں تسمیہ کو سورۃ فاتحہ کے ساتھ ملا کر جہراً پڑھنا مسنون ہے۔ (الفقہ الاسلامی :۲/۸۷۵-۸۷۸)

(و) قرأت مسنونہ کرنا:

حالت سفر میں: حسب موقع قرأت کی مقدار میں کمی بیشی کرنا سنت نبوی سے ثابت ہے، اگر عجلت کا موقع ہو تو مختصر سورتیں پڑھ کر نماز پوری کی جاسکتی ہے، نبی ﷺ سے حالت سفر میں عشاء کی دو رکعتوں میں سے ایک رکعت میں سورۃ تین پڑھنا (۱) نماز فجر میں معوذتین پڑھنا ثابت ہے (۲) حضرت ابراہیم نخعیؒ فرماتے ہیں کہ اصحاب رسول صلی اللہ علیہ وسلم سفر میں چھوٹی چھوٹی سورتیں پڑھا کرتے تھے۔ (۳) اور اگر اطمینان وسکون میسر ہو تو قدرے طویل قرأت کرنا اچھا ہے حضرت ابن عمرؓ کے بارے میں منقول ہے کہ وہ دوران سفر، نماز فجر کی ہر رکعت میں سورۃ ''حجرات'' سے ابتدائی دس سورتوں میں سے کوئی ایک سورت پڑھا کرتے تھے۔ (۴)

حالت اقامت میں: فجر وظہر کی نماز میں طویل قرأت کرنا، عصر وعشاء میں متوسط مقدار میں قرأت کرنا اور مغرب میں مختصر قرأت کرنا مسنون ہے، بحالت اقامت پانچ نمازوں میں نبی ﷺ سے جو قرأت منقول ہے ان کی تفصیل اس طرح ہے:

نماز فجر: ساٹھ تا سو آیتوں کی تلاوت فرماتے۔ (۵)

سورۃ ''ق'' اور اس جیسی سورتوں کی تلاوت فرماتے۔ (۶)

---

(۱) بخاری : باب الجهر في العشاء : ۷٦۷

(۲) أبوداؤد تحقيق الالباني : باب في المعوذتين : ۱۴٦۴ – ۱۴٦۵ – صحيح

(۳) مصنف ابن أبي شيبة : من كان يخفف القراءة في السفر : ۳۷۰۴۰ – سكت عليه المحقق محمد عوامه

(۴) موطا مالک : باب القراءة في الصبح : ۱۸۵ – موطا محمد مع التعليق الممجد : باب القرائة في الصلاة في السفر : ۲۰۱

(۵) مسلم : باب القراءة في الصبح : ۱۰۵۹

(٦) مسلم : باب القراءة في الصبح : ۱۰۵۵

نماز ظہر: پہلی دو رکعتوں میں سے ہر رکعت میں تیس تیس آیتوں کے بقدر تلاوت فرماتے (۱) واللیل جیسی سورتیں پڑھا کرتے، (۲) سورۃ بروج وطارق جیسی سورتیں پڑھا کرتے۔ (۳)

نماز عصر: پہلی دو رکعتوں میں سے ہر رکعت میں پندرہ پندرہ آیتوں کے بقدر تلاوت فرماتے۔ (۴)

واللیل جیسی سورتیں پڑھا کرتے۔ (۵)

سورۃ بروج وطارق جیسی سورتیں پڑھا کرتے۔ (٦)

نماز مغرب: سورۃ کافرون وسورۃ اخلاص تلاوت فرماتے، (۷) قصار مفصل (مختصر سورتیں) پڑھا کرتے۔ (۸)

نماز عشاء: نبی ﷺ نے حضرت معاذ سے فرمایا: سورۃ الشمس، سورۃ اللیل، سورۃ الاعلیٰ سورۂ العلق (جیسی سورتیں) پڑھا کرو۔ (۹)

---

(۱) ابو داؤد تحقيق الالبانى : باب تخفيف الأخريين : ۸۰۴ – صحيح

(۲) نسائى تحقيق الالبانى : باب القراءة في الركعتين الأوليين من صلاة العصر : ۹۷۹ – حسن صحيح – ۹۸۰ – صحيح

(۳) حواله سابق

(۴) أبو داؤد تحقيق الالبانى : باب تخفيف الأخريين : ۸۰۴ – صحيح

(۵) أبو داؤد تحقيق الالبانى : باب قدر القراءة في صلاة الظهر والعصر : ۸۰٦ – صحيح – ۸۰۵ – حسن صحيح

(٦) حواله سابق

(۷) ابن ماجه : باب القراءة في صلاة المغرب : ۸۳۳ – صحيح – عمدة القارى : باب القراءة في المغرب : ۲۵/٦

(۸) نسائى تحقيق الالبانى : باب القراءة في المغرب بقصار المفصل: ۹۸۳ – صحيح

(۹) مسلم : باب القراءة في العشاء : ۱۰٦۹

نبی ﷺ نے نماز عشاء میں اوساط مفصل پڑھنے کی تلقین فرمائی۔(۱)

پانچ نمازوں میں ان کے علاوہ اور بھی سورتوں کا تلاوت کرنا نبی ﷺ سے ثابت ہے لیکن قرأت کا عام معمول تفصیل بالا کے مطابق تھا، اسی معمول نبوی کو پیش نظر رکھتے ہوئے حضرت عمرؓ نے حضرت ابوموسی اشعریؓ کو یہ ہدایت نامہ لکھا تھا کہ مغرب کی نماز میں قصار مفصل ، نماز عشاء میں اوساط مفصل اور نماز فجر میں طوال مفصل پڑھا کرو۔(۲) طوال مفصل سورۃ ''ق''(۳) تا سورۃ بروج، اوساط مفصل سورۃ بروج تا سورۃ لم یکن (۴) اور قصار مفصل سورۃ لم یکن تا سورۃ ناس۔(۵) کہلاتے ہیں۔

حضرت عمرؓ کے اس سرکاری خط میں نماز ظہر وعصر کی قرأت کا ذکر آیا ہے، تاہم اوپر ذکر کردہ راویات سے معلوم ہوتا ہے کہ نماز عصر کی قرأت بھی نماز عشاء کے مانند ہے، البتہ نماز ظہر کے بارے میں احادیث مختلف ہیں، بعض راویات میں نماز ظہر میں قرأت مسنونہ کی مقدار وہ آئی ہے جو نماز فجر کی ہے یعنی ساٹھ آیتیں اور بعض میں نماز ظہر وعصر کی قرأت یکساں آئی ہے؛ اس لئے نماز ظہر کے سلسلہ میں امام، اپنے مقتدیوں کے احوال کو مدنظر رکھتے ہوئے، ان دو معمول نبوی میں سے جسے چاہے اختیار کرسکتا ہے۔(۶)

---

(۱) بخاری : باب إذا طول الإمام : ۷۰۱

(۲) مصنف عبد الرزاق : باب ما يقرأ في الصلاة : ۲۶۷۲ وفي معنى أثر عمر ما رواه النسائي مرفوعاً بإسناد صحيح : باب القراءة في المغرب بقصار المفصل : ۹۸۳ – تحفة الأحوذي : باب ما جاء في القراءة في الصبح –

(۳) مسند احمد : مسند اوس بن حذيفةؓ : ۱۹۰۴۳ – صحيح أو حسن : إعلاء السنن : ۳۷/۴

(۴) إعلاء السنن : ۳۸/۴

(۵) فتح الباري : باب الجهر في المغرب : ۲۵۰/۲ – حسن أو صحيح – إعلاء : ۳۷/۴

(۶) إعلاء السنن : ۲۴/۴

فائدہ: ہر رکعت میں مکمل سورت پڑھنا مستحب ہے تاہم اگر کوئی اس کے خلاف کرے تب بھی کوئی مضائقہ وگناہ نہیں۔

حضرت ابوالعالیہؒ کہتے ہیں: مجھ سے اس شخصیت نے یہ حدیث بیان کی ہے جس نے براہ راست نبی ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا کہ ہر سورت کے لئے مستقل رکعت ہے (۱) اس سے معلوم ہوا کہ ہر رکعت میں کامل سورت کا پڑھنا اچھا ہے تاہم نبی ﷺ سے کبھی کبھار اس کے برخلاف عمل بھی ثابت ہے کہ آپ ﷺ نے ایک سورۃ کو دو رکعتوں میں تقسیم فرمایا تھا۔ (۲) جس سے اس صورت کا جائز ہونا بھی معلوم ہوتا ہے۔

فائدہ: جمہور علماء کے نزدیک قرآن پاک میں سورتوں کی ترتیب وحی خداوندی اور حکم نبوی کے موافق ہے، مصحف عثمانی میں باجماع صحابہ سورتوں کی وہی ترتیب برقرار رکھی گئی تھی؛ اس لئے نمازوں میں قرآن پاک اسی ترتیب کے مطابق پڑھنا چاہئے، اس کی خلاف ورزی کرنا کہ بعد والی سورت کو پہلی رکعت میں اور پہلے والی سورۃ کو دوسری رکعت میں پڑھنا مکروہ ہے۔

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے اس شخص کے بارے میں سوال کیا گیا جو الٹا قرآن پڑھتا ہے، فرمایا: وہ اوندھے والٹے دل والا آدمی ہے۔ (۳)

فائدہ: تجوید کے ساتھ قرأت کرنا، حکم خداوندی کی رو سے انتہائی ضروری اور لازم ہے، ارشاد ربانی ہے اور قرآن کی تلاوت اطمینان سے صاف صاف کیا کرو ' وَرَتِّلِ الْقُرْآنَ

---

(۱) طحاوی : باب جمع السور في ركعة : ۲۰۲۹- ۲۰۳۰ - مسند أحمد : حديث من سمع النبي صلى الله عليه وسلم : تحقيق شعيب الأرنؤوط : ۲۰۵۹۰ - إسناده صحيح

(۲) نسائي : تحقيق الالباني : باب القراءة في المغرب : ۹۹۱ - صحيح

(۳) طبراني كبير : ۸۷۵۵ ، سند جيد : الاتقان في علوم القرآن : ۱۴۳۲

تَرْتِیْلاً ''۔(۱)

حضرت علیؓ ارشاد فرماتے ہیں کہ ترتیل درحقیقت حروف کی باتجوید ادائیگی اوراوقاف کی شناخت کا نام ہے۔(۲)

(ز) آہستہ آمین کہنا:

امام، مقتدی، منفرد، سب کے لئے سورۃ فاتحہ کے ختم پر آہستہ آمین کہنا مسنون ہے، حضرت وائل بن حجرؓ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے ہم کو نماز پڑھائی ، جب ''غیر المغضوب علیھم و لاالضالین '' پڑھا تو آہستہ سے آمین کہا۔(۳)

حضرت ابوہریرہؓ سے مروی ہے رسول اللہ ﷺ ہمیں تعلیم دیتے تو فرماتے کہ امام سے آگے نہ بڑھو جب وہ ''اللہ اکبر '' کہے تو ''اللہ اکبر '' کہو اور جب 'ولاالضالین '' کہے تو ''آمین '' کہو۔(۴)

اس حدیث سے صراحۃً تو آمین آہستہ کہنا نہیں معلوم ہوتا؛ البتہ یہ ہدایت کہ جب امام ''ولاالضالین '' کہے تو تم آمین کہو، اس بات کی طرف بھی اشارہ موجود ہے کہ امام '' آمین '' کے لفظ کو آہستہ ادا کرے گا۔(۵)

حضرت ابووائلؒ کہتے ہیں: حضرت عمرؓ وعلیؓ تعوذ، تسمیہ اور آمین زور سے نہیں کہا

---

(۱) المزمل : ۴

(۲) النشر في القراء ات العشر : ۲۲۵/۱ ، منار الھدی في بیان الوقف والابتدا : ۹/۱ ، الاتقان في علوم القرآن : ۱۱۲۲ – بغیر سند

(۳) المستدرک مع تعلیقات الذھبي : باب قراء ات النبي صلی اللہ علیہ وسلم : صحیح علی شرط البخاري ومسلم : امام حاکمؒ وذھبيؒ۔ إسنادہ صحیح : آثار السنن : ۹۶/۱

(۴) مسلم:باب النھي عن مبادرۃ الإمام : ۹۵۹

(۵) آثارالسنن : ۹۵/۱

کرتے تھے (۱) امام طبریؒ فرماتے ہیں: صحابہ کرام اور تابعین عظام کی زیادہ تعداد آمین آہستہ کہتی تھی۔ (۲)

آہستہ آمین کہنے کی افضلیت کی تائید اس سے بھی ہوتی ہے کہ حضرت عطاؒ کے بقول آمین ایک دعا ہے (۳) اور دعا کا ادب قرآن پاک میں یہ بتلایا گیا ہے کہ وہ عاجزی وانکساری کے ساتھ اور خفیہ طور پر ہو (۴) پس آمین کو آہستہ اور خفیہ طور پر کہنا منشأ قرآنی کے مطابق بھی ہے۔☆

---

(۱) طحاوی :باب قراء ة بسم الله الرحمن الرحيم في الصلاة : ۱۲۰۸ – إسناده ضعيف : آثار السنن : ۱/ ۹۹

(۲) إعلاء السنن : ۲/ ۲۲۳

(۳) بخاری تعلیقا: باب جهر الامام بالتأمين

(۴) الأعراف: ۵۵

☆ یہی امام مالکؒ کا بھی مسلک ہے امام شافعیؒ واحمدؒ کے نزدیک بلند آواز سے آمین کہنا افضل ہے۔ الفقه الاسلامی : ۲/ ۸۸۰

فائدہ: بعض حضرات بے تحاشہ بلند آواز سے آمین کہنے پر اصرار کرتے ہیں اور دلیل میں حضرت ابو ہریرہؓ کی یہ روایت پیش کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب "غير المغضوب عليهم ولا الضالين" کہتے تو "آمین" کہتے، یہاں تک کہ صفِ اول والے اس کو سن لیتے، پھر اس سے مسجد بھی گونج اٹھتی؛ (ابن ماجۃ: باب الجہر بآمین: ۸۵۳) حالاں کہ یہ روایت سند ومتن دونوں اعتبار سے ناقابل حجت ہے، اس کی سند میں ایک راوی بشیر بن رافع ہیں، جن پر امام بخاریؒ، امام احمدؒ، امام ابن معینؒ، امام نسائیؒ جیسے ائمہ جرح وتعدیل نے کلام کیا ہے اور ابن حبان نے تو ان پر وضعِ حدیث تک کی بات کہی ہے، پھر سننِ ابوداؤد اور مسندِ ابویعلی میں یہ روایت اخیر جملے (مسجد اس سے گونج اٹھتی تھی) کے بغیر آئی ہے، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ابن ماجہ کی اس روایت کا کوئی متابع بھی نہیں ہے، متن کے اعتبار سے خامی یہ ہے کہ ابن ماجہ کی روایت کا اخیر اور ماقبل اخیر جملہ باہم متعارض ہیں کہ ماقبل اخیر جملہ سے تو اتنا معلوم ہوتا ہے کہ صرف صفِ اول والے آمین کی آواز کو سن لیتے تھے، اور اخیر جملے سے معلوم ہوتا ہے کہ پوری مسجد گونج اٹھتی تھی۔ (التعليق الحسن : ۱/ ۹۴)

تکبیرات انتقالات کہنا:

علامہ بغویؒ فرماتے ہیں: امت مسلمہ تکبیرات انتقالات کے سنت ہونے پر متفق ہے،(۱) حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے مروی ہے رسول اللہ ﷺ جھکنے، اٹھنے، بیٹھنے، کھڑے ہونے کے وقت تکبیر کہا کرتے تھے، اسی طرح حضرت ابوبکرؓ وعمرؓ وعثمانؓ بھی، (۲) حضرت علیؓ فرماتے ہیں: رسول اللہ ﷺ نماز میں جب جب جھکتے اور اٹھتے تو تکبیر کہتے دنیا سے پردہ فرمانے تک آپ ﷺ کی یہی نماز رہی، (۳) حضرت ابوہریرہؓ نے ایک دفعہ لوگوں کو نماز پڑھائی جس میں آپؓ نے تکبیر کہی جب جب آپؓ جھکے اور جب جب آپؓ اٹھے، نماز سے فارغ ہونے کے بعد ارشاد فرمایا: نماز کے اعتبار سے میں تم میں سب سے زیادہ رسول اللہ ﷺ کے مشابہ ہوں۔ (۴) ☆

رکوع کی سنتیں:

(الف) رکوع میں ہتھیلیوں کو گھٹنوں پر رکھنا۔

ہاتھوں کو پہلوؤں سے علیحدہ رکھنا، کھلی انگلیوں سے گھٹنوں کو پکڑے رہنا، پشت سیدھی رکھنا، پشت اور سر ایک سیدھ میں رکھنا، رسول اللہ ﷺ نے اپنے چہیتے خادم حضرت انسؓ سے یوں

---

(۱) السعایة: ۱۷۶/۲

(۲) ترمذی: باب التکبیر عند الرکوع والسجود: ۲۵۳ – حسن صحیح – امام ترمذی

(۳) موطامالک: باب افتتاح الصلاۃ: ۱۶۴

(۴) بخاری: باب اتمام التکبیر فی الرکوع: ۷۸۵

☆ تکبیرات انتقالات کہنے کا موقع کیا ہے اس بارے میں علماء کی تین رائے ہیں: (۱) پہلے تکبیر کہی جائے پھر رکن کی طرف منتقل ہو (۲) تکبیر کہتے ہوئے رکن کی طرف منتقل ہو (۳) رکن کی طرف جھکتے ہوئے تکبیر کا آغاز ہو اور رکن کی طرف منتقل ہونے پر تکبیر کا اختتام ہو، احادیث کی رو سے دوسرے طریقہ کی زیادہ تائید ہوتی ہے کیوں کہ عمل نبوی صلی اللہ علیہ وسلم یہ بیان کیا گیا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم جھکنے اور اٹھنے کے وقت تکبیر کہا کرتے تھے بغیر اس تفصیل کے کہ تکبیر کا آغاز جھکنے کی ابتداء پر اور اختتام جھکنے کے مکمل ہونے پر ہوا کرتا تھا۔ (السعایہ ۱۷۸/۲)

فرمایا: اے بیٹے! جب رکوع کرو تو دونوں ہاتھ گھٹنوں پر رکھو اور انگلیوں کے درمیان کشادگی رکھو اور ہاتھوں کو پہلو سے دور رکھو۔(۱)

حضرت ابو حمیدؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے رکوع فرمایا تو اپنے دونوں ہاتھ گھٹنوں پر اس انداز سے رکھے کہ گویا کہ آپ ﷺ ان کو پکڑے ہوئے ہیں اور اپنے دونوں ہاتھوں کو قوس بنالیا اور ان کو پہلوؤں سے علیحدہ رکھا۔(۲)

حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں جب آپ ﷺ رکوع فرماتے تو نہ سر کو اٹھاتے نہ جھکائے رکھتے بلکہ درمیانی حالت پر رکھتے (۳) حضرت وابصہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ جب رکوع فرماتے تو اپنی پیٹھ کو نہایت سیدھی رکھتے حد یہ کہ اگر پشت مبارک پر (بالفرض) پانی انڈیلا جاتا تو وہ ٹھہر جاتا ہوتا۔(۴)

(ب) تین دفعہ تسبیح پڑھنا:

حضرت ابن مسعودؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا جب تم میں سے کوئی رکوع کرے تو اسے چاہئے کہ تین دفعہ " **سبحان ربی العظیم** " کہے اور یہ کم از کم درجہ ہے (یعنی تکمیل سنت کا اولین درجہ ہے) اور جب سجدہ کرے تو اسے تین دفعہ " **سُبْحَانَ رَبِّیَ الْاَعْلٰی** " کہنا چاہئے اور یہ کم از کم درجہ ہے۔(۵)

تسبیح پڑھنے میں سنت کا اعلیٰ درجہ گیارہ دفعہ پڑھنا ہے، سعید بن جبیرؒ سے مروی ہے:

---

(۱) مسند ابو یعلی : شریک عن أنسؓ : ۳۶۲۴، سند کے ایک راوی ضعیف ھیں ، مجمع الزوائد : باب الغسل من الجنابة : ۱۴۷۰

(۲) ترمذی :باب ما جاء أنه یجافي یدیه عن جنبیه في الرکوع : ۲۶۰ – حسن صحیح – امام ترمذي

(۳) مسلم : باب ما یجمع صفة الصلاة : ۱۱۳۸

(۴) سنن ابن ماجه : تحقیق الالبانی : ۸۶۲ – صحیح

(۵) ترمذی :باب ما جاء في التسبیح في الرکوع والسجود : ۲۶۱ . صالح الاحتجاج : مرعاة المفاتیح : ۸۸۷

حضرت انسؓ نے ارشاد فرمایا: میں نے رسول اللہ ﷺ کے بعد کسی ایسے آدمی کے پیچھے نماز نہیں پڑھی جو اس نوجوان (عمر بن عبدالعزیزؒ) سے زیادہ نماز نبوی سے مشابہت رکھتا ہو۔ سعیدؒ کہتے ہیں ہم نے ان کے رکوع وسجود کا اندازہ دس دس تسبیحات سے لگایا۔(۱) ایک اور حدیث میں ارشاد نبوی ہے: یقیناً اللہ طاق اور یکتا ہے اور طاق ہی کو پسند فرماتا ہے۔(۲)

ملا علی قاری نقل فرماتے ہیں: ان دو روایات کے ملانے سے اس بات کا ثبوت ملتا ہے کہ سنیت کا اعلیٰ درجہ گیارہ گیارہ دفعہ کہنا ہے (۳) تاہم امام کو ان مواقع پر مقتدیوں کے احوال کی رعایت کرنا نہایت ضروری ہے اگر وہ رکوع وسجود میں اتنی تاخیر کرنے سے اکتاہٹ کا شکار ہو جاتے ہوں تو امام تین دفعہ تسبیح کہنے پر اکتفاء کرے (۴) حضرت عبداللہ بن مبارکؒ سے منقول ہے کہ امام کے لئے پانچ دفعہ تسبیح کہنا مستحب ہے۔(۵)

قومہ (رکوع سے اٹھنے کے بعد کی حالت) کی سنتیں:

تسمیع (سمع الله لمن حمده) وتحمید (ربنالک الحمد) کہنا:

(الف) تنہا نماز پڑھنے والے کے لئے تسمیع وتحمید دونوں کہنا مسنون ہے:

حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے: رسول اللہ ﷺ جس وقت نماز کے لئے کھڑے ہوتے تو تکبیر کہتے پھر رکوع کرتے وقت بھی تکبیر کہتے پھر جس وقت رکوع سے پشت کو اٹھاتے تو کہتے سمع الله لمن حمده پھر کھڑے ہونے کی حالت میں ربنالک الحمد کہتے۔(۶)

(ب) امام کے لئے بھی آیا تسمیع وتحمید دونوں مسنون ہیں یا صرف تسمیع؟ اس

---

(۱) نسائی تحقیق الالبانی: عدد التسبیح فی السجود: ۱۱۳۵ – حسن
(۲) مسلم: باب فی اسماء الله تعالی: ۶۹۸۵
(۳) مرقاۃ المفاتیح: ۸۸۳ – ۲/۵۵۷
(۴) السعایۃ: ۲/۱۸۳
(۵) ترمذی: باب التسبیح فی الرکوع والسجود: ۲۶۱
(۶) بخاری: باب التکبیر إذا قام من السجود: ۷۸۹

بارے میں علماء احناف کے دونقطۂ نظر ہیں: صاحبینؒ کے نزدیک دونوں مسنون ہیں، دلیل یہی اوپر والی روایت ہے جس کا تعلق بظاہر امامت ہی سے ہے، امام طحاویؒ، امام فضلیؒ، اور متاخرین کی ایک بڑی جماعت اس رائے کی موید ہے یہی امام شافعیؒ واحمدؒ کا بھی مسلک ہے۔(۱) امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک امام کے لئے تسمیع پر اکتفاء کرنا مسنون ہے، کیوں کہ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد گرامی ہے، جب امام **سمع الله لمن حمده** کہے تو **اللهم ربنالک الحمد** کہو(۲) یہاں اس روایت میں امام اور مقتدی دونوں کا دائرہ کار تقسیم کردیا گیا ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ نہ امام کو یہ دونوں اذکار جمع کرنے چاہئے نہ مقتدی کو، عام متون احناف: میں اسی رائے کو اختیار کیا گیا ہے۔(۳)

(ج) مقتدی کے لئے صرف تحمید پر اکتفاء کرنا مسنون ہے۔

حضرت انسؓ سے روایت ہے: رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: جب امام **سمع الله لمن حمده** کہے تو تم **ربنالک الحمد** کہو۔(۴) اس جیسی متعدد روایات میں مقتدی کا وظیفہ صرف تحمید بتلایا گیا ہے اور اس کے برخلاف ایسی کوئی روایت موجود نہیں جس سے مقتدی کے لئے تسمیع وتحمید کا جمع کرنا معلوم ہوتا ہو۔☆

---

(۱) اعلاء السنن ۳/۱۱ ، الفقه الاسلامی ۲/۸۹۱

(۲) بخاری : باب فضل اللهم ربنا لک الحمد : ۷۹۶

(۳) اعلاء السنن ۳/۱۱ ، الفقه الاسلامی ۲/۸۹۱

(۴) بخاری : باب ایجاب التکبیر وافتتاح الصلاۃ : ۷۳۳

☆ فائدہ: روایات میں تحمید کے مختلف الفاظ وصیغے وارد ہوئے ہیں جو درج ذیل ہیں: (۱) ربنالک الحمد (بخاری: باب التکبیر إذا قام من السجود : ۷۸۹) ربنا ولک الحمد (بخاری: باب التکبیر إذا قام من السجود : ۷۸۹) (۳) اللهم ربنا لک الحمد (بخاری: باب فضل اللهم ربنا لک الحمد (۴) اللهم ربنا ولک الحمد (بخاری: باب ما یقول الإمام ومن خلفه إذارفع رأسه من الرکوع : ۷۹۵) ان میں سے جو صیغہ چاہے تحمید کے طور پر اختیار کیا جاسکتا ہے۔

فائدہ: رکوع وسجدہ، قومہ وجلسہ میں صحیح روایات کے حوالے سے بہت سارے اذکار ودعائیں بھی وارد ہوئی ہیں، امام شافعیؒ انہی روایات کے پیش نظر امام، مقتدی، منفرد، مفترض ومتنفل ہر ایک کے لئے ان کا پڑھنا مسنون قرار دیتے ہیں، جب کہ احناف ان دعاؤں کو نوافل پر محمول کرتے ہیں یا یہ کہتے کہ آپ ﷺ نے کبھی کبھی بیان جواز کے لئے فرائض میں انہیں پڑھا ہے، امام طحاویؒ کا خیال ہے کہ ان اذکار وادعیہ کو رکوع وسجود میں پڑھنے کا معمول اس زمانے میں تھا جب کہ رکوع =

فائدہ: قومہ میں ہاتھ باندھ لینے چاہیے یا اپنی حالت پر کھلے چھوڑنا چاہیے، اس بارے میں علماء کی رائے مختلف ہے، امام ابو حفصؒ، علامہ حلوائیؒ وغیرہ کا خیال ہے کہ ہاتھ کھلے چھوڑنا چاہیے، جبکہ قاضی ابو علی نسفی، شیخ اسماعیل الزاہد وغیرہ کا خیال ہے کہ قومہ میں بھی قیام کی طرح ہاتھ باندھ لینے چاہیے، اصل بات یہ ہے کہ اس سلسلہ میں کوئی صریح حدیث موجود نہیں، جس کی بناپر علماء نے قیاس کا سہارا لیا ہے۔

پہلی جماعت کہتی ہے چوں کہ قومہ میں قیام کی طرح کوئی چیز پڑھنا نہیں ہے؛ اس لئے ہاتھ باندھنا بھی نہیں ہے، دوسری جماعت کہتی ہے: قومہ میں چوں کہ تسمیع وتحمید مسنون ہے؛ اس لئے ہاتھ باندھنا بھی مسنون ہے، علامہ لکھنوی فرماتے ہیں: ''اگر قومہ میں ذکر طویل کرنے کا ارادہ ہو (جیسے بعض روایات میں نوافل کے قوموں میں طویل طویل اذکار منقول ہیں) تو ہاتھ باندھ لینا چاہیے، ورنہ ہاتھ نہ باندھے؛ اس لئے کہ لمحہ بھر کے لئے ہاتھ باندھنا پھر کھول لینا بے فائدہ ہے۔(۱)

قومہ سے سجدہ کی طرف تکبیر کہتے ہوئے منتقل ہونا۔(۲)

پہلے گھٹنے زمین پر رکھے پھر دونوں ہاتھ پھر چہرہ

حضرت وائل بن حجرؓ سے مروی ہے کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو دیکھا جب آپ ﷺ سجدہ فرماتے تو دونوں ہاتھوں کے رکھنے سے قبل گھٹنوں کو رکھتے (۳) حضرت ابو ہریرہؓ

= اور سجدہ کی تسبیح مقرر نہیں ہوئی تھی لیکن جب فسبح باسم ربک العظیم (سورۂ واقعہ۹۶) اور سبح اسم ربک اعلی (سورۂ اعلی:۱)

ان آیات کا نزول ہوا تو آپ ﷺ نے رکوع میں سبحان ربی العظیم اور سجدہ میں سبحان ربی الاعلی کی تسبیح مقرر کرنے کا حکم فرمایا جس کے ساتھ ہی رکوع وسجود میں ان اذکار و دعاؤں کے پڑھنے کا طریقہ منسوخ ہوا۔(طحاوی : باب ما ینبغی أن یقال في الرکوع والسجود : ۱۴۱۷، السعایۃ: ۲/۱۹۰،۱۹۱)

(۱) السعایۃ : ۲/۱۵۷ – ۱۵۹ ، بدائع الصنائع : ۱/ ۴۶۹ ، سنن الصلاۃ

(۲) بخاری : باب اتمام التکبیر في السجود : ۷۸۶

(۳) ترمذی : باب في وضع الرکبتین قبل الیدین في السجود : ۲۶۸ – حسن غریب امام ترمذی ، حسن : آثار السنن : ۱/۱۱۷

سے روایات ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: جب تم میں سے کوئی سجدہ کرے تو ہاتھوں سے پہلے گھٹنوں کو رکھے اور اونٹ کے بیٹھنے کی طرح نہ بیٹھے۔(۱)

حضرت انسؓ فرماتے ہیں: سجدہ کے لئے جھکنے میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے گھٹنے، ہاتھوں پر سبقت کرتے تھے۔(۲)

حضرت عمرؓ سے بھی سجدہ میں جانے کا یہی طریقہ ثابت ہے،(۳) حضرت ابراہیم نخعیؒ سے اس شخص کے بارے میں دریافت کیا گیا جو سجدہ میں جاتے وقت پہلے ہاتھ ٹیکتا ہے پھر گھٹنے رکھتا ہے حضرت ابراہیم نخعیؒ نے جواب دیا: ایسا کام بے وقوف و پاگل انسان ہی کرسکتا ہے۔(۴) ☆

سجدہ کی سنتیں:

سجدہ میں چہرہ دونوں ہتھیلیوں کے درمیان ہو اور ہتھیلیاں کانوں کے مقابل میں ہوں، انگلیاں ملی ہوئی ہوں، ہاتھ پہلوؤں سے علیحدہ ہوں، پیٹ رانوں سے علیحدہ ہو، پیروں کی انگلیاں قبلہ رخ ہوں، سرین ایڑیوں سے علیحدہ ہو۔

حضرت وائل بن حجرؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ جب سجدہ فرماتے تو اپنے چہرہ

---

(۱) مصنف ابن أبي شيبة : باب في الرجل إذا انحط إلى الركوع أي شيئ يقع منه قبل إلى الأرض : ۲۷۱۷ – له شاهد من حديث وائل بن حجر : محمد عوامه

(۲) مستدرک حاکم مع تعليقات الذهبي : باب التأمين: ۸۲۲ – صحيح على شرط الشيخين

(۳) طحاوی :باب ما يبدأ بوضعه في السجود : ۱۵۲۸ – صحيح – آثار السنن : ۱/۱۱۷

(۴) طحاوی :باب ما يبدأ بوضعه في السجود : ۱۵۳۰ – أثر محفوظ : زاد المعاد : مبحث في ترجيح وضع الركبتين قبل اليدين : ۱/۲۱۵

☆ امام شافعیؒ و احمدؒ کے یہاں بھی سجدہ میں جانے کا یہی طریقہ مسنون ہے امام مالکؒ کے نزدیک پہلے ہاتھ رکھنا پھر گھٹنے ٹیکنا مسنون ہے۔(الفقہ الاسلامی:۸۹۲/۲)

کو اپنی دونوں ہتھیلیوں کے درمیان رکھتے۔(۱)

حضرت وائل حجرؓ فرماتے ہیں: رسول اللہ ﷺ نے سجدہ فرمایا یہاں تک کہ میں نے آپ ﷺ کے انگوٹھوں کو کانوں کے پاس میں دیکھا۔(۲)

حضرت وائل بن حجرؓ سے ہی مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ جب سجدہ فرماتے تو اپنی انگلیاں ملا لیتے۔(۳)

حضرت میمونہؓ سے روایت ہے رسول اللہ ﷺ جب سجدہ فرماتے تو اپنے شکم مبارک کو اپنی رانوں سے اس قدر دور رکھتے کہ درمیان سے اگر کوئی بکری کا بچہ گذرنا چاہے تو گذر سکے۔(۴)

حضرت احمر بن جزء سے مروی ہے: رسول اللہ ﷺ جب سجدہ فرماتے تو اپنے بازؤں کو پہلوؤں سے علیحدہ رکھتے۔(۵)

حضرت ابوحمید ساعدیؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ جب سجدہ فرماتے تو نہ اپنے ہاتھوں کو بچھا کر رکھتے نہ سمیٹ کر اور آپ ﷺ اپنے پیروں کی انگلیوں کے کناروں کو قبلہ رخ رکھتے۔(۶)

حضرت براء بن عازبؓ رسول اللہ ﷺ کی سجدہ کی ہیئت کو بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں: آپ ﷺ نے سرین کو اٹھائے رکھا (یعنی ایڑیوں پر ٹکایا نہیں)۔(۷)

---

(۱) مسلم : باب وضع يده اليمنى على اليسرى : ۹۲۳

(۲) نسائی تحقيق الالبانی : باب مكان اليدين من السجود : ۱۱۰۲ – صحيح

(۳) المعجم الكبير : ۱۷۴۹۵ ، حسن : مجمع الزوائد : باب صفة الصلاة : ۲۸۰۷

(۴) مسلم :باب ما يجمع صفة الصلاة : ۱۱۳۵

(۵) أبو داؤد تحقيق الالبانی : باب صفة السجود : ۹۰۰ – حسن صحيح

(۶) بخاری : باب سنة الجلوس في التشهد : ۸۲۸

(۷) السنن الكبرى للبيهقي : باب يفرج بين رجليه ويقل بطنه عن فخذيه : ۲۸۲۱ – حسن – خلاصة الأحكام : ۴۱۳/۱ – مصنف ابن أبي شيبة : تحقيق محمد عوامه التجافی في السجود : ۲۶۶۵ – مؤيد بالحديث الصحيح .

سجدہ میں تین دفعہ تسبیح کہنا:

رکوع کی تسبیح کے ذیل میں اس کا بیان تفصیل سے گذرا ہے۔

جلسہ کی سنتیں:

دو سجدوں کے درمیان اس کیفیت کے ساتھ بیٹھنا مسنون ہے جس کیفیت پر قعدۂ تشہد میں بیٹھا جاتا ہے، حضرت ابوحمید ساعدیؓ فرماتے ہیں: پھر آپ ﷺ زمین کی طرف جھکتے پھر کھل کر سجدہ فرماتے پھر اپنے سر کو اٹھاتے اور بائیں پیر کو موڑ کر اس پر بیٹھ جاتے۔(۱)

فائدہ: جلسہ میں ایک تسبیح کے بقدر بیٹھنا واجب ہے اور تین تسبیح کے بقدر بیٹھنا مسنون ہے، رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: جب تم سجدہ سے سر اٹھاؤ تو اطمینان سے بیٹھ جاؤ، پھر دوسرا سجدہ کرو۔(۲) فقہاء نے اطمینان کی تشریح اسی انداز پر کی ہے۔(۳)

فائدہ: جلسہ میں نبی کریم ﷺ سے بعض دعائیں پڑھنا بھی ثابت ہے، احناف ان روایات کو یا تو نوافل پر محمول کرتے ہیں یا یہ کہتے ہیں کہ کبھی کبھار آپ ﷺ نے فرائض میں بھی بیان جواز کے لئے ان کو پڑھا ہے۔

علامہ شامیؒ فرماتے ہیں: دو سجدوں کے درمیان کم از کم اَللّٰھُمَّ اغْفِرْلِیْ پڑھ لینا بہتر اور مناسب ہے؛ اس لئے کہ اتنی دعا کا پڑھنا امام احمدؒ کے یہاں واجبات نماز میں سے ہے جسے عمداً ترک کرنے سے نماز باطل ہو جاتی ہے۔(۴)

---

(۱) ترمذی: باب ما جاء في وصف الصلاة : ۳۰۴ — حسن صحیح : امام ترمذی

(۲) بخاری : باب أمر النبي صلى الله عليه وسلم الذي لا يتم ركوعه بالإعادة : ۷۹۳

(۳) السعايه: ۲۰۸/۲

(۴) شامی : ۳۷۳/۱

سجدۂ ثانیہ سے دوسری رکعت کی طرف منتقل ہونے کا مسنون طریقہ:

پہلے سر اٹھائے پھر ہاتھوں کو پھر گھٹنوں کو، سجدہ ثانیہ سے دوسری رکعت کی طرف براہ راست اٹھ جائے، نہ ہاتھوں کے ذریعہ زمین کا سہارا لے نہ ہی بیٹھ کر (جلسۂ استراحت کرکے) اٹھے، حضرت وائل بن حجرؓ سے راویت ہے کہ رسول اللہ ﷺ جب سجدہ سے اٹھتے تو گھٹنوں سے پہلے ہاتھوں کو اٹھاتے۔(۱)

حضرت ابن عمرؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اس بات سے منع فرمایا کہ آدمی جب نماز میں اٹھ کھڑے ہو تو اپنے ہاتھوں پر سہارا لے؛ (۲) البتہ اگر عذر ہو تو ہاتھوں سے زمین کا سہارا لینے میں کوئی مضائقہ نہیں۔

حضرت علیؓ سے مرفوعاً روایت ہے کہ فرض نماز میں سنت طریقہ یہ ہے کہ جب آدمی دو رکعتوں میں (قعدہ اولی سے) کھڑا ہو تو زمین پر سہارا نہ لے الّا یہ کہ وہ بوڑھا ہو اور ایسا نہ کرسکتا ہو۔(۳)

حضرت ابو ہریرۃؓ سے مروی ہے کہ: رسول اللہ ﷺ نماز میں پاؤں کے پنجوں کے بل کھڑے ہو جایا کرتے تھے۔(۴) حضرت عباس یا عیاش بن سھل الساعدی سے مروی ہے کہ وہ ایک ایسی مجلس میں حاضر تھے جس میں ان کے والد جو صحابی رسول تھے وہ اور حضرت ابو ہریرۃؓ، حضرت ابو حمید ساعدیؓ، حضرت ابو سعیدؓ بھی تشریف فرما تھے، حضرت عباس یا عیاش کے والد نے حضرت سھل ساعدیؓ سے حدیث بیان کی جس میں یہ ہے کہ پھر آنحضرت ﷺ

---

(۱) ترمذی : باب في وضع الركعتين قبل اليدين في السجود : ۲۶۸ – حسن : آثار السنن : ۱/۱۱۷

(۲) أبو داؤد تحقيق الالبانی : باب كراهية الاعتماد على اليد في الصلاة : ۹۹۲ – صحيح

(۳) السنن الكبرى للبيهقي : باب الاعتماد بيديه على الأرض : ۲۹۲۶ – مصنف ابن أبي شيبة : باب في الرجل يعتمد على يديه في الصلاة : ۴۰۲۰، سند کے ایک راوی ضعیف ھے – محمد عوامه

(۴) ترمذی : باب ماجاء كيف النهوض من السجود : ۲۸۸ – له شواهد صحيحة : إعلاء : ۳/۵۰

نے تکبیر کہی اور (دوسرا) سجدہ کیا پھر تکبیر کہی اور کھڑے ہو گئے اور تورک نہیں کیا یعنی کھڑے ہونے سے پہلے بیٹھے نہیں۔(۱)

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کے بارے میں منقول ہے کہ وہ نماز کی پہلی اور تیسری رکعت میں اپنے پنجوں کے بل کھڑے ہو جاتے تھے اور بیٹھتے نہ تھے(۲) امام شعبیؒ کہتے ہیں، حضرت عمرؓ وعلیؓ اور صحابہ رسول اللہ ﷺ نماز میں اپنے پنجوں کے بل کھڑے ہو جاتے تھے۔(۳) جب اپنا سر پہلی یا تیسری رکعت کے سجدے سے اٹھاتے تو اسی حال میں کھڑے ہو جاتے تھے اور بیٹھتے نہیں تھے۔(۴)

حضرت نعمان بن عیاشؓ سے مروی ہے کہ میں نے بہت سے صحابہ کرام کو پایا کہ وہ عذر کی بنا پر یا موٹاپے کی وجہ سے جلسۂ استراحت کی ضرورت پڑتی ہے تو اس میں کوئی مضائقہ نہیں، بعض روایات سے جلسۂ استراحت کا جو ثبوت ملتا ہے احناف نے ان کو حالت عذر پر محمول کیا ہے، اس زمانے میں رسول اللہ ﷺ نے صحابہ سے فرمایا تھا، کھڑے ہونے اور رکوع وسجدہ کرنے میں مجھ سے سبقت مت کرو اس لئے کہ میرا بدن اب بھاری ہو گیا ہے۔(۵)☆

فائدہ(۱): دوسری رکعت بھی پہلی رکعت کی طرح پڑھی جائے گی البتہ دوسری

(۱) ابو داؤد : باب افتتاح الصلاۃ : ۷۳۳ – صحیح – آثار السنن : ۱/۱۲۰

(۲) معجم کبیر طبرانی : ۹۲۲۵ – صحیح : مجمع الزوائد : باب صفة الصلاة : ۲ | ۲۸

(۳) مصنف ابن ابی شیبه : باب من ینهض علي صدور قدمیه : ۴۰۰۴ – سکت علیه المحقق محمد عوامه : أسانید صحیحة : أرواء الغلیل : ۳۶۳ : ۲/۸۴

(۱) مصنف ابن ابی شیبه :باب من کان یقول إذا رفعت رأسک من السجدة الثانیة في الرکعة الأولی فلا تقعد : ۴۰۱۱ – حسن – آثار السنن : ۱/۱۲۱

(۲) طبرانی کبیر: ۱۵۵۸ – صحیح : مجمع الزوائد : باب متابعة الإمام : ۲۴۱۱ – أبو داؤد تحقیق الالبانی : باب ما یؤمر به المأموم من اتباع الإمام : ۶۱۹ – حسن صحیح

☆ جلسه استراحت تنهاء امام شافعیؒ کے یهاں مسنون هے امام مالکؒ واحمدؒ کے نزدیک بهی یه مسنون نهیں . (الفقه الاسلامی:۲/۸۹۹)

رکعت میں نہ تکبیر تحریمہ ہے نہ کانوں تک ہاتھ اٹھانا ہے نہ ہی ثنا وتعوذ پڑھنا ہے۔حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ جب دوسری رکعت میں اٹھتے تو الحمد للہ رب العالمین سے قرأت شروع کرتے (ثناء وغیرہ) کے لئے خاموش نہ رہتے۔(۱)

فائدہ(۲): مسنون یہ ہے کہ دوسری رکعت، قرأت کے اعتبار سے پہلی رکعت کے مقابلے میں مختصر ہو حضرت ابوقتادہؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ ظہر کی پہلی دو رکعتوں میں سورہ فاتحہ اور ضم سورۃ پڑھا کرتے تھے، پہلی رکعت لمبی کرتے تھے اور دوسری رکعت (اس کے مقابلے میں) مختصر اور عصر میں بھی (اسی طرح) سورہ فاتحہ اور ضم سورۃ پڑھا کرتے تھے اور آپ ﷺ فجر کی پہلی رکعت کو طویل کرتے تھے اور دوسری کو مختصر۔(۲)

سنن ابوداؤد میں حضرت ابوقتادہؓ ہی سے یہ اضافہ بھی منقول ہے کہ ہم یہ خیال کرتے تھے کہ رسول اللہ ﷺ اپنے اس طرز عمل سے یہ چاہتے تھے کہ لوگ پہلی رکعت کو پالیں (۳) علامہ شبیر احمد عثمانیؒ فرماتے ہیں: پہلی رکعت کو دوسری رکعت کے مقابلے میں طویل کرنا، امام محمدؒ کے نزدیک تمام نمازوں میں مسنون ہے اور اس کی دلیل حدیث بالا ہے، ایک قول کے مطابق احناف کے یہاں اس رائے پر فتوی بھی ہے، خلاصہ میں اسے پسندیدہ رائے سے تعبیر کیا گیا ہے اور علامہ ابن ہمامؒ کا رجحان بھی اسی کی جانب ہے۔(۴)

قعدۂ اولی کی سنتیں:

(الف) قعدہ میں بیٹھنے کا مسنون طریقہ یہ ہے کہ دایاں قدم کھڑا ہوا اور بائیں قدم کو بچھا کر اس پر بیٹھے، دائیں قدم کی انگلیاں قبلہ رخ ہوں اور دونوں ہاتھ رانوں پر رکھے

---

(۱) مسلم: باب ما یقال بین تکبیرۃ الاحرام والقراءۃ : ۱۳۸۴

(۲) بخاری : باب القراءۃ في الظھر : ۷۵۹

(۳) ابوداؤد: تحقیق الالبانی : باب ما جاء في القراءۃ في الظھر : ۸۰۰ – صحیح

(۴) فتح الملھم : ۲/۷۷

ہوئے ہوں، حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ اپنے بائیں پاؤں کو بچھا دیتے تھے اور دائیں پاؤں کو کھڑا رکھتے تھے۔(۱)

حضرت ابن عمرؓ فرماتے ہیں: نماز کی سنت یہ ہے کہ دایاں پاؤں کھڑا ہو اور اس کی انگلیاں قبلہ رخ ہوں اور نشست بائیں پاؤں پر ہو۔(۲) حضرت عبداللہ بن زبیرؓ سے مروی ہے: رسول اللہ ﷺ (قعدہ میں) دونوں ہاتھ رانوں پر رکھتے تھے۔(۳) حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ جب نماز میں بیٹھتے تو اپنی دائیں ہتھیلی کو داہنی ران پر رکھتے اور تمام انگلیوں کو موڑے ہوئے رکھتے، انگشت شہادت سے اشارہ کرتے اور اپنی بائیں ہتھیلی کو بائیں ران پر رکھتے۔(۴) حضرت معاذؓ فرماتے ہیں: دونوں ہاتھوں کو دونوں رانوں پر رکھنا فعلِ نبوی ﷺ ہے۔(۵)

فائدہ: امام محمدؒ سے ایک روایت ہے کہ رانوں پر ہاتھ اس انداز سے رکھے جائیں کہ انگلیوں کے سرے گھٹنوں کے نزدیک ہوں، امام طحاویؒ کا خیال یہ ہے کہ رکوع کی طرح قعدہ میں بھی ہاتھ گھٹنوں پر رکھے جائیں، احادیث سے یہ دونوں طریقے ثابت ہیں؛(۶) البتہ پہلا طریقہ افضل ہے کیوں کہ اس کے اختیار کرنے کی صورت میں انگلیاں قبلہ رخ رہیں گی جب کہ گھٹنوں پر ہاتھ رکھنے کی صورت میں انگلیوں کا رخ زمین کی طرف ہوگا۔(۷)

---

(۱) مسلم: باب ما يجمع صفة الصلاة: ۱۱۳۸

(۲) بخاری: باب سنة الجلوس في التشهد: ۸۲۷

(۳) مسلم: باب صفة الجلوس في الصلاة: ۱۳۳۶

(۴) مسلم: باب صفة الجلوس في الصلاة: ۱۳۳۹

(۵) طبرانی: عن معاذؓ

(۶) مسلم: باب صفة الجلوس في الصلاة: ۱۳۳۶-۱۳۳۷ – نسائی تحقيق البانی: بسط اليسری علی الركبة: ۱۲۶۹ – صحيح

(۷) السعايه: ۲/۲۱۵ – مرقاة المفاتيح: باب التشهد: ۹۰۸

(ب) تشہد ابن مسعودؓ پڑھنا(۱):

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اس اہتمام سے مجھے تشہد سکھایا جیسے قرآنی سورۃ کی آپ ﷺ نے تعلیم فرمائی تھی، میرا ہاتھ آپ کے مبارک ہاتھوں میں تھا، آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا جب تم میں سے کوئی قعدہ میں بیٹھے تو یوں کہے:

" اَلتَّحِيَّاتُ لِلّٰهِ وَالصَّلَوٰاتُ وَالطَّيِّبَاتُ السَّلَامُ عَلَيْكَ اَيُّهَا النَّبِيُّ وَرَحْمَةُ اللّٰهِ وَبَرَكَاتُهُ السَّلَامُ عَلَيْنَا وَعَلٰى عِبَادِ اللّٰهِ الصَّالِحِيْنَ اَشْهَدُ اَنْ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ" (۲)

امام ترمذیؒ فرماتے ہیں کہ عبداللہ بن مسعودؓ سے یہ حدیث متعدد سندوں سے مروی ہے اور تشہد کے سلسلہ میں یہ سب سے صحیح ترین حدیث ہے، اکثر اہل علم حضرات صحابہ کرامؓ و تابعین عظامؒ نے اسی تشہد کو اختیار کیا ہے۔(۳)

قعدہ اولیٰ میں صرف تشہد پر اکتفاء کرنا چاہئے حضرت عبداللہ بن مسعودؓ فرماتے ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب درمیان نماز میں ہوتے تو تشہد سے فارغ ہوتے ہی کھڑے ہو جاتے (۴) ایک اور روایت میں ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب دو رکعتوں میں ہوتے تو ایسا معلوم ہوتا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم توے پر ہیں حتی کہ (فوراً) کھڑے ہو جاتے۔(۵)

---

(۱) ابوالحسنات علامہ عبدالحی لکھنویؒ کی تصریح کے مطابق تقریباً دس صحابہ سے تشہد کے کلمات معمولی معمولی فرق کے ساتھ منقول ہیں تاہم ان تمام میں حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے منقول تشہد کئی ایک وجوہ سے فوقیت اور افضلیت کا درجہ رکھتا ہے، علامہ لکھنویؒ نے فقہاء احناف کے حوالوں سے پندرہ معنوی وفنی وجوہ ترجیح بیان کی ہیں۔(السعایہ:۲/۲۲۶)

(۲) بخاري:باب التشهد في الأخرة : ۸۳۱

(۳) ترمذي: باب التشهد : ۲۸۹

(۴) صحيح ابن خزيمة : باب اخفاء الشتهد : ۷۰۸ – صحيح : مجمع الزوائد : باب التشهد والجلوس : ۲۸۶۰

(۵) مستدرک مع تعليقات الذهبي : باب التأمين : ۹۹۳ – صحيح

(ج) تشہد میں انگلی سے اشارہ کرنا:

حضرت وائل بن حجرؓ کہتے ہیں میں نے رسول اللہ ﷺ کو دیکھا کہ تشہد میں انگوٹھے اور درمیانی انگلی کا حلقہ بنائے ہوئے ہیں اور انگشت شہادت سے اشارہ فرمارہے ہیں،(۱) ایک اور روایت میں ہے رسول اللہ ﷺ نے (تشہد میں) دو انگلیوں کو موڑے رکھا اور حلقہ بنایا، بشر راوی کہتے ہیں انگوٹھے اور درمیانی انگلی کا حلقہ بنایا اور انگشت شہادت کے ذریعہ اشارہ فرمایا(۲) ایک اور روایت میں مزید وضاحت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے خنصر اور بنصر کو موڑے رکھا، پھر درمیانی انگلی اور انگوٹھے کے ذریعہ حلقہ بنایا اور انگشت شہادت کے ذریعہ اشارہ فرمایا۔(۳)

انگلی سے ارشارہ کرنے کی حکمت بیان کرتے ہوئے رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا یہ اشارہ شیطان پر لوہے سے زیادہ بھاری ہے،(۴) یعنی میدان جہاد میں دشمنانِ اسلام کے خلاف آہنی ہتھیار اٹھانے سے زیادہ ناگوار شیطان کے نزدیک تشہد میں انگلی کے ذریعہ اشارہ کرنا ہوتا ہے؛ اس لئے کہ اس اشارہ توحید کے ذریعہ نمازی، شیطان کی، بندگان خدا کو شرک میں مبتلا کرنے کی ساری امیدوں پر پانی پھیر دیتا ہے۔(۵)

فائدہ: یہاں چند امور قابل تحقیق ہیں:

۱) اشارہ کا وقت کیا ہے؟

۲) اشارہ کا طریقہ کیا ہے؟

---

(۱) سنن ابن ماجة تحقيق الالباني : باب الإشارة في الشتهد : ۹۱۲ – صحيح

(۲) أبوداؤد تحقيق الالباني : باب كيف الجلوس في التشهد ؟ ۹۵۸ – صحيح

(۳) السنن الكبرى للبيهقي : باب ما روي في تحليق الوسطى بالابهام : ۲۸۹۵ – صحيح : خلاصة الأحكام : باب كيفية وضع اليدين على الفخذين : ۱۳۸۴

(۴) مسند احمد :مسند عبد الله بن عمرؓ : ۶۰۰۰ – سند کے ایک راوی مختلف فیه هیں – مجمع الزوائد : باب التشهد : ۲۸۵۰

(۵) السعاية : ۲/۲۱۷

۳) اشارہ ایک بار کرنا ہے یا مسلسل کرتے رہنا ہے؟

۴) اشارہ کے وقت باقی انگلیوں کی کیفیت کیا ہو؟

۵) انگلیاں شروع تشہد سے موڑ کر رکھی جائیں یا اشارہ کے موقع پر موڑی جائیں؟

۶) اشارہ کے بعد انگلیوں کو کھول دیا جائے یا سابقہ کیفیت پر سلام تک برقرار رکھا جائے؟

ان امور کی تفصیل ترتیب وار ملاحظہ ہو:

(۱) حضرت عبداللہ بن زبیرؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ جب دعا کرتے تو انگلی کے ذریعہ اشارہ کرتے۔(۱)

بظاہر یہاں دعا سے مراد دعائے توحید لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ ہے،(۲) اور ان الفاظ پر دعا کا اطلاق خود احادیث سے ثابت ہے چنانچہ متعدد احادیث میں درج ذیل کلمات " لَا اِلٰـهَ اِلَّا اللّٰهُ الْعَظِيْمُ الْحَلِيْمُ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ رَبُّ الْعَرْشِ الْعَظِيْمِ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ رَبُّ السَّمٰوَاتِ وَرَبُّ الْاَرْضِ وَرَبُّ الْعَرْشِ الْكَرِيْمِ " کو دعائے کرب (کرب و مصیبت کو دور کرنے والی دعا) سے تعبیر کیا گیا ہے،(۳) اس کی تائید اس سے بھی ہوتی ہے کہ حضرت ابن عباسؓ نے اشارۂ تشہد کی حقیقت اخلاص سے (۴) اور حضرت خفاف بن ایماء نے توحید کے ذریعہ بیان فرمائی ہے(۵) اور اخلاص و توحید لَا اِلٰـهَ اِلَّا اللّٰهُ میں ہے،

---

(۱) نسائی تحقیق البانی : باب بسط اليسرى على الركبة : ۱۲۷۰ – صحیح

(۲) مرقاة المفاتيح : باب التشهد : ۹۱۲

(۳) مسلم : باب دعاء الكرب : ۷۰۹۶

(۴) السنن الكبرى للبيهقي : باب ما ينوي المشير بإشارته : ۲۹۰۶ – مصنف ابن أبي شيبة : باب في الدعاء في الصلاة بأصبع : ۵ ۸۵۱ – سكت عليه المحقق محمد عوامه

(۵) السنن الكبرى للبيهقي : باب ما ينوي المشير بإشارته : ۲۹۰۴ – طبرانی کبیر : ۴۱۷۶ – رجاله ثقات : مجمع الزوائد : ۲۸۴۳

پس اشارہ کا موقع بھی لا الہ الا اللہ پر پہنچنے کے وقت ہوگا۔

(۲) اشارہ کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ انگشت شہادت کو قدرے موڑ کر قبلہ رخ کیا جائے اور نگاہ اشارہ پر مرتکز کی جائے۔(۱)

حضرت مالک بن نمیر خزاعیؒ اپنے والد سے روایت کرتے ہیں کہ میں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو تشہد کی حالت میں دیکھا کہ انگشت شہادت کو کسی قدر موڑ کر اٹھائے ہوئے ہیں۔(۲)

حضرت عبداللہ بن زبیرؓ سے مروی ہے کہ اشارہ کے موقع پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی نگاہ اشارہ سے آگے نہ بڑھتی تھی۔(۳)

حضرت ابن عمرؓ فرماتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اشارہ کے موقع پر انگشتِ شہادت کو قبلہ کی جانب کرتے اور نگاہ اس پر مرتکز کردیتے۔(۴)

(۳) لا الہ الا اللہ پر چوں کہ دعائے توحید کا اختتام ہوجاتا ہے؛ اس لئے اس کے ساتھ ہی اشارہ بھی ختم ہوجائے گا، بار بار اشارہ کرتے رہنا مناسب نہیں، حضرت عبداللہ بن زبیرؓ سے مروی ہے رسول اللہ ﷺ جب دعاء کرتے تو اپنی انگلی کے ذریعہ اشارہ کرتے اور اس کو حرکت دیتے نہ رہتے۔(۵)

---

(۱) عون المعبود : باب الإشارة في التشهد : ۹۹۱

(۲) أبو داؤد : باب الإشارة في التشهد : ۹۹۳ – خبر صحيح : مرقاة المفاتيح : ۴۷۹/۲ – باب صفة الصلاة

(۳) أبو داؤد تحقيق الالباني : باب الإشارة في التشهد : ۹۹۲ – حسن صحيح

(۴) نسائي تحقيق الالباني : باب موضع البصر في التشهد : ۱۱۶۰ – حسن صحيح – السنن الكبرى للبيهقي : باب الإشارة بالمسبحة إلى القبلة : ۲۹۰۱

(۵) أبو داؤد : باب الإشارة في التشهد : ۹۹۱ – حسن : تعليقات شعيب الأرنؤوط على مسند أحمد : ۱۸۸۷۰

واضح ہو کہ وائل بن حجرؓ کی روایت میں اس کے برخلاف یہ ذکر ہے کہ آپ ﷺ نے انگلی اٹھائی پھر میں نے آپ ﷺ کو دیکھا کہ اس کو حرکت دے رہے ہیں، امام بیہقیؒ اس پر تبصرہ کرتے ہوئے کہتے ہیں، حرکت دینے سے مراد اس کے ذریعہ اشارہ کرنا ہے نہ کہ بار بار اس کو حرکت دینا اس لحاظ سے یہ روایت عبداللہ بن زبیرؓ کی روایت کے مطابق وموافق ہے۔(۱)

علامہ ابن ہمامؒ: شمس الائمہ حلوانیؒ کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ لا الہ (نہیں ہے کوئی معبود) کہتے ہوئے انگلی اٹھائے اور الا اللہ (سوائے اللہ کے) پر گرادے تاکہ انگلی اٹھانے سے غیر اللہ کی نفی کا اشارہ ہو اور انگلی رکھنے سے توحید کے اثبات کا۔(۲)

(۴) اشارہ کے وقت باقی انگلیاں کس کیفیت پر ہوں، اس کی تفصیل اس طرح ہے:
(الف) خنصر (چھوٹی انگلی) بنصر (چھوٹی انگلی سے لگی ہوئی انگلی) بند ہوں، درمیانی انگلی اور انگوٹھے کا حلقہ بنا ہو اور انگشت شہادت کے ذریعہ اشارہ ہو۔(۳)
(ب) خنصر، بنصر، وسطی (درمیانی انگلی) بند ہو، انگشت شہادت کھلی ہوئی ہو اور انگوٹھا اس کی جڑ میں لگا ہوا ہو، احادیث میں اس کیفیت کو ترپن، عدد کی علامت کے ذریعہ تعبیر کیا گیا ہے۔(۴)
(ج) خنصر، بنصر، وسطی بند ہوں، انگشت شہادت کھلی ہوئی ہو اور انگوٹھا، درمیانی انگلی سے لگا ہوا ہو، احادیث میں اس کو تیئیس (۲۳) عدد کی علامت کے ذریعہ تعبیر

---

(۱) السنن الكبرى للبيهقي : باب من روي أنه أشار بها ولم يحركها : ۲۸۹۹
(۲) فتح القدير : ۱/۳۱۳ – ناشر دار الفكر
(۳) السنن الكبرى للبيهقي : باب ما روي في تحليق الوسطى بالابهام : ۲۸۹۵ – صحيح – خلاصة الأحكام : ۱۳۸۴
(۴) مسلم : باب صفة الجلوس في الصلاة : ۱۳۳۸ – مرقاة المفاتيح : باب التشهد : ۹۰۶

کیا گیا ہے(۱) احناف کے یہاں پہلا طریقہ رائج ہے۔(۲)

(۵) انگلیاں شروع تشہد ہی سے موڑ کر نہ رکھی جائیں بلکہ اشارہ کے موقع پر موڑی جائیں حضرت ابن عمرؓ سے مروی ہے رسول اللہ ﷺ جب بیٹھتے تو اپنی دائیں ہتھیلی دائیں ران پر رکھ دیتے اور اپنی انگلیاں بند کر لیتے اور انگوٹھے سے متصل انگلی کے ذریعہ اشارہ فرماتے اور بائیں ہتھیلی بائیں ران پر رکھتے۔(۳)

علامہ ابن ہمامؒ فرماتے ہیں: انگلیوں کے بند کرنے کے ساتھ ساتھ ہتھیلی کا رکھنا متصور نہیں ہو سکتا اس بنا پر حدیث کا مفہوم یہ ہے کہ اولاً ہتھیلی کو آپ ﷺ کھلی رکھتے پھر اس کے بعد اشارہ کرنے کے لئے انگلیاں بند کر لیتے۔(۴)

طحاوی کی روایت میں اس مفہوم کی تقریباً صراحت ہے: وائل بن حجرؓ کہتے ہیں اور آپ ﷺ نے اپنی داہنی ہتھیلیکو داہنی ران پر رکھا پھر اپنی انگلیاں موڑی اور انگوٹھے اور درمیانی انگلی کا حلقہ بنایا پھر دوسری انگلی (انگشت شہادت) کے ذریعہ دعا کرنے لگے۔(۵)

(۶) اشارہ کرنے کے بعد انگلیوں کو کھولا نہ جائے بلکہ بدستور حلقہ برقرار رکھا جائے، اس تعلق سے اگر چہ کوئی تصریح موجود نہیں تاہم چوں کہ اشارہ کے وقت حلقہ بنانے کا صراحۃً تذکرہ کتب احادیث میں موجود ہے اور اشارہ کی بعد کی کیفیت کے بارے میں احادیث خاموش ہیں؛ اس لئے یہاں سابقہ حالت یعنی حلقہ بنائے رکھنے ہی کی حالت کو اختیار کرنا بہتر و مناسب ہے۔

---

(۱) مسلم : باب صفة الجلوس في الصلاة : ۱۳۳۶ – مرقاة المفاتيح : باب التشهد : ۹۰۶

(۲) مرقاة المفاتيح : باب التشهد : ۹۰۶

(۳) مسلم : باب صفة الجلوس في الصلاة : ۱۳۳۹

(۴) فتح القدير : ناشر دار الفكر : ۳۱۳/۱

(۵) طحاوی : باب صفة الجلوس كيف هو ؟ ۱۵۴۲ – احتج به الطحاویؒ

اس موقف کی تائید ترمذی کی اس روایت سے بھی ہوتی ہے کہ عاصم بن کلیبؒ اپنے والد سے اور وہ اپنے دادا سے روایت کرتے ہیں کہ میں نبی ﷺ کے پاس داخل ہوا آپ ﷺ نماز پڑھ رہے تھے اور اپنا بایاں ہاتھ بائیں ران پر اور دایاں ہاتھ دائیں ران پر رکھے ہوئے تھے اور آپ ﷺ اپنی انگلیاں موڑے ہوئے تھے البتہ انگشت شہادت پھیلی ہوئی تھی اور آپ ﷺ فرمارہے تھے: يَامُقَلِّبَ الْقُلُوْبِ ثَبِّتْ قَلْبِیْ عَلٰی دِيْنِکَ ۔(۱)

یہاں تشہد کے بعد دعا کے موقع پر انگلیوں کا اس حالت پر رہنا اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ تشہد سے فراغت کے بعد بھی حلقہ کو برقرار رکھنا چاہئے۔(۲)

فرض کی اخیر ایک یا دو رکعتوں کی سنت:

فرض نمازوں میں پہلی دو رکعت کے بعد والی رکعتوں میں سورۃ فاتحہ کے پڑھنے پر اکتفاء کرنا مسنون ہے، حضرت ابوقتادہؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ ظہر وعصر کی اخیر دو رکعتوں میں صرف سورۃ فاتحہ پڑھا کرتے تھے۔(۳) اخیر کی ایک یا دو رکعتوں میں سورۃ فاتحہ کے واجب نہ ہونے کی دلیل یہ ہے کہ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ اور حضرت علیؓ جیسے جلیل القدر صحابہ فرض کی اخیر دو رکعتوں میں قرأت ہی نہیں کیا کرتے تھے، بلکہ ان دونوں حضرات سے یہ بھی منقول ہے کہ انہوں نے فرمایا: پہلی دو رکعتوں میں قرأت کرو اور اخیر والی دو رکعتوں میں تسبیح پڑھ لو۔(۴)

---

(۱) ترمذی : باب نمر : ۱۲۵ ، حدیث نمبر : ۳۵۸۷ ، غریب من هذا الوجه: امام ترمذی

(۲) السعایه : ۲/۲۲۱

(۳) بخاری : باب یقرأ في الأخريين بفاتحة الكتاب : ۷۷۶

(۴) مصنف ابن ابی شیبه : من كان يقول يسبح في الأخريين ولا يقرأ : ۳۷۶۳ – ۳۷۶۴ – مصنف عبد الرزاق : باب كيف القراءة في الصلاة : ۲۶۵۶ – صحيح : إعلاء السنن : ۱۳۴/۳

قعدہ اخیرہ میں قعدہ اولیٰ کی کیفیت ہی پر بیٹھنا:

حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ (قعدہ میں) اپنے بائیں پاؤں کو بچھا دیتے تھے اور دائیں پاؤں کو کھڑا رکھتے تھے۔(۱)☆

قعدۂ اخیرہ میں درود شریف پڑھنا:

تشہد سے فراغت کے بعد درود شریف کا پڑھنا قعدہ اخیرہ میں مسنون ہے، صحابہ کرام کے دریافت کرنے پر رسول اللہ ﷺ نے ان الفاظ کے ساتھ درود کی تعلیم دی تھی:

" اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَعَلٰی اٰلِ مُحَمَّدٍ کَمَا صَلَّیْتَ عَلٰی اِبْرَاھِیْمَ وَعَلٰی اٰلِ اِبْرَاھِیْمَ اِنَّکَ حَمِیْدٌ مَجِیْدٌ اَللّٰھُمَّ بَارِکْ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَ عَلٰی اٰلِ مُحَمَّدٍ کَمَا بَارَکْتَ عَلٰی اِبْرَاھِیْمَ وَعَلٰی اٰلِ اِبْرَاھِیْمَ اِنَّکَ حَمِیْدٌ مَجِیْدٌ " (۲)

دعائے ماثورہ پڑھنا

حضرت ابوبکر صدیقؓ نے رسول اللہ ﷺ سے عرض کیا یا رسول اللہ مجھے کوئی ایسی دعا

---

(۱) مسلم:باب ما یجمع صفة الصلاة : ۱۱۳۸

☆ یہاں اختلاف ائمہ جاننے سے قبل ان دو الفاظ کی حقیقت سمجھ لی جائے (۱) افتراش: بائیں پاؤں کو بچھا کر اس پر سرین رکھنا اور دائیں پاؤں کو انگلیوں اور پنجوں کے سہارے کھڑا رکھنا (۲) تورّک: دائیں پاؤں کو تو مذکورہ کیفیت ہی پر رکھنا البتہ بائیں پاؤں کو سیدھی جانب نکال کر بایاں سرین زمین سے لگا دینا (السعایہ: ۲/۲۳۴)

امام مالکؒ کے نزدیک قعدۂ اولی و قعدۂ اخیرہ دونوں میں تورک مسنون ہے امام شافعیؒ کے نزدیک صرف قعدہ اخیرہ میں تورک مسنون ہے اور قعدۂ اولی میں افتراش مسنون ہے،

امام احمدؒ کے نزدیک دو رکعت والی نماز کے قعدہ میں اسی طرح تین یا چار رکعت والی نماز کے قعدۂ اولی میں بھی افتراش ہی مسنون ہے، البتہ تین چار رکعت والی نماز کے صرف قعدۂ اخیر میں تورک مسنون ہے (الفقه الاسلامی:۲/۹۰۱)

(۲) بخاری : أحادیث الأنبیاء : ۳۳۷۰

سکھلا دیجئے جس کے ذریعہ میں اپنی نماز میں دعا کروں رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا، کہو:

" اَللّٰھُمَّ اِنِّی ظَلَمْتُ نَفْسِی ظُلْمًا کَثِیْرًا وَلَا یَغْفِرُ الذُّنُوْبَ اِلَّا اَنْتَ فَاغْفِرْلِی مَغْفِرۃً مِّنْ عِنْدِکَ وَارْحَمْنِی اِنَّکَ اَنْتَ الْغَفُوْرُ الرَّحِیْمُ " (۱)

تشہد کی طرح درود دعا کے بھی مختلف صیغے احادیث میں وارد ہوئے ہیں؛ لیکن حنفیہ کے نزدیک مذکورہ بالا درود دعا کو اختیار کیا گیا ہے، حضرت عبداللہ بن مسعودؓ فرماتے ہیں نماز میں آدمی تشہد پڑھے پھر نبی ﷺ پر درود پڑھے پھر اس کے بعد اپنے لئے دعا کرے۔(۲)

نماز کے بعد دعا کرنا:

نماز کے بعد دعا کرنا قول نبی اور فعل نبی ﷺ دونوں سے ثابت ہے، حضرت ابوامامہؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ سے پوچھا گیا کونسی دعا جلد سن لی جاتی ہے؟ فرمایا: رات کے اخیر حصہ کی اور فرض نمازوں کے بعد کی۔(۳)

حضرت معاذؓ سے مروی ہے کہ ان سے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اے معاذؓ مجھے تم سے محبت ہے تو تم ہر نماز کے بعد اس دعا کو پڑھنا نہ چھوڑو کہ: اَللّٰھُمَّ اَعِنِّی عَلٰی ذِکْرِکَ وَشُکْرِکَ وَحُسْنِ عِبَادَتِکَ ۔(۴) حضرت علی فرماتے ہیں: نبی صلی اللہ علیہ وسلم جب سلام پھیرتے تو یہ دعاء فرماتے:

" اَللّٰھُمَّ اغْفِرْلِي مَا قَدَّمْتُ وَمَا أَخَّرْتُ وَمَا أَسْرَرْتُ وَمَا أَعْلَنْتُ وَمَا أَسْرَفْتُ وَمَا أَنْتَ أَعْلَمُ بِهِ مِنِّي أَنْتَ الْمُقَدِّمُ وَأَنْتَ الْمُؤَخِّرُ لاَ إِلٰهَ إِلاَّ أَنْتَ " (۵)

---

(۱) بخاری :باب الدعاء قبل السلام : ۸۳۴

(۲) المستدرک مع تعلیقات الذھبي : باب التأمین : ۹۹۰ – صحیح

(۳) ترمذی تحقیق الالبانی : باب : ۷۹ ، حدیث نمبر : ۳۴۹۹ – حسن

(۴) أبوداؤد تحقیق الالبانی : باب الاستغفار : ۱۵۲۴ – صحیح

(۵) أبوداؤد تحقیق الالبانی : باب ما یقول الرجل إذا سلم : ۱۵۱۱ – صحیح

حضرت ثوبانؓ فرماتے ہیں: جب آپ ﷺ سلام پھیرتے تو تین دفعہ استغفار پڑھتے اور کہتے :" اَللّٰھُمَ اَنْتَ السَّلاَمُ وَمِنْکَ السَّلاَمُ تَبارَکْتَ یَا ذَاالْجَلاَلِ وَالاِکْرَامِ " (۱)

دعا کے آداب:

کندھوں کے بالمقابل یا اس کے قریب تک ہاتھ اٹھانا، دونوں ہتھیلیوں کو باہم ملائے رکھنا، حمد وصلاۃ پڑھنا، دعا آہستہ کرنا اخیر میں آمین کہنا، ختم دعا پر ہاتھوں کو چہرے پر پھیر لینا، حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ دعا میں اپنے ہاتھوں کو اٹھاتے تھے یہاں تک کہ آپ ﷺ کے بغلوں کی سفیدی نظر آنے لگتی تھی۔(۲) حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم دعاء میں اپنے دونوں ہاتھوں کو اٹھاتے تھے، بہت دیر تک ہاتھ اٹھائے دعاء فرماتے رہتے یہاں تک کہ مجھے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ان اٹھے ہوئے ہاتھوں کو دیکھ کر ترس اور اکتاہٹ کا احساس ہونے لگتا۔(۳) حضرت عبداللہ بن عباسؓ کہتے ہیں کہ دعا مانگنے کا طریقہ یہ ہے کہ تم اپنے دونوں ہاتھوں کو کندھوں کے بالمقابل یا اس کے آس پاس تک اٹھاؤ۔(۴)

حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے مروی ہے کہ نبی ﷺ جب دعا کرتے تو اپنی ہتھیلیوں کو ملا لیتے اور انہیں چہرہ سے قریب رکھتے۔(۵) فضالہ بن عبید سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ

---

(۱) مسلم : باب استحباب الذکر بعدالصلاة : ۱۳۶۲ – ۱۳۶۳

(۲) صحيح مسلم : باب رفع اليدين بالدعاء في الاستسقاء : ۲۱۱۱ – شرح نووي على المسلم : كتاب الاستسقاء : ۱۹۰/۶

(۳) مسند أحمد : ۲۵۸۸۳ – صحيح : مجمع الزوائد : باب ما جاء في الإشارة في الدعاء ورفع اليدين : ۱۷۳۳۵

(۴) أبوداؤ د تحقيق الالباني : باب الدعاء : ۱۴۹۱ – صحيح

(۵) طبراني كبير : ۴۳۵/۱۱ ، ضعف إسناده العراقي ولكن له شواهد تقويه – الموسوعة الفقهية : آداب الدعاء : ۲۶۲/۲۰

نے ارشاد فرمایا جب تم میں سے کوئی نماز پڑھے تو (دعا کرنے سے پہلے) اس کو چاہئے کہ اللہ کی حمد وثنا کرے پھر اس کے رسول پر درود بھیجے اس کے بعد جو چاہے اللہ سے مانگے۔(۱)

حضرت ابوزہیر نمیریؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا اگر آدمی ختم دعا پر آمین کہے تو بس اس نے اللہ سے (اپنی درخواست) منظور کروالی۔(۲)

آہستہ و پست آواز میں دعا کرنا باآواز بلند دعا کرنے سے افضل و بہتر ہے، ارشاد خداوندی ہے تم اپنے پروردگار کو پکارو عاجزی کے ساتھ اور خفیہ طور پر۔(۳)

سائب بن یزیدؓ اپنے والد سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کا دستور تھا کہ جب آپ ﷺ ہاتھ اٹھا کے دعا مانگتے تو اخیر میں اپنے ہاتھ چہرہ مبارک پر پھیر لیتے تھے (۴)

حضرت ابوسعیدؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ سلام پھیرنے کے بعد:

" سُبْحَانَ رَبِّکَ رَبِّ الْعِزَّةِ عَمَّا يَصِفُوْنَ وَسَلَامٌ عَلَى الْمُرْسَلِيْنَ وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ " کہتے (۵)

اجتماعی طور پر دعا کرنا:

حضرت حبیب بن مسلم فہریؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا جب کوئی جماعت اکٹھے ہوتی ہے پھر ان میں سے کوئی دعا کرتا ہے اور باقی تمام لوگ آمین کہتے ہیں

---

(۱) ترمذی : کتاب الدعوات : باب نمبر : ۶۵ ، حدیث نمبر : ۳۴۷۶ – ۳۴۷۷ – حسن صحیح امام ترمذی

(۲) ابوداؤد: باب التأمين وراء الإمام : ۹۳۹ – سكت عليه أبو داؤد : حسن : مرقاة المفاتيح : باب القراءة في الصلاة : ۸۵۲

(۳) اعراف : ۵۵

(۴) ابوداؤد: باب الدعاء : ۱۴۹۴ – ترمذی : باب رفع الأيدي عند الدعاء : ۳۳۸۶ – حسن : بلوغ المرام : باب الذكر والدعاء : ۱۵۵۳

(۵) مسند ابو یعلی :۱۱۱۸، رجاله ثقات : مجمع الزوائد : باب ما يقول من الذكر : ۲۸۹۱

تو اللہ ان کی دعا کو ضرور قبول فرما لیتے ہیں۔(۱)

حضرت سلمان فارسیؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا جب لوگ اللہ تعالی کے سامنے دست سوال دراز کرتے ہیں تو اللہ تبارک وتعالی ان کی مراد برآری کا ذمہ لے لیتے ہیں۔(۲)

ان روایات سے نماز کے بعد اجتماعی دعا کا ثبوت ملتا ہے تاہم اس کو دائمی سنت خیال کرنا، اس کا غیر معمولی التزام رکھنا اور اس کے تارک پر نکیر کرنا، بدعت اور زیادتی ہے، علامہ لکھنویؒ فرماتے ہیں بہت سے مباح ومستحب امور غیر معمولی التزام وتخصیص کی وجہ سے مکروہ بن جاتے ہیں۔(۳)

فرض نمازوں کے بعد وظائف: فرض نمازوں کے بعد رسول اللہ ﷺ سے مختلف وظائف واذکار منقول ہیں مثلاً آیت الکرسی پڑھنا، سورۃ اخلاص پڑھنا(۴) معوذتین کا پڑھنا (۵) تاہم مشہورتر ذکر وہ ہے جو عوام الناس میں تسبیح فاطمی کے نام سے معروف ومشہور ہے، اور یہ ذکر بھی مختلف طریقوں سے ثابت ہے۔

۱) بعض روایات کے مطابق: تسبیح۔ تحمید۔ تکبیر ہر ایک کو ۳۳۔۳۳ دفعہ پڑھنا۔(۶)

---

(۱) المعجم الکبیر للطبرانی : ۳۴۵۶ – رجالہ رجال الصحیح غیر ابن لھیعة وھو حسن الحدیث : مجمع الزوائد : باب التأمین علی الدعاء : ۱۷۳۴۷

(۲) المعجم الکبیر للطبرانی : ۶۰۱۹ – مجمع الزوائد : باب ما جاء في الإشارة في الدعاء : ۱۷۳۴۱

(۳) السعایہ: ۲/۴۷

(۴) طبرانی کبیر : ۷۴۰۸ : جید : مجمع الزوائد :باب ماجاء في الأذکار عقب الصلاة : ۱۶۹۲۲ – ۱۶۹۲۳

(۵) نسائی تحقیق الالبانی : باب الأمر بقراءة المعوذات بعد التسلیم : ۱۳۳۶ – صحیح

(۶) مسلم :باب استحباب الذکر بعد الصلاة وبیان صفة : ۱۳۷۵ –

۲) بعض روایات کے مطابق: تسبیح۔تحمید۔تکبیر۔ ہر ایک کو ۳۳۔۳۳۔۳۳۔دفعہ پڑھنااور لَااِلٰـهَ اِلَّا اللّٰـهُ وَحْـدَهٗ لَاشَرِيْکَ لَهٗ لَهُ الْمُلْکُ وَلَهُ الْحَمْدُ وَهُوَعَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِيْرٌ ایک بار پڑھ کر سو کا عدد مکمل کرنا۔(۱)

۳) بعض روایات کے مطابق: تسبیح۔تحمید کو تو ۳۳۔۳۳/دفعہ پڑھنا البتہ تکبیر ۳۴ بار پڑھنا۔(۲)

۴) بعض روایات کے مطابق: تسبیح۔تحمید۔تکبیر۔ ہر ایک کو گیارہ گیارہ دفعہ کہنا۔(۳)

۵) بعض روایات کے مطابق: تسبیح۔تحمید۔تکبیر۔تہلیل (لا الہ الا اللہ) ان میں ہر ایک کو پچیس (۲۵) پچیس (۲۵) دفعہ پڑھنا۔(۴)

۶) بعض روایات کے مطابق: تسبیح۔تحمید۔تکبیر۔ ہر ایک کو دس دس بار پڑھنا۔(۵)

البتہ مسلم شریف کی مختلف روایات کے تعلق سے شارح مسلم علامہ نوویؒ فرماتے ہیں: مناسب یہ ہے کہ تسبیح وتحمید تینتیس (۳۳) تینتیس (۳۳) بار، تکبیر چونتیس (۳۴) بار اور ایک بار لَااِلٰـهَ اِلَّا اللّٰـهُ وَحْدَهٗ لَاشَرِيْکَ لَهٗ لَهُ الْمُلْکُ وَلَهُ الْحَمْدُ وَهُوَعَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِيْرٌ پڑھ لیا جائے، اس طرح تمام روایات پر عمل ہو جائے گا۔(۶)

دیگر محققین کا کہنا یہ ہے کہ ان طریقوں میں سے کبھی کسی کو اور کبھی کسی کو اختیار کرلیا

---

(۱) مسلم شريف : باب استحباب الذكر بعد الصلوة :۱۳۸۰

(۲) مسلم شريف : باب استحباب الذكر بعد الصلوة :۱۳۷۷

(۳) مسلم :باب استحباب الذكر بعد الصلاة : ۱۳۷۵ – ۱۳۷۶

(۴) نسائی تحقيق الالبانی : نوع آخر من عدد التسبيح :۱۳۵۰ – ۱۳۵۱ – حسن صحيح

(۵) نسائی تحقيق الالبانی : باب عدد التسبيح بعد التسليم:۱۳۴۸ –صحيح

(۶) نووی علی مسلم : باب استحباب الذكر بعد الصلاة : ۳۷۲/۲

جائے، اس طرح متعدد اوقات میں ان تمام روایات پر عمل کی سعادت میسر ہو جائے گی۔(۱)

فائدہ: ان اذکار و وظائف کو فرض کے متصلاً بعد پڑھا جائے یا سنن ونوافل سے فراغت کے بعد؟ اس سلسلہ میں محققین احناف سے دونوں طرح کی رائے منقول ہے، علامہ ابن ھمامؒ، ابوالحسنات علامہ عبدالحی لکھنویؒ کی رائے یہ ہے کہ سنن ونوافل سے فراغت کے بعد ان اذکار و وظائف میں مشغول ہوا جائے۔(۲)

شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ اور علامہ شبیر احمد عثمانیؒ کی رائے یہ ہے کہ فرض کے متصلاً بعد ان اذکار و وظائف کو پڑھ لیا جائے اور ان سے فراغت کے بعد سنن وغیرہ میں مشغول ہوا جائے (۳) آدمی اپنے ذوق و مزاج کے اعتبار سے ان میں کسی ایک رائے پر عمل کر سکتا ہے کوئی مضائقہ نہیں ہے۔

---

(۱) فتح الملھم : ۲/ ۱۷۸

(۲) السعایہ : ۲/ ۲۶۳

(۳) فتح الملھم: ۲/۱۷۷–۱۷۸

عورتوں اور مردوں کی نماز میں فرق

خلقی و پیدائشی اعتبار سے مرد و عورت کے درمیان فرق ایک ناقابل انکار حقیقت ہے، مرد کے مقابلے میں عورت فطرۃ کمزور، منفعل مزاج ساتھ ہی پر کشش واقع ہوئی ہے۔

اس فرق کا تقاضہ یہ ہے کہ ایک طرف تو عورت کو مشقت بھرے اور محنت طلب کاموں سے مستثنیٰ رکھا جائے اور دوسری طرف اس کے لائق اعمال میں اسے پردہ وحجاب کا پابند بنایا جائے، شریعت محمدیہ کا کمال یہ ہے کہ اس نے عورت کی ان دونوں خاصیتوں کی رعایت کی ہے، چنانچہ عورت نہ جہاد کی مخاطب ہے، (۱) نہ مستقل کسب و کمائی کی (۲) نہ عبادات میں پر مشقت طریقوں کی۔

تاہم اس کے ساتھ ہی عورت، اپنے اوپر عائد احکام شرعیہ کی انجام دہی میں ستر وحجاب کی بھی مخاطب ہے، احرام حج میں مرد کے لئے سلے ہوئے کپڑے پہننا جنایت اور گناہ ہے، جب کہ عورت کا احرام اس کے معمول کے کپڑے ہیں صرف اتنا خیال رکھنا ہے کہ کپڑا چہرے سے نہ لگے۔ (۳)

---

(۱) بخاری، باب جهاد النساء : ۲۸۷۵ ، مسند أحمد ، تحقيق شعيب الأرنؤوط : ۲۴۴۶۷ ، صحيح

(۲) البقرة: ۲۳۳

(۳) مستدرک مع تعليقات الذهبي : كتاب المناسک : ۱۶۶۸ - صحيح ، السنن الكبرى للبيهقي : باب المرأة لا تتنقب في إحرامها : ۹۳۱۴ - ۹۳۱۵، روي مرفوعا وموقوفا والمحفوظ موقوف إمام بيهقيؒ

حجاب کی اہمیت ہی کے پیش نظر شریعت نے عورتوں کی مساجد و جماعات میں حاضری کی حوصلہ افزائی نہیں کی ہے،(۱) تاہم اس کے باوجود اگر وہ حاضر ہوتی ہیں تو خستہ حالت میں آنے کی تلقین کی گئی ہے(۲) مسجد میں بالکل اخیر صفوں میں ان کی جگہ رکھی گئی ہے۔(۳) امام کو یا مصلی کو اپنے سامنے سے پھلانگ کر گذرنے والے کو متنبہ کرنے کی ضرورت پڑے تو بجائے تسبیح کے تصفیق یعنی آہستہ طور پر تالی بجانے کی ہدایت کی گئی ہے۔(۴)

نماز کے بارے میں بھی مرد وعورت کے درمیان فرق موجود ہے اوصاف کے لحاظ سے بھی اور اصل کے لحاظ سے بھی کہ عورت پر جمعہ وعیدین نہیں ہے،(۵) ایام مخصوصہ کی نمازیں ان سے معاف کردی گئیں ہیں۔(۶)

اوصاف وکیفیات کے اعتبار سے فرق یہ ہے کہ عورت ممکنہ حد تک ایسے طریقہ سے نماز کے ارکان وافعال ادا کرے کہ جس میں زیادہ سے زیادہ پردہ کی رعایت ہوسکتی ہو، امام بیہقی فرماتے ہیں: نماز کے جن احکام میں مرد وعورت کے درمیان فرق ہے وہ اصولی طور پر ستر کے اصول پر مبنی ہے، عورت اس طریقہ پر مامور ہے جس میں اس کے لئے زیادہ ستر ہو۔(۷)

علامہ عبدالحی لکھنویؒ نے فقہاء حنفیہ کے اقوال کی روشنی میں عورت اور مرد کی نماز کے درمیان مندرجہ ذیل فروق شمار کرائے ہیں:

---

(۱) مستدرک مع تعلیقات الذهبی : کتاب الإمامة وصلاة الجماعة :۷۵۷ – صحیح

(۲) مسند احمد تحقیق شعیب الارنؤوط، عن عائشه رضی الله عنها : ۲۴۴۵۱ ، صحیح لغیره – عن ابن عمر : ۵۷۲۵ ، صحیح لغیره ، عن أبي هريرة : ۹۰۴۹ – حسن

(۳) مسلم : باب تسوية الصفوف : ۱۰۱۳

(۴) بخاری : باب التصفيق للنساء : ۱۲۰۳

(۵) ابوداؤد، تحقيق الألباني ، باب الجمعة للمملوک والمرأة : ۱۰۶۹ – صحیح

(۶) مسلم : باب وجوب قضاء الصوم علي الحائض دون الصلاة : ۷۸۹

(۷) السنن الکبری للبیهقي ، قبیل باب ما يستحب للمرأة من ترک التجافی فی الرکوع والسجود ، باب نمبر :۳۰۷

۱) تکبیر تحریمہ میں عورت صرف کندھوں تک ہاتھ اٹھائے گی۔

۲) قیام میں سیدھے ہاتھ کو بائیں ہاتھ پر چھاتی کے نیچے رکھے گی۔

۳) رکوع میں معمولی طور پر جھکے گی۔

۴) رکوع میں انگلیاں باہم ملاکر، گھٹنوں پر محض رکھے گی، گھٹنوں پر کسی طرح کا زور نہ ڈالے گی۔

۵) پست ہوکر سجدہ کرے گی۔

۶) سمٹ کر سجدہ کرے گی بایں طور کہ پیٹ کو رانوں سے ملالے گی، ہاتھوں کو پہلوؤں سے لگا کر زمین پر بچھادے گی۔

۷) قعدہ میں تورّک کرے گی، یعنی دونوں قدم سیدھی جانب نکال کر بائیں سرین پر بیٹھے گی۔(۱)

ان فرقوں میں سے اکثر کا ذکر احادیث وا ثار میں موجود ہے، بقیہ کا استنباط فقہاء نے انہی دلائل کی روشنی میں کیا ہے، یہاں ان احادیث وا ثار کو نقل کیا جاتا ہے:

حضرت وائل بن حجر ؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے مجھ سے فرمایا: جب تم نماز پڑھو تو اپنے ہاتھوں کو کانوں کے برابر میں رکھو اور عورت اپنے ہاتھوں کو سینے کے برابر میں رکھے۔(۲)

حضرت ام الدرداء نماز میں ہاتھوں کو کندھوں کے برابر اٹھاتی تھیں۔(۳)

ابن جریج ؒ کہتے ہیں میں نے حضرت عطاءؒ سے دریافت کیا کہ عورت تکبیر تحریمہ کے وقت مردوں کی طرح ہاتھ اٹھائے گی؟ تو انہوں نے فرمایا کہ عورت اپنے ہاتھوں کو مرد کی طرح

---

(۱) السعایہ : ۲/۲۳۴

(۲) طبرانی کبیر : ۱۷۴۹۷، ایک راوی غیر معروف ہیں، باقی رجال ثقہ ہیں – مجمع الزوائد : باب رفع الیدین في الصلاۃ : ۲۵۹۴

(۳) مصنف ابن ابی شیبہ : فی المرأۃ إذا افتتحت الصلاۃ إلي أین ترفع یدیھا : ۲۴۸۵ سکت علیہ المحقق محمد عوامہ . جزء رفع الیدین للبخاری : ۲۲

نہ اٹھائے، اتنا کہہ کر انہوں نے رفع یدین کیا اور ہاتھوں کو نہایت پست اور اپنی جانب سمیٹے رکھا پھر فرمایا کہ (نماز میں) عورت کی خاص ہیئت ہے جو مرد کی نہیں اور اگر وہ اس ہیئت کو اختیار نہ کرے تو کوئی حرج نہیں۔(۱)

عورت کے سینہ پر ہاتھ باندھنے کے بارے میں علامہ عبدالحی لکھنویؒ نے یہ تصریح کی ہے کہ باتفاق علماء عورت کے لئے یہی طریقہ مسنون ہے۔(۲)

عورت کے رکوع کی کیفیت کے بارے میں حضرت عطاءؒ کا یہ فرمان منقول ہے کہ جب وہ رکوع کرے تو اپنے ہاتھ کو اپنے پیٹ کے نزدیک رکھے۔ (یعنی ہاتھوں کو گھٹنوں تک لے جانا ضروری نہیں بلکہ کسی قدر جھک لینا کافی ہے)۔(۳)

عورت کی نماز کی عمومی کیفیت کے بارے میں حضرت عبداللہ بن عباسؓ کا ارشاد ہے کہ عورت خوب سمٹ کر اور اپنے جسم کو ملا کر نماز ادا کرے۔(۴)

سجود وقعود کے طریقہ میں مرد وعورت کے مابین فرق کا موجود ہونا، درج ذیل احادیث سے نہایت وضاحت کے ساتھ ثابت ہوتا ہے؛ زید بن ابی حبیب سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ دو عورتوں کے پاس سے گذرے جو نماز پڑھ رہی تھیں، آپ ﷺ نے فرمایا: جب تم سجدہ کرو تو اپنے جسم کا کچھ حصہ زمین سے ملا لیا کرو کیوں کہ عورت کا حکم (سجدہ کی حالت

---

(۱) مصنف ابن ابی شیبہ : فی المرأة إذا افتتحت الصلاة إلي أين ترفع يديها : ۲۴۸۹ – رجاله رجال البخاری : باب بعث علیؓ وخالدؓ : ۴۳۵۳

(۲) السعایہ : ۱۵۶/۲

(۳) مصنف عبد الرزاق : باب تكبير المرأة بيديها وقيام المرأة وركوعها و سجودها : ۵۰۶۹ ، رجاله رجال البخاری : بخاری : باب قول الله تعالى واتخذوا من مقام إبراهيم مصلى : ۳۹۸ .

(۴) مصنف ابن ابی شیبہ :باب المرأة كيف تكون في سجودها ، ۲۷۹۴ ، سكت عليه المحقق محمد عوامه .

میں)مرد کی طرح نہیں ہے۔(۱)

حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جب عورت نماز میں بیٹھے تو اپنی ایک ران دوسری ران پر رکھے (دونوں قدم سیدھی جانب نکال کر رانوں کو اتنا چپکا لے کہ ایک دوسرے پر رکھی ہوئی معلوم ہوں)اور جب سجدہ کرے تو پیٹ کو رانوں سے چپکا لے تا کہ اس کے لئے زیادہ سے زیادہ پردہ ہو جائے تو اللہ تعالی اس عورت کی طرف نظر رحمت فرماتے ہیں اور ارشاد فرماتے ہیں کہ: اے فرشتو! میں تمہیں اس پر گواہ بناتا ہوں کہ میں نے اسے بخش دیا ہے۔(۲)

حضرت علیؓ سے مروی ہے کہ انہوں نے فرمایا: عورت کو خوب سمٹ کر اور دونوں رانوں کو ملا کر سجدہ کرنا چاہئے۔(۳)

حضرت ابوسعید خدریؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: مردوں کی بہترین صف پہلی صف ہے اور عورتوں کی بہترین صف آخری صرف ہے، آپ ﷺ مردوں کو حکم فرمایا کرتے تھے کہ سجدہ کی حالت میں اپنے اعضاِ جسم الگ الگ کر کے رکھیں اور عورتوں کو پست ہو کر سجدہ کرنے کا حکم فرماتے تھے، مردوں کو حکم فرماتے تھے کہ تشہد میں دایاں پاؤں کھڑا رکھیں اور بایاں پاؤں بچھائیں اور عورتوں کو حکم فرماتے تھے کہ چہار زانو ہو کر بیٹھیں۔(۴)

---

(۱) السنن الکبری للبیھقی :باب ما یستحب للمرأۃ من ترک التجافی في الرکوع والسجود : ۳۳۲۵، معتبر و مقبول : إعلاء السنن : ۲۶/۳

(۲) السنن الکبری للبیھقی :باب ما یستحب للمرأۃ من ترک التجافی في الرکوع والسجود : ۳۳۲۴، ضعیف وله شواهد : إعلاء السنن : ۳۳/۳ .

(۳) مصنف ابن ابی شیبه : باب المرأۃ کیف تکون فی سجودھا : ۲۷۹۳– حسن : إعلاء السنن : ۳۲/۳

(۴) السنن الکبری للبیھقی :باب ما یستحب للمرأۃ من ترک التجافی في الرکوع والسجود : ۳۳۲۴، ضعیف وله شواهد : إعلاء السنن : ۳۳/۳ .

حضرت عبداللہ بن عمرؓ کے بارے میں مروی ہے کہ آپؓ سے دریافت کیا گیا کہ رسول اللہ ﷺ کے عہد میں خواتین کس طرح نماز ادا کرتی تھیں؟ فرمایا: چہار زانو بیٹھ کر پھر انہیں حکم دیا گیا کہ خوب سمٹ کر بیٹھا کریں (یعنی اپنے سرینوں پر ہموار ہو کر بیٹھ جائیں)۔(۱)☆

---

(۱) جامع المسانید : ۱/۴۰۰،

☆ فائدہ: ائمہ ثلاثہ بھی اصولی طور پر مرد وعورت کی نماز کے درمیان فرق کے قائل ہیں، ان حضرات کے نزدیک بھی عورت کے حق میں افعال نماز کی ادائیگی کا وہی طریقہ مسنون ہے جس میں زیادہ سے زیادہ پردہ کی رعایت ہوتی ہے۔(الفقہ الاسلامی:۲/۹۱۵۔۹۳۵)

دیگر ائمہ کی آراء ملاحظہ ہوں:

شافعیہ: امام شافعیؒ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے عورتوں کو چھپ کر رہنے کا ادب سکھلایا ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی عورتوں کو یہی ادب سکھلایا ہے اور میں عورتوں کے لئے حالت سجدہ میں یہ پسند کرتا ہوں کہ وہ اپنے بدن کے ایک حصہ کو دوسرے حصہ سے ملالے اور اپنے پیٹ کو ران سے چپکالے اور اس طرح سجدہ کرے جو اس کے لئے زیادہ چھپانے والا ہو، اسی طرح عورت کے لئے رکوع، جلسہ اور پوری نماز میں یہی پسند کرتا ہوں کہ عورت اس ہیئت پر رہے جو اس کے لئے سب سے زیادہ ساتر ہو اور میں پسند کرتا ہوں کہ رکوع وسجدہ میں اپنی چادر کو کشادہ رکھے؛ تاکہ کپڑوں سے اس کے بدن کے خدوخال نمایاں نہ ہوں۔(کتاب الأم:۱/۱۰۰)

مالکیہ: مرد کے لئے حالت سجدہ میں اپنے پیٹ کو رانوں سے علیحدہ رکھنا مطلوب ہے، اسی طرح کہنیوں، گھٹنوں، بازوؤں اور پہلو کو ایک دوسرے سے جدا رکھنا اور کشادہ سجدہ کرنا مطلوب ومندوب ہے؛ لیکن عورت اپنے تمام احوال میں سمٹی رہے گی۔(الشرح الصغیر:۱/۳۲۸=۳۲۹)

حنابلہ: عورت بھی (نماز کے طریقہ کے معاملہ میں) مرد کی طرح ہے؛ لیکن عورت اپنے آپ کو سمیٹے رہے گی اور اپنے دونوں پیر دائیں جانب نکالے گی۔(زاد المستنقع، ص: ۱۱۹)

اہل حدیث: سرخیل علماء اہل حدیث نواب وحید الزمان صاحب حیدرآبادی لکھتے ہیں:

''عورت بھی مرد کی طرح تکبیر تحریمہ کے وقت رفع یدین کرے گی اور عورت کی نماز مرد کی طرح ہے تمام ارکان وآداب میں، سوائے اس کے کہ عورت تحریمہ کے وقت اپنے ہاتھ کو چھاتی تک اٹھائے گی اور سجدہ میں مرد کی طرح پیٹ کو زمین سے اونچا نہیں رکھے گی، بلکہ پست رکھے گی اور اپنے پیٹ کو دونوں رانوں سے چپکالے گی، اور جب کوئی بات پیش آئے تو لقمہ دینے کے لئے اللہ اکبر نہیں کہے گی؛ بلکہ تالی بجادے گی اور باندی کا بھی وہی حکم ہے جو آزاد عورت کا ہے''(نزل الأبرار:۱/۸۵، مطبع سعید المطابع بنارس)

مفسدات نماز

(۱) بات چیت کرنا:

حضرت معاویہ بن حکم السلمیؓ فرماتے ہیں: کہ میں رسول اللہ ﷺ کے پیچھے نماز پڑھ رہا تھا، کہ ایک شخص کو چھینک آئی، میں نے (نماز ہی میں) یرحمک اللہ کہا، اتنا کہنا تھا کہ لوگ اپنی نگاہوں سے مجھے گھور گھور کر دیکھنے لگے، میں نے کہا تمہارا ناس ہو کیوں مجھ کو گھور گھور کر دیکھ رہے ہو؟ اس پر (لوگ مزید بگڑے اور مجھکو چپ کرنے کے لئے) ہاتھوں کو اپنی رانوں پر مارنے لگے، تو جب میں نے ان کو دیکھا کہ وہ مجھے خاموش کررہے ہیں (تو مجھے سخت ناگوار ہوا) تاہم میں خاموش ہوگیا پھر جب رسول اللہ ﷺ نماز پڑھ چکے تو میرے ماں باپ آپ ﷺ پر قربان، میں نے نہ آپ ﷺ سے قبل آپ سے بہتر معلم دیکھا نہ آپ ﷺ کے بعد ، قسم بخدا نہ آپ ﷺ نے مجھے ڈانٹا نہ مارا نہ مجھے برا بھلا کہا بلکہ یوں فرمایا: بلاشبہ یہ نماز ایسی چیز ہے جس میں کسی قسم کا کلام مناسب نہیں یہ تو بس تسبیح وتکبیر اور تلاوت قرآن کا نام ہے (۱)

حضرت عبد اللہ بن مسعودؓ سے مروی ہے کہ دوران نماز ہم رسول اللہ ﷺ کو سلام کیا کرتے تھے اور آپ ﷺ اس حالت میں بھی جواب مرحمت فرمایا کرتے تھے، لیکن جب ہم نجاشی کے پاس سے لوٹے اور ہم نے آپ ﷺ کو سلام کیا تو آپ ﷺ نے جواب نہ دیا، ہم نے آپ ﷺ سے اپنی بے چینی کا اظہار کیا تو آپ ﷺ نے فرمایا: بے شک نماز میں اہم مصروفیت (مناجاتِ پروردگار) ہوتی ہے (۲) نسائی کی روایت میں یہ اضافہ بھی ہے کہ بلاشبہ اللہ جو چاہتا ہے نیا حکم بھیج دیتا ہے اور فی الحال جو نیا حکم آیا ہے وہ یہ ہے کہ نماز میں گفتگو نہ کی جائے۔ (۳)

---

(۱) مسلم : باب تحریم الکلام فی الصلاۃ: ۱۲۲۷

(۲) مسلم : باب تحریمۃ الکلام فی الصلاۃ: ۱۲۲۹

(۳) نسائی : تحقیق البانی : الکلام فی الصلاہ : ۱۲۲۱ صحیح

ان دو روایتوں سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ شروع زمانے میں نماز کے اندر بات چیت اور سلام کلام کی گنجائش موجود تھی مگر بعد میں یہ گنجائش بالکل ختم کردی گئی حتی کہ چھینک اور سلام کے جواب کو تک نماز میں نامناسب قرار دے دیا گیا پس اب شرعی حکم یہ ہے کہ نماز میں کھانے اور پینے کی طرح کلامِ ناس بھی ممنوع اور مفسدِ صلوۃ ہے، چنانچہ حضرت زید بن ارقمؓ کا بیان ہے کہ صحابہ نماز میں گفتگو کرلیا کرتے تھے یہاں تک کہ یہ آیت نازل ہوئی'' اور اللہ کے آگے ادب سے کھڑے رہو(۱) تو ہم کو خاموش رہنے کا حکم دیا گیا اور بات چیت سے روک دیا گیا(۲)

جس زمانے کے اندر نماز میں بات چیت جائز تھی، ان دنوں ایک عجیب قصہ پیش آیا تھا کہ رسول اللہ ﷺ نے بھول کر چار رکعت والی فرض نماز میں دو رکعت پر سلام پھیر دیا تھا، صحابہ اس خیال سے کہ شاید نماز کے احکام میں کوئی تبدیلی ہوگئی ہے، خاموش رہے، لیکن حضرت ذوالیدینؓ نے ہمت کر کے پوچھا کہ یارسول اللہ کیا نماز میں کمی کردی گئی ہے یا آپ ﷺ بھول گئے ہے، آپ ﷺ نے فرمایا کہ نہ بھول چوک ہوئی ہے نہ نماز میں کمی ہوئی ہے، پھر رسول اللہ ﷺ نے صحابہ سے فرمایا: کیا معاملہ اسی طرح ہے جیسے ذوالیدین کہتے ہیں؟ (یعنی آیا واقعۃً نماز کی رکعتوں میں کچھ خلاف عادت بات پیش آئی ہے) صحابہ نے عرض کیا کہ ہاں! اس پر آپ ﷺ مصلی پر تشریف لائے اور مابقیہ رکعتیں پوری فرمائیں (۳)

یہ واقعہ شروع زمانہ کا ہے اور اس واقعہ میں سائل کی حیثیت سے بات چیت کرنیوالے صحابی حضرت ذوالیدینؓ کی شہادت غزوہ بدر ہی میں ہوچکی تھی جب کہ نماز میں

---

(۱) البقرۃ: ۲۳۸

(۲) مسلم: باب تحریم الکلام فی الصلاۃ: ۱۲۳۱

(۳) مسلم: باب السھو فی الصلاہ ۱۳۱۶

بات چیت غزوۂ بدر کے بعد منسوخ ہوئی ہے (۱) یہی وجہ ہے کہ حضرت عمرؓ (جو اس واقعہ میں بحیثیت ایک مقتدی کے شریک تھے ان سے) اپنے زمانہ خلافت میں ایک دفعہ ایسی ہی بھول چوک ہوگئی تھی، انہوںؓ نے دو رکعت پر سلام پھیر دیا تھا جب آپؓ کو اس جانب توجہ دلائی گئی تو آپؓ نے ازسرنو چار رکعات نماز پڑھائی (۲) اس سے معلوم ہوتا ہے کہ امام کو غلطی پر متنبہ کرنے اور نماز کی درستگی کی غرض سے کیا جانے والا کلام بھی مفسد صلاۃ ہوتا ہے☆

فوائد: (الف) تکلیف ومصیبت کی وجہ سے نماز میں آہ اوہ کیا یا ایسا رو دیا کہ رونے میں کچھ حروف نکل گئے تو مسئلہ یہ ہے کہ اگر وہ اپنے آپ کو ضبط کرسکتا تھا تو اس کی نماز فاسد ہوجائے گی کہ یہ بھی کلام ناس ہے اور اگر بے اختیار آہ اوہ زبان سے نکل گیا اور اسے ضبط کرنا اس کے بس میں نہیں ہے تو اس کی نماز فاسد نہیں ہوگی کہ وہ اپنی طبیعت سے مجبور ہے (۳) حصرت عبداللہ بن مبارک سے منقول ہے کہ اگر کوئی آدمی نماز میں بے اختیار رو

(۱) التعلیق الحسن ۱/۱۴۳

(۲) طحاوی : باب الکلام فی الصلاۃ لما یحدث فیھا من السھو: ۲۶۰۴ مرسل جید: اثار السنن ۱/۱۴۰

(۳) فتح القدیر ۱/۳۴۷

☆امام مالکؒ کے نزدیک وہ کلام جو نماز کی اصلاح کی غرض سے ہو اور قلیل وبقدر ضرورت ہو وہ مفسد صلاۃ نہیں، باقی بے ضرورت دو حرفی کلام بھی مفسد صلاۃ ہے، امام شافعیؒ کے نزدیک وہ کلام جو بے ساختہ زبان سے نکل جائے یا نماز کا خیال نہ رہنے کی بنا پر زبان پر آجائے یا نومسلم ہونے کی وجہ سے مسائل سے ناواقفیت کی بنا پر زبان سے صادر ہوجائے اور وہ قلیل مقدار میں ہو تو وہ مفسدِ صلاۃ نہیں، اس کے سوا ہر قسم کا مختصر کلام بھی مفسدِ صلاۃ ہے خواہ وہ نماز کی اصلاح کی غرض سے ہی کیوں نہ ہو، امام احمدؒ کے یہاں وہ شخص جس نے نماز مکمل ہونے کے خیال سے سلام پھیر دیا، وہ اگر نماز کی اصلاح کی غرض سے مختصر کلام کرتا ہے تو وہ مفسد صلاۃ نہیں جیسے امام نے ظہر یا عصر میں نماز مکمل ہونے کے خیال سے سلام پھر دیا، مقتدیوں میں سے کسی نے بذریعہ کلام امام کو غلطی پر آگاہ کیا یا امام نے ازخود، اس بارے میں مقتدیوں سے استفسار کیا تو اس قسم کے کلام سے امام یا مقتدی کی نماز فاسد نہیں ہوتی، ایسے ہی بے اختیار زبان سے کچھ حروف نکل جائیں تو اس سے بھی نماز فاسد نہیں ہوتی (الفقہ الاسلامی ۲/۱۰۲۶)

مغلوب ہو کر آہ اوہ کہہ دے تو کوئی مضائقہ نہیں اور اس پر نماز کا اعادہ نہیں ہے،(۱) حضرت ابراہیم نخعیؒ فرماتے ہیں: جو شخص (اختیار سے) نماز میں آہ اوہ کہے تو اس کی نماز فاسد ہوگی (۲)

(ب) بے ضرورت کھانسا جس سے کچھ حروف پیدا ہو گئے تو نماز فاسد ہو جائے گی ایسے ہی بے عذر زور سے سانس چھوڑا یا پھونک مارا جس سے حروف بن گئے تو بھی نماز فاسد ہو جائے گی۔ ارشاد نبوی ہے: جس نے (حروف پر مشتمل) پھونک ماری اس نے کلام کرلیا۔ (۳) حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ: نماز میں پھونک مارنا بھی گویا بات کرنا ہے (۴)

(ج) دو حرف یا ایک معنی خیز و با مطلب حرف زبان سے کسی نے نکالا ہے تو اس کی نماز فاسد ہو جاتی ہے خواہ عمداً نکالا ہو یا بھول کر، مسئلہ سے لاعلمی کی بنا پر نکالا ہو یا غلطی سے، خوشی سے نکالا ہو، یا زبردستی سے، جیسے آ، جا، پی، چل، ڈر، مرَ، نہَ، وغیرہ کہا ہو (۵) امام شعبیؒ فرماتے ہیں: جو آدمی نماز میں ھاہ کہے وہ نماز کا اعادہ کرے (۶)

(د) بلا ضرورت لقمہ دینا:

نماز میں لقمہ دینا بھی در حقیقت کلام اور سیکھنے سکھانے کے حکم میں ہے اور نماز اس کا محل نہیں ہے، حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے لقمہ دینے کو کلام کہا ہے، (۷) نبی کریم ﷺ نے

---

(۱) الاوسط لابن المنذر : ذکر الانین و التاوه فی الصلاه ۱۳۳/۵ عمدة القاری ۴۵۰/۸

(۲) مصنف ابن ابی شیبة: فی الرجال یئنّ فی الصلا ته :۶۸۵۵ سکت علیه المحقق محمد عوامه

(۳)نسائی : النهی عن النفخ فی الصلوة : ۵۴۸

(۴)مصنف ابن ابی شیبه : فی النفخ فی الصلاة : ۶۶۰۴.۶۶۰۵ صحیح : التکمیل لما فات تخریجه من ارواء الغلیل:۳۹۵

(۵)الفقه الاسلامی : ۱۰۲۳/۲

(۶) مصنف ابن ابی شیبه : من قال :هاه فی الصلاة : ۸۹۰۷. سکت علیه المحقق محمد عوامه

(۷) طبرانی کبیر : ۹۲۱۲ . صحیح :مجمع الزوائد : باب تلقین الامام : ۲۳۵۲

نماز میں لقمہ دینے میں عجلت کرنے سے منع فرمایا ہے۔(۱)

پس اگر مقتدی بوقت ضرورت اپنے امام کو لقمہ دیتا ہے تو شریعت نے قرأت قرآن کی بسہولت ادائیگی کی خاطر لقمہ دینے کو گوارا کیا ہے اور اسے مفسد صلاۃ قرار نہیں دیا، حضرت ابن عمرؓ فرماتے ہیں: نبی ﷺ نے کوئی نماز پڑھائی تو قرأت میں آپ ﷺ کو شبہ لگ گیا، نماز سے فارغ ہونے کے بعد آپ ﷺ نے حضرت ابی بن کعبؓ سے فرمایا: کیا تم نے ہمارے ساتھ نماز پڑھی ہے، عرض کیا کہ ہاں، اس پر آپ ﷺ نے فرمایا: پھر تم نے مجھے لقمہ کیوں نہیں دیا؟(۲)

لیکن اگر مقتدی بجائے اپنے امام کے کسی اور نمازی کو یا کسی اور قاریٔ قرآن کو لقمہ دیتا ہے تو لقمہ دینے والے کی نماز فاسد ہو جائے گی۔☆

(ہ) نماز میں دیکھ کر قرآن پڑھنا بھی مفسد صلاۃ ہے دو وجہ سے (۱) نماز سے باہر والی شئی سے سیکھنا ہے، اور نماز اس کی جگہ نہیں (۲) دیکھ کر قرآن پڑھنے کے لئے قرآن کو اٹھانا، اس کے اوراق کو الٹنا پلٹنا پڑتا ہے اور یہ عمل کثیر ہے جو نماز میں ممنوع ہے۔ حضرت عبد اللہ بن عباسؓ فرماتے ہیں کہ امیر المومنین حضرت عمرؓ نے ہم کو قرآن دیکھ کر لوگوں کی امامت

---

(۱) ابو داؤد: تحقیق البانی باب النهي عن التلقين : ۹۰۹ . ضعيف

(۲) ابو داود : باب الفتح على الامام : ۹۰۸ . صحيح : خلاصة الاحكام : باب استحباب تلقين الامام : ۱۶۸۰

☆ یہی امام مالکؒ کا بھی مسلک ہے، امام شافعیؒ کے نزدیک لقمہ دینے والے کے لئے ضروری ہے کہ وہ قرأت قرآن کی نیت کرے اگر وہ خالص لقمہ دینے کی نیت سے امام کو لقمہ دے گا تو اس کی نماز فاسد ہو جائے گی امام احمدؒ کے یہاں غیر امام کو لقمہ دینا مکروہ ہے اس سے نماز فاسد نہیں ہوتی الفقه الاسلامي وادلته ۱۰۲۸/۲

کرنے سے منع فرمایا(۱) حضرت سلیمان بن حنظلہؓ البکری سے مروی ہے کہ وہ ایک امام کے پاس سے گذرے جو قرآن میں دیکھ کر امامت کر رہا تھا تو حضرت سلیمانؓ اس کے پاؤں پر مارا۔ حضرت ابراہیم نخعیؒ فرماتے ہیں کہ اسلاف، قران دیکھ کر امامت کرنے کو ناپسند کرتے تھے(۲)

(۲) کھانا یا پینا:

نماز میں کھانا یا پینا بالاتفاق مفسد صلاۃ ہے؛ اس لئے کہ یہ امور، نماز کی وضع اور حقیقت کے بالکل خلاف ہیں پھر ان کے ارتکاب کرنے میں عمل کثیر کی ضرورت پڑتی ہے جو نماز میں ممنوع ہے(۳)

حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے مروی ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا: جب تم میں سے کسی کا رات کا کھانا چن دیا گیا (اور وہ بھوک سے بے قرار ہو) اور ادھر جماعت کھڑی ہوگئی ہو تو پہلے کھانا کھالے اور فارغ ہونے تک (نماز کی طرف) عجلت نہ کرے(۴)

نماز میں اگر کھانا پینا جائز رہتا تو محض کھانے کی خاطر نماز میں تاخیر کرنے کا اور کھانے سے فارغ ہونے تک نماز سے رکے رہنے کا حکم کیوں دیا جاتا ہے؟

(۳) عمل کثیر:

ائمہ کا اس پر اتفاق ہے کہ ہر وہ کام جو نماز کے منافی ہو اور وہ زیادہ ہو تو اس سے نماز، باطل ہو جاتی ہے اور اگر کم ہو تو اس سے نماز باطل نہیں ہوتی، (۵) عمل کثیر سے مراد وہ کام

(۱) المصاحف لابن ابی داؤد : هل یوم القرآن فی المصاحف :۶۵۵ مؤید بالاثار الکثیرة : حواله سابق ۶۵۶. ۶۷۲

(۲) مصنف ابن ابی شیبه : فی الرجل یؤم القوم و هو یقرافی المصحف : ۷۳۰۱.۷۳۰۴ سکت علیه المحقق محمد عوامه

(۳) هدایه مع العنایه : ۱/۳۵۹

(۴) بخاری : باب اذا حضر الطعام و اقیمت الصلاة :۶۷۴

(۵) الفقه الاسلامی :۲/۱۰۳۱

ہے جسے دیکھ کر انسان یہ سمجھے کہ آدمی نماز نہیں پڑھ رہا ہے۔(۲)

نبی کریم ﷺ نے ایک دفعہ بعض صحابہ کو دیکھا کہ وہ نماز میں اپنے ہاتھوں کو اٹھا رہے ہیں، اس پر آپ ﷺ نے ان صحابہ کو ڈانٹا اور یوں فرمایا، یہ کیا ہے کہ میں تم کو اپنے ہاتھوں کو اٹھاتے دیکھ رہا ہوں، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ سرکش گھوڑوں کی دم ہیں، نماز میں سکون سے رہو۔(۳)

فائدہ: نماز میں تیل لگانا، کنگھی کرنا، سرمہ لگانا، ایک رکن میں تین بار اس طرح کھجانا کہ ہر بار کھجا کر ہاتھ اس جگہ سے ہٹا لینا، تیر چلانا، پاجامہ باندھنا، کرتا پہننا، ایک ہی دفعہ میں دو صفوں کی مقدار میں چل لینا یا قبلہ کی جانب میں بیک دفعہ ایک صف سے زیادہ چل لینا یہ سارے افعال عمل کثیر کی تعریف میں شمار ہوتے ہیں اور ان سے نماز فاسد ہو جاتی ہے(۴)

(۴) نماز میں کسی رکن یا شرط کا ترک کر دینا:

مثلاً کسی نے نماز میں قرأت کو ترک کر دیا یا وضو کئے بغیر نماز شروع کر دی، حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا: بغیر قرأت کے نماز نہیں ہوتی (۵) نیز ارشاد نبوی ہے: بے وضو آدمی کی نماز اللہ تعالیٰ قبول نہیں فرماتا تاوقتیکہ وہ دوبارہ وضو نہ کرے۔(۶)

(۵) قہقہہ لگانا:

بلند آواز کے ساتھ ہنسنے سے نماز بھی فاسد ہو جاتی ہے اور وضو بھی ٹوٹ جاتا ہے اور پست آواز (جو صرف خود کو سنائی دے) سے ہنسنے کی صورت میں صرف نماز پر اثر پڑتا ہے وضو

(۲) فتح القدیر : ۳۵۱/۱

(۳) مسلم : باب الامر با لسکون فی الصلاة :۹۹۶

(۴)فتح القدیر : ۳۵۲/۱

(۵)مسلم : باب وجوب قراء ةالفاتحة فی کل رکعة:۹۰۸

(۶)(ترمذی : باب الوضوء من الریح: حسن صحیح امام ترمذی)

پر نہیں یعنی نماز ٹوٹ جاتی ہے وضو نہیں ٹوٹتا۔

ایک دفعہ مسجد میں ایک ناگہانی واقعہ پیش آنے پر بہت سے صحابہ حالت نماز میں ہنس پڑے تھے تو نبی ﷺ نے نماز کے بعد ان کو وضو اور نماز کے اعادہ کا حکم فرمایا تھا۔(۱)

پست آواز سے ہنسنا بھی اگرچہ نماز کی حالت کے مناسب عمل نہیں ہے لیکن یہ اتنا سنگین نہیں جتنا زوردار آواز سے ہنسنا سنگین ہے؛ اس لئے فقہاء حنفیہ نے پست آواز سے ہنسنے کو صرف مفسد صلاۃ کہا ہے، وضو اس سے نہیں ٹوٹے گا حضرت جابرؓ فرماتے ہیں کہ تبسم سے نماز نہیں ٹوٹتی یہاں تک کہ (آواز سے) ہنس لے (۲) ☆

(۶) نمازی کے سامنے سے کسی کا گذرنا:

اس تعلق سے نبی ﷺ نے ارشاد فرمایا: نماز کو کوئی چیز (جو نمازی کے سامنے سے گذرے) نہیں کاٹتی۔(۴) اور جو بعض روایات میں سیاہ کتے، گدھے اور عورت کے گذرنے سے نماز کے قطع ہونے کا بیان آیا ہے اس سے مراد خشوع وخضوع میں خلل کا پیدا ہو جانا ہے نہ کہ ظاہری اعتبار سے نماز کا ٹوٹ جانا مراد ہے۔(۵)

---

(۱) مصنف ابن ابی شیبہ : من کان یعید الوضوء و الصلاۃ : ۳۹۳۸ مرسل صحیح :محمد عوامہ۔ علامہ عینیؒ فرماتے ہیں اس مسئلہ میں ہمارے پاس گیارہ احادیث موجود ہیں۔ عمدۃ القاری ; باب من لم یر الوضوء الامن المخرجین ۴۸/۳

(۲) مصنف ابن ابی شیبہ : فی التبسّم فی الصلاۃ : ۳۹۲۲. سکت علیہ المحقق محمد عوامہ۔ السنن الکبری للبیھقی : باب من تبسم فی الصلاۃ : ۳۴۹۰. محفوظ .امام بیہقیؒ

(۴) طبرانی کبیر : ۷۵۸۸. حسن : مجمع الزوائد : باب لا یقطع الصلاۃ شئی : ۲۳۰۸

(۵) اعلاء السنن : ۶۳/۵

☆ دیگر فقہاء کے نزدیک آواز سے ہنسنا اس وقت مفسد صلاۃ ہے جب کہ اس کی وجہ سے دو حرف یا ایک بامعنی حرف بھی زبان سے نکل گیا ہو۔ الفقہ الاسلامی : ۱۰۳۴/۲

(۷) محاذات یعنی عورت کا مرد کے برابر میں آکر کھڑے ہو جانا:

محاذات، درج ذیل شرائط کے ساتھ مفسد صلاۃ ہے۔

(الف) عورت (محرم ہو یا اجنبیہ) بالغہ ہو خواہ بوڑھی ہو یا حد بلوغ کو پہونچی ہوئی ہو۔

(ب) امام نے عورتوں کی امامت کی بھی نیت کی ہو۔

(ج) مرد و عورت کی نماز بحیثیت تحریمہ و ادا ایک ہو☆

(د) دونوں کے درمیان کوئی حائل اور فاصلہ نہ ہو۔

(ہ) محاذات رکوع و سجدہ والی نماز میں ہو۔

(و) دونوں کے کھڑے ہونے کی سطح ایک ہو اس طور پر کہ ایک دوسرے کے اعضاء کسی نہ کسی لحاظ سے محاذات میں ہوں۔

(ز) محاذات کے پیش آنے پر مرد نے عورت کو پیچھے ہونے کا اشارہ نہ کیا ہو۔

(ہ) محاذات کم از کم ایک رکن کی ادائیگی کے بقدر رہی ہو(۱)

حضرت انسؓ کی جدہ حضرت ملیکہ نے رسول اللہ ﷺ کی دعوت کی تھی، کھانے سے فراغت کے بعد رسول اللہ ﷺ نے اہل خانہ کو جمع کر کے نماز پڑھائی اس طور پر کہ رسول اللہ ﷺ آگے تھے، حضرت انسؓ اور ان کے بھائی حضرت یتیمؓ آپ ﷺ کے پیچھے صف لگائے ہوئے تھے اور ان کی جدہ حضرت ملیکہؓ ان دونوں کے پیچھے تنہا کھڑی تھیں۔(۲)

☆ تحریمہ ایک ہونے کا مطلب یہ ہے کہ دونوں کی ایک ہی جیسی فرض نماز ہو یا عورت کی نماز نفل ہو اور مرد کی فرض، ادا میں ایک ہونے کا مطلب یہ ہے کہ دونوں اپنی نماز کی ادائیگی میں یا مدرک ہوں (امام کے ساتھ ہی نماز شروع کئے ہوں اور ساتھ ہی ختم کئے ہوں) یا لاحق ہوں (کہ شروع تو امام کے ساتھ کئے ہوں اور ختم امام کے ساتھ نہ کئے ہوں) البتہ جو رکعتیں مسبوق ہونے کی حیثیت سے مرد اور عورت ادا کر رہے ہوں ان میں محاذات مفسد صلاۃ نہیں ہے۔

(۱) عنایہ مع فتح القدیر ۱/۳۱۳ حاشیہ الطحطاوی علی مراقی الفلاح: باب ما یفسد الصلاۃ : ۳۳۱

(۲) بخاری باب الصلاۃ علی الحصیر : ۳۸۰

یہاں رسول اللہ ﷺ نے تنہا عورت کے پیچھے کھڑے رہنے کو گوارفرمایا ہے، مردوں کی صف میں شریک ہونے کا حکم نہیں دیا، حالاں کہ صف سے علیحدہ ہوکر کھڑے ہونا، مردوں کے لئے ، رسول اللہ ﷺ کی نظر میں اس قدر ناپسندیدہ فعل ہے کہ ایک دفعہ آپ ﷺ نے اس طرح کرنے والے شخص کو (بطور استحباب) نماز کے دہرانے کا حکم فرمایا تھا۔(۱) ایک موقع پر حضرت ابوبکرہؓ نے بھی ایسا ہی کیا تھا تو آپ ﷺ نے آئندہ انہیں ایسا کرنے سے منع فرمادیا تھا۔(۲)

رسول اللہ ﷺ کے ان دوطرح کے طرز عمل کو سامنے رکھنے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ مردوں کی صف میں عورت کے شامل ہونے سے مردوں کی نماز میں بگاڑ پیدا ہوجاتا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کا فرمان ہے: ان کو پیچھے کردو جیسے اللہ نے ان کو (درجہ میں) پیچھے رکھا ہے۔(۳)

حضرت حارث بن معاویہؓ نے نہایت اہتمام سے حضرت عمرؓ سے یہ مسئلہ دریافت کیا کہ بسا اوقات میں اور ایک خاتون (بیوی) ایک تنگ عمارت میں ہوتے ہیں، نماز کا وقت آتا ہے تو تشویش پیدا ہو جاتی ہے، اگر میں اور وہ اسی تنگ کوٹھری میں نماز پڑھتے ہیں تو وہ میرے محاذات میں ہوجاتی ہے اور اگر وہ میرے پیچھے نماز پڑھنا چاہے تو عمارت سے باہر ہو جاتی ہے؟ حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ: اپنے اور عورت کے درمیان کپڑے کی اوٹ قائم کرلو پھر چاہو تو محاذات میں نماز پڑھ لو۔ (۴)

---

(۱)ترمذی : تحقیق الالبانی باب ما جاء فی الصلاۃ خلف الصف وحدہ: ۲۳۱ : صحیح

(۲)بخاری : باب اذا رکع دون الصف: ۷۸۳

(۳)طبرانی کبیر: ۹۳۷۱ صحیح : السلسلۃ الضعیفہ : ۹۱۷. صحیح : مجمع الزوائد: باب خروج النساء الی المساجد: ۲۱۲۰

(۴)مسند احمد :مسند عمر ابن خطابؓ :تحقیق شعیب الانؤوط : ۱۱۱ .حسن رجالہ ثقات

حضرت ابراہیم نخعیؒ فرماتے ہیں: اگر عورت مرد کے بازو میں نماز پڑھے اور دونوں کی نماز ایک ہو تو مرد کی نماز فاسد ہو جاتی ہے۔(۱)

نیز باتفاق امت مردوں کے لئے عورت کی اقتداء کرنا صحیح نہیں ہے، اس کی وجہ تحقیق سے یہ سامنے آئی کہ مردوں نے صف بندی میں اپنے مقام کو نظر انداز کر دیا ہے کہ خود آگے ہونے کے بجائے پیچھے ہو گئے، محاذات کے معاملہ میں بھی مردوں کا اپنا مقام متاثر ہو رہا ہے، شرعی حکم کی بنا پر انہیں، عورتوں کو پیچھے کرنا چاہئے تھا جو انہوں نے نہیں کیا، لہذا محاذات کی صورت میں بھی مردوں کی نماز صحیح نہیں ہوگی۔

یہاں یہ امر واضح ہو کہ محاذات کا مفسد صلاۃ ہونا بظاہر غیر معقول ہے لیکن چوں کہ ان مذکورہ بالا دلائل سے ان کا مفسد صلاۃ ہونا سمجھ میں آتا ہے؛ اس لئے حنفیہ نے انہیں مفسد صلاۃ تسلیم کیا ہے، لیکن ان تمام شرائط کے ساتھ جو نص میں (حضرت انسؓ و حضرت حارث بن معاویہؓ کی روایت میں) موجود ہیں۔(۲)

---

(۱)(کتاب الاٰثار لامام محمدؒ: باب ما یقطع الصلاۃ: ۱۳۶۔ صحیح

(۲)(فتح القدیر مع العنایہ: ۱/۳۱۳۔۳۱۲)

نماز کے مکروہات

(۱) عمداً کسی واجب کو ترک کرنا:

واجبات نماز میں سے کسی واجب مثلاً قرأت فاتحہ، ضم سورۃ، تشہد یا تعدیل ارکان کو چھوڑ دیا ہے تو نماز مکروہ تحریمی اور واجب الاعادۃ ہو جاتی ہے، رسول اللہ ﷺ نے تعدیل ارکان کے ترک کرنے والے کو بڑی تاکید سے نماز دہرانے کا حکم فرمایا تھا۔(۱)

(۲) بے ضرورت جائے سجدہ سے کنکریوں کو صاف کرنا:

حضرت معیقیبؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: نماز پڑھتے ہوئے کنکریوں پر ہاتھ نہ پھیرو، اگر تمہیں ایسا کرنا ضروری ہو تو ایک مرتبہ کنکریوں کو ہموار کرلو۔(۲)

حضرت جابرؓ سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے کنکریوں کے صاف کرنے کے بارے میں سوال کیا تو آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ایک دفعہ میں کرلو اور اگر یہ بھی نہ کرو تو یہ تمہارے لئے ۱۰۰ کالی آنکھوں والی اونٹنیوں سے بہتر ہے۔(۳)

(۳) کپڑے یا بدن سے کھیلنا:

ارشاد نبوی ہے: اللہ تعالیٰ نے تمہارے لئے نماز میں بے کار عمل کو ناپسند کیا ہے(۴)

نبی کریم نے ایک شخص کو دیکھا کہ وہ نماز کی حالت میں اپنی داڑھی سے کھیل رہا ہے تو آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: اگر اس کے دل میں خشوع ہوتا تو اس کے اعضاء و جوارح

---

(۱) بخاری: باب وجوب القراءۃ للامام والماموم: ۷۵۷

(۲) مسلم باب کراھۃ مسح الحصی: ۱۲۴۷

(۳) مسند احمد تحقیق شعیب الارنؤوط: مسند جابر بن عبد اللہ: ۱۴۲۰۴ ۔سند کے ایک راوی ضعیف ہیں باقی رجال بخاری و مسلم کے رجال ہیں۔

(۴) الزھد لابن المبارک: ۱۵۵۷ ضعیف: سلسلۃ الاحادیث الضعیفۃ: ۳۰۷۹

سے بھی خشوع ٹپکتا۔(۱)

(۴) انگلیاں چٹخانا:

حضرت علیؓ سے راویت ہے کہ نبی ﷺ نے ارشاد فرمایا: نماز کی حالت میں اپنی انگلیوں کو مت چٹخاؤ۔(۲)

(۵) کمر پر ہاتھ رکھنا:

حضرت ابو ہریرۃؓ سے راویت ہے کہ نبی ﷺ نے نماز میں کمر پر ہاتھ رکھنے سے منع فرمایا ہے۔(۳)

(۶) اِدھر اُدھر متوجہ ہونا:

حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ میں نے نبی ﷺ سے نماز کی حالت میں اِدھر اُدھر متوجہ ہونے کے بارے میں سوال کیا تو آپ ﷺ نے فرمایا: یہ ایک جھپٹا ہے جو شیطان انسان کی نماز سے جھپٹ لیتا ہے۔(۴)

(۷) ارکان کی ادائیگی خلاف سنت طریقہ پر کرنا:

حضرت ابو ہریرۃؓ سے راویت ہے کہ میرے خلیل ﷺ نے مجھے تین باتوں سے منع کیا ہے: (اطمینان کے ساتھ ارکان کی ادائیگی کے بجائے) مرغ کی طرح ٹھونگ مارنے سے، کتے کی طرح بیٹھنے سے اور لومڑی کی طرح اِدھر اُدھر توجہ کرنے سے۔(۵)

---

(۱) نوادر الاصول لحکیم الترمذیؒ: باب فی حقیقة الخشوع ۲ /۱۷۲. ضعیف و لکن فی شرح البخاری لابن المنیر: صحّ عن النبی ﷺ: الفتح السماوی لعبد الرؤف المناوی :سورة المومنون ۲/۸۵۴

(۲) ابن ماجه : باب ما یکره فی الصلاة : ۹۶۵ :سند ایک راوی مختلف فیہ ہے باقی رجال ثقہ ہیں اعلاء۵/۱۰۸

(۳) نسائی تحقیق الالبانی : باب النهی عن التخصر فی الصلاة : ۸۹۰ صحیح

(۴) بخاری : باب الالتفات فی الصلاة: ۷۵۱

(۵) مسند احمد : ۸۱۰۶ حسن : مجمع الزوائد باب ما ینهی عنه فی الصلاة : ۲۴۲۵

فائدہ: کتے کے بیٹھنے کی ہیئت یہ ہے: سرین زمین سے لگا لئے جائیں، گھٹنے کھڑے ہوں اور سینے سے لگے ہوئے ہوں اور ہتھیلیاں زمین پر بچھی ہوئی ہوں (۱)

فائدہ: دو سجدوں کے درمیان بھی اسی حالت پر بیٹھنا چاہئے جیسے قعدہ میں بیٹھا جاتا ہے تاہم کسی عذر کی وجہ سے اس طرح بیٹھنا ممکن نہ ہو تو حسب سہولت بیٹھ جانے میں کوئی مضائقہ نہیں ہے۔

حضرت عبداللہ بن عمرؓ نماز کے اندر دو سجدوں کے درمیان ایڑیوں پر بیٹھا کرتے تھے، نماز کے بعد ان سے اس تعلق سے پوچھا گیا تو ارشاد فرمایا: یہ (بیٹھک سو فیصد) سنت تو نہیں مگر مجھے کچھ (پیروں میں) تکلیف ہے اس لئے ایسا کیا ہوں۔ (۲)

(۸) مرد کا چوٹی باندھ کر نماز پڑھنا:

حضرت ام سلمہؓ سے راویت ہے رسول اللہ ﷺ نے چوٹی باندھے ہوئے ہونے کی حالت میں نماز پڑھنے سے آدمی کو منع فرمایا۔ (۳)

(۹) بالوں یا کپڑوں کو سمیٹنا:

حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرایا کہ مجھے یہ حکم ہوا کہ میں (دوران نماز) بالوں اور کپڑوں کو نہ سمیٹوں (۴)

(۱۰) کپڑے کو لٹکانا اور منہ چھپانا:

حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے منع فرمایا ہے کہ کوئی شخص نماز میں اپنا کپڑا لٹکائے اور یہ کہ اپنا منہ چھپائے (۵)

(۱)طحطاوی علی المراقی : ۳۴۸ (۲)مؤطا مالک : باب العمل فی الجلوس فی الصلاۃ : ۲۰۰

(۳) طبرانی کبیر : ۱۹۰۲۳ صحیح :مجمع الزوائد : باب فیمن یصلی وراسہ معقوس : ۲۴۶۹

(۴)بخاری : باب لا یکف ثوبہ فی الصلاۃ:۸۱۶

(۵)ابو داؤد : تحقیق الالبانی : باب ما جاء فی السدل فی الصلاۃ : ۶۴۳۔ صحیح مقطوع

(۱۱) امام کا مقتدیوں سے اونچے مکان پر یا تنہا محراب میں کھڑا ہونا:

حضرت ابو مسعودؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے منع فرمایا کہ امام تو کسی اونچی چیز کے اوپر کھڑا ہو اور لوگ اس کے پیچھے (عام حالت پر) کھڑے ہوں۔(۱)

حضرت ابن مسعودؓ نے محراب میں نماز پڑھنے کو ناپسند فرمایا اور ارشاد فرمایا کہ یہ طریقہ گرجا گھروں میں رائج ہے تم اہل کتاب سے مشابہت اختیار نہ کرو۔(۲)

(۱۲) جاندار کی تصویر کے ہوتے ہوئے نماز پڑھنا:

نمازی کے اوپر آگے یا دائیں بائیں جاندار کی تصویر نمایاں طور پر موجود ہو تو نماز مکروہ ہو جاتی ہے۔

حضرت جبرئیل امین علیہ الصلوۃ والسلام نے جماعتِ ملائکہ کی ترجمانی کرتے ہوئے فرمایا کہ ہم کسی ایسے گھر میں داخل نہیں ہوتے جہاں کتا یا تصویر ہو۔(۳)

نماز کی جگہ تصویر اس کیفیت پر موجود ہو تو اس سے تصاویر کی تعظیم کا شائبہ معلوم ہوتا ہے اس لئے بھی نماز مکروہ ہو جاتی ہے۔

(۱۳) آنکھیں بند کرنا:

حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: جب تم میں سے کوئی نماز میں کھڑے ہو تو اپنی آنکھوں کو بند نہ کرے۔(۴) علامہ ابن قیمؒ فرماتے ہیں:

---

(۱) مستدرک حاکم : کتاب الامامه : ۷۶۱ حسن : اعلاء السنن ۱۱٦/۵

(۲) مسند بزار :۱۵۷۷ رجاله مؤثقون :مجمع الزوائد:باب الصلاة فی المحراب:۱۹۸۲ :قوی:السلسلةالضعیفة مختصرة:۴۴۸

(۳) بخاری :باب لا تدخل الملائکةبیتا فیه صورة:۵۹٦۰

(۴) طبرانی صغیر:۲۴. اوسط :۲۲۱۸ . کبیر :۱۰۷۹۴ .ضعیف : صحیح و ضعیف الجامع الصغیر ۱٦۳۰

نماز میں آنکھ بند کرنا نبی ﷺ کی سیرت نہیں ہے تاہم اگر کوئی خشوع وخضوع حاصل کرنے کے مقصد سے آنکھیں بند کرتا ہے تو کوئی مضائقہ بھی نہیں ہے(۱)

(۱۴) چھینک یا جمائی لینا:

حضرت ابوہریرۃؓ سے مروی ہے کہ نبی ﷺ نے ارشاد فرمایا: نماز میں جمائی لینا، شیطانی اثرات سے ہے، لہٰذا تم میں سے جس کسی کو جمائی آئے تو وہ بقدر استطاعت اس کو دفع کرے(۲)

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے ارشاد فرمایا کہ نماز میں جمائی اور چھینک شیطانی اثر سے ہے(۳)

(۱۵) پیشاب و پاخانہ کو روک کر نماز پڑھنا:

حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ میں نے نبی ﷺ کو یہ فرماتے سنا کہ تم میں سے کوئی شخص کھانے کی موجودگی میں (جب کہ وہ بھوک سے بے تاب ہو) اور پیشاب و پاخانہ کو روکتے ہوئے نماز نہ پڑھے(۴)

(۱۶) انگلیوں کو ایک دوسرے میں ڈالنا:

حضرت کعب بن عجرہؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: جب تم سے کوئی خوب اچھی طرح وضو کر کے مسجد کے ارادہ سے گھر سے نکلے تو اپنے ہاتھوں کی انگلیوں کو ایک دوسرے میں داخل نہ کرے کیوں کہ وہ نماز ہی میں ہے۔(۵)

(۱) زاد المعاد : فصل لم یکن من ھدیه تغمیض عینیه فی الصلاۃ ۱ /۲۸۳

(۲)ترمذی : کراھیة التثاؤب فی الصلاۃ : ۳۷۰حسن صحیح : امام ترمذی

(۳)طبرانی کبیر : ۹۳۴۳.رجاله موثقون : مجمع الزوائد باب التثاؤب والعطاس فی الصلوۃ : ۲۴۷۲

(۴)مسلم :باب کراھة الصلوۃ بحضرۃ الطعام : ۱۲۷۴

(۵) ابو داؤد : تحقیق البانی : باب ما جاء فی الھدی فی المشی الی الصلاۃ :۵۶۲. صحیح

کعب بن عجرہؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک شخص کو دیکھا کہ اس نے نماز کی حالت میں اپنی انگلیوں کو ایک دوسرے میں ڈال لیا ہے تو آپ ﷺ نے اس کی انگلیوں کو کھول دیا۔(۱)

(۱۷) آسمان کی طرف دیکھنا:

حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا: کچھ لوگ نماز میں اپنی نگاہیں آسمان کی طرف اٹھاتے ہیں، انہیں چاہئے کہ باز آجائیں ورنہ ان کی نگاہیں اچک لی جائیں گی۔(۲)

(۱۸) چادر میں پورے طور پر لپٹ جانا:

یعنی اس طور پر لپٹ جانا کہ چادر سے ہاتھ باہر نکالنے کے لئے کوئی راستہ نہ ہو یا چادر کے ذریعہ بدن کے ایک حصہ کو مضبوطی کے ساتھ چھپالینا اور دوسرے حصہ کو برہنہ چھوڑ دینا۔

حضرت ابوسعید خدریؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے لباس کے ذریعہ مذکورہ ہیئت بنانے سے منع فرمایا ہے(۳)

(۱۹) آدھے لباس میں نماز پڑھنا:

حضرت ابن عمرؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: جب تم میں سے کوئی نماز پڑھے تو اسے دو کپڑے (مکمل لباس) پہننا چاہئے کیوں کہ اللہ اس کے زیادہ حقدار ہیں کہ اس کے لئے زینت اختیار کی جائے۔(۴)

---

(۱) ابن ماجه : باب مایکره فی الصلاۃ :۹۶۷ حجت ومعتبر : اعلاء السنن۱۲۷/۵

(۲)بخاری : باب رفع البصر الی السماء:۷۵۰

(۳)بخاری :باب اشتمال الصماء : ۵۸۲۰ .تحفة الاحوذی: باب ماجاء فی ا لنهی عن اشتمال الصماء ۳۶۷/۵

(۴)طبرانی اوسط :۹۲۳۷ .صحیح : صحیح و ضعیف الجا مع الصغیر: ۶۵۴

(۲۰) اٹھتے یا بیٹھتے ہاتھوں کا سہارا لینا:

حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے اس چیز سے منع فرمایا کہ انسان نماز میں ہاتھوں کا سہارا لیتے ہوئے بیٹھے(۱)

(۲۱) سجدہ میں دونوں ہاتھ زمین پر بچھا دینا:

حضرت عائشہؓ سے راویت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے آدمی کو درندوں کی طرح ہاتھ بچھا دینے سے منع فرمایا(۲)

(۲۲) انگڑائی لینا:

حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے نماز میں انگڑائی لینے سے منع فرمایا(۳)

(۲۳) بے ضرورت چہار زانو بیٹھنا:

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ فرماتے ہیں: دو انگاروں پر بیٹھوں یہ بہتر ہے کہ نماز میں پالتی مار کر بیٹھوں(۴)

---

(۱)ابوداؤد: تحقیق الالبانی باب کراھیۃالاعتماد علی الید فی الصلوۃ : ۹۹۴

(۲)مسلم باب ما یجمع صفۃ الصلاۃ:۱۱۳۸

(۳)الافراد لدار قطنی عن ابی ھریرہ . ضعیف: صحیح و ضعیف الجامع الصغیر :۱۴۱۷۳ مساعد بالقیاس : اعلاء السنن۱۳۸/۵

(۴)مصنف ابن ابی شیبہ : باب من کرہ التربع فی الصلاۃ:۶۱۸۷. سکت علیہ المحقق محمد عوامہ

وہ چیزیں جو نماز میں جائز ہیں

(۱) خشیت الٰہی سے رونا:

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: جب ان پر اللہ کی آیتیں پڑھی جاتی ہیں تو وہ روتے ہوئے سجدہ میں گر جاتے ہیں۔(۱)

حضرت مطرف اپنے والد سے روایت کرتے ہے کہ نبی ﷺ کو میں نے نماز پڑھتے دیکھا اور آپ ﷺ کے سینے سے رونے کی آواز یوں آرہی تھی جیسے پکتی ہوئی ہنڈی سے آواز آتی ہے(۲)

(۲) کنکھیوں سے دیکھنا:

نبی ﷺ گردن موڑے بغیر (کبھی کبھار) نماز میں کنکھیوں سے دیکھ لیا کرتے تھے۔(۳)

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ نظریں پھرا کر دیکھنے کی کراہت نہیں ہے، پھر بھی اس سے خشوع وخضوع میں فرق پڑسکتا ہے؛ اس لئے بلا ضرورت نہیں دیکھنا چاہئے۔

(۳) کسی کھڑے ہوئے یا بیٹھے انسان کی طرف رخ کر کے نماز پڑھنا:

نافعؒ کہتے ہیں، حضرت ابن عمرؓ کو جب مسجد کے کسی ستون کی آڑ میں نماز پڑھنے کا موقع نہ ملتا تو مجھ سے کہتے پشت پھیر کر کھڑے ہو جاؤ(۴)

---

(۱) سورة مریم :۵۸

(۲) ابو داؤود و نسائی تحقیق الالبانی: باب البکاء فی الصلاة :۹۰۴. ۱۲۱۴ .صحیح

(۳) مصنف ابن ابی شیبہ:من کان یرخص ان یلحظ و یلتفت: ۴۵۸۲. ضعیف: محمدعوامه

(۴)مصنف ابن ابی شیبہ:الرجل یستر الرجل اذا صلّی الیه ام لا : ۲۸۹۵ سکت علیه المحقق محمد عوامه

(۴) سبحان اللہ کہنا اور ہاتھ پر ہاتھ مارنا:

جب نماز پڑھتے ہوئے انسان کو کوئی ایسی چیز پیش آئے جس پر وہ دوسرے کو ٹوکنا یا متنبہ کرنا چاہتا ہو (مثلاً: یہ کہ امام نماز میں کوئی غلطی کرتا ہے اور اسے بتانا مقصود ہو) تو مردوں کے لئے سبحان اللہ کہنا اور عورتوں کے لئے دائیں ہاتھ کی انگلیوں کو بائیں ہاتھ کی ہتھیلی پر مار کر آگاہ کرنا جائز ہے۔

حضرت سہل بن سعد ساعدی سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا: جس کسی کو نماز میں کوئی چیز پیش آئے تو اسے چاہئے کہ سبحان اللہ کہے، ہاتھ پر ہاتھ مارنا صرف عورتوں کے لئے ہے اور سبحان اللہ کہنا مردوں کے لئے (۱)

(۵) سانپ، بچھو یا دیگر زہریلے ونقصاندہ جانوروں کو مارنا:

حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا: نماز میں دو سیاہ جانوروں سانپ اور بچھو کو مارو۔(۲)

نماز کی حالت میں اس قسم کے جانوروں کو قتل کرنا جائز ہے البتہ اگر اس کے لئے عمل کثیر کی ضرورت پڑ گئی تو نماز فاسد ہو جائے گی گناہ نہیں ہوگا اور اگر ایک دو ضرب سے کام ہو گیا تو نماز بھی نہیں ٹوٹی۔(۳)

(۶) سخت ضرورت کے وقت تھوڑا سا چلنا:

حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نماز پڑھا کرتے تھے، جب کوئی انسان دروازہ کھلواتا اور دروازہ سامنے یا دائیں یا بائیں طرف ہوتا تو آپ ﷺ دروازہ کھول دیتے

---

(۱) ابو داؤد : تحقیق الالبانی باب التصفیق فی الصلوۃ : ۹۴۱ صحیح

(۲) ابو داؤد : تحقیق الالبانی : باب العمل فی الصلوۃ : ۹۲۲ صحیح

(۳) حاشیۃ الطحطاوی علی مراقی الفلاح : فصل فیما لا یکرہ للمصلی : ۳۷۰

اور آپ ﷺ قبلہ کی طرف پیٹھ نہ کیا کرتے تھے۔(۱)

(۷) ذی روح کی تصویر بے وقعتی کے ساتھ موجود ہونا:

نماز کی جگہ پر ذی روح کی تصاویر بے وقعت طور پر موجود ہوں تو اس کی وجہ سے نماز میں کراہت پیدا نہیں ہوتی مثلاً ان تصاویر کے سرے کٹے ہوئے ہوں یا وہ تصاویر فرشی چادر پر پیروں تلے پڑی ہوئی ہوں۔

حضرت جبرئیلؑ نے نبی ﷺ سے گھر میں داخل ہونے کی اجازت چاہی آپ ﷺ نے فرمایا: داخل ہو جاؤ اس پر حضرت جبرئیلؑ نے عرض کیا: میں کیسے داخل ہوں حالاں کہ آپ ﷺ کے گھر میں ایک ایسا پردہ لگا ہوا ہے جس میں تصاویر ہیں! اگر آپ کو ایسا کرنا ناگزیر ہو تو ان کے سروں کو کاٹ دو یا ان کو کاٹ کر تکئے بنالو یا چادر و بستر بنالو۔(۲)

---

(۱)دارقطنی : باب جواز العمل القلیل فی الصلاۃ :۱۸۷۶ مسند احمد : ۲۴۰۲۷. اسناد حسن: شعیب الارنؤوط

(۲)صحیح ابن حبان : تحقیق شعیب الارنؤوط ذکر الاخبار بان الملائکۃ لا تد خل البیوت التی فیھا التماثیل: ۵۸۵۳. حدیث صحیح

وہ جگہیں جہاں نماز کا پڑھنا مکروہ ہے

حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے سات جگہوں میں نماز پڑھنے سے منع فرمایا ہے: گوبر خانہ، ذبح خانہ، قبرستان، چلتا ہوا راستہ، حمام، اونٹوں کا باڑہ، کعبۃ اللہ کی چھت۔(۱)

ان مواقع پر نماز پڑھنے کی ممانعت یا تو ان مقامات کے ناپاک ہونے کی وجہ سے ہے جیسے گوبر خانہ، ذبح خانہ، اونٹوں کے باڑہ اور حمام خانہ میں، یا شیطانی اثرات کے غلبہ کی وجہ سے جیسے اونٹوں کے باڑہ اور حمام خانہ میں یا شرک کا شائبہ پائے جانے کی وجہ سے جیسے قبرستان میں یا بے ادبی کی وجہ سے جیسے کعبۃ اللہ کی چھت پر، یا عامۃ الناس کو ضرر پہنچنے کی وجہ سے جیسے چلتے ہوئے راستہ میں نماز پڑھنا۔

اب جن جگہوں میں نماز پڑھنے سے مذکورہ بالا خرابیاں پیدا ہوتی ہیں وہاں نماز پڑھنا مکروہ ہوگا۔(۲)

---

(۱) ابن ماجہ : باب المواضع التی تکرہ فیھا الصلاۃ: ۷۴۶ صححہ ابن السکن: اعلاء السنن ۱۳۷/۵

(۲)الفقہ الاسلامی وادلتہ: ۹۷۷/۲، ۹۸۳

مساجد

حضرت جابرؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا: میرے لئے ساری زمین پاک اور مسجد بنادی گئی ہے؛ لہذا جس آدمی کو جہاں وقتِ نماز پالے (یعنی نماز کا وقت آجائے) اسے نماز پڑھ لینی چاہئے۔(۱)

امت محمدیہ کے لئے یہ سہولت وخصوصیت اپنی جگہ مسلم ہے، تاہم روئے زمین کے وہ حصے جنہیں باقاعدہ عبادت وبندگی کے لئے مختص کردیا گیا ہے وہ زمین کے مقدس حصے کہلاتے ہیں، ان میں نماز پڑھنا، عام جگہوں میں نماز پڑھنے سے افضل ہے، ان میں بعض ایسے امور انجام دینے ممنوع ہیں جو اور مواقع پر انجام دیئے جاسکتے ہیں، ان کے چند خاص آداب ہیں جنہیں بجالانا ضروری ہے۔

حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا: جس نے اپنے گھر میں پاکیزگی حاصل کی (وضوکیا) پھر وہ اللہ کا کوئی فریضہ ادا کرنے کے لئے اس کے کسی گھر میں گیا تو اس کا ایک قدم اس کا گناہ مٹاتا ہے اور دوسرا قدم اسکے درجے بلند کرتا ہے(۲)

مسجد میں داخل ہوتے اور مسجد سے نکلتے وقت کی دعا:

حضرت ابوحمیدؓ اور حضرت ابواسیدؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا جب تم میں سے کوئی شخص مسجد میں داخل ہو تو یہ دعا پڑھے:

"اللھم افتح لی ابواب رحمتک "(۳)

---

(۱)بخاری : باب قول النبی ﷺ جعلت لی الارض مسجد او طھور:۴۳۸۱

(۲)باب المشی الی الصلاۃ تمحی به الخطایا:۱۵۵۳

(۳)ابوداؤد تحقیق البانی: باب ما یقوله الرجل عند دخوله المسجد:۴۶۵. صحیح

حضرت فاطمہؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ جب مسجد میں داخل ہوتے تو یہ دعا پڑھتے : " بسم اللہ والسلام علی رسول اللہ ۔اللھم اغفرلی ذنوبی وافتح لی ابواب رحمتک "(۱)

اور جب نکلتے تو یہ دعا پڑھتے :

" بسم اللہ والسلام علی رسول اللہ اللھم اغفر لی ذنوبی وافتح لی ابواب فضلک "(۲)

ایک روایت میں ہے کہ نکلتے وقت یہ دعا پڑھے " اللھم انی اسئلک من فضلک " (۳)

داخل ہونے کا طریقہ:

مسجد میں داخل ہوتے ہوئے دایاں قدم اور نکلتے ہوئے بایاں قدم پہلے رکھنا مستحب ہے۔حضرت انسؓ کہتے ہیں: سنت یہ ہے کہ جب مسجد میں داخل ہوتو پہلے دایاں پاؤں ڈال اور جب نکلے تو پہلے بایاں پیر نکال۔(۴)

تحیۃ المسجد:

حضرت ابوقتادہؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا: جب تم میں سے کوئی شخص مسجد میں آئے تو اسے چاہئے کہ بیٹھنے سے پہلے دو رکعت نماز پڑھ لے(۵)

(۱)مصنف ابن ابی شیبہ: باب ما یقول الرجل اذا دخل المسجد و ما یقول اذا خرج : ۳۴۳۱. صحیح : اعلاء السنن۱۶۵/۵

(۲)مصنف ابن ابی شیبہ: باب ما یقول الرجل اذا دخل المسجد و ما یقول اذا خرج : ۳۴۳۱. صحیح : اعلاء السنن۱۶۵/۵

(۳)ابو داؤد تحقیق الالبانی : باب فیما یقوله الرجل عند دخوله المسجد ۴۶۵. صحیح

(۴)مستدرک مع تعلیقات الذھبی : کتاب الامامة و صلاة الجماعة : ۷۹۱.صحیح

(۵)بخاری : باب اذا دخل المسجد فلیرکع رکعتین :۴۴۴

مسجد کی صفائی ستھرائی کا حکم:

حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے محلوں میں مسجدیں بنانے اور انہیں صاف رکھنے اور ان میں خوشبو کرنے کا حکم دیا(۱)

مسجد میں ممنوع امور:

(۱) گندگی اور بدبو پھیلانا

حضرت انسؓ بن مالک سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا ان مسجدوں میں پیشاب کرنا اور گندگی پھیلانا صحیح نہیں ہے یہ صرف اللہ کا ذکر کرنے اور قرآن کی تلاوت کرنے کے لئے ہیں۔(۲)

حضرت جابرؓ سے راویت ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا جس شخص نے پیاز، لہسن، وغیرہ کھائی ہو وہ ہماری مسجد کے قریب نہ آئے، اس لئے کہ جس چیز سے انسانوں کو تکلیف ہوتی ہے اس سے فرشتوں کو بھی تکلیف ہوتی ہے۔(۳)

البتہ اگر کسی کو یہ تیز بو رکھنے والی اشیاء کھانا ہی ہو تو انہیں پکا کر ان کی بو ختم کر دے(۴)
علامہ عثمانیؒ فرماتے ہیں: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ پکا ہوا لہسن کھا کر مسجد میں آنا منع نہیں ہے۔(۵)

---

(۱)ابوداؤد: تحقیق البانی : باب اتخاذ المسجدفی الدور:۴۵۵. صحیح

(۲)مسلم: باب وجوب غسل البول وغیرہ من النجاسات اذا حصلت فی المسجد: ٦٨٧

(۳)مسلم : باب نھی من اکل ثوما او بصلاا و کراثا او نحوھا عن حضور المسجد : ۱۲۸۲

(۴)مسلم : باب نھی من اکل ثوما :۱۲۸٦

(۵)اعلاء السنن : ۱۷۲/۵

نبی ﷺ ارشاد فرماتے ہیں، مسجد میں تھوکنا برا کام ہے اور (اگر کسی نے کسی وجہ سے ایسا کر دیا ہے تو پھر) اس کا کفارہ اس کو دفن کر دینا ہے (اگر فرش مٹی کی ہو یا ریت کی ہو ورنہ اسے اس طور پر صاف کر دینا چاہئے کہ کوئی اثر باقی نہ رہے) (۱)

(۲) گم شدہ چیز کی تلاش کرنا:

حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا جو شخص کسی کو مسجد میں گم شدہ چیز تلاش کرتے ہوئے دیکھے تو اس سے کہے اللہ کرے تمہاری چیز نہ ملے، اس لئے کہ مسجد اس کام کے لئے نہیں بنائی گئی ہے (۲)

کوئی چیز مسجد کے باہر گم ہوئی ہو اور اس کا اعلان مسجد میں کیا جا رہا ہو تو یہ شکل نہایت قبیح ہے اور اگر مسجد ہی میں گم ہوئی ہے تو نمازیوں اور آداب مسجد کی رعایت کے ساتھ شائستگی سے اعلان کرنا مباح و جائز ہے (۳)

(۳) بلند آواز سے بولنا یا قرآن پڑھنا جب کہ لوگ نماز پڑھ رہے ہوں:

ایک روز نبی ﷺ تشریف لائے دیکھا کہ لوگ بلند آواز سے نماز پڑھ رہے ہیں تو فرمایا: نمازی اپنے رب سے سرگوشی کرتا ہے اس لئے یہ دیکھنا چاہئے کہ وہ اپنے رب سے کیا سرگوشی کر رہا ہے؟ تم میں سے کوئی شخص اس طرح بلند آواز سے قرآن نہ پڑھے کہ دوسرے کو دقت ہو (۴)

رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: بازاروں کے سے شور و شغف سے اجتناب کرو۔ (۵)

(۱) مسلم :باب نهی عن البصاق فی المسجد: ۱۲۵۹ مع فتح الملهم : ۱۴۵/۲

(۲) مسلم: باب النهی عن نشد الضالة فی المسجد: ۱۲۸۸

(۳) معارف السنن :۲۱۳/۳

(۴) مؤطا مالک :باب العمل فی القراءة : ۱۷۷

(۵) مسلم : باب تسویة الصفوف :۱۰۰۲

(۴) فضول قسم کے اشعار پڑھنا:

رسول اللہ ﷺ نے مسجد میں اشعار پڑھنے اور خرید وفروخت کرنے سے منع فرمایا۔(۱)

اس حدیث میں اشعار سے مراد بیہودہ اور فضول قسم کے اشعار ہیں، رہے وہ اشعار جن کا تعلق حمد خداوندی یا نعت نبی یا دینیات سے ہو، ان کو مسجد میں پڑھنا منع نہیں۔

حضرت حسانؓ مسجد نبوی میں سرور دو عالم ﷺ کی منقبت میں اور اسلام کے دفاع میں ممبر نبوی ﷺ پر کھڑے ہو کر اشعار پڑھا کرتے تھے اور آپ ﷺ بنفس نفیس ان کو سنا کرتے تھے اور انؓ کو داد دیا کرتے تھے(۲)

(۵) دنیاوی باتیں کرنا:

محض دنیاوی گفتگو کرنے کی غرض سے مسجد میں آنا سخت معیوب اور گناہ ہے، کیوں کہ اس مقصد کے لئے مساجد کی تعمیر نہیں ہوئی ہے، ارشاد خداوندی ہے: بلاشبہ مسجدیں اللہ تعالیٰ کی ہیں، پس اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی اور کو مت پکارو(۳)

ایک اور جگہ ہے: اللہ تعالیٰ نے حکم دیا کہ ان (مساجد) کی تعظیم کی جائے اور ان میں اللہ کا نام لیا جائے(۴)

رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ایک زمانہ ایسا آئے گا کہ محض دنیا کی باتیں مسجدوں میں ہونے لگیں گی، ایسے لوگوں میں تم نہیں بیٹھنا کیوں کہ ان کی اللہ تعالیٰ کو ضرورت نہیں ہے۔(۵)

---

(۱) ابن ماجه تحقيق البانى : باب ما يكره فى المسجد: ۷۴۹. حسن

(۲) اسد الغابه : ۱ / ۲۵۵ حسان بن ثابتؓ

(۳) سورة الجن : ۱۸

(۴) سورة النور : ۳۵

(۵) مستدرک حاكم مع تعليقات الذهبى : كتاب الرقاق : ۷۹۱۶. صحيح

ہاں، مساجد میں حاضری کا اولین مقصد تو نماز اور عبادت ہی ہو، مگر ضمنی طور پر مباح اور جائز دنیوی گفتگو، آداب مساجد کی رعایت کے ساتھ کر لی جائے تو اس میں کوئی مضائقہ نہیں ہے۔

حضرت جابرؓ سے روایت ہے کہ صبح کی نماز کے بعد سورج نکلنے تک نبی ﷺ اپنی جگہ سے نہیں اٹھا کرتے تھے جب سورج نکل آتا تو آپ ﷺ اٹھتے، اس دوران میں لوگ زمانہ ٔ اسلام سے پہلے کی باتیں کرتے اور ہنستے تھے اور نبی ﷺ مسکراتے تھے(۱)

(۶) نماز جنازہ پڑھنا:

آنحضرت ﷺ نے ایک دفعہ فرمایا کہ جو شخص مسجد میں جنازہ کی نماز پڑھے گا اس کو کچھ نہ ملے گا(۲) آپ ﷺ خود بھی جنازہ کی نماز مسجد میں نہیں پڑھتے تھے۔

علامہ ابن قیمؒ لکھتے ہیں: آپ ﷺ کی سنت اور آپ ﷺ کا دستور مسجد سے باہر نماز جنازہ پڑھنے کا تھا مگر کسی عذر کے وقت نماز جنازہ مسجد میں بھی پڑھ لی جاتی تھی، اور جائز اگر چہ دونوں ہی ہیں مگر افضل جنازہ کی نماز مسجد سے باہر ہی ہے(۳)

ارشاد نبوی ﷺ ہے: اپنی مسجدوں کی حفاظت کرواپنے (بے شعور) بچوں سے، پاگلوں سے، خرید وفروخت سے، جھگڑوں سے، شور وغل سے، اقامت حدود سے، اور تلوار سونتنے سے(۴)

چند چیزیں مسجدوں میں کرنے کی نہیں ہیں، اس کو راستہ نہ بنایا جائے، نہ ان میں

---

(۱)مسلم : باب فضل الجلوس فی مصلاہ: ۱۵۵۷

(۲) ابن ماجه : باب ماجاء فی الصلوة علی الجنائز فی المسجد تحقیق البانی : ۱۵۱۷ . حسن

(۳)زاد المعاد : فی الجنائز : ۴۸۱/۱

(۴) ابن ماجه : باب ما یکره فی المسجد : ۷۵۰. معتبر : اعلاء :۱۶۰/۵

ہتھیار تیز کئے جائیں، نہ کمان پکڑی جائے، نہ تیر پھیلائے جائیں نہ کچا گوشت لے کر گذرا جائے، نہ حد ماری جائے، نہ قصاص لیا جائے، اور نہ اسے بازار بنایا جائے۔(۱)

مسجد میں یہ امور ممنوع نہیں:

کھانا کھانا: بوقت ضرورت مسجد میں کھانا بھی جائز ہے، مسافر و معتکف کے لئے تو عام اجازت ہے، باقی لوگوں کے لئے بھی گاہ بہ گاہ اس کی گنجائش ہے بہتر یہ ہے کہ اس صورت میں اعتکاف کی نیت کرلی جائے، روایت میں ہے کہ ہم لوگ عہد نبوی میں مسجد میں گوشت روٹی کھاتے تھے(۲)

ایک روایت میں ہے کہ آنحضرت ﷺ مسجد میں تشریف فرما تھے آپ ﷺ کی خدمت میں گوشت روٹی حاضر کی گئی، آپ ﷺ نے تناول فرمایا، راوی کہتے ہیں کھانے میں آپ ﷺ کے ساتھ میں بھی تھا، کھانے کے بعد آپ نے اور دوسرے لوگوں نے کنکریوں سے ہاتھ صاف کئے اور پھر نماز پڑھی۔(۳)

البتہ مسجد میں کھانے کے لئے یہ شرط ہے کہ مسجد آلودہ نہ ہونے پائے، ملا علی قاریؒ نے لکھا ہے کہ اس کا لحاظ رکھنا اولی ہے۔(۴)

لیٹنا اور سونا

معتکف اور مسافر مسجد میں سو بھی سکتا ہے، بقیہ لوگوں کے لئے بھی بوقت ضرورت اس کی گنجائش ہے۔

(۱) ابن ماجه : باب ما يكره في المسجد : ۷۴۸. معتبر: اعلاء السنن ۱۶۰/۵

(۲) ابن ماجه : تحقيق الباني : باب الاكل في المسجد : ۳۳۰۰. صحيح

(۳) ابن ماجه: باب الشواء : ۳۳۱۱. يقويه و يعضده الحديث الصحيح: صحيح ابن حبان مع حواشي الارناؤوط: باب ذكر الاباحة للمرء اكل الخبز و اللحم في المسجد: ۱۶۵۷

(۴) مرقاة المفاتيح مع المشكوة : كتاب الأطعمه: ۱۲/ ۴۶۴

فقہاء نے لکھا ہے کہ غیر معتکف کو جب ایسی ضرورت ومجبوری پیش آجائے تو اعتکاف کی نیت کر لے اور تھوڑی دیر نوافل وذکر اللہ میں بھی مشغول رہے(۱)

حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے روایت ہے کہ وہ نبی ﷺ کی مسجد میں استراحت کیا کرتے تھے(۲) حضرت ابن عمرؓ فرماتے ہیں کہ ہم عہد نبوی میں مسجد کے اندر سویا کرتے تھے (۳)

حدیث میں مذکور ہے کہ ایک دن آنحضرت ﷺ اپنی صاحبزادی حضرت فاطمہؓ کے یہاں تشریف لائے، حضرت علیؓ غائب تھے، پوچھنے پر معلوم ہوا کہ خفا ہوکر چلے گئے ہیں، آپ ﷺ جب مسجد میں تشریف لائے تو دیکھا کہ وہ مسجد میں سوئے ہوئے ہیں، چادر پہلو سے ہٹی ہوئی ہے اور پہلو گرد آلود ہورہا ہے، یہ دیکھ کر آپ ﷺ نے شفقت سے گرد جھاڑ دی اور فرمایا: اے ابوتراب اٹھواٹھو (۴) البتہ مسجد کو سونے کا مستقل ٹھکانہ بنانا مناسب نہیں، حضرت ابوذرؓ فرماتے ہیں: ایک دفعہ میں مسجد نبوی میں سویا ہوا تھا، رسولِ خدا ﷺ تشریف لائے اور مجھے اپنے پائے اقدس سے بیدار کیا پھر فرمایا: کیا بات ہے میں تمہیں مسجد میں سویا ہوا دیکھ رہا ہوں؟ حضرت ابوذرؓ نے عرض کیا: یارسول اللہ ﷺ: مجھے آنکھ لگ گئی تھی۔(۵)

حضرت سعد بن ابی وقاصؓ سے مروی ہے کہ نبی ﷺ ایک دفعہ مسجد تشریف لائے تو دیکھا کہ کچھ صحابہ مسجد میں سوئے ہوئے تھے، اس پر آپ ﷺ نے فرمایا: یہاں سے جاؤ یہ کوئی تمہاری خوابگاہ نہیں ہے۔(۶)

---

(۱)رد المحتار ۱/۶۱۹. احسن الفتاوی ۶/۴۵۳

(۲)بخاری : نوم الرجال فی المسجد : ۴۴۰

(۳)ابن ماجه : باب النوم فی المسجد: ۷۵۱

(۴)بخاری : باب نوم الرجال فی المسجد: ۴۱۱

(۵) مسند احمد تحقيق شعيب الارنووط : ۲۱۳۸۲ . اسناده ضعيف

(۶) ناسخ الحديث ومنسوخه للأثرم: اسناده مجهول و منقطع ۴۲/۱

ملا علی قاری فرماتے ہیں: پہلی قسم کی احادیث اور دوسری قسم کی احادیث میں اس طور پر تطبیق ممکن ہے کہ جو صاحب رہائش ہو اس کے لئے مسجد میں مستقل سونا مکروہ ہے ورنہ مکروہ نہیں (۱)

مشرکین کا مسجد میں داخلہ:

عہد نبوی میں مشرکین اور یہود و نصاری کو مسجد میں ٹھہرانے کا رواج تھا، ثمامہ بن اثال گرفتار ہو کر آئے تو ان کو مسجد ہی کے ایک ستون سے باندھا گیا تھا، بعد ازاں وہ مسلمان ہو گئے تھے۔ (۲)

حافظ ابن قیمؒ لکھتے ہیں کہ آپ ﷺ نے وفد ثقیف کو مسجد ہی میں اتارا اور ان کے لئے خیمہ نصب کیا تاکہ وہ قرآن پاک سن سکیں اور مسلمانوں کو نماز پڑھتے ہوئے دیکھ سکیں، اس واقعہ کے نقل کرنے کے بعد لکھا ہے: اس واقعہ سے مسجد میں کافر و مشرک کا اتارنا جائز ثابت ہوا۔ (۳)

---

(۱) مرقاۃ المفاتیح : باب المساجد ۲/ ۳۸۲

(۲) بخاری : باب دخول المشرک المسجد: ۴۶۹

(۳) زاد المعاد جواز انزال المشرک فی المسجد : ۳/ ۵۲۵

سترہ

سترہ کے لفظی معنی پردہ یا اوٹ کے ہیں اور اس سے مراد یہ ہے کہ انسان نماز پڑھتے ہوئے اپنے سامنے کوئی چیز رکھ لے تا کہ کوئی شخص اس کے آگے سے نہ گذرے۔

سترہ کا حکم

ایسی جگہ جہاں لوگوں کے گذرنے کا اندیشہ ہو وہاں اپنے آگے سترہ قائم کر لینا مستحب ہے۔

حضرت ابو سعید خدریؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا: جب تم میں سے کوئی شخص نماز پڑھے تو اسے چاہئے کہ سترہ کی طرف نماز پڑھے اور اسے چاہئے کہ اس کے قریب ہو۔(۱)

حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے کھلی فضا میں نماز پڑھی (جہاں سامنے سے لوگوں کے گذرنے کا اندیشہ نہ تھا) اور آپ ﷺ کے سامنے کوئی چیز بطور (سترہ) نہ تھی۔(۲)

سترہ کی حکمت:

نمازی کے خشوع کو متاثر کرنے والی چیزوں کو نمازی کے سامنے سے گذرنے سے روکنا اور نمازی کے خیال کو نماز ہی میں محدود رکھنا، اِدھر اُدھر جانے سے روکے رکھنا ہے۔(۳)

---

(۱) ابو داؤد: تحقیق البانی: باب الدنو من السترة: ۶۹۵. صحیح

(۲) مسند ابی یعلی ۲۶۰۱ حسن. اعلاء السنن ۵/۷۷

(۳) الفقه الاسلامی وادلته: ۲/ ۹۴۰

سترہ کی صورت:

سترہ کم از کم ایک بالشت لمبا اور ضخامت میں کم از کم انگلی کے بقدر ہو، اگر ایسی صفت کا، سترہ دستیاب نہ ہو تو پھر خشوع وخضوع کی برقراری کی غرض سے، سترہ کے متبادل کے طور پر کسی تدبیر کو اختیار کر لینا زیادہ بہتر ہے۔

حضرت سبرہ بن معبدؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: جب تم میں کوئی نماز پڑھے تو تیر کے ذریعہ سترہ بنالے۔(۱)

علامہ عینیؒ فرماتے ہیں کہ تیر کی لمبائی ایک ہاتھ اور چوڑائی ایک انگلی کے بقدر ہوتی ہے۔(۲)

حضرت طلحہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: جب تم میں سے کوئی اپنے سامنے کجاوہ کی پچھلی لکڑی کے مانند کوئی چیز رکھ لے تو کون اس کے آگے سے گذر رہا ہے اس سے بے فکر ہو کر نماز پڑھ لے۔(۳)

حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا: جب تم میں سے کوئی نماز پڑھے تو اپنے آگے کوئی چیز رکھ لے، اگر نہ پائے تو لاٹھی ہی رکھ لے اگر یہ بھی نہ ملے تو لکیر کھینچ لے، پھر اس کے بعد جو بھی اس کے آگے سے گذرے اس کے لئے کچھ نقصان دہ نہیں (۴)

حضرت ابو ہریرہؓ ہی سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا: (مطلوبہ سترہ نہ ملنے پر) کجاوہ کی پچھلی لکڑی جس طرح کی بھی ہو کافی ہے خواہ وہ بال کی طرح باریک ہی کیوں نہ ہو۔(۵)

---

(۱) مسند احمد :تحقیق شعیب الارنووط۱۵۳۷۸ .حسن

(۲)بنایه : ۱/ ۷۸۹

(۳)مسلم : باب سترة المصلی: ۱۱۳۹

(۴) مسند احمد : تحقیق شعیب الارنؤوط :۷۴۵۴ حسن : بلوغ المرام : باب سترة المصلی۲۳۶

(۵) مستدرک حاکم مع تعلیقات الذهبی:باب التامین : ۹۲۴ . صحیح

سترہ نمازی سے قریب ہو مگر بالکل سامنے نہ ہو:

نبی ﷺ نے فرمایا: نماز پڑھنے والے کو چاہئے کہ سترہ کے قریب ہو(۱)

حضرت مقداد بن اسودؓ سے روایت ہے کہ میں نے جب بھی نبی ﷺ کو کسی ٹہنی یا ستون یا درخت کی طرف نماز پڑھتے ہوئے دیکھا تو یہی دیکھا کہ آپ ﷺ اسے اپنے سامنے نہیں بلکہ کچھ دائیں یا بائیں طرف کئے ہوئے تھے(۲)

امام کا سترہ مقتدیوں کا سترہ ہے:

حضرت انس بن مالکؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: امام کا سترہ، مقتدیوں کا بھی سترہ ہے(۳)

نمازی کے آگے سے گذرنے کی حرمت:

نبی ﷺ نے ارشاد فرمایا اگر نمازی کے سامنے سے گذرنے والا یہ جان لے کہ اس پر کیا گناہ ہوتا ہے تو اس کا یونہی چالیس سال ٹھہر جانا، نمازی کے سامنے گذرنے سے بہتر ہوتا۔(۴)

یہ روایت صحیحین میں بھی ہے لیکن اس میں چالیس سال مذکور نہیں ہے۔ ایک روایت میں یہ حدیث ان الفاظ کے ساتھ بھی آئی ہے کہ: اگر نمازی اور اسکے نماز کی جگہ کے سامنے سے گذرنے والا جان لیتا کہ اس پر کیا گناہ ہے تو وہ چالیس (سال) ٹھہرے رہنے کو نمازی کے آگے سے گذرنے سے بہتر سمجھتا۔(۵)

---

(۱) ابوداؤد :تحقیق البانی :باب الدنو من السترة:۶۹۵. صحیح

(۲)ابوداؤد: باب اذا صلی الی سارية:۶۹۳ .سکت عنه

(۳)طبرانی اوسط : ۴۷۲ حسن:اعلاء السنن۵/۷۷

(۴) مسند بزار : ۳۷۸۲. صحیح: مجمع الزوائد: باب فیمن یمر بین یدی المصلی: ۲۳۰۲

(۵)مسند السراج: ۳۹۱.طبع ادارة العلوم الاثرية. اسناد صحیح : تخریج احادیث الاحیاء: ۵۲۹

اس کے پیش نظر علماء کی ایک جماعت کا کہنا ہے کہ نمازی کے سامنے سے گذرنے کی ممانعت اس کے اور اس کی جائے سجدہ کے درمیانی حصہ ہی تک محدود ہے، جائے سجدہ کے آگے سے گذرنا منع نہیں (فتح الباری:۲/۲۶۵) احتیاط اس میں ہے کہ جائے سجدہ کے آگے اتنے حصہ کے اندر سے نہ گذرا جائے کہ نمازی اگر اپنی سجدہ کی جگہ پر نگاہ مرکوز رکھ کر نماز پڑھے تو آگے سے گذرنے والا اس کو نظر نہ آئے، اس کا اندازہ فقہاء نے دو صف آگے یا تین ہاتھ کے ذریعہ لگایا ہے۔(۱)

فائدہ: مسجد حرام میں طواف کرنے والوں کا نمازیوں کے سامنے سے گذرنا ممنوع نہیں ہے۔

حضرت حسن بن علیؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ حجر اسود کے قریب میں سترہ کے بغیر نماز پڑھ رہے تھے اور مرد و عورت آپ ﷺ کے سامنے طواف کر رہے تھے (۲) باقی غیر طائفین کا نمازیوں کے سامنے سے گذرنا مسجد حرام میں بھی ممنوع ہے، البتہ حنفیہ میں سے امام طحاویؒ اس کا بھی استثناء کرتے ہیں، بعض احادیث سے امام طحاویؒ کے اس موقف کی تائید بھی ہوتی ہے مثلاً: حضرت مطلبؓ فرماتے ہیں: رسول ﷺ کو مسجد حرام میں اس کیفیت کے ساتھ نماز پڑھتے ہوئے دیکھا کہ آپ ﷺ اور لوگوں کے درمیان کوئی سترہ نہ تھا (۳)
تاہم دیگر فقہاء احناف، سابقہ روایات کی روشنی میں یہاں، لوگوں سے طواف کرنے والے لوگ مراد لیتے ہیں۔(۴)

---

(۱) اعلاء السنن : ۵/۸۰

(۲) طبرانی کبیر:۲۶۶۸. ایک راوی متکلم فیه هیں . اعلاء السنن ۵/۸۷

(۳) (مسند احمد تحقیق شعیب الارنؤوط :۲۷۲۸۴. ایک راوی مبهم هے باقی رجال ثقه هیں)

(۴) (اعلاء السنن : ۵/ ۸۴

نمازی کے سامنے سے گذرنے والے کو روکنے کا طریقہ:

نمازی اپنے سامنے سے گذرنے والے کو تسبیح، اشارہ، یا عمل قلیل کے ذریعہ روک سکتا ہے اور متوجہ کر سکتا ہے اگر گذرنے والے کو روکنے میں عمل کثیر ہو جائے تو نماز فاسد ہو جاتی ہے۔

نبی ﷺ نے ارشاد فرمایا: جب نماز میں کوئی معاملہ پیش آجائے تو تسبیح کہنی چاہئے اس لئے کہ جب وہ تسبیح کہے گا تو دوسرا اس کی طرف ضرور متوجہ ہو جائے گا(۱)

عمل کثیر کے ذریعہ نماز کے فاسد ہونے کا بیان سابق میں گذر چکا ہے۔

---

(۱) بخاری : باب ما جاء فی الاصلاح بین الناس: ۲۶۹۰

نماز باجماعت کے احکام

(الف) حکم اور فضیلت:

جمہور کے نزدیک جماعت سنت موکدہ ہے (۱) کوئی عذر لاحق نہ ہو تو جماعت میں شرکت کے لئے مسجد حاضر ہونا ضروری ہے تاہم اس کے باوجود کوئی بے جماعت نماز پڑھ لیتا ہے تو نماز ذمہ سے تو ادا ہو جاتی ہے مگر ترک جماعت کی وجہ سے گنہگار ضرور ہوگا۔ (۲)

فرض نماز میں جماعت سنت موکدہ اور شریعت کا جاری وساری طریقہ ہے، بے عذر ترک جماعت درست نہیں ہے حتی کہ اگر کسی شہر والے اجتماعی طور پر ترک جماعت کے مرتکب ہوتے ہیں تو اولاً انہیں فہمائش کی جائے گی پھر اگر وہ مانتے نہیں تو ان سے جنگ کی جائے گی کیوں کہ نماز باجماعت دین اسلام کی پہچان اور اس کے خصائص میں سے ہے، اس کا قیام واظہار ضروری ہے اور اس کے ترک کرنے پر تنبیہ بھی ضروری ہے۔ (۳)

اب چند احادیث ملاحظہ ہوں:

نبی ﷺ کا فرمان ہے: میرا یہ قطعی ارادہ ہوا کہ موذن کو اذان کہنے کا حکم کروں پھر ایک آدمی کو لوگوں کی امامت کرنے کا حکم دوں، بعد ازاں چند نوجوانوں کو لے کر، جن کے ساتھ لکڑی کے ڈھیر ہوں، ان لوگوں کے پاس جاؤں جو نماز سے پیچھے رہ جاتے ہیں (۴) ایک اور روایت میں ہے کہ جو بے عذر اپنے گھروں میں نماز پڑھ لیتے ہیں ان کو ان کے گھروں سمیت جلا ڈالوں۔ (۵)

---

(۱) الفقه الاسلامی: ۲/۱۱۶۷، نیل الاوطار: ۳/۱۰۵

(۲) اعلاء السنن: ۴/۱۸۶

(۳) فتح الملهم: ۲/۲۱۷

(۴) مسلم: باب فضل صلاة الجماعة: ۱۵۱۴

(۵) ابو داؤد تحقیق البانی: باب فی التشدید فی ترک الجماعة: ۵۴۹ صحیح

مسند احمد کی روایت میں ہے کہ اگر ان کے گھروں میں بے گناہ عورتیں اور بچے نہ ہوتے تو میں ان کو جلا ڈالتا۔(۱)

حضرت ابوالدرداءؓ سے روایت ہے کہ میں نے نبی ﷺ کو یہ فرماتے سنا ہے کہ جس بستی یا گاؤں میں تین آدمی رہتے ہوں اور پھر ان میں جماعت نہیں ہوتی تو یقیناً ان پر شیطان اپنا غلبہ پا چکا ہوتا ہے، لہذا تم ضرور جماعت سے نماز پڑھو اس لئے کہ بھیڑیا، ریوڑ سے دور بکری ہی کو اپنا نوالہ بناتا ہے، (اور انسان کا بھیڑیا درحقیقت شیطان ہے جب وہ (انسان) تنہا ہوتا ہے تو شیطان اسے کھا جاتا ہے)۔(۲)

رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے: ایک شخص کا دوسرے شخص کے ساتھ مل کر نماز پڑھنا اس کے تنہا نماز پڑھنے سے اچھا ہے، اور دو اشخاص کو لے کر نماز پڑھنا ایک شخص کو لے کر نماز پڑھنے سے اچھا ہے اور جتنی تعداد زیادہ ہوتی رہے گی اسی قدر وہ نماز اللہ کے نزدیک پسندیدہ ہے۔(۳)

حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا: جو آدمی "حی علی الفلاح" سنے پھر اس کا جواب نہ دے (مسجد نہ آئے) تو اس نے محمد ﷺ کی سنت کو ترک کر دیا ہے۔(۴)

(ب) عورتوں کا مسجد میں آ کر جماعت میں شریک ہونا:

جماعت میں شرکت وحاضری کی تاکید مردوں کے لئے ہے، عورتوں کے لئے گھر پر نماز پڑھنا بلکہ گھر پر بھی اندر کی کوٹھری میں نماز پڑھنا، مسجد میں آ کر با جماعت نماز

---

(۱) مسند احمد تحقیق شعیب الارنووط: ۸۷۸۲ سند کے ایک راوی ضعیف ہیں

(۲) نسائی تحقیق البانی : باب فی التشدید فی ترک الجماعۃ: ۸۴۷. حسن

(۳) ابو داؤد تحقیق البانی :باب فی فضل الجماعۃ: ۵۵۴. حسن

(۴) طبرانی اوسط:. ۷۹۹ صحیح: مجمع الزوائد: باب التشدید فی ترک الجماعۃ: ۲۱۷۱

پڑھنے سے بہتر ہے(۱)

ابوعمرو شیبانیؒ کہتے ہیں کہ انہوں نے حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کو دیکھا کہ وہ جمعہ کے روز عورتوں کو مسجد سے یہ کہتے ہوئے نکال رہے تھے کہ اپنے گھروں کو جاؤ تمہارے لئے یہی بہتر ہے(۲) مجموعی اعتبار سے جمہور ائمہ اربعہ کا مسلک یہی ہے کہ عورتوں کا جماعت میں شرکت کی غرض سے مسجد آنا مناسب نہیں (۳)

فائدہ: نبی ﷺ کے زمانے میں مردوں کی طرح عورتیں بھی مسجد آیا کرتی تھیں، تاہم زمانہ رسالت میں خواتین کی حاضری کی نوعیت مختلف تھی، ایک تو ان خواتین کے پیش نظر صاحب وحی ﷺ سے استفادہ کرنا ہوتا تھا، دوسرے یہ خواتین ان حدود و قیود کی رعایت کے ساتھ حاضر ہوا کرتی تھیں جو بارگاہ رسالت ﷺ سے ان کے لئے مقرر کئے گئے تھے یعنی خستہ حالت (۴) اور بے خوشبو لگائے ہوئے (۵) مسجد آیا کرتی تھیں نیز ان کا باب الداخلہ مسجد میں الگ مقرر تھا(۶) گویا زمانہ رسالت میں خواتین کی حاضری مشروط ہوا کرتی تھی، بعد کے زمانہ میں خواتین نے ان قیود و شرائط کو نظر انداز کر دیا تو ان کی حاضری بھی ممنوع ہو گئی چنانچہ حضرت عائشہؓ کا فرمان ہے کہ اگر رسول پاک ﷺ اس صورتحال کا مشاہدہ فرما لیتے جو عورتوں نے آپ ﷺ کے وصال کے بعد پیدا کر رکھی ہے تو ضرور آپ ﷺ ان کو مسجد سے روک دیتے جیسے بنی اسرائیل کی عورتوں کو روک دیا گیا تھا(۷)

(۱)مسند احمدتحقیق شعیب الارنؤوط : ۲۷۱۳۵.حسن

(۲)طبرانی کبیر: ۹۳۶۳ :رجاله موثقون : مجمع الزوائد : باب خروج النساء الی المسجد : ۲۱۱۹

(۳)الفقه الاسلامی : ۱۱۷۲/۲

(۴) ابوداؤد تحقیق الالبانی : باب ماجاء فی خروج النساء الی المسجد : ۵۶۵.حسن

(۵)مسلم : باب خروج النساء الی المساجد:۱۰۲۵

(۶)ابو داؤد :تحقیق البانی : باب فی اعتزال النساء فی المساجد عن الرجال: ۴۶۲.صحیح

(۷)مسلم شریف باب خروج النساء الی المساجد۱۰۲۷ مع فتح الملهم : ۷۰،۶۸/۲

(ج) جماعت میں شرکت کے لئے چلنے کا ثواب: مسجد جانے کے لئے انسان کو جتنا زیادہ چلنا پڑے اتنا ہی اس کا ثواب زیادہ ہے، حضرت ابوموسی اشعریؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا: نماز میں سب سے زیادہ اجر اس شخص کا ہے جو سب سے زیادہ چل کر جماعت میں شامل ہوتا ہے(۱)

(د) جماعت کی طرف سکون واطمینان سے چلنا:

مسجد کی طرف جماعت میں شریک ہونے کے لئے دوڑ کر یا تیزی سے نہیں چلنا چاہئے بلکہ سکون واطمینان سے چلنا چاہئے، اس لئے کہ جب انسان نماز کے لئے نکلتا ہے تو وہ نماز ہی میں ہوتا ہے۔

حضرت ابوقتادہؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ کے ساتھ ہم لوگ نماز پڑھ رہے تھے کہ آپ ﷺ نے بعض لوگوں کا شور سنا، جب ہم نماز سے فارغ ہوئے تو حضور ﷺ نے دریافت فرمایا: کیا بات تھی؟ ان لوگوں نے عرض کیا کہ ہم لوگ جماعت کی طرف تیزی سے آرہے تھے ،فرمایا: ایسا نہ کرو جب تم نماز کی طرف آؤ تو اطمینان اور سکون کے ساتھ آؤ جتنی جماعت تم کو مل جائے اس کو پڑھ لو اور جو رہ جائے اسے پوری کرلو۔(۲)

(ہ) جماعت سے رہ جانے کے اعذار:

مندرجہ ذیل حالات میں جماعت سے رہ جانے کی رخصت ہے:

(۱) سخت سردی (۲) سخت گرمی (۳) تیز وتند ہوا (۴) موسلا دھار بارش (۵) کیچڑ آلود راستہ۔ حضرت ابن عمرؓ کے بارے میں منقول ہے کہ انہوں نے ایک سخت سرد اور بادوباراں والی رات میں اذان کہی اور اذان کے آخر میں یہ اعلان بھی فرمایا کہ: لوگو اپنے

---

(۱) بخاری :باب فضل صلاۃ الفجر فی جماعۃ: ۶۵۱

(۲) بخاری : باب قول الرجل فا تتنا الصلاۃ: ۶۳۵

اپنے ٹھکانوں ہی میں نماز پڑھ لو، سنو! ٹھکانوں ہی میں نماز پڑھ لو! پھر فرمایا کہ رسول پاک ﷺ بھی سفر میں، سرد یا بارش والی رات کے موقع پر موذن کو یہ اعلان کرنے کا حکم فرماتے کہ اے لوگو! اپنے ٹھکانوں ہی میں نماز پڑھ لو(۱)

حضرت نعیم بن نحام سے مروی ہے کہ ایک نہایت سرد رات کی صبح، موذن رسول اللہ ﷺ نے اذان فجر کہی، مجھے یہ چاہت ہوئی کہ کاش (اذان کے اختتام پر) موذن یوں کہتا کہ جو جماعت میں نہ آئے اس پر کوئی مضائقہ نہیں، چنانچہ (میری چاہت کے مطابق) موذن نے (بحکم رسول اللہ ﷺ) ایسے ہی کہا(۲)

فقہاء نے شدت کی گرمی کو بھی شدت کی سردی کے حکم میں رکھا(۳)

حضرت ابوالملیح اپنے والد سے روایت کرتے ہیں کہ حدیبیہ کے موقع پر جمعہ کے روز، وہ نبی ﷺ کے ہمراہ تھے اسی اثناء کسی قدر بارش ہوئی (جس کی وجہ سے راستہ میں کیچڑ پیدا ہو گیا تھا اور پھسلن کی کیفیت پیدا ہو گئی تھی) تو رسول اللہ ﷺ نے لوگوں کو اپنے ٹھکانوں ہی میں نماز پڑھنے کا حکم دیا۔(۴)

حضرت عبداللہ بن عباسؓ نے ایک موقع پر (راستوں میں) سخت کیچڑ بن جانے کے سبب اپنے موذن کے ذریعہ یہ اعلان کروایا کہ نماز گھروں ہی میں پڑھ لو مزید فرمایا کہ ایسا عمل خود نبی ﷺ نے بھی کیا ہے۔(۵)

(۶) بیماری (۷) خوف

حضرت ابن عباسؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا جو شخص اذان

(۱) مسلم : باب الصلاۃ فی الرحال فی المطر : ۱۶۳۲، ۱۶۳۳

(۲) مسنداحمد: ۱۷۹۶۳ . قوی: ارواء الغلیل: ۵۵۳ . ۲۰/۳۴۲

(۳) شامی : ۱/ ۵۸۰

(۴) ابو داؤد : تحقیق البانی: باب الجمعۃ فی الیوم المطیر: ۱۰۶۱ . صحیح

(۵) بخاری : باب الرخصۃ ان لم یحضر الجمعۃ فی المطر: ۹۰۱

سنے پھر اسے اذان کی پیروی کرنے سے کوئی عذر خوف یا بیماری نہ روکے تو جو نماز اس نے (بے جماعت کے) پڑھ لی ہے اللہ تعالی اسے قبول نہیں کرتے (۱)

بیماری کے تحت اپاہج، لنگڑا، فالج زدہ، مجبور بوڑھا، ہاتھ و پاؤں کٹا ہوا، سب داخل ہیں (۲) اور خوف عام ہے خواہ جان کا ہو یا مال کا (۳)

(۸) جب کھانا سامنے ہو:

حضرت ابن عمرؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا: جب تم میں سے کسی شخص کے سامنے کھانا آجائے تو اسے جلدی نہیں کرنی چاہئے اور اسے چاہئے کہ اپنی ضروری پوری کرے خواہ نماز کھڑی ہو جائے (۴)

دیگر روایات کی روشنی میں یہ رخصت اس صورت میں ہے جب کہ دل کھانے میں اٹکا ہوا ہو اور وقت میں گنجائش بھی ہو ورنہ تو نماز کو مقدم کرنا ہی ضروری ہے۔

چنانچہ بعض روایات میں یہ بھی ہے کہ جب نماز کھڑی ہو جائے اور تم میں سے کوئی روزہ کی حالت میں ہو تو اسے چاہئے کہ نماز مغرب سے پہلے شام کے کھانے سے فارغ ہو لے اور کھانے میں جلد بازی کا مظاہرہ نہ کرے (۵) ظاہر ہے کہ آدمی جب روزہ سے ہوتا ہے تو اس کا ذہن کھانے کی طرف متوجہ رہتا ہے۔

حضرت جابرؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے ارشاد فرمایا: نماز کو (اپنے وقت سے) نہ کھانے کی وجہ سے موخر کرو اور نہ کسی اور وجہ سے۔ (۶)

---

(۱) ابو داؤد: تحقیق البانی: باب التشدید فی ترک الجماعة : ۵۵۱. صحیح

(۲) درمختار : ۱/ ۵۸۰

(۳) حوالۂ سابق

(۴) بخاری : باب اذا حضر الطعام و : اقیمت الصلاۃ: ۶۷۴

(۵) طبرانی اوسط: ۵۰۷۵ صحیح: مجمع الزوائد: باب الا عذار فی ترک الجماعة: ۲۱۹۱

(۶) ابو داؤد : تحقیق البانی: باب اذا حضر الصلاۃ و العشاء: ۳۷۶۰. ضعیف

پھر یہاں یہ امر بھی ملحوظ رہے کہ سلف صالحین سادہ غذاؤں کے عادی تھے، کھجور، ستو یا دودھ کے چند گھونٹ ہی ان کے دستر خوانوں کی کل کائنات ہوا کرتے تھے، ایسے میں اگر وہ فوری جماعت میں شریک ہونے کے بجائے کھانے کو ترجیح دیا کرتے تو نماز تو در کنار، ان کی جماعت بھی فوت نہیں ہوا کرتی تھی، اب جب کہ پر تکلف اور نوع بہ نوع کھانوں کا شیوع ہو گیا ہے تو ایسی حالت میں کھانے کی مشغولیت جماعت تو جماعت، نماز کے فوت ہونے کا باعث بھی بن سکتی ہے، اس لئے اگر کھانے کا بہت شدید تقاضا نہ ہو تو پہلے اطمینان سے نماز باجماعت پڑھ لے پھر دستر خوان پر آئے (۱)

(۹) جب پیشاب پاخانے کا شدید تقاضا ہو:

حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: کھانے کی موجودگی میں اور بول و براز کے شدید تقاضے کے وقت کوئی نماز نہیں۔ (۲)

(۱۰) سخت ضرورت کے وقت:

حضرت ابوالدرداءؓ فرماتے ہیں کہ انسان کی دین کے بارے میں سمجھ کی ایک علامت یہ بھی ہے کہ اگر اسے نماز کے وقت کوئی ضرورت درپیش ہو تو پہلے وہ اپنی ضرورت پوری کر لے تا کہ جب وہ نماز کی طرف آئے تو پوری دلجمعی کے ساتھ آئے۔ (۳)

احادیث و آثار کے مجموعہ سے یہ قاعدہ کلیہ معلوم ہوتا ہے کہ ہر وہ عذر جس کی وجہ سے آدمی کو جماعت کی حاضری میں غیر معمولی مشقت اٹھانی پڑتی ہو یا جس کی وجہ سے علانیہ اس کی جمعیت خاطر متاثر ہوتی ہو، اس کے پیش آنے پر اسے جماعت کی شرکت

---

(۱) اعلاء السنن: ۲۰۷/۴

(۲) مسلم: باب کراھۃ الصلاۃ مع مدافعۃ الاخبثان: ۱۲۷۴

(۳) بخاری: تعلیقا: باب اذا حضر الطعام واقیمت الصلاۃ

سے رخصت مل جاتی ہے۔(۱)

(و) کتنے آدمیوں کے ملنے سے جماعت بنتی ہے:

امام کے علاوہ کم از کم ایک نمازی ہو تو جماعت ہو جاتی ہے خواہ وہ سمجھ دار بچہ ہو یا عورت ہو، حضرت ابوموسی اشعریؓ سے روایت ہے کہ نبی نے فرمایا: دو یا ان سے زیادہ افراد سے جماعت ہو جاتی ہے۔(۲) حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ میں ایک رات اپنی خالہ میمونہؓ کے یہاں سویا، رات کو نبی ﷺ جب اٹھ کر نماز پڑھنے لگے تو میں بھی آپ ﷺ کے ساتھ شامل ہو گیا، میں آپ ﷺ کی بائیں جانب کھڑا ہو گیا تھا تو آپ ﷺ نے مجھے سر سے پکڑا اور اپنی دائیں جانب کھڑا کر لیا(۳) مسند احمد کی روایت میں یہ الفاظ زیادہ ہیں: اور میں اس وقت دس سال کا تھا(۴) معلوم ہوا کہ سمجھ دار بچہ ہو تو بھی جماعت بن جاتی ہے۔

حضرت ابوسعیدؓ اور حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا: جو شخص رات کو جاگا اور اس نے اپنی بیوی کو بھی جگایا اور پھر دونوں نے نماز پڑھی تو ان دونوں کو الذکرین اللہ کثیراً والذکرات . (اللہ کو بہت یاد کرنے والے مرد اور عورتوں) میں لکھ دیا گیا۔(۵)

اس سے معلوم ہوا کہ امام کے علاوہ تنہا ایک عورت موجود ہو تو بھی جماعت بن سکتی ہے ،البتہ اگر وہ عورت غیر محرم ہو تو پھر ایسی عورت کا امام بننا باعث فتنہ ہونے کی وجہ سے مکروہ ہے۔(۶)

(۱)اعلاء السنن: ۴/ ۲۰۱

(۲)ابن ماجہ : باب الاثنان جماعۃ:۹۷۲ یو یّدہ خبر البخاری:مرقاۃ المفاتیح: باب الجماعۃ۱۰۸۱

(۳)بخاری:باب یقوم عن یمین الامام :۶۹۷.۶۹۸.۶۹۹

(۴)مسند احمد :۳۴۳۷ تحقیق شعیب ار نؤوط: ایک راوی ضعیف ہیں باقی رجال بخاری ومسلم کے رجال ہیں

(۵)ابوداؤد : تحقیق البانی: باب الحث علی قیام اللیل :۱۴۵۳. صحیح

(۶) درعلی الرد: ۱/ ۵۳۹باب الامامۃ

مسجد محلّہ میں جماعت ثانیہ:

مسجد محلّہ میں جماعت ثانیہ کرنا جمہور ائمہ (امام ابوحنیفہؒ، امام مالکؒ وامام شافعیؒ) کے نزدیک مکروہ ہے(۱) بلکہ امام شافعیؒ نے نہایت پرزور انداز میں جماعت ثانیہ کے قیام پر نکیر فرمائی ہے اور اسے سلف صالحین کے طریقہ کے خلاف بتلایا ہے، مزید فرمایا کہ مسجد محلّہ میں جماعت ثانیہ کا رواج امت مسلمہ کی وحدت وجمعیت کے لئے نقصان دہ ہے۔(۲)

ایک موقع پر جماعت سے پیچھے رہ جانے والوں کے متعلق رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: میرا ارادہ یہ ہے کہ میں اپنی جگہ کسی آدمی کو نماز پڑھانے کا حکم کروں اور خود ان لوگوں کے پاس جاؤں جو جماعت سے پیچھے رہ جاتے ہیں پھر ان کے گھروں کو لکڑیوں کا ڈھیر لگا کر جلا ڈالنے کا حکم دیدوں (۳) اس حدیث سے معلوم ہوا کہ ہر مسجد میں ایک ہی جماعت کی جاتی تھی، جماعت ثانیہ کا کوئی تصور ہی نہ تھا، اگر جماعت ثانیہ کا رواج ہوتا تو جماعت اولی سے پیچھے رہ جانے والوں کے تعلق سے اس قدر شدید وعید رسول پاک ﷺ بیان نہ فرماتے۔

چنانچہ خود رسول اللہ ﷺ کے بارے میں منقول ہے کہ ایک دفعہ رسول اللہ ﷺ مدینہ منورہ کے اطراف سے تشریف لائے آپ ﷺ کا ارادہ نماز پڑھنے کا تھا، لیکن آپ ﷺ نے دیکھا کہ لوگ نماز پڑھ چکے ہیں، لہذا آپ ﷺ اپنے گھر چلے گئے اور گھر والوں کو اکھٹا کر کے نماز پڑھائی۔(مسجد میں جماعت ثانیہ قائم نہیں کی)۔(۴)

---

(۱)ترمذی: باب ما جاء فی الجماعۃفی مسجد قد صلّی فیہ مرّۃ : ۲۲۰

(۲)کتاب الام فضل الجماعۃو صلاۃ معھم: ۱/۱۵۴۔۱۵۵

(۳)مسلم باب فضل صلاۃ الجماعۃ : ۱۵۱۴

(۴)طبرانی اوسط : ۴۶۰۱ رجالہ ثقات :مجمع الزوائد : باب فیمن جاء الی المسجد فوجد الناس قد صلوا:۲۱۷۷

حضرت سالمؒ بن عبد اللہؓ بن عمرؓ سے لوگوں نے ایک موقع پر جماعت ثانیہ کی درخواست کی تو فرمایا: ایک مسجد میں ایک ہی نماز دو دفعہ باجماعت نہیں پڑھی جاسکتی۔(۱)

حضرت سالمؒ کے والد بزرگوار حضرت عبد اللہ بن عمرؓ سے بھی یہی بات منقول ہے(۲)

فائدہ: بخاری شریف میں ہے کہ حضرت انسؓ نے ایک مسجد میں اذان واقامت، کہہ کر جماعت ثانیہ فرمائی تھی (۳) محدثین کا خیال یہ ہے کہ مسجد مذکور شاید راستہ کی مسجد تھی جس کا کوئی امام وموذن مقرر نہ تھا اور ایسی مسجد میں جماعت ثانیہ کسی کے یہاں مکروہ نہیں ہے، یہ خیال اس بنا پر بھی قرین قیاس معلوم ہوتا ہے کہ یہاں حضرت انسؓ نے باقاعدہ اذان اقامت کہہ کر جماعت ثانیہ فرمایا تھا، حالاں کہ جو لوگ جماعت ثانیہ کے قائل ہیں وہ بھی تکرار جماعت کی صورت میں اذان کی تکرار کو نادرست سمجھتے ہیں (۴) ایسے ہی ترمذی شریف کی ایک روایت ہے کہ ایک شخص ایسے وقت حاضر ہوا جب کہ رسول اللہ ﷺ نماز پڑھا چکے تھے، رسول اللہ ﷺ نے (اسے دیکھ کر) فرمایا: کون ہے جو اس پر تجارت کرے گا؟ (اس کو جماعت کا ثواب دلا کر خود بھی شریک اجر ہوگا) ایک شخص کھڑا ہوا اور اس آنے والے کے ساتھ نماز پڑھ لیا (۵) اس روایت کے ذریعہ جماعت ثانیہ کے ثبوت پر استدلال اس لئے نہیں کیا جاسکتا کہ یہاں دوسری بار جماعت میں شریک ہونے والا نفل کی نیت سے شریک ہو رہا ہے فرض نماز تو وہ رسالت مآب ﷺ کی اقتداء میں ادا کر چکا ہے اور یہ چیز ممنوع نہیں، ممنوع تو وہ صورت ہے کہ جب امام اور مقتدی فرض نماز کی ادائیگی کے لئے جماعت ثانیہ کر رہے ہوں۔(۶)

---

(۱) المدونة الکبری لمالک : ۱/۹۰ رجاله کلهم ثقات : اعلاء السنن ۴/۲۸۰

(۲) ابو داؤد: باب اذا صلی فی جماعة ثم ادرک جماعة یعید

(۳) بخاری : تعلیقا: باب فصل صلاة الجماعة

(۴) اعلاء السنن : ۴/۲۸۰

(۵) ترمذی : باب ما جاء فی مسجد قد صلی فیه مرة : ۲۲۰ . حسن امام ترمذی

(۶) اعلاء السنن : ۴/۲۸۰

امامت کا بیان

(الف) امام کن صفات کا حامل ہو:

امام کے لئے ضروری ہے کہ وہ نماز کی درستگی وفساد سے تعلق رکھنے والے ضروری مسائل سے واقفیت رکھتا ہو، معاصی اور گناہ کے کاموں سے اجتناب کرتا ہو، بقدر واجب قرآن کا حافظ ہو، بقدر ضرورت علم تجوید سیکھا ہوا ہو، نبی ﷺ نے ارشاد فرمایا: اگر تم کو اس بات سے مسرت ہو کہ تمہاری نمازیں مقبول ہوں تو تمہارے بھلے لوگ تمہارے امام ہونے چاہئے (۱) ایک اور روایت میں ہے: چاہئیں کہ تمہارے علماء تمہارے امام ہوں، اس لئے کہ ائمہ حضرات، تمہارے اور تمہارے پروردگار کے درمیان ترجمان ہوتے ہیں (۲)

امامتِ صلاۃ درحقیقت نبی ﷺ کی، جو دنیا وآخرت کے پیشوا اور امام ہیں، نیابت کا ایک حصہ ہے، چوں کہ نبی ﷺ تمام اوصاف حمیدہ کے جامع اور نمونہ قرآن ہیں، اس لئے آپ ﷺ کی ہدایت یہ رہی کہ جو شخص آپ ﷺ کی نیابت کرے اس میں بھی ان اوصاف کا پرتو موجود ہو چنانچہ متعدد ارشادات کے ذریعہ بنی ﷺ نے امام کی صفات اور امامت کے معیارات کو بیان فرمایا ہے (۳)

نبی ﷺ نے ارشاد فرمایا: لوگوں کی امامت، ان میں کتاب اللہ کا جو سب سے بڑا قاری ہو وہ کرے، پس اگر وہ قرأت میں برابر ہوں تو جوان میں سنت (دین) کا سب کے بڑا عالم ہو وہ کرے پس اگر وہ سنت میں بھی برابر ہوں تو جوان میں ہجرت کے لحاظ سے قدیم

---

(۱) مستدرک حاکم مع تعلیقات الذھبی ذکر مناقب مرثد بن ابی مرثدالغنوی: ۴۹۸۱ .سکت علیه الحاکم و الذھبی

(۲) طبرانی کبیر : ۷۷۷.حسن لغیرہ: اعلاء۴/۲۱۹

(۳) فتح الملھم : ۲/۲۳۱

ہو وہ کرے پھر اگر ہجرت کے معاملہ میں بھی سب ایک جیسے ہوں تو جو ان میں زیادہ عمر والا ہو وہ امامت کرے۔(۱)

حضرت عقبہ بن عمر وابو مسعود انصاریؓ ہی سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے ارشاد فرمایا: جو دین کی زیادہ سمجھ بوجھ رکھنے والا ہے وہ قوم کی امامت کرے اور اگر اس صنف میں تمام لوگ، برابر ہوں تو جو سب سے بڑا قاری قرآن ہو وہ امامت کرے۔(۲)

حضرت عطاءؒ کہتے ہیں کہ صحابہ کرام کا کہنا تھا کہ قوم کی امامت، ان میں کا فقیہ ترین آدمی کرے، اگر فقہ میں وہ سب برابر ہوں تو جو ان میں کا بڑا قاری ہو وہ کرے اور اگر اس میں بھی برابر ہوں تو جو ان میں بڑی عمر والا ہو وہ کرے۔(۳)

یہاں بظاہر حدیث اول اور حدیث ثانی وثالث میں تعارض معلوم ہوتا ہے کہ حدیث اول میں تو قاری کو عالم وفقیہ پر مقدم رکھا گیا ہے اور دوسری وتیسری حدیث میں اس کے برعکس عالم وفقیہ کو قاری پر مقدم کیا گیا ہے۔

اصل بات یہ ہے کہ قاری کا جو مصداق ابتداء اسلام میں پایا جاتا تھا بعد میں وہ باقی نہ رہا، دور اول کے جملہ صحابہ جو قاری ہوتے تھے وہ دین کی کافی سمجھ بوجھ رکھنے والے بھی ہوا کرتے تھے، بعد کے دور میں یہ صورتحال نہیں رہی کہ جو قاری ہو وہ فقیہ بھی ضرور ہو، وجہ اس کی یہ تھی کہ جو صحابہ دور اول میں اسلام لائے وہ حفظ وقرأت قرآن اور فہم قرآن دونوں کو ایک ساتھ لے کر چلتے تھے، بعد میں جو نسل اسلام میں پیدا ہوئی وہ اپنی عمر کے ابتدائی حصہ میں قرآن سیکھا کرتی تھی پھر آگے چل کر دین کی سمجھ بوجھ میں کمال پیدا کیا کرتی تھی، چنانچہ

---

(۱)مسلم : عن ابی مسعود الانصاری : باب من احق با لامامة ۱۵۶۴

(۲)مستدرک حاکم مع تعلیقات الذهبی:۸۸۷. سکت علیه الحاکم و الذهبی

(۳) کتاب الام : اجتماع القوم فی منزلهم سواء ۱۵۸/۱ . صحیح:اعلاء السنن ۲۱۷/۴

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کا فرمان ہے،ہم دس آیتوں سے اس وقت تک آگے نہیں بڑھتے تھے جب تک کہ ان کے احکام اور اوامر و نواہی کی معرفت حاصل نہ کر لیں (۱)

ایک زمانہ کے بعد یہ صورتحال بھی عمومی طور پر برقرار نہ رہی ، بہت سے لوگ نرے قاری ہوکر رہ گئے ،قرآن فہمی کی طرف ان کی مطلق توجہ نہ ہوئی ،اس پس منظر میں حضرت عبد اللہ بن عمرؓ فرماتے ہیں کہ: ہم قرآن سے قبل ایمان کے خوگر ہو چکے تھے، حال یہ تھا کہ کوئی سورت جناب محمد رسول اللہ ﷺ پر اترتی تو ہم اس کے حلال وحرام کو اور اس کے اوقاف کو سیکھتے جیسے تم لوگ قرآن سیکھتے ہو، پھر میں نے بعض ایسے لوگوں کو دیکھا جو ایمان (کے راسخ ہونے) سے قبل ،قرآن کو لئے ہیں تو وہ سورۃ فاتحہ سے ختم قرآن تک پڑھ جاتے ہیں مگر یہ پتہ نہیں ہوتا کہ قرآن انہیں کیا حکم دے رہا ہے اور کس سے روک رہا ہے اور قرآن میں کہاں کہاں اوقاف کرنے چاہئیں ،بس وہ بے قاعدہ قرآن پڑھتے چلے جاتے ہیں (۲)

غرض معلوم ہوا کہ اصل مطلوب اور اہمیت کی حامل چیز تفقہ اور قرآن فہمی ہے ،دور اول میں چوں کہ دینی سمجھ بوجھ ہر ایک کو فی الجملہ حاصل تھی ، نیز حفاظت قرآن کے مقصد کے پیش نظر لوگوں کو قرآن کے حفظ کی ترغیب دینا بھی عین مصلحت تھا ،اس لئے حفظ اور قرأت قرآن کی زیادتی کو وجہ ترجیح بنایا گیا کہ بسہولت اس کا ادراک ہوسکتا ہے، بعد میں اس صورتحال میں فرق پیدا ہو گیا تو بقدر ضرورت قرأت وحفظ کو مدنظر رکھنے کے ساتھ علم فقہ ہی کو وجہ ترجیح قرار دیدیا گیا ،اس کی تائید اس سے بھی ہوتی ہے کہ نبی ﷺ نے اپنی حیات مبارکہ کے آخری ایام میں حضرت ابو بکرؓ کو منصب امامت پر فائز فرمایا تھا، حالاں کہ حضرت ابو بکرؓ

---

(۱)الاتقان فی علوم القرآن النوع الثامن و السبعون فی معرفة شروط المفسر وادابه:۶۲۸۸. مصنف عبد الرزاق عن ابی عبد الرحمان السلمی. باب تعلیم القرآن و فضله:۶۰۲۷ صحیح : احمد شاکر :مباحث فی علوم القران: التعریف بالعلم وبیان نشأته ۶/۱..فتح الملهم : ۲/۲۳۰

(۲) مستدرک حاکم مع تعلیقات الذهبی :کتاب الایمان : ۱۰۱ . صحیح

گو تمام صحابہ میں سب سے بڑے عالم تھے(۱) مگر سب سے بڑے قاری نہ تھے بلکہ سب سے بڑے قاری حضرت ابی بن کعب تھے(۲) معلوم ہوا کہ اعلم (علم میں بڑا) اقرأ (قرأت میں بڑا) پر فوقیت رکھتا ہے(۳)☆

تفصیل بالا سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ: امامت کا زیادہ حقدار:

(۱) وہ شخص ہے جو دین کی (بالخصوص مسائل نماز کی) زیادہ سمجھ بوجھ رکھنے والا ہو (بقدر ضرورت علم تجوید و قرأت و حفظ قرآن کے ساتھ ساتھ)

(۲) پھر وہ شخص ہے جو کتاب اللہ کا بڑا قاری ہو۔

(۳) پھر وہ ہے جو ہجرت کے اعتبار سے قدیم ہو۔

فقہاء کرام نے ہجرت کا رواج نہ ہونے کی بناء پر، گناہوں اور خطاؤں سے زیادہ اجتناب کرنے والے (متقی) کو تیسرے درجہ پر رکھا ہے، اس لئے کہ احادیث کی رو سے ایسا شخص بھی مہاجر (معنوی) کہلاتا ہے، ارشاد نبوی ہے: مہاجر وہ شخص کہلاتا ہے جو اللہ کی منع کردہ چیزوں کو ترک کردے(۴)

(۴) پھر وہ ہے جو عمر میں زیادہ ہو۔

حضرت مالک بن حویرثؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے (دو مسافر صحابہ سے)

---

(۱) بخاری : باب اهل العلم و الفضل احق با لامامة: ۶۷۸

(۲) مستدرک حاکم : مع تعليقات الذهبی : ذکر مناقب ابی بن کعبؓ: ۵۳۲۸ سکت عنه الحاکم و الذهبی

(۳) اعلاء السنن : ۴/۲۱۷. ۲۲۲

☆ یہی امام مالکؒ و شافعیؒ کی بھی رائے ہے البتہ امام احمدؒ کے نزدیک اقرأ کو افقہ پر فوقیت حاصل ہے. الفقه الاسلامی : ۲/۱۲۰۱

(۴) بخاری: باب المسلم من سلم المسلمون من لسانه و یده: ۱۰

فرمایا: جب نماز کا وقت ہو جائے تو اذان کہو اور اقامت دو پھر جو تم میں کا بڑا ہو وہ امامت کرے(۱)

(۵) پھر وہ جو زیادہ خوش اخلاق ہو۔

بعض روایات میں ہے کہ اگر وہ عمر میں برابر ہوں تو ان میں جو حسن صورت رکھنے والا ہو وہ امامت کرے(۲) سلف کے مطابق اس سے مراد حسن کردار واخلاق ہے(۳)

(۶) پھر وہ جو عمدہ نسب والا ہو۔

نبی ﷺ نے ارشاد فرمایا: تمہارے بھلے لوگ تمہارے امام ہونے چاہئیں (۴)

عمدہ نسب والا بالعموم گھٹیا نسب والے سے عادات واطوار میں فائق و برتر ہوتا ہے، رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: سونے اور چاندی کی کانوں کی طرح انسانوں کی مثال بھی کانوں جیسی ہے جو ان میں زمانۂ جاہلیت میں اچھا تھا وہ قبول اسلام کے بعد بھی اچھا رہا جب کہ دین کی سمجھ حاصل کر لی(۵)

(۷) پھر وہ جو خوش آواز رکھنے والا ہو۔

نبی ﷺ نے ارشاد فرمایا، اچھی آواز رکھنے والا بندہ جب خوش آوازی کے ساتھ قرآن پڑھتا ہے تو اللہ تبارک وتعالی اس کی جانب اس سے زیادہ توجہ فرماتے ہیں جتنا کہ ایک گلوکارہ کا مالک، گلوکارہ کی آواز کی طرف توجہ کرتا ہے۔(۶)

---

(۱)بخاری : باب سفر الاثنین: ۲۸۴۸

(۲)السنن الکبری للبیھقی : باب من قال یو مھم احسنھم ان صح الخبر:۵۵۰۵. اشارالبیھقی الی تضعیفه

(۳)تلخیص الحبیر : ۹۷/۲ کتاب صلاۃ الجماعة

(۴)مستدرک حاکم مع تعلیقات الذهبی: ذکر مناقب مرثد بن ابی مرثد الغنوی: ۴۹۸۱. سکت علیه الحاکم و الذهبی

(۵)بخاری : باب قول الله تعالی : یایھاالناس انا خلقناکم من ذکر و انثی : ۳۴۹۳

(۶)صحیح ابن حبان تحقیق شعیب الارنووط باب قراءۃ القرآن : ۷۵۴ حسن

(۸) پھر پاکیزہ لباس والا:

نبی ﷺ نے ارشاد فرمایا: اللہ تعالی جمیل وخوبصورت ہے اور خوبصورتی و جمال کو پسند فرماتا ہے(۱)

فائدہ: خلیفہ وقت اپنے حدود سلطنت میں، صاحب خانہ اپنے مکان میں، مسجد کا امام اپنی مسجد میں جب کہ ان کے اندر امامت کے ضروری شرائط موجود ہوں تو یہ حضرات دوسروں کے مقابلہ امامت کا زیادہ حق رکھتے ہیں خواہ دوسرے لوگ علم وفقہ وغیرہ میں ان پر فائق ہوں۔

حضرت ابو مسعودؓ انصاری سے مروی ہے کہ نبی ﷺ نے ارشاد فرمایا: آدمی کے افراد خانہ میں کوئی اور شخص اس کی امامت نہ کرے اور نہ اس کے دائرہ اختیار میں کوئی اس کا امام بنے الّا یہ کہ وہ خود (صاحب خانہ یا سلطان) اس کی اجازت دے دے۔ (۲)

حضرت ابن مسعودؓ ارشاد فرماتے ہیں: سنت یہ ہے کہ خود صاحب خانہ امامت کے لئے آگے بڑھے۔ (۳)

حضرت عبداللہ بن عمرؓ کسی کام سے مدینہ منورہ کے ایک محلّہ میں تشریف لے گئے، نماز کا وقت آیا تو وہاں کی قریبی مسجد میں تشریف لے گئے، مسجد کا امام حضرت عبداللہ بن عمرؓ کا آزاد کردہ (صاحب علم وفضل) غلام تھا، امام مسجد نے حضرت ابن عمرؓ سے نماز پڑھانے کی درخواست کی تو حضرت ابن عمرؓ نے جواب میں فرمایا کہ تم اپنی مسجد میں مجھ سے زیادہ امامت کے حقدار ہو، چنانچہ انہی امام صاحب نے نماز پڑھائی۔ (۴)

(۱) مسند احمد : تحقیق شعیب الارنوط : مسند عبداللہ بن مسعودؓ : ۳۷۸۹. صحیح لغیرہ

(۲) مسلم : باب من احق بالامامة : ۱۵۶۴

(۳) طبرانی کبیر : ۸۴۱۴ صحیح . مجمع الزوائد : باب امامة الرجل فی رحله : ۲۳۳۳

(۴) مسند الشافعی : الباب السابع فی الجماعة : ۳۲۱. السنن الکبری للبیهقی : باب الامام الراتب اولی من الزائر : ۵۵۳۱ حسن : ارواء الغلیل : ۵۲۲

(ب) وہ لوگ جن کی امامت مکروہ ہے:

(۱) فاسق وفاجر

نبی ﷺ کا ارشاد مبارک ہے، تمہارے بھلے لوگ تمہارے امام ہونے چاہئیں۔(۱) تاہم کوئی فاسق وبدکار آدمی بزور طاقت امام بن گیا ہو، اسے برطرف کرنا قدرت واختیار میں نہ ہو، اور اس کے پیچھے نماز پڑھے بغیر چارہ کار بھی نہ ہو تو اس کے پیچھے نماز پڑھ لینے سے کوئی کراہت یا جماعت کے ثواب میں کوئی کمی واقع نہیں ہوتی۔

ارشاد نبوی ہے: کوئی بدکار آدمی، کسی صالح مومن کا امام نہ بنے، ہاں اگر وہ تلوار اور کوڑے کی طاقت سے امام بن جائے (تو پھر اس میں صالح مومن کا کوئی قصور نہیں، اسے بدستور جماعت کا بھرپور ثواب ملے گا)(۲)☆

ایسی ہی ناگوار صورتحال کے بارے میں ارشاد نبوی ہے کہ ہر امام کے پیچھے (خواہ متقی ہو یا فاسق) نماز پڑھو۔(۳)

اور عمل صحابہ بھی ہے کہ حضرت عبداللہ بن عمرؓ، حجاج بن یوسف (جیسے ظالم وفاجر) کے پیچھے نماز پڑھ لیا کرتے تھے۔(۴)

حضرت حسنؓ وحسینؓ مروان کے پیچھے نماز پڑھ لیا کرتے تھے اور اعادہ بھی نہیں

---

(۱) مستدرک حاکم مع تعلیقات الذهبی: ذکر مناقب مرثد بن ابی مرثد الغنوی: ۴۹۸۱. سکت علیه الحاکم والذهبی

(۲) ابن ماجه: باب فی فرض الجمعه: ۱۰۸۱

☆ سند کے لحاظ سے یہ اگرچہ ضعیف ہے تاہم معتبر وقابل استدلال ہے (اعلاء السنن: ۲۲۹/۴)

(۳) طبرانی کبیر: ۱۶۷۸۳. الاسناد منقطع وهو حجة عند الاصحاب اعلاء السنن ۲۳۱/۴

(۴) مصنف ابن شیبه: فی الصلوة خلف الامراء: ۷۶۴۱. صحیح. ارواء الغلیل: ۵۲۵

کرتے تھے (۱) عبدالکریم البکاء کہتے ہیں: میں نے دس صحابہ کرام کو ایسے پایا کہ وہ ظالم حکمرانوں کے پیچھے نماز پڑھ لیتے تھے (۲)

(۲) غلام (۳) گنوار (۴) نابینا (۵) ولد الزنا، ان کی امامت بھی مکروہ ہے، دو وجہ سے ایک تو اس بنا پر کہ حصول علم کے مواقع ان کو میسر نہیں ہوتے، دوسرے اس لئے کہ لوگوں کی نگاہوں میں ان کی وقعت نہیں ہوتی، لوگ ان سے خوش نہیں رہتے اور حدیث پاک میں ہے کہ وہ امام، جس سے مقتدی راضی نہیں، اس کی نماز اس کے کانوں سے بھی اوپر نہیں اٹھتی (چہ جائیکہ بارگاہ خداوندی اور عرش معلیٰ تک رسائی ہو) (۳)

حضرت سمرہؓ فرماتے ہیں کہ نبی ﷺ مہاجرین کو آگے بڑھنے اور اگلی صفوں میں رہنے کا حکم فرمایا کرتے تھے اور یوں ارشاد فرماتے کہ یہ لوگ، بے وقوفوں اور گنواروں سے کہیں زیادہ نماز کی جانکاری رکھتے ہیں، میں نہیں چاہتا کہ گنوار لوگ، ان کے امام بنیں حالاں کہ انہیں یہ بھی پتہ نہ ہو کہ نماز کیسے ہوتی ہے؟ (۴)

معلوم ہوا کہ ان لوگوں کی امامت کے مکروہ ہونے کی وجہ، ان کی لاعلمی اور بے وقعتی ہے، پس اگر یہ لوگ علم وفضل سے آراستہ ہوجائیں اور معاشرہ میں شرف وعزت حاصل کرلیں تو ان کے امام ہونے میں کسی قسم کی کراہت نہیں۔

---

(۱) السنن الکبری للبیهقي: باب الصلوة خلف من لا یحمد فعله: ۵۰۸۶. ۵۰۸۷. صحیح: ارواء الغلیل: ۵۲۶

(۲) التاریخ الکبیر للامام البخاریؒ: باب عبد الکریم: ۱۸۰۰

(۳) ترمذی تحقیق الالبانی: /باب فیمن ام قوما وهم له کا رهون: ۳۶۰. حسن

(۴) مسند بزار: ۴۶۴۵ اسناد ضعیف: مجمع الزوائد: باب فیمن یستحق ان یکون فی الصف الاول: ۲۵۲۵

چنانچہ حضرت عائشہؓ کے باکمال غلام ابو عمرؒ کے پیچھے بعض صحابہ اور جلیل القدر تابعین کا نماز پڑھنا ثابت ہے۔(۱) مشہور نابینا صحابی حضرت عبداللہ بن ام مکتومؓ کو ایک موقع پر خود نبی پاک ﷺ نے، مدینہ میں نماز وغیرہ امور کے متعلق اپنا جانشین بنایا تھا۔(۲) حضرت ابراہیم نخعیؒ فرماتے ہیں: گنوار آدمی، غلام اور ولد الزنا جب نماز قائم کرنے کی صلاحیت رکھتے ہوں تو ان کے امام بننے میں کوئی حرج نہیں ہے۔(۳)

(ج) امام اور مقتدی کے باہمی ربط کی نوعیت:

شریعت کی نظر میں امام و مقتدی کی نماز یکساں و متحد شمار کی جاتی ہے یعنی مقتدیوں کی نماز، امام کی نماز میں ضم رہتی ہے، جس کے دلائل درج ذیل ہیں:

(۱) شریعت نے امامت کا زیادہ حقدار، اس شخص کو قرار دیا ہے، جو فضل و کمال میں باقی افراد سے بڑھا ہوا ہو۔(۴) یہ اس وجہ سے ہے کہ انسان جس طرح سفر کے لئے عمدہ سواری کا انتخاب کرتا ہے تاکہ آرام کے ساتھ سفر ہو سکے، اسی طرح شریعت نے عمدہ امام کے انتخاب کرنے کو کہا ہے تاکہ مقتدیوں کی نماز عمدہ ہو سکے، کیوں کہ ان کی نماز، فضیلت و نقصان میں امام کی نماز کے تابع ہے جیسے سوار آدمی، تیز رفتاری اور سست رفتاری، کج روی اور راست روی میں سواری کے تابع ہوتا ہے، نبی ﷺ نے ارشاد فرمایا: اگر تم یہ بات پسند کرتے ہو کہ تمہاری نمازیں مقبول ہوں تو تمہارے بھلے اور نیک لوگ،(۵) ایک راویت کے مطابق تمہارے

---

(۱)مسند الشافعي:الباب السابع في الجماعة: ۳۱۴.صحيح او حسن:خلاصة الاحكام:ابواب صفةالائمه: ۲۴۱۹

(۲)مسند احمد تحقيق شعيب الارنووط:مسند انس بن مالک:۱۳۰۲۳.حسن

(۳)مصنف عبد الرزاق :هل يوم ولدالزنى:۳۸۳۸. صحيح

(۴) مسلم : باب من احق بالامامة :۱۵۶۴

(۵)مستدرک حاکم مع تعليقات الذهبي : ذکر مناقب مرثد ابن ابي مرثد : ۴۹۸۱. سکت عليه الحاکم والذهبي

علماء، تمہارے امام ہونے چاہئیں کیوں کہ ائمہ حضرات تمہارے اور تمہارے پروردگار کے درمیان ترجمان ہوتے ہیں۔(۱) اس سے معلوم ہوا کہ امام اور مقتدیوں کی نماز متحد ہے۔

(۲) شریعت کی نظر میں، امام کی نماز کا فساد، مقتدیوں کی نماز کو بھی متاثر و فاسد کردیتا ہے، اس کے برخلاف مقتدی کی نماز کا فساد خود اس کی نماز تک محدود رہتا ہے امام کی نماز کو متاثر نہیں کرتا۔

نبی ﷺ کا ارشاد: امام ضامن ہوتا ہے(۲) یعنی نماز کی صحت و فساد کے اعتبار سے ذمہ دار، امام ہوتا ہے نہ کہ مقتدی۔(۳)

سفیان ثوریؒ سے منقول ہے کہ میں نے حضرت حمادؒ کو فرماتے ہوئے سنا ہے کہ جب امام کی نماز فاسد ہوجائے تو مقتدیوں کی نماز بھی فاسد ہوجاتی ہے۔(۴) معلوم ہوا کہ امام کی نماز مقتدیوں کی نماز کو ضم کیے رہتی ہے۔

(۳) امام کے سہو سے خود اس پر اور تمام مقتدیوں پر سجدہ سہو لازم ہوجاتا ہے مگر مقتدی کے سہو سے نہ اس پر سجدہ سہو لازم ہوتا ہے نہ دوسرے مقتدیوں پر اور نہ امام پر، متعدد صحابہ و تابعین سے یہ مسئلہ منقول ہے۔(۵) معلوم ہوا کہ امام کی نماز مقتدیوں کی نماز کو ضم کیے رہتی ہے۔

---

(۱) طبرانی کبیر: ۷۷۷. حسن لغیرہ: اعلاء السنن ۲۱۹/۴

(۲) ترمذی تحقیق الالبانی: باب ما جاء ان الامام ضامن: ۲۰۷. صحیح

(۳) عمدۃ القاری ۲۳۹/۵ باب اذا طول الامام و کان للرجل حاجة.

(۴) مصنف عبد الرزق: باب الرجل یؤم القوم: ۳۶۵۹ کتاب الاثار لامام محمد: باب مایقطع الصلوة عن ابراهیم النخعیؒ: ۱۳۲. صحیح

(۵) مصنف عبد الرزاق: باب هل علی من خلف الامام سهو: ۳۵۰۲، ۳۵۰۹. مصنف ابن ابی شیبه: الامام یسهو فلا یسجد: ۴۵۵۶، ۴۵۶۱. سکت علیه المحقق محمد عوامه

(۴) شرعی حکم ہے کہ امام کا سترہ، مقتدیوں کے لئے بھی کافی ہے (۱) امام بخاری اور دیگر اصحاب صحاح نے اس کو ترجمۃ الباب بنایا ہے۔ یہ مسئلہ بھی دلالت کرتا ہے کہ امام اور مقتدیوں کی نماز ایک (متحد) ہے۔

(۵) عربی زبان کا قاعدہ ہے کہ جب واحد کی اضافت جمع کی طرف ہوتی ہے تو مضاف ایک ہوتا ہے اور مضاف الیہ متعدد ہوتا ہے مثلاً کتابھم (ان کی کتاب) ابوھم (ان کے والد) پس کتاب، اور والد ایک ہیں اور مالک اور بیٹے متعدد ہیں، اور جب جمع کی اضافت جمع کی طرف ہوتی ہے تو مضاف اور مضاف الیہ دونوں متعدد ہوتے ہیں جیسے أخذوا أقلامھم (انہوں نے اپنے اپنے قلم لئے) یہاں اشخاص بھی متعدد ہیں اور قلم بھی، خلاصہ یہ کہ اضافت کی پہلی صورت میں جمع کے تمام افراد واحد میں شریک رہتے ہیں اور دوسری صورت میں علیحدہ علیحدہ، جمع کے تمام افراد پر شئی کی تقسیم ہوتی ہے، اب تمام احادیث پر نظر ڈال لیجئے اور عرف کو بھی دیکھ لیجئے کہ سب جگہ صلوۃ الجماعۃ کہا جاتا ہے، کسی جگہ صلوات الجماعۃ نہیں ملے گا، اس سے بھی ثابت ہوا کہ کل جماعت کی نماز ایک ہے، اور امام کی نماز میں شامل ہے۔ (۲)

امام و مقتدی کے اس باہمی ربط و تعلق (کہ امام کی نماز اصل اور مقتدیوں کی نماز کو اپنے اندر ضم اور شامل کئے رہتی ہے) کی نوعیت پر بیشتر مسائل اقتداء موقوف ہیں مثلاً

(۱) مقتدی کو امام کے پیچھے قرأت کرنے کی ضرورت نہیں۔

(۲) وضو والا آدمی، تیمّم والے امام کی اقتداء کرسکتا ہے۔

---

(۱) سند میں ضعف ہے (طبرانی اوسط: ۴۶۵، مجمع الزوائد: باب سترة الامام سترة من خلفه: ۲۳۰۶

(۲) شرح توثیق الکلام ملخصاً: ۸۰ ۔ ۸۷

(۳) نفل پڑھنے والا فرض پڑھنے والے کی اقتداء کر سکتا ہے۔

(۴) کھڑے ہو کر نماز پڑھنے والا، بیٹھ کر رکوع سجدہ کرنے والے کی اقتداء کر سکتا ہے۔

ان تمام مسائل میں امام کی نماز مقتدیوں کی نماز کو اپنے اندر ضم کرنے کی شرعاً صلاحیت وقوت رکھتی ہے۔

(۵) فرض پڑھنے والا، نفل پڑھنے والے کی ایسے ہی بالغ، نابالغ کی اقتداء نہیں کر سکتا کیوں کہ یہاں امام کی نماز، مقتدیوں کی نماز کو اپنے اندر ضم کرنے کی شرعاً صلاحیت وقوت نہیں رکھتی۔

اب ان مسائل پر تھوڑی تفصیل سے گفتگو کی جاتی ہے۔

قرأت خلف الامام کا مسئلہ:

مقتدی کو امام کے پیچھے نہ جہری نماز میں قرأت کرنی ہے نہ سری نماز میں، ارشاد خداوندی ہے: اور جب قرآن پڑھا جائے تو اس کو کان لگا کر سنو اور خاموش رہو تا کہ تم پر رحمت ہو۔(۱)

امام احمد بن حنبلؒ کے مطابق بالاجماع اس آیت کا نزول، امام کے پیچھے قرأت کرنے کے سلسلہ میں ہوا ہے۔(۲)

امام بیہقیؒ نے امام احمدؒ سے نقل کیا ہے کہ لوگوں کا اس بات پر اجماع ہے کہ یہ آیت نماز کے بارے میں ہے (۳)

---

(۱) الاعراف : ۲۰۴

(۲) المغنی لابن قدامة : ۱/ ۶۳۶ .فتاوی ابن تیمیه : ۲/ ۲۸۸ . تحقیق عبدالقادر عطا. الناشر: دار الکتب العلمیه

(۳) التعلیق الحسن : ۱/ ۸۴

حافظ ابن تیمیہؒ فرماتے ہیں کہ سلف سے بطریق شہرت منقول ہے کہ یہ آیت نماز کے اندر قرأت کرنے کے سلسلہ میں نازل ہوئی ہے۔(۱)

حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے مروی ہے کہ نبی ﷺ نے کسی فرض نماز میں قرأت فرمائی اور صحابہ نے بھی آپ ﷺ کے پیچھے قرأت کی اور آپ ﷺ پر (قرأت کے معاملہ میں) اشتباہ پیدا کردیا، اس پر قرآن کی یہ آیت نازل ہوئی۔(۲)

حضرت مجاہدؒ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نماز میں قرأت فرمارہے تھے تو آپ ﷺ نے (مقتدیوں میں سے) ایک انصاری نوجوان کی قرأت کو سنا، اس پر یہ آیت نازل ہوئی کہ جب قرآن پڑھا جائے تو اس کو کان لگا کر سنو اور خاموش رہو تا کہ تم پر رحمت ہو۔(۳)

حافظ ابن تیمیہؒ فرماتے ہیں: آیت کریمہ کی رو سے قرآن پاک کو کان لگا کر سننا قرأت کرنے سے بہتر ہے اور جو اس کے برعکس کہے وہ نص یعنی کتاب وسنت اور اجماع کا مخالف ہے، تعجب ہے کہ چند لوگ ضم سورۃ میں تو کان لگا کر سننے کو، قرأت کرنے سے بہتر تسلیم کرتے ہیں لیکن قرأت فاتحہ میں یہ تسلیم نہیں کرتے حالاں کہ قرآن کا اہم ترین مصداق فاتحہ ہی ہے جس کے (قرآن کے) پڑھے جانے پر غور سے سننے اور خاموش رہنے کا آیت اعراف میں حکم ہے۔(۴)

علامہ شبیر احمد عثمانیؒ فرماتے ہیں: مقتدیوں کے لئے غور سے سننے اور خاموش رہنے کے حکم خداوندی میں دو مصلحتیں ہیں ایک تو تلاوت قرآن کو بغور سماعت کرنا، جو ظاہر ہے، دوسری مصلحت امام کو اپنا ترجمان ونمائندہ تسلیم کرنا یعنی بارگاہ خداوندی میں

---

(۱) فتاوی ابن تیمیه : ۲/۲۸۸

(۲)طبری : ۹ / ۱۱۲

(۳) القراءة خلف الامام:للبیهقی: ۲۱۶ .وهذا مرسل:الدرایه: ۱/ ۱۶۴

(۴)فتاوی ابن تیمیه : ۲/ ۲۸۸

بشکل سورۃ فاتحہ ہدایت کی درخواست پیش کرنے پھر وہاں سے ہدایت کے سرچشمہ (ضم سورۃ اور باقی قرآن) کا نشان وسراغ پانے میں امام کو واسطہ بنانا۔

سلاطین کے دربار اور آداب شاہان سے آگاہ، ہر خاص وعام یہ بخوبی جانتا ہے کہ وہاں یکساں ضرورت وغرض سے جب کوئی جماعت حاضر ہوتی ہے اور جماعت میں سے ہر ایک جب اپنی ضرورت کو بیان کرنے لگتا، تو شور وشغف کا سماں پیدا ہو جاتا ہے، جو بدتہذیبی اور آداب شاہی کے سخت خلاف ہے، شائستگی اور سلیقہ مندی کا تقاضا یہ ہے کہ ان میں سے کوئی ایک صاحب علم وفضل، ان سب کی طرف سے ترجمانی وعرض گذاری کا فریضہ انجام دے، احکم الحاکمین اور مالک الملوک کا دربار، اس شائستگی وسلیقہ مندی کے مظاہرہ کا اصل حقدار ہے۔(۱)

احادیث:

(۱) حضرت ابو ہریرۃؓ سے مروی ہے: رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: امام اس لئے بنایا جاتا ہے کہ اس کی پیروی کی جائے پس جب وہ تکبیر کہے تو تم بھی تکبیر کہو اور جب وہ قرأت کرنے لگے تو تم خاموش رہو اور جب وہ **غیر المغضوب علیھم ولا الضالین** کہے تو آمین کہو اور جب رکوع کرے تو تم بھی رکوع کرو اور جب **سمع اللہ لمن حمدہ** کہے تو **اللھم ربنا لک الحمد** کہو اور جب وہ سجدہ کرے تو تم بھی سجدہ کرو۔(۲)

حضرت ابو ہریرۃؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے ارشاد فرمایا: امام اس لئے بنایا جاتا ہے تاکہ اس کی پیروی کی جائے پس جب وہ تکبیر کہے تو تم بھی تکبیر کہو اور جب وہ قرأت کرنے لگے تو خاموش ہو جاؤ۔(۳)

---

(۱) فتح الملھم : ۲/۲۲

(۲) سنن ابن ماجه تحقيق الالبانی: ۸۴۶. حسن صحيح

(۳) ابو داؤد :تحقيق الالبانی باب الامام يصلی من قعود : ۶۰۴. صحيح

امام مسلمؒ نے اپنی صحیح میں اس مضمون کی روایت حضرت ابوموسی اشعریؓ کے حوالے سے نقل کی ہے اور اپنی عادت کے بالکل برخلاف نہ صرف اس حدیث کی تصحیح کی ہے بلکہ حضرت ابوہریرہؓ کی روایت کی بھی تصحیح کی ہے اور حضرت ابوہریرہؓ کی حدیث کو اپنی صحیح میں ذکر نہ کرنے کا یہ عذر بیان کیا کہ میں نے ہر ہر صحیح حدیث کو اپنی کتاب میں نقل کرنے کا التزام نہیں کیا ہے (بلکہ میری یہ کتاب بے شمار صحیح احادیث میں سے ایک انتخاب ہے)۔(۱)

محققین حدیث کے مطابق حدیث مذکور مجموعی طور پر بارہ طریقوں سے ثابت ہے، کچھ طریقے ان میں سے صحیح ہیں اور بعض کی سندیں ضعیف ہیں، اصول حدیث کا قاعدہ یہ ہے کہ جب کوئی حدیث متعدد سندوں سے ثابت ہو اور ساری سندیں ضعیف ہوں تب بھی وہ حدیث ضعیف کے خانہ سے نکل کر حدیث حسن کے دائرہ میں آجاتی ہے، اور معتبر قابل حجت ہوجاتی ہے، یہاں جب کہ حدیث مذکور کی کچھ سندیں صحیح بھی ہیں، وہ معتبر اور قابل حجت کیوں نہیں ہوگی۔(۲)

علامہ شبیر احمد عثمانیؒ فرماتے ہیں کہ حدیث بالا کا پہلا جملہ کہ امام اس لئے بنایا جاتا ہے تاکہ اس کی پیروی کی جائے تنہاء یہی ارشاد نبوی زیر بحث مسئلہ میں فیصلہ کن اور قاطعِ نزاع ہے، وہ اس طور پر کہ اس ارشاد گرامی میں مقتدیوں کو امام کی کامل پیروی کا حکم دیا گیا ہے، تکبیر تحریمہ میں پیروی یہ ہے کہ امام جب تکبیر تحریمہ کہے تو مقتدی بھی تکبیر تحریمہ کہے، رکوع وسجود میں پیروی یہ ہے کہ امام صاحب رکوع وسجدہ کرے تو مقتدی بھی کرے یہ تو بالکل ظاہر ہے، مشکل یہ ہے کہ قرأت میں پیروی بھی آیا یہی ہے کہ مقتدی بھی قرأت کرے یا پیروی کا معنی یہ ہے کہ مقتدی امام کی قرأت کے موقع پر خاموش اور چپ رہے۔

---

(۱) مسلم شریف : باب التشهد فی الصلوة : ۱ /۱۷۴

(۲) (بذل المجهود : ۱ /۳۴۰

غور کرنے پر واضح ہوا کہ امام کی قرأت کے موقع پر خاموشی اختیار کرنا ہی فی الحقیقت، قرأت میں امام کی پیروی کرنا ہے، اس کی دلیل حضرت عبد اللہ بن عباسؓ کی وہ روایت ہے کہ نبی ﷺ شروع زمانے میں نزول وحی کے وقت سخت مشقت اٹھایا کرتے تھے، عین نزول وحی کی حالت میں (اس کی بغور سماعت کے ساتھ ساتھ) ہونٹوں کو بھی حرکت دیا کرتے تھے (تا کہ وحی یاد ہو جائے اور سینہ میں محفوظ ہو جائے) اس پر اللہ تعالی نے یہ آیتیں نازل فرمائیں (اے پیغمبر!) تم اس قرآن کو جلدی جلدی یاد کرنے کے لئے اپنی زبان ہلایا نہ کرو، یقین رکھو کہ اس کو یاد کرانا اور پڑھوانا ہماری ذمہ داری ہے، پھر جب ہم اسے (جبرئیلؑ کے واسطہ سے) پڑھ رہے ہوں تو تم اس کے پڑھنے کی پیروی کرو۔ (القیامۃ: ۱۶۔۱۸) یعنی خاموشی سے بغور اس کو سنو، اس کے بعد رسول اللہ ﷺ کا معمول یہ تھا کہ جب جبرئیل امین علیہ السلام آپ ﷺ کے پاس وحی لے کر آتے تو آنحضرت ﷺ بغور اس کو سماعت فرماتے پھر جبرئیل کے واپس چلے جانے کے بعد اسے ویسے ہی پڑھ لیتے جیسے انہوں نے پڑھا تھا۔(۱) پس معلوم ہوا کہ قرأت میں پیروی کا مطلب خاموشی کے ساتھ بغور اس کو سننا ہے، اسی مفہوم کی جانب حدیث کا بعد والا جملہ بھی اشارہ کر رہا ہے کہ جب امام قرأت کرنے لگے تو تم خاموش رہو۔(۲)

(۲) حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ کسی جہری نماز میں، نماز سے فارغ ہوئے تو فرمایا: کیا تم میں سے کسی نے میرے ساتھ ابھی قرأت کی ہے، ایک شخص نے کہا: ہاں اے اللہ کے رسول! اس پر رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: یہی وجہ ہے کہ میں (دل ہی دل میں) کہہ رہا ہوں کہ کیا بات ہے آج قرآن سے میں الجھ رہا ہوں، حضرت ابو ہریرہؓ

---

(۱) بخاری باب بدء الوحی: ۵

(۲) فتح الملہم : ۲ / ۲۳

فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ سے یہ ارشاد سننے کے بعد صحابہ کرام جہری نمازوں میں نبی ﷺ کے پیچھے قرأت کرنے سے باز آگئے (۱)

یہ واقعہ اگر چہ جہری نماز کا ہے تاہم نبی ﷺ نے قرآن سے الجھاؤ کا جو احساس ظاہر کیا وہ جہری نمازوں تک محدود نہیں ہے بلکہ یہ شکل سری نمازوں میں بھی پیش آسکتی ہے کہ سری نمازوں میں بھی جب تمام مقتدی قرأت کرنے لگ جائیں تو مخارج وحروف کی صحت کے ساتھ ادائیگی کی جدوجہد میں خفیف سا اضطراب آمیز ماحول پیدا ہوجائے گا، اور امام کو قرأت کرنے میں دشواری پیش آئے گی۔ (۲)

یہ توجیہ وتفصیل الجھاؤ کے عام معنی کے اعتبار سے ہے، ائمہ حدیث نے الجھاؤ کے ایک اور معنی بھی بیان کئے ہیں وہ یہ کہ امام کو قرأت کرنے کے لئے تنہا نہ چھوڑنا بلکہ اس کے ساتھ (آہستہ و بے آواز ہی سہی) خود بھی قرأت کرنا اس معنی کے لحاظ سے جہری وسری دونوں قسم کی نمازوں میں، مقتدیوں کا امام کے ہمراہ قرأت کرنا، امام کو الجھانے کا باعث ہوگا جو ممنوع ہے، (۳)

یہاں ایک اور بات قابل توجہ ہے کہ سورۃ اعراف کی آیت کے نازل ہونے کے بعد مقتدیوں کے لئے قرأت کرنا ممنوع اور منکر شرعی ہوگیا، پھر بھی بعض لوگ بالخصوص جہری نمازوں میں (چپکے چپکے) اس منکر کا ارتکاب کرنے لگے تو نبی کریم ﷺ کے قلب اطہر پر اس کی وجہ سے تکدر اور انقباض کے آثار محسوس ہوئے اور قرأت میں الجھاؤ پیدا ہوگیا، یہ باطنی اثر ایسا ہی ہے جیسے بعض لوگوں کی جانب سے طہارت، وضو میں بے قاعدگی و بدمعاملگی برتنے کی وجہ سے ایک دفعہ نماز صبح میں آپ ﷺ کو سورۃ روم کی تلاوت میں اشتباہ لگ گیا تھا

(۱) ابوداؤد تحقیق الالبانی :باب من کرہ القرأۃ بفاتحۃ الکتاب اذا جھر الامام : ۸۲۶ . صحیح
(۲) حجۃ اللہ البالغہ : ۲/ ۴۳، بذل المجھود : ۱/ ۴۴۰
(۳) شرح الزرقانی علی موطا الامام مالک باب ترک القراءۃ خلف الامام فیما جھر فیہ: ۱/ ۲۵۸

اور آپ ﷺ نے ایسے لوگوں کو تنبیہ بھی فرمائی تھی۔(۱) ظاہر ہے امر منکر، اصل میں امام کے پیچھے قرأت کرنا ہے جہری وسری نمازوں کی اس میں تخصیص نہیں۔

حضرت عمران بن حصینؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے نماز ظہر پڑھائی تو ایک شخص آپ ﷺ کے پیچھے سورۂ ''سبح اسم ربک الاعلیٰ'' پڑھنے لگا، نماز سے فارغ ہونے کے بعد آپ ﷺ نے دریافت فرمایا: پڑھنے والا کون آدمی ہے؟ ایک شخص نے کہا: میں! اس پر آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: مجھے یہ صاف محسوس ہوا کہ تم میں سے کسی نے مجھے قرأت میں الجھا دیا ہے۔(۲)

(۳) حضرت جابر ﷺ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نماز پڑھا رہے تھے اور آپ ﷺ کے پیچھے ایک شخص قرأت کر رہا تھا ایک صحابی اس کو نماز میں قرأت کرنے سے منع کرنے لگے، اسی اثنا میں نبی ﷺ نے نماز ختم فرمائی تو وہ صاحب ان صحابی سے کہنے لگے: تم کون ہوتے ہو جو مجھ کو رسول اللہ ﷺ کے پیچھے قرأت کرنے سے منع کر رہے ہو؟ دونوں میں بحث ہوئی پھر یہ قضیہ رسول اللہ ﷺ کے سامنے پیش ہوا تو نبی ﷺ نے ارشاد فرمایا: جو آدمی امام کے پیچھے نماز پڑھے تو امام کی قرأت کرنا ہی اس کی قرأت ہے۔(۳)

امام ابوحنیفہؒ کی روایت میں اتنا اضافہ ہے کہ یہ واقعہ نماز ظہر یا عصر میں پیش آیا تھا(۴)

یہ حدیث مسنداً اور مرسلاً دونوں طریقوں سے مروی ہے، مسند روایت (جس میں حضرت جابرؓ کا واسطہ مذکور ہے) کے بارے میں محدثین وسلف صالحین کا تبصرہ یہ ہے کہ اس حدیث کی سند کے تمام راوی ثقہ اور قابل اعتماد ہیں اور اس کی سند بخاریؒ و مسلمؒ کے شرائط پر پوری اترتی ہے۔

---

(۱) مسند احمد: حدیث ابی روح الکلاعیؓ: تحقیق شعیب الارنووط: ۱۵۹۱۴. حدیث حسن

(۲) مسلم : باب نهی الماموم عن جهره بالقرأة خلف الامام : حدیث نمبر : ۹۱۴

(۳) ابن ماجه: تحقیق الالبانی: باب اذا قرأ الامام فانصتوا: ۸۵۰. حسن

(۴) مسند ابی حنیفه لابی نعیم : ۱/ ۲۲۹. الناشر: مکتبة الکوثر

مرسل روایت حضرت عبداللہ بن شدادؓ سے ہے (حضرت جابرؓ کا واسطہ مذکور نہیں) عبداللہ بن شدادؓ صغار صحابہ میں سے ہیں، ان کو دیدار نبوی تو نصیب ہوا ہے مگر سماع حدیث کا موقع نہیں مل سکا، اس مرسل روایت کے بارے میں حافظ ابن تیمیہؒ کا کہنا ہے کہ اس کو، قرآن وسنت کے ظاہر سے تقویت حاصل ہے، طبقہ صحابہ وتابعین کے جمہور اہل علم اس روایت کے مضمون کے قائل ہیں اور اس قسم کی مرسل روایت باتفاق ائمہ اربعہ حجت ہوتی ہے(۱)

حضرت جابر بن عبداللہ کے علاوہ، حضرت عبداللہ بن عمرؓ، حضرت ابوسعید خدریؓ حضرت ابوہریرہؓ، حضرت عبداللہ بن عباسؓ، حضرت انس بن مالکؓ جیسے جلیل القدر صحابہ کرام سے اسی مضمون کی مرفوع روایات ثابت ہیں کہ جس شخص کا امام ہو تو اس کی قرأت کرنا ہی مقتدی کے لئے قرأت ہے۔(۲)

جن کا حاصل یہی ہے کہ امام گویا بارگاہ خداوندی میں پوری قوم کا ترجمان ہوتا ہے اور اس عظیم الشان بارگاہ میں ادب کا تقاضا یہی ہے کہ باقی تمام لوگ دست بستہ وزبان بستہ تصویر عجز ونیاز بنے رہیں۔

مجموعی اعتبار سے اسّی بڑے بڑے صحابہ کرام،(۳) بہت سے جلیل القدر تابعین وتبع تابعین(۴) امام مالکؒ امام احمد بن حنبلؒ (۵) شیخ الاسلام امام ابن تیمیہ (جہری نمازوں میں) ان کے نامور شاگرد علامہ ابن القیمؒ (٦) یہ سارے حضرات قرأت خلف الامام سے منع کیا

---

(۱)فتح الملہم : ۲/ ۲۵) (فتاوی ابن تیمیہ : ۲/ ۲۸۹

(۲)بذل المجھود : ۲/۵۳

(۳) عمدۃ القاری : ٦/ ۱۳

(۴) اعلاء السنن : ۴/ ۱۲۷

(۵)الفقہ الاسلامی ۲/ ۸۳۷

(٦)احسن الکلام : ۱/ ۷۰

کرتے تھے۔(۱) امام شافعیؒ کا قول قدیم بھی یہی ہے کہ جہری نمازوں میں مقتدی پر قرأت واجب نہیں۔(۲)

تاہم امام شافعی کا قول جدید جو شوافع کا موجودہ مسلک ہے، وہ یہ ہے کہ جہری اور سری دونوں نمازوں میں مقتدی پر قرأت فاتحہ واجب اور ضروری ہے(۳) امام لیثؒ، ابوثورؒ، امام اسحٰق وغیرہ بھی اس کے قائل ہیں۔(۴)

قائلین فاتحہ خلف الامام کے دلائل کا جائزہ:

شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسن گنگوہیؒ کے مطابق، ان حضرات کے دلائل کا بنیادی سقم یہ ہے کہ اگر وہ دلائل سنداً صحیح ہیں تو زیر بحث مسئلہ پر صریح نہیں ہیں اور اگر صریح ہیں تو صحیح نہیں ہیں۔ ان حضرات کا اولین مستدل حضرت عبادۃ بن صامتؓ کی روایت ہے: واضح ہو کہ حضرت عبادہؓ کی روایت کتب احادیث میں تین طرح سے آئی ہے:

طریق اول: محمود بن ربیعؓ نے حضرت عبادہ بن صامت سے روایت کی ہے کہ نبی ﷺ نے ارشاد فرمایا: اس شخص کی نماز نہیں ہوتی جو سورۃ فاتحہ کی قرأت نہیں کرتا۔(۵) اس حدیث کا مضمون صرف اتنا ہی ہے اور یہ روایت صحیحین کی ہے، اعلی درجہ کی سند رکھتی ہے، تاہم مسئلہ پر صریح نہیں کہ اس حکم کے تحت مقتدی بھی داخل ہے یا نہیں ہے؟

سابق میں ذکر کردہ دلائل کی روشنی میں یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ اس حکم کے مخاطب امام و منفرد ہی ہیں، مقتدی اس کے تحت داخل نہیں ہیں؛ کیوں کہ نبی ﷺ نے تو

(۱) فتاوی ابن تیمیه : ۲/ ۳۰۰

(۲) السعایه : ۲/ ۲۹۱

(۳) الفقه الاسلامی : ۲/ ۸۳۷

(۴) السعایه : ۲/ ۲۹۱

(۵) بخاری باب وجوب القراءۃ للامام: ۷۵۶. مسلم باب وجوب قراءۃ الفاتحه: ۹۰۰

مقتدی کو امام کی قرأت کے موقع پر خاموش رہنے کا حکم فرمایا ہے(۱) اور امام کی قرأت کو مقتدی کی قرأت کے بجائے قرار دیا ہے(۲) مقتدی حکم نبوی کی تعمیل میں خاموش رہتا ہے اور شریعت کی نظر میں قرأت کرنے والے کے حکم میں ہوتا ہے، پس اس کی نماز بے قرأت رہتی ہی نہیں کہ اس پر یہ حکم چسپاں کیا جائے کہ جو سورۃ فاتحہ کی قرأت نہیں کرتا، اس کی نماز نہیں ہوتی۔

طریق ثانی: محمود بن ربیعؒ کہتے ہیں کہ میں نے حضرت عبادہ بن صامتؓ کے بازو میں نماز پڑھی، تو انہوں نے (باوجود مقتدی ہونے کے) سورۃ فاتحہ کی قرأت کی، بعد میں انہوں نے کہا: اے ابولید (حضرت عبادہؓ) کیا ایسی بات نہیں کہ میں نے آپ کو سورۃ فاتحہ کی قرأت کرتے سنا ہے؟ حضرت نے فرمایا ہاں! اس لئے کہ اس کے بغیر نماز نہیں ہوتی۔(۳)

یہ روایت بھی سنداً صحیح ہے مگر مرفوع نہیں بلکہ یہ حضرت عبادہؓ کا اپنا اجتہاد ہے یعنی انہوں نےؓ نے "**لاصلوۃ لمن لم یقرأ بفاتحۃ الکتاب**"۔ (اس آدمی کی نماز نہیں ہوتی جس نے سورۃ فاتحہ نہیں پڑھی) والی حدیث کو امام اور مقتدی دونوں کے لئے عام سمجھا اور اس سے یہ حکم مستنبط کیا کہ مقتدی پر بھی قرأت فاتحہ واجب ہے، لیکن ان کا یہ استنباط احادیث مرفوعہ کے مقابلہ میں حجت نہیں ہوسکتا، بلکہ اس روایت سے تو جمہور کی تائید ہوتی ہے، کیوں کہ اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اکثر صحابہ وتابعین امام کے پیچھے قرأت نہیں کیا کرتے تھے، جس کی دلیل یہ ہے کہ اگر ایسا نہ ہوتا تو حضرت محمود بن ربیعؒ حضرت عبادہؓ کو قرأت فاتحہ کرتے ہوئے دیکھ کر تعجب سے سوال نہ کرتے، ان کا تعجب سے سوال کرنا اس بات کی دلیل

(۱) مسلم باب التشھدفی الصلاۃ: ۶۱۲

(۲) ابن ماجه :باب اذا قرأ الامام فأنصتوا. ۸۵۰ حسن

(۳) مصنف ابن ابی شیبه من رخص فی القرأۃ خلف لامام: ۳۷۶۱ .سکت علیه المحقق محمد عوامه

ہے کہ حضرت عبادہؓ کا یہ عمل، صحابہؓ و تابعینؒ کے عام عمل کے خلاف تھا۔

اس کے علاوہ یہاں یہ بات بھی ظاہر ہے کہ حضرت محمود بن ربیعؓ نے فاتحہ کی قرأت نہیں کی، اس کے باوجود حضرت عبادہؓ نے ان کو اعادہ نماز کا حکم نہیں دیا اس سے معلوم ہوا کہ حضرت عبادہؓ کے نزدیک بھی قرأت فاتحہ مقتدی کے لئے واجب نہیں تھی۔

طریق ثالث: نافع بن محمودؒ کہتے ہیں کہ ایک دفعہ حضرت عبادہؓ نماز صبح میں تاخیر سے تشریف لائے، اس دوران ابونعیمؒ موذن نے نماز کھڑی کر دی اور لوگوں کو نماز پڑھائی، حضرت عبادہؓ بھی حاضر ہوگئے، میں بھی ان کے ہمراہ تھا، پھر ہم ابونعیمؒ کے پیچھے صف میں کھڑے ہوگئے، ابونعیمؒ جہراً قرأت کررہے تھے، حضرت عبادہ بھی سورۃ فاتحہ پڑھنے لگے، جب نماز ختم ہوئی تو میں نے حضرت عبادہؓ سے کہا: میں نے آپ کو سورۃ فاتحہ پڑھتے سنا ہے حالاں کہ ابونعیم جہراً قرأت کررہے تھے، حضرت عبادہؓ نے جواب دیا ہاں! پھر فرمایا ہم کو رسول اللہ ﷺ کوئی جہری نماز پڑھا رہے تھے دوران قرأت آپ ﷺ کو اشتباہ لگ گیا، نماز سے فارغ ہونے کے بعد، آپ ﷺ نے ہماری جانب متوجہ ہوکر فرمایا: کیا جس وقت میں جہراً قرأت کرتا ہوں تو تم لوگ بھی قرأت کرنے لگتے ہو، ہم میں سے چند لوگوں نے کہا کہ ہاں ہم ایسا کرتے ہیں! اس پر آنحضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا: ایسا نہ کرو مجھے بار بار یہ احساس ہو رہا تھا کہ میں قرآن سے الجھ رہا ہوں، جب میں جہراً قرأت کروں تو سوائے سورۃ فاتحہ کے کچھ قرآن نہ پڑھو۔(۱)

یہ روایت مسئلہ پر صریح ہے لیکن صحیح نہیں، کبار محدثین اور ناقدین حدیث نے اسے معلول و ناقابل اعتبار قرار دیا ہے، اس روایت میں جو علت و کمزوری ہے وہ یہ ہے کہ نیچے

---

(۱) السنن الکبری للبیھقی: باب من قال یقرأ خلف الامام:: ۳۰۳۴ ۔ ۳۰۳۶، ابو داؤد تحقیق الالبانی: باب من ترک القراءۃ فی صلاتہ بفاتحۃ الکتاب: ۸۲۴۔ ضعیف

کے کسی راوی نے حدیث مرفوع (جو بطریق اول مروی ہے) اور حدیث موقوف (حضرت عبادہؓ کا اپنا واقعہ جو بطریق ثانی مروی ہے) کو وہم کھا کر خلط ملط کر دیا ہے جس کے نتیجے میں ،تیسرے طریق والی روایت وجود میں آئی ہے۔

حافظ ابن تیمیہؒ کہتے ہیں کہ ائمہ اھل حدیث، امام احمد بن حنبلؒ وغیرہ کے مطابق یہ روایت معلول ہے اور سچ بات یہ ہے کہ بعض شامی راویوں کو حدیث مرفوع وموقوف میں اشتباہ لگ گیا ہے۔(۱)

علامہ انور شاہ کشمیریؒ فرماتے ہیں: مکحول شامی کے پیش نظر طریق اول اور طریق ثانی والی دونوں روایتیں تھیں، انہوں نے غضب یہ کر دیا کہ وہم وشبہ میں پڑ کر دونوں کو باہم خلط ملط کر دیا۔(۲)

مکحول شامی اگر چہ بحیثیت مجموعی ثقہ ہیں، لیکن محدثین اور علماء جرح وتعدیل نے ان کے بارے میں یہ تصریح کی ہے کہ بسا اوقات ان کو روایات میں وہم ہو جاتا ہے جیسا کہ یہاں ہوا ہے۔(۳)

فائدہ: دلائل بالا سے پورے طور پر یہ ثابت ہوتا ہے کہ امام کے پیچھے مقتدی کو قرأت کرنا ممنوع ہے، رہی یہ شکل کہ امام سورۃ فاتحہ کے اختتام پر کچھ دیر کے لئے خاموش رہے اور مقتدی اس وقفہ میں سورۃ فاتحہ پڑھ لیں تو یہ ایسا عمل ہے جو نہ رسول اللہ ﷺ سے ثابت ہے نہ صحابہ وسلف وصالحین سے، علامہ ابن تیمیہؒ نے اس طریقہ کو بدعت کا نام دیا ہے، حافظ ابن قیمؒ نے بھی اس سے اتفاق کیا ہے۔(۴)

---

(۱) فتاوی ابن تیمیه : ۲/ ۲۹۹

(۲) فتح الملهم : ۲/ ۲۶

(۳) علل الحديث لابن ابی حاتم: علل أخبار رويت فی الاطعمة: ۱۵۹۰

(۴) اعلاء السنن : ۴/ ۱۲۴

یہ صحیح ہے کہ رسول اللہ ﷺ ختم قرأتِ فاتحہ پر لطیف سکتہ فرمایا کرتے تھے مگر وہ اتنا طویل نہیں ہوا کرتا تھا کہ اس میں سورۃ فاتحہ پڑھی جا سکے بس اس کا حال اسی قدر تھا کہ جیسے ختم آیت پر سانس کی بحالی کے لئے ایک لحہ سکوت کیا جاتا ہے جو حقیقت میں سکتہ نہیں کہلاتا۔(۱)

باوضو آدمی کا تیمّم والے امام کی اقتداء کرنا:

حضرت عمرو بن العاصؓ فرماتے ہیں کہ مجھے غزوہ ذات السلاسل میں ایک نہایت سرد رات میں احتلام ہو گیا، مجھے یہ خوف ہوا کہ غسل کروں تو ہلاک ہو جاؤں میں نے تیمّم کر لیا پھر ساتھیوں کو صبح کی نماز پڑھائی، ساتھیوں نے یہ معاملہ رسول اللہ ﷺ سے بیان کیا تو آنحضرت ﷺ نے فرمایا: اے عمرو! کیا تم نے اپنے ساتھیوں کو حالت جنابت میں نماز پڑھادی؟ میں نے رسول اللہ ﷺ سے وہ عذر بیان کر دیا جس نے مجھے غسل کرنے سے باز رکھا تھا (یعنی سخت جان لیوا سردی) مزید عرض کیا کہ میں نے اللہ عزوجل کا یہ ارشاد بھی سن رکھا تھا کہ اور اپنے آپ کو قتل نہ کرو یقین جانو اللہ تم پر بہت مہربان ہے، اس پر رسول اللہ ﷺ ہنس پڑے اور کچھ نہیں فرمایا۔(۲)

حضرت معمرؒ کہتے ہیں، میں نے امام زہریؒ سے دریافت کیا، ایک قوم کے امام کو جنابت لاحق ہو گئی اور پانی موجود نہیں تھا جس سے وہ وضو کر سکے تو وہ کیا کرے؟ فرمایا: تیمّم کرے اور آگے بڑھ کر نماز پڑھادے کیوں کہ اللہ تعالیٰ نے اس کو پاک کر دیا ہے (۳) حضرت حسن اور حضرت سعید بن المسیب کا فرمان ہے کہ تیمّم، پانی کے درجہ میں ہے جب تک حدث پیش نہ آئے، اس سے تمام نمازیں پڑھی جا سکتی ہیں۔(۴)

(۱) فتاوی ابن تیمیه : ۲/ ۲۹۴

(۲)ابو داؤد تحقیق الالبانی :باب اذا خاف الجنب البرد ایتیمم: ۳۳۴، صحیح

(۳)مصنف عبد الرزاق باب امام قوم اصابة جنابة فلم یجد ماء: ۳۶۶۴

(۴)مصنف عبد الرزاق:باب کم یصلی بتیمم واحد:۸۳۵

نفل پڑھنے والے کا فرض پڑھنے والے کی اقتداء کرنا:

حضرت جابر بن یزیدؒ اپنے والد سے روایت کرتے ہیں کہ انہوں نے نوجوانی کے زمانے میں رسول اللہ ﷺ کے ساتھ نماز پڑھی تھی، نبی ﷺ نماز سے فارغ ہوئے تو مسجد کے ایک گوشہ میں دو آدمیوں کو دیکھا جو نماز میں شریک نہیں ہوئے تھے، آپ ﷺ نے ان دونوں کو طلب فرمایا، گھبراہٹ کے مارے، ان کے سینہ اور مونڈھے کے درمیان کا گوشت حرکت کر رہا تھا، آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: تم نے ہمارے ساتھ نماز کیوں نہیں پڑھی؟ انہوں نے عرض کیا کہ ہم اپنے مقام پر نماز پڑھ کر آئے تھے! اس پر آپ نے ارشاد فرمایا: جب تم میں سے کوئی اپنے مقام پر نماز پڑھے پھر وہ امام کو اس حال میں پائے کہ اس نے ابھی نماز نہیں پڑھی تو وہ امام کے ساتھ نماز میں شریک ہو جائے، یہ اس کے لئے نفل نماز ہو جائے گی۔(۱)

فائدہ: نماز فجر، عصر اور مغرب، میں ایسا آدمی امام کے ساتھ شریک نہ ہو، کیوں کہ ایک دفعہ جب وہ نماز پڑھ چکا تو دوسری بار پڑھی جانے والی یہ نماز اس کے حق میں نفل ہوگی اور فجر وعصر کے بعد نفل پڑھنا ممنوع ہے نیز طاق رکعتوں کے ساتھ نفل پڑھنا بھی منع ہے، اس لئے مغرب میں بھی شرکت نہ کرے۔

حضرت ابوسعید خدریؓ سے مروی ہے کہ نبی ﷺ نے ارشاد فرمایا: صبح کی نماز کے بعد طلوع آفتاب تک اور عصر کی نماز کے بعد غروب آفتاب تک کوئی نماز نہیں ہے۔(۲)

نافع کہتے ہیں کہ حضرت عبداللہ بن عمرؓ فرمایا کرتے تھے کہ جو آدمی نماز مغرب یا فجر پڑھ چکا ہو پھر یہ دونمازیں امام کو پڑھتا ہوا پائے تو وہ ان دونوں نمازوں کو دوبارہ نہ پڑھے(۳)

---

(۱)ابوداؤد :تحقیق الالبانی: باب فیمن صلی فی منزلہ ثم أدرک الجماعۃ ۵۷۵. صحیح

(۲) بخاری :باب لا یتحری الصلاۃ قبل غروب الشمس: ۵۸۶.۵۸۵

(۳)موطا امام مالک باب اعادۃ الصلاۃ مع الامام: ۳۰۲

ظہر وعشاء میں بھی دوبارہ امام کے ساتھ نفل کی نیت سے شریک ہونے کا حکم اس آدمی کے لئے ہے جس نے یہ دو نمازیں تنہا پڑھی ہو، رہا وہ شخص جو ان دو نمازوں کو ایک دفعہ باجماعت ادا کر چکا ہو، اس کے لئے دوبارہ ان نمازوں میں شریک ہونا پسندیدہ نہیں، نبی ﷺ کے اس ارشاد گرامی سے اس مسئلہ پر روشنی پڑتی ہے کہ جب تم میں سے کوئی اپنے گھر میں (تنہا اور بے جماعت) نماز پڑھے پھر مسجد میں آئے اور لوگ نماز پڑھ رہے ہوں تو ان کے ساتھ شریک ہو جائے۔(۱) معلوم ہوا کہ ان نمازوں میں دوبارہ شریک ہونے کا حکم اس شخص کے لئے جس نے ان نمازوں کو اپنے گھر میں جماعت کے بغیر پڑھا ہے۔

قائم کا قاعد کی اقتداء کرنا:

بیٹھ کر رکوع سجدہ کرنے والا کھڑے ہو کر نماز پڑھنے کی قدرت رکھنے والوں کی امامت کر سکتا ہے، البتہ مقتدیوں میں جو قیام پر قدرت رکھتے ہوں ان کے لئے کھڑے ہو کر اقتداء کرنا ہی ضروری ہے، بیٹھ کر نماز پڑھیں گے تو نماز نہیں ہوگی۔

نبی ﷺ کا اخری عمل اور اخری تعلیم یہی رہی، مرض الوفات میں ایک دفعہ نبی ﷺ نے بیٹھ کر امامت فرمائی تھی اور لوگ آپ ﷺ کے پیچھے کھڑے ہو کر اقتداء کر رہے تھے۔(۲)

نبی ﷺ نے حضرت عمران بن حصین ؓ سے جنہیں بواسیر کی بیماری تھی، یہ فرمایا کہ کھڑے ہو کر نماز پڑھو لیکن اگر اس کی استطاعت نہ ہو تو بیٹھ کر پڑھو اور اگر اس کی بھی قدرت نہ ہو تو پھر پہلو پر لیٹ کر نماز پڑھ لو۔(۳) معلوم ہوا کہ قیام پر قدرت کے باوجود بے عذر بیٹھ کر نماز پڑھنا جائز نہیں ہے۔

---

(۱) طبرانی کبیر: ۱۸۳۸۲۔ دو راوی غیر معروف ہیں۔ مجمع الزوائد: باب فیمن صلی فی بیته ثم وجد الناس یصلون فی المسجد: ۲۱۷۶

(۲) بخاری: باب انما جعل الامام لیؤتم به: ۶۸۹

(۳) بخاری: باب اذا لم یطق قاعدا صلی علی جنب: ۱۱۱۷

فائدہ: نبی ﷺ نے مرض الوفات سے بہت سال پہلے اپنے ایک حادثاتی مرض کے موقع پر فرمایا تھا، جب امام بیٹھ کر نماز پڑھے تو تم بھی بیٹھ کر نماز پڑھو۔(۱) اس ارشاد گرامی کے بارے میں امام بخاریؒ اپنے استاذ حمیدیؒ سے نقل کرتے ہیں کہ حکمِ مذکور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے قدیم مرض کے موقع کا ہے، اس کے بعد مرض الوفات میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بیٹھ کر نماز پڑھی تھی اور لوگ کھڑے ہو کر اقتداء کر رہے تھے، آپ ﷺ نے ان کو بیٹھنے کا حکم نہیں دیا اور قاعدہ یہی ہے کہ نبی ﷺ کے آخری عمل ہی کو اختیار کیا جاتا ہے۔(۲)

امام شافعیؒ نے بھی پورے وثوق کے ساتھ سابقہ حکم کے منسوخ ہونے کی تصریح کی ہے۔(۳)☆

(۱) بخاری: باب انما جعل الامام لیتوتم به: ۶۸۹

(۲) بخاری باب انما جعل الامام لیتوتم به: ۶۸۹

(۳) (الرسالة: ۱/ ۲۵۴: ۲۰۲: ۷. کتاب الام باب صلاة الامام قاعداً: ۱۹۹۷)

☆امام شافعیؒ اور جمہور سلف کا یہی مسلک ہے۔(نیل الاوطار: ۳/ ۴۹) امام مالکؒ کے یہاں بیٹھ کر امامت کرنا نبی علیہ السلام کی خصوصیت تھی، آپ علیہ السلام کے بعد کسی اور کے لئے بیٹھ کر امامت کرنا درست نہیں، امام احمدؒ کا مسلک یہ ہے کہ اگر مستقل امام شروع نماز ہی سے کسی عارضی بیماری کی وجہ سے بیٹھ کر نماز پڑھتا ہے تو مقتدی حضرات بھی بیٹھ کر نماز پڑھیں گے اور اگر امام روزمرہ کا نہیں بلکہ اتفاقی طور پر امام بن گیا ہو یا روزمرہ کا امام ہی ہو مگر اس نے کھڑے ہو کر نماز شروع کی تھی پھر دوران نماز عذر کی وجہ سے بیٹھنا پڑا تو ان دونوں صورتوں میں مقتدی کھڑے ہو کر ہی اقتداء کریں گے۔(الفقه الاسلامی: ۲/ ۱۲۴۴. فتح الباری: ۲/ ۱۷۶)

فرض پڑھنے والے کا نفل پڑھنے والے کی یا بالغ کا نابالغ کی اقتداء کرنا:

حضرت ابوامامہ باہلیؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: امام ضامن ہوتا ہے۔(۱) یعنی مقتدیوں کی نمازوں کی ذمہ داری لیتا ہے اور احکام کے لحاظ سے ان کی نمازوں کو اپنی نماز میں شامل کر لیتا ہے، اور یہ اس وقت ہو سکتا ہے جب کہ امام کی نماز قوت وصفت میں مقتدی کی نماز سے بڑھی ہوئی ہو (بایں طور پر کہ امام فرض پڑھ رہا ہو اور مقتدی نفل کی نیت سے شریک ہو جیسا کہ اس کا جائز ہونا سابق میں معلوم ہو چکا ہے) یا کم از کم برابر ہو (بایں طور کہ دونوں فریضہ وقت کی ادائیگی کر رہے ہو)۔

حضرت انس بن مالکؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے ارشاد فرمایا: امام اس لئے ہوتا ہے کہ اس کی اقتداء کی جائے لہذا اس سے اختلاف نہ کرو(۲) اختلاف کے عمومی مفہوم میں یہ بات بھی داخل ہے کہ مقتدی کی نیت امام کی نیت کے مخالف ہو، پس امام کی نیت نفل کی ہو اور مقتدی کی فرض کی ہو تو اس سے امام کی خلاف ورزی لازم آتی ہے جو ممنوع ہے(۳)

اس کی تائید اس سے بھی ہوتی ہے کہ متعدد روایات میں: نابالغ کو (جس پر شرعاً نماز فرض نہیں رہتی) بالغ لوگوں (جن پر شریعت نے نماز فرض کر دی ہے) کا امام بننے سے روکا گیا ہے۔(۴) معلوم ہوا کہ مفترض، متنفل کے پیچھے نماز نہیں پڑھ سکتا۔☆

---

(۱) ترمذی :تحقیق الالبانی:باب ما جاء ان الامام ضامن: ۲۰۷. صحیح

(۲) بخاری : ۷۳۲ باب اقامة الصف من تمام الصلوة

(۳)اعلاء السنن : :۴/۲۹۰

(۴)مصنف ابن ابی شیبه:باب امامة الغلام قبل ان یحتلم:۳۵۲۴.۳۵۲۵.سکت علیه المحقق محمد عوامه

☆امام مالکؒ واحمدؒ کے یہاں بھی مفترض متنفل کے پیچھے نماز نہیں پڑھ سکتا۔(معارف السنن : ۵/۹۱.۹۲،الفقه الاسلامی : ۲/۱۲۴۳

صف بندی کی اہمیت

صفوں کی درستگی سنت موکدہ ہے، صفوں کا بگاڑ واختلاف دلوں کے بگاڑ واختلاف کا سبب اور اللہ کی رحمت سے دوری کا باعث ہے،

رسول اللہ ﷺ کا ارشاد گرامی ہے: نماز میں صفوں کو سیدھی رکھو، کیوں کہ صفوں کی درستگی، نماز کا حسن ہے(۱) ایک اور روایت میں ہے کہ صفوں کی درستگی سے نماز کامل ومکمل ہوتی ہے۔(۲)

حضرت براء بن عازبؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ صف کے ایک کنارے سے دوسرے کنارے کے درمیان چلتے اور لوگوں کے سینوں اور کندھوں کو درست فرماتے اور ارشاد فرماتے: اختلاف نہ کرو (صفوں میں) ورنہ تمہارے دلوں میں اختلاف پیدا ہو جائے گا۔(۳)

حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: جو صف کو جوڑتا ہے اللہ اس کو (اپنی رحمت اور لطف وعنایت سے) جوڑ دیتا ہے اور جو صف کو کاٹتا ہے اللہ اس کو کاٹ دیتا ہے(۴) صف کی درستگی کا طریقہ یہ ہیکہ کندھے، گردن، گھٹنے، قدم ایک سیدھ میں ہوں اور درمیان میں خلا نہ ہو،

رسول اللہ ﷺ ارشاد فرماتے ہیں، اپنی صفوں کو درست کرو اور اپنے کندھوں کو ایک سیدھ میں رکھو اور خلاء کو بند کرو کیوں کہ شیطان تمہارے درمیان بکری کے بچے کی طرح داخل ہو جاتا ہے (اور نماز خراب کر دیتا ہے)(۵)

---

(۱) بخاری :باب اقامة الصف: ۷۲۲

(۲) مسلم :باب تسوية الصفوف:۱۰۰۳

(۳) ابو داؤد تحقيق الالبانی:باب تسوية الصفوف:۶۶۴. صحيح

(۴)نسائی:تحقيق الالبانی:باب من وصل صفا: ۸۱۹. صحيح

(۵) ابو داؤد تحقيق الالبانی:باب تسوية الصفوف:۶۶۷

حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا صفوں کو ملائے رکھو قریب قریب کھڑے ہو اور گردنوں کو ایک سیدھ میں رکھو۔(۱)

شروع زمانے میں صحابہ کرام صفوں کی درستگی کے عادی نہ تھے اس سلسلہ میں کبھی کبھار ان سے بے ترتیبی بھی ہو جایا کرتی تھی، حضرت جابر بن سمرہؓ فرماتے ہیں، ایک دفعہ رسول اللہ ﷺ تشریف لائے تو دیکھا کہ ہم حلقہ نما شکل میں کھڑے ہوئے ہیں، اس پر آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: کیا بات ہے تم لوگ بکھرے بکھرے ٹولیوں کی شکل میں کھڑے ہو؟ پھر دوبارہ تشریف لائے تو فرمایا تم لوگ ویسے صف بندی کیوں نہیں کرتے جیسے ملائکہ اپنے پروردگار کے حضور میں صف بندی کرتے ہیں؟ ہم نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ ملائکہ اپنے پروردگار کے حضور میں صف بندی کس طرح کرتے ہیں؟ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: اگلی صفوں کو مکمل کرتے ہیں اور مل مل کر کھڑے ہوتے ہیں (۲)

رسول اللہ ﷺ نے صحابہ کرام کے ذہنوں میں صفوں کی درستگی کی اس قدر اہمیت بٹھادی تھی کہ صحابہ کرام نماز شروع کرنے سے قبل یہ یقین کرنے کے لئے کہ صف درست ہوگئی ہے باہم ایک دوسرے کے گھٹنے اور ٹخنے ملالیا کرتے تھے، حضرت نعمان بن بشیرؓ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ تشریف لائے پھر تین دفعہ فرمایا: اپنی صفوں کو سیدھی رکھو، قسم بخدا صفوں کو درست رکھو ورنہ اللہ تمہارے دلوں میں پھوٹ ڈالدے گا، حضرت نعمانؓ کہتے ہیں (اس قسم کے ارشادات سن کر) ہم لوگ ایک دوسرے کے کندھے، گھٹنے اور ٹخنے ملالیا کرتے تھے۔(۳) بخاری کی روایت میں ہے کہ ہم میں ایک اپنا قدم دوسرے کے قدم سے ملالیا کرتا تھا۔(۴)

---

(۱) ابوداؤد تحقیق الالبانی: باب تسویۃ الصفوف ٦٦٧ . صحیح

(۲) مسلم : باب الامر بالسکون فی الصلاۃ: ٦٩٩

(۳) مسلم : باب تسویۃ الصفوف: ١٠٠٧ . ابوداؤد: تحقیق الالبانی باب تسویۃ الصفوف: ٦٦٣ . صحیح

(۴) بخاری: باب الزاق المنکب بالمنکب: ٧٢٥

تاہم صفوں کی درستگی میں اصل مقصود اور منشأ شریعت، آگے پیچھے نہ ہونا اور درمیان میں خالی جگہ نہ رکھنا ہے، رسول اللہ ﷺ کا اہتمام بھی یہی تھا، چنانچہ آپ ﷺ نے انہی دو باتوں کا حکم بھی دیا ہے، اور ان سے پہلو تہی کرنے پر سخت وعید بھی بیان فرمائی ہے، نعمان بن بشیرؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ ہماری صفوں کو اس قدر سیدھی کیا کرتے تھے کہ ان کے سیدھے پن سے تیر کی سیدھ بھی ڈھالی جاسکتی تھی، پھر رسول اللہ ﷺ کو اطمینان ہو گیا کہ ہم صفوں کی درستگی کی اہمیت کو سمجھ چکے ہیں اچانک ایک دن آپ ﷺ نے عین تکبیر تحریمہ کے موقع پر دیکھا کہ ایک شخص اپنے سینے کو صف سے آگے کیا ہوا ہے تو رسول اللہ ﷺ نے (جوش سے) فرمایا اللہ کے بندو! صفوں کو درست رکھو ورنہ اللہ تعالیٰ تمہارے چہروں میں مخالفت پیدا کر دے گا۔(۱)

باقی قدم کا قدم سے یا گھٹنے کا گھٹنے سے ملائے رکھنے کا نہ ہی آپ ﷺ نے حکم فرمایا ہے اور نہ ہی اس کا لحاظ نہ رکھنے پر کوئی وعید بیان فرمائی ہے اور نہ ہی ختم نماز تک یہ شکل برقرار رکھنا ممکن ہے، اس لئے صفوں کی درستگی کے اصل معیار کو نظر انداز کر کے اس طریقہ پر اصرار کرنا مناسب نہیں ہے۔

(الف) صف اول اور سیدھی جانب میں کھڑے ہونے کی فضیلت:

حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا: اگر لوگوں کو یہ معلوم ہوتا کہ اذان اور پہلی صف کا کیا ثواب ہے اور پھر انہیں قرعہ ڈالنے کے سوا کوئی چارہ نہ ہوتا تو وہ قرعہ ڈالا کرتے۔(۲)

حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا: اللہ تعالیٰ اور اس کے فرشتے ان لوگوں پر سلامتی بھیجتے ہیں جو صفوں کی دائیں طرف نماز پڑھتے ہیں۔(۳) البتہ اگر صف کا

(۱)مسلم : باب تسوية الصفوف: ۱۰۰۷ .ابو داؤد: تحقيق الالبانى باب تسوية الصفوف:۶۶۳ . صحيح

(۲)بخارى باب الاستهام فى الاذان : ۶۱۵

(۳)ابو داؤد: تحقيق الالبانى باب من يستحب ان يلى الامام فى الصف : ۶۷۶ .حسن

بایاں حصہ پُر نہ ہو تو پھر اس کو آباد کرنا زیادہ ثواب کا باعث ہے۔

حضرت ابن عمرؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ سے عرض کیا گیا کہ مسجد کا بایاں حصہ خالی پڑ گیا ہے تو آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: جو بھی مسجد کے بائیں حصہ کو آباد کرے اس کو ثواب کے دو حصے ہیں۔(۱)

(ب) صف اول کو مکمل کرنا:

حضرت انسؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: اگلی صف کو مکمل کرو پھر بعد والی صف کو جو کمی ہو تو وہ پچھلی صف میں رہنی چاہئے۔(۲)

صف اول میں جگہ پانے کے شوق سے عاری ہونا، نیکی کی جانب دوڑ و دھوپ کے جذبہ سے عاری ہونے کی علامت ہے کوئی آدمی صف اول میں جگہ رکھتے ہوئے، بے عذر پچھلی صف میں کھڑا ہو جاتا ہے تو اس کا یہ فعل نہایت مکروہ و قبیح ہے۔

حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: بعض لوگ صف اول سے پیچھے رہنے کی عادت بنائے ہوتے ہیں، ان کا انجام یہ ہوتا ہے کہ اللہ تبارک وتعالی انہیں دوزخ میں پیچھے دھکیل دیتے ہیں۔(۳)

(ج) صف کے پیچھے تنہا نماز پڑھنا مکروہ ہے:

حضرت ابوبکرہؓ سے روایت ہے کہ میں مسجد میں آیا تو دیکھا کہ نبی ﷺ نماز پڑھا رہے ہیں اور رکوع میں ہیں، میں اس صف میں پہنچنے سے پہلے ہی رکوع میں آ گیا بعد میں رسول اللہ ﷺ سے میں نے اپنا یہ عمل بیان کیا تو آنحضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا: اللہ تمہارے

(۱)ابن ماجة تحقيق الالبانی : باب فضل ميمنة الصف : ۱۰۰۷ . ایک راوی ضعیف ھیں .

(۲)ابو داؤد: تحقيق الالبانی باب تسوية الصفوف: ۶۷۱. صحيح

(۳)ابو داؤد تحقيق الالبانی: باب صف النساء و كراهية التاخر عن الصف الاول: ۶۷۹. صحيح

شوق وحرص میں مزید اضافہ کرے، آئندہ ایسا نہ کرو۔(۱)

اگر کوئی شخص اس وقت آئے جب کہ صف پوری ہو چکی ہو تو اسے چاہئے کہ تنہا نماز پڑھنے کے بجائے صف میں کسی کو کھینچ کر اپنے ساتھ ملا لے۔

حضرت مقاتل بن حیانؒ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے ارشاد فرمایا: اگر کوئی شخص آئے اور وہ کسی دوسرے شخص کو نہ پائے تو اسے چاہئے کہ صف میں سے کسی آدمی کو کھینچ کر اپنے بازو میں کھڑا کر لے، جس شخص کو کھینچا جائے گا اس کا ثواب بہت ہے۔(۲) اگر سامنے کی صف میں کھڑا آدمی مسائل سے ناواقف ہو تو اس کو پیچھے کھینچنے کی سعی نہ کی جائے (کہ اس میں فساد کا اندیشہ ہے) بلکہ تنہا ہی کھڑا ہو جائے۔(۳)

(د) اگر امام کے ساتھ ایک مقتدی ہو تو وہ امام کے ساتھ دائیں جانب کھڑا ہوگا اور اگر دو یا دو سے زیادہ مقتدی ہیں تو وہ امام کے پیچھے کھڑے ہوں گے۔

حضرت جابرؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نماز پڑھنے کے لئے کھڑے ہوئے تو میں آکر آپ ﷺ کی بائیں جانب شامل ہو گیا، آپ ﷺ نے میرا ہاتھ پکڑا اور مجھے گھما کر اپنی دائیں جانب کھڑا کر دیا، پھر جبار بن صخرؓ آگئے اور نبی ﷺ کی بائیں جانب کھڑے ہو گئے، آپ ﷺ نے ہمارے ہاتھ پکڑے اور ہمیں دھکیل دیا اور اپنے پیچھے کھڑا کر دیا۔(۴)

(ہ) اگر جماعت میں مرد، عورت بچے سب موجود ہوں تو آگے مردوں کی صف رہے گی پھر بچوں کی پھر عورتوں کی، حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ ہمارے گھر میں، میں نے اور یتیم نے رسول اللہ ﷺ کے پیچھے نماز پڑھی اور ہماری ماں ام سلیمؓ ہمارے پیچھے (نماز ادا کر رہی)

(۱) بخاری: اذا رکع دون الصف: ۷۸۳

(۲) مراسیل ابوداؤد: ۸۰

(۳) البحر الرائق: ۱/۳۵۳

(۴) مسلم باب حدیث جابر الطویل: ۷۷۰۵

تھی (۱) حضرت ابو مالک اشعری سے روایت ہے کہ نبی ﷺ جماعت میں مردوں کو سب سے آگے رکھتے تھے، ان کے پیچھے بچوں کو اور ان کے پیچھے عورتوں کو۔ (۲)

(و) جماعت ختم ہونے کے بعد، امام و باقی مقتدیوں کے لئے مستحب یہ ہے کہ سنن و نوافل، اگر مسجد ہی میں پڑھنی ہو تو اپنی جگہ تبدیل کر لیں، (۳) نبی ﷺ نے ارشاد فرمایا: امام کو چاہیئے کہ وہ نماز پڑھانے کے بعد جگہ تبدیل کر کے نماز پڑھے۔ (۴)

حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے ارشاد فرمایا: جب تم میں سے کوئی اپنی نماز سے فارغ ہو تو کچھ آگے یا پیچھے یا دائیں یا بائیں ہونے سے وہ عاجز و مجبور نہ ہو جائے؟ (۵) امام ابوداؤدؒ نے اس حدیث پر سکوت کیا ہے جو ان کے نزدیک حدیث کے معتبر ہونے کی دلیل ہے، مسلم شریف میں بھی ایک روایت حدیث مذکور کے مضمون کی فی الجملہ تائید کرتی ہے۔ (۶)

جگہ تبدیل کر کے نماز پڑھنے کا فائدہ یہ ہوگا کہ کل قیامت کے دن یہ جگہیں نمازی کے حق میں گواہی دیں گی۔ (۷)

---

(۱) بخاری باب صلوة النساء خلف الرجال:: ۸۷۱

(۲) مسند احمد: تحقیق شعیب الارنووط: ۲۲۹۶۲. اسناده ضعیف لضعف شهر بن حوشب

(۳) طحطاوی علی المراقی : ۳۱۳

(۴) ابو داؤد تحقیق الالبانی :باب الامام یتطوع فی مکانه: ۶۱۶. صحیح

(۵) ابو داؤد: تحقیق الالبانی: باب الرجل یتطوع فی مکانه الذی صلی فیه المکتوبة: ۱۰۰۸. صحیح

(۶) عمدة القاری : ۳/۲۹، اعلاء السنن : ۳۷۵

(۷) السنن الکبری للنسائی : کتاب المواعظ: ۱۱۸۶۱، در منثور : ۱۳/ ۲۷۵. سورة الدخان

اگر نماز ایسی ہو کہ اس کے بعد سنن ونوافل نہیں تو نمازیوں کو اختیار ہے، چاہیں تو وہیں بیٹھے رہیں اور ذکر ودعا میں مشغول رہیں اور چاہیں تو چلے جائیں، حضرت ابن مسعودؓ فرماتے ہیں: جب امام نماز سے فارغ ہوگیا اور اپنی جگہ سے نہ کھڑا ہوا نہ ہی اپنی نشست ابھی تبدیل کی اور تم کو کوئی ضرورت درپیش ہو تو اٹھ کر چلے جاؤ اس لئے کہ تمہاری نماز مکمل ہوچکی۔(۱) ایسے ہی امام کو بھی یہ اختیار ہے تاہم اگر وہ مصلے پر ذکر ودعا میں مشغول رہنا چاہتا ہے تو اپنی سیدھی جانب مڑکر صف کے داہنی جانب کے نمازیوں کی طرف رخ کرکے بیٹھے(۲)

حضرت انسؓ فرماتے ہیں: میں نے رسول اللہ ﷺ کو بکثرت اپنی سیدھی جانب پھرتے دیکھا ہے(۳)

حضرت براءؓ کہتے ہیں: ہم جب رسول اللہ ﷺ کے پیچھے نماز پڑھتے تو آپ ﷺ کی سیدھی جانب میں ہونے کو پسند کرتے تھے تاکہ آپ ﷺ (بعد فراغت نماز) ہماری جانب متوجہ ہوں(۴)

ہاں سیدھی جانب رخ کرنے ہی کو ضروری سمجھنا زیادتی اور غلط خیال ہے، حضرت ابن مسعودؓ فرماتے ہیں: تم سیدھی جانب رخ کرنے ہی کو ضروری خیال کرکے اپنی طرف سے شیطان کے لئے کوئی حصہ مقرر نہ کرو، میں نے بارہا نبی ﷺ کو بائیں طرف بھی پھرتے دیکھا ہے۔(۵)

---

(۱) طبرانی کبیر: ۹۲۳۷ .رجاله ثقات: مجمع الزوائد: باب متابعة الامام: ۹ ۲۴۱

(۲) بدائع الصنائع: ۱۳۴/۲

(۳) مسلم: باب جواز الانصراف من الصلاة عن اليمين والشمال: ۱۶۷۵

(۴) مسلم: باب استحباب يمين الامام: ۱۶۷۶

(۵) مسلم: باب جواز الانصراف من الصلاة عن اليمين والشمال: ۱۶۷۲

(ز) ارکان کی ادائیگی میں امام سے سبقت کرنے کی ممانعت:

حضرت ابو ہریرہؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: امام اس لئے بنایا جاتا ہے کہ اس کی پیروی کی جائے لہذا اس کی مخالفت نہ کرو، جب وہ تکبیر کہے تو تم بھی تکبیر کہو ، جب وہ رکوع کرے تو تم بھی رکوع کرو اور جب وہ سمع اللہ لمن حمدہ کہے تو تم اللھم ربنا لک الحمد کہو: اور جب وہ سجدہ کرے تو تم بھی سجدہ کرو۔(۱)

حضرت ابو ہریرہؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ ہم کو تعلیم دیتے ہوئے فرمایا کرتے تھے کہ امام سے سبقت نہ کرو بلکہ جب وہ تکبیر کہے تو تم بھی تکبیر کہو، اور جب وہ ولا الضالین کہے تو تم امین کہو اور جب وہ رکوع کرے تو تم بھی رکوع کرو۔(۲)

(ح) امام کے ساتھ رکوع پانے والا رکعت پانے والا ہوتا ہے۔

حضرت ابوبکرۃؓ سے مروی ہے کہ وہ نبی ﷺ کے پاس پہنچے تو آپ ﷺ رکوع کی حالت میں تھے، انہوں نے صف میں شامل ہونے سے پہلے ہی رکوع کر لیا، بعد ازاں نبی ﷺ سے اس کا تذکرہ کیا تو آپ ﷺ نے فرمایا: اللہ تمہارے شوق میں اور اضافہ کرے، آئندہ ایسی جلد بازی نہ کرنا۔(۳)

امام بخاری کے رسالہ ''القرأۃ خلف الامام'' میں ہے کہ حضرت ابوبکرۃؓ نے اپنی عجلت کی وجہ یہ بیان فرمائی کہ مجھے آپ ﷺ کے ساتھ رکعت فوت ہو جانے کا اندیشہ ہو گیا تھا اس لئے میں نے جلد بازی کا مظاہرہ کیا تھا(۴) معلوم ہوا کہ رکوع پانے سے رکعت مل جاتی ہے۔

(۱)مسلم :باب ائتمام الماموم بالامام:۹۵۷

(۲)مسلم :باب النهي عن مبادرة الامام: ۹۵۹

(۳)بخاری :باب اذا رکع دون الصف:۷۸۳

(۴)القرأة خلف الامام: للامام بخاری:۱۲۵ .مصدر الکتاب:موقع جامع الحدیث

حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: جب تم نماز کے لئے آؤ اور ہمیں سجدہ کی حالت میں پاؤ تو تم بھی سجدہ میں شامل ہو جاؤ مگر اس کو کچھ شمار نہ کرو، ہاں جو آدمی رکوع پالے تو اس کو نماز (رکعت) مل گئی۔(۱)

(ط) رکعت ملنے کے لئے امام کا تعاون:

کسی مقتدی کی ذاتی حیثیت و معرفت سے قطع نظر کوئی امام محض اس نیت سے کہ مقتدیوں کو رکعت مل جائے، رکعت یا رکوع کو قدرے طویل کرتا ہے تو اس میں کوئی قباحت ومضائقہ نہیں ہے۔

حضرت ابوقتادہؓ سے مروی ہے کہ نبی پاک ﷺ نماز فجر وظہر میں پہلی رکعت کو دوسری رکعت کے مقابلہ میں طویل کیا کرتے تھے،(۲) بعض روایات میں یہ اضافہ بھی منقول ہے کہ ہمارا خیال یہ ہوتا تھا کہ رسول اللہ ﷺ، ایسا اس لئے فرمایا کرتے تھے کہ لوگ پہلی رکعت کو پالیں۔(۳)

(ی) مسبوق اپنی نماز کیسے پوری کرے:

مسبوق اپنی فوت شدہ رکعتوں میں تو شروع نماز ادا کرنے والے کے حکم میں ہوتا ہے مگر قعدہ وتشہد کے لحاظ سے، ترتیب وار رکعتوں کو ادا کرنے والے کے حکم میں ہوتا ہے، حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے ارشاد فرمایا جب تم اقامت کو سنو تو نماز کی جانب وقار واطمینان کے ساتھ آؤ، جلد بازی نہ کرو، پھر جتنی رکعتیں تم کو مل جائیں وہ پڑھ لو، اور جو چھوٹ گئی ہوں، ان کی قضا کرو۔(۴)

(۱)ابو داؤد تحقیق الالبانی: باب فی الرجل یدرک الامام ساجداً کیف یصنع: ۸۹۳. حسن
(۲) بخاری: باب یطول فی الرکعۃ الاولی: ۷۷۹
(۳)ابوداود تحقیق الالبانی: باب ماجاء فی القراء ۃ فی الظھر: ۸۰۰ صحیح
(۴)بو داؤد تحقیق الالبانی: باب السعی الی الصلاۃ: ۸۶۱. صحیح

حضرت ابن مسعودؓ سے مسبوق کے بارے میں حکم دریافت کیا گیا تو فرمایا وہ، امام کے ساتھ پانے والی رکعتوں کو اپنی نماز کا اخیر حصہ قرار دے لے (اور اول حصہ کی قضا امام کے سلام پھیرنے کے بعد کرلے)(۱)

ابراہیم نخعیؒ سے مروی ہے کہ حضرت مسروقؒ اور جندبؒ امام کے ساتھ مغرب کی تیسری رکعت میں شریک ہوئے، امام کے سلام پھیرنے کے بعد دونوں حضرات اپنی فوت شدہ دو رکعتوں کی قضا کے لئے کھڑے ہوگئے، حضرت مسروقؒ نے ان دو رکعتوں میں سے پہلی رکعت میں بھی قعدہ کیا اور حضرت جندبؒ نے قعدہ نہیں کیا، بلکہ صرف اخیر رکعت میں قعدہ کیا، پھر یہ دونوں حضرات حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کی خدمت میں پہنچ کر اپنا اپنا عمل بیان کیا، حضرت ابن مسعودؓ نے فرمایا دونوں نے ہی خوب کیا ہے؛ البتہ مجھے اسی طرح پر نماز پوری کرنا پسند ہے جیسے مسروقؒ نے پوری کیا ہے۔(۲)

(ک) امام نے بے وضو یا حالت جنابت میں نماز پڑھادی تو؟

حضرت علیؓ سے مرفوعاً اور موقوفاً ثابت ہے کہ ایسی صورت میں امام اور مقتدی سب نماز کا اعادہ کریں۔

حضرت علی بن ابی طالبؓ سے روایت ہے کہ ایک دن رسول اللہ ﷺ نے ہمیں نماز پڑھائی اور واپس تشریف لے گئے پھر دوبارہ اس حال میں تشریف لائے کہ سر مبارک سے پانی کے قطرے گر رہے تھے، پھر آپ ﷺ نے ہم کو نماز پڑھائی اور ارشاد فرمایا کہ میں نے حالت جنابت میں تمہیں نماز پڑھادی تھی، پس جس کسی کو میری طرح کوئی صورت پیش

(۱) طبرانی کبیر: ۹۲۶۴ صحیح: مجمع الزوائد :باب فیما یدرک مع الامام وما فاته: ۲۴۰۰

(۲) طبرانی کبیر: ۹۲۶۵، ۹۲۶۷ کتاب الاثار امام محمدؒ: باب من سبق بشیء من صلاته: ۱۲۹ سند کے ایک راوی متکلم فیہ ہیں: مجمع الزوائد: باب فیما یدرک مع الامام وما فاته: ۲۴۰۱

آجائے تو وہ ایسا ہی کرے جیسے میں نے کیا ہے۔(۱)

حضرت علیؓ نے اس امام کے بارے جس نے بحالت جنابت نماز پڑھادی ہو، یہ فرمایا کہ وہ بھی نماز کا اعادہ کرے اور لوگ بھی کریں۔(۲)

حضرت عمرؓ سے نماز مغرب میں قرأت میں بھول ہوگئی تھی، آپؓ نے بھول سے قرأت ہی نہیں فرمائی، نماز کے بعد آپؓ کو اس طرف توجہ دلائی گئی تو آپؓ نے لوگوں کو نماز کا اعادہ کروادیا تھا(۳) امام طحاویؒ فرماتے ہیں کہ ترک قرأت پر نماز کے فاسد ہونے میں پھر بھی اختلاف ہے! اس کے باوجود حضرت عمرؓ نے نماز کا اعادہ فرمایا تھا، ترک طہارت کے ساتھ تو کسی کے یہاں بھی نماز نہیں ہوتی تو ترک طہارت کی بنا پر نماز کا لوٹانا تو عین لائق وضروری ہے۔(۴)

بعض راویات میں حضرت عمرؓ کا یہ واقعہ مذکور ہے کہ انہوں نے ایک دفعہ حالت جنابت میں نماز پڑھادی تھی، بعد کو احساس ہوا تو خود تو نماز کا اعادہ کیا لیکن لوگوں کو اعادہ صلوۃ کا حکم نہیں دیا۔(۵)

امام طحاویؒ فرماتے ہیں: اس کی دو وجہ ہیں: ایک تو یہ کہ انہیں، اس رطوبت کے منی ہونے میں شک تھا، اس طرف بھی ذہن جاتا تھا کہ شاید مذی ہو اور نماز کے بعد نکلی ہو۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ معمولی مقدار میں شاید یہ منی، بیوی سے مجامعت کے درمیان لگی ہو پھر غسل کے بعد یہی کپڑا جسم پر رہ گیا، ایک آدھ دن کے بعد دھبہ پر نظر پڑی تو شبہ ہوگیا کہ تازہ احتلام کا دھبہ ہے یا دوران مجامعت لگی ہوئی منی ہے جس کے بعد غسل کرلیا

---

(۱) مسند احمد : ۷۷۷. ۷۷۹ . حسن اعلاء السنن : ۴/ ۳۱۱

(۲) کتاب الاثار: امام محمد باب ما یقطع الصلاۃ: ۱۳۳ . حسن: اعلاء السنن ۴ / ۳۰۹

(۳) طحاوی :باب الرجل یصلی الفریضۃ خلف من یصلی تطوعا: ۲۳۶۵ . اعلاء السنن ۴/۳۱۴

(۴) طحاوی : ۲۳۶۵

(۵) السنن الکبری للبیہقی :باب امامۃ الجنب : ۳۸۷۷

گیا تھا، ظاہر ہے ایسی مشتبہ صورتحال میں حضرت عمرؓ نے خود تو احتیاط کے تقاضے پر عمل کرنے کو ضروری خیال فرمایا، مگر لوگوں کو نماز کے اعادہ کے حکم نہیں کیا۔

بعض روایات سے ایک اور وجہ سامنے آتی ہے کہ یہ اس زمانے کا واقعہ ہے جب کہ حضرت عمرؓ کی رائے اس مسئلہ میں یہ تھی کہ تنہا امام اعادہ کرے مقتدیوں کو اعادہ کرنے کی ضرورت نہیں، بعد میں ان کی رائے بدل گئی اور آپؓ نے حضرت علیؓ کی رائے کی طرف رجوع فرمالیا۔(۱)

---

(۱)اعلاء السنن : ۳۱۶/۴، مصنف عبدالرزاق باب الرجل یؤم القوم وھو جنب: ۳۶۶۲.قابل استدلال:اعلاء السنن ۳۱۷/۴

نماز وتر

وتر کے وجوب اور اس کے وقت کا بیان:

وتر کی نماز واجب ہے اور اس کا وقت وہی ہے جو عشاء کا ہے، نبی ﷺ نے مختلف طریقوں سے وتر کی اہمیت کو بیان فرمایا ہے، اور وتر کے ترک کرنے پر سخت وعید بیان فرمائی ہے، وتر کے فوت ہونے کی صورت میں اس کی قضاء کی تاکید کی گئی ہے، اور ان اوقات میں بھی، اس کی قضا کا موقع رکھا گیا ہے، جن میں نوافل پڑھنا مکروہ ہے، لیکن فرائض کی قضاء مکروہ نہیں جیسے صبح صادق سے طلوع آفتاب تک کا درمیانی وقت، تاہم وتر کا درجہ فرض نمازوں کی طرح نہیں ہے۔

حضرت بریدہؓ سے مروی ہے کہ: میں نے رسول اللہ ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا ہے کہ وتر (بندوں پر ایک) حق ہے، جو وتر نہ پڑھے وہ ہم میں سے نہیں، تین دفعہ یہ جملہ ارشاد فرمایا(۱)

نبی ﷺ کا ارشاد ہے: بلاشبہ اللہ تعالی نے ایک ایسی نماز کے ذریعہ تمہاری امداد فرمائی ہے جو تمہارے لئے سرخ اونٹوں سے بھی بہتر ہے، وہ نماز وتر ہے، عشاء سے فجر تک کے درمیانی وقت میں اللہ تبارک وتعالی نے تمہارے لئے یہ نماز مقرر فرمائی ہے۔(۲) اس مضمون کی احادیث آٹھ یا نو صحابہؓ سے معتبر سندوں کے ساتھ مروی ہے۔(۳) حضرت ابوایوب انصاریؓ سے روایت ہے کہ آنحضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا: وتر (حق) واجب ہے۔(۴) حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے روایت ہے: نبی ﷺ نے ارشاد فرمایا: وتر ہر مسلمان پر واجب ہے۔(۵)

---

(۱)مستدرک مع تعلیقات الذھبی: کتاب الوتر: ۱۱۴۶ . ۱۱۴۷ . صحیح امام حاکمؒ، حسن. فتح القدیر: باب صلوۃ الوتر: ۱/ ۴۲۵

(۲)المستدرک مع تعلیقات الذھبی: کتاب الوتر: ۱۱۴۸ . صحیح امام حاکمؒ وذھبیؒ

(۳)اعلاء السنن: ۶/ ۸

(۴)دار قطنی باب الوتر بخمس او بثلاث: ۱۶۵۹ . رواتہ کلھم ثقات: اعلاء السنن: ۶/ ۱۱

(۵)مسندبزار: ۷ ۔ ۱۶۳ ۔ ۱۴۵۵ . حسن: اعلاء السنن: ۶/ ۱۴

حضرت جابرؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے ارشاد فرمایا: جس کو یہ اندیشہ ہو کہ وہ رات کے اخیر حصے میں نہیں اٹھ سکے گا تو وہ شروع رات ہی میں وتر پڑھ لے اور جو رات کے اخیر حصہ میں بیدار ہونے کی قوی امید رکھتا ہو تو وہ اخیر رات میں وتر پڑھے، اس لئے کہ اخیر رات کی نماز، حضوری کی ہوتی ہے اور یہ افضل بھی ہے۔(۱)

حضرت ابن عمرؓ سے مروی ہے: رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: جب صبح صادق ہو جائے تو رات کی تمام نمازوں اور وتر کا وقت نکل گیا، لہذا صبح صادق سے قبل وتر ادا کرلو۔(۲)

حضرت ابو ہریرہؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا جب تم میں سے کوئی صبح اس حالت میں کردے کہ اس نے وتر نہیں پڑھی تو اب وتر پڑھ لے۔(۳) حضرت علیؓ کا ارشاد ہے وتر، فرض کی طرح ضروری نماز نہیں، لیکن رسول پاک ﷺ نے (نہایت پابندی و اہتمام سے) وتر ادا فرمائی ہے۔(۴)

ایک موقع پر حضرت عبداللہ بن عباسؓ کی نماز وتر رہ گئی تھی، فجر کے اخیر وقت میں آنکھ کھلی تو اپنے احباب سے پوچھا کیا وقت میں اتنی گنجائش ہے کہ میں تین رکعت وتر، دو رکعت سنت فجر اور نماز فجر پڑھ سکوں؟ احباب نے کہا ہاں!(۵)

رکعات وتر:

نماز وتر کی تین رکعت ہیں، درمیان میں دوسری رکعت میں قعدہ کرنا ہے، تیسری رکعت میں قرأت فاتحہ وضم سورۃ پھر تکبیر کہہ کر دعائے قنوت پڑھنا، تیسری رکعت کے ختم پر سلام پھیرنا ہے۔

---

(۱)مسلم :باب من خاف ان لا یقوم من اخر اللیل: ۱۸۰۲

(۲)ترمذی تحقیق الالبانی باب ما جاء فی مبادرة الصبح بالوتر: ۴۶۹۔صحیح

(۳) مستدرک مع تعلیقات الذھبی: کتاب الوتر: ۱۱۳۶۔صحیح: امام حاکمؒ وذھبیؒ

(۴)مستدرک مع تعلیقات الذھبی: کتاب الوتر: ۱۱۱۸۔ لہ شواھد : امام حاکمؒ

(۵) طحاوی: باب الوتر: ۱۷۲۳۔صحیح: اعلاء السنن: ۶/۴۷

تین رکعت ایک سلام سے:

حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں: رسول اللہ ﷺ رمضان وغیر رمضان میں گیارہ رکعات پر اضافہ نہیں فرماتے تھے (یعنی نماز تہجد میں)، اولاً چار رکعت پڑھتے ان کی عمدگی اوران کی طوالت نا قابل بیان ہے، پھر اس کیفیت کے ساتھ مزید چار رکعت ادا فرماتے، پھر اخیر میں تین رکعت وتر پڑھتے۔(۱)

حضرت عبداللہ بن عباسؓ نے جب ایک مرتبہ رسول اللہ ﷺ کے یہاں شب گذاری کی تو، انہوں نے بھی آنحضرت ﷺ کی نماز تہجد کی یہی کیفیت بیان فرمائی پھر فرمایا: (اخیر میں) آپ ﷺ نے تین رکعت وتر ادا فرمائی۔(۲)

حضرت عائشہؓ ارشاد فرماتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ: وتر کی پہلی دو رکعتوں پر سلام نہیں پھیرتے تھے۔(۳)

حضرت عائشہؓ ہی سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ وتر تین رکعات پڑھا کرتے تھے اورصرف اخیر رکعت میں سلام پھیرتے تھے۔(۴) امیر المؤمنین حضرت عمرؓ کی وتر بھی اسی طرح تھی اوراس کو اہل مدینہ نے آپؓ سے سیکھا تھا۔(۵)

چنانچہ ابوالزنادؒ مدینہ کے فقہاء سبعہ کے بارے میں بیان کرتے ہیں کہ وہ سب اس پر متفق تھے کہ وتر کی نماز تین رکعت ہے اورسلام بالکل اخیر میں ہے۔(۶) اہل مکہ اصحاب ابن عباسؓ بھی یہی رائے رکھتے تھے۔(۷)

---

(۱) بخاری :باب قیام النبی صلی اللہ علیہ وسلم باللیل فی رمضان وغیرہ:۱۱۴۷

(۲)مسلم :باب الدعاء فی صلوۃ اللیل وقیامہ:۱۸۳۵

(۳)مستدرک مع تعلیقات الذھبی: کتاب الوتر: ۱۱۳۹ .صحیح:امام حاکمؒ وذھبیؒ

(۴)مستدرک حاکم مع تعلیقات الذھبی:۱۱۴۰ .حسن:اعلاء السنن:۳۰/۶

(۵) مستدرک حاکم مع تعلیقات الذھبی:۱۱۴۰ .حسن:اعلاء السنن:۳۰/۶

(۶) طحاوی :باب الوتر:۱۷۵۸ .حسن:آثار السنن۱۳/۲

(۷)اعلاء السنن : ۳۹/۶

حضرت حسن بصریؒ فرماتے ہیں تمام مسلمانوں کا اس پر اجماع ہے کہ وتر کی نماز ایک سلام سے تین رکعت ہیں۔(۱)

وتر کی دوسری رکعت پر قعدہ:

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے مروی ہے کہ نماز مغرب کی طرح وتر کی نماز بھی تین رکعت ہے۔(۲)

اس مضمون کی متعدد صحیح روایات صحابہ وتابعین سے ثابت ہیں(۳) وتر کو مغرب کی نماز کے مشابہ قرار دینے سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ وتر میں بھی مغرب کی طرح دوسری رکعت پر قعدہ کیا جائے گا نیز نبی ﷺ نے اپنے مختلف ارشادات میں یہ قاعدہ کلیہ بھی بیان فرمادیا کہ: ہر دو رکعت پر التحیات ہے۔(۴)

ہر دو رکعتوں میں تشہد ہے جس کے ضمن میں پیغمبروں اور ان کے متبعین، نیکوکار بندگان خدا پر سلام بھیجا جاتا ہے(۵) ہر دو رکعت پر تشہد ہے۔(۶) اس سے بھی دوسری رکعت پر قعدہ کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے۔

حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں، نبی کریم ﷺ، شب کو اٹھتے تو مسواک کرتے، وضو فرماتے پھر نو رکعت ادا فرماتے، ان نو رکعتوں میں سے (کسی میں لگا تار دو قعدے نہ فرماتے سوائے نماز وتر کے

---

(۱) مصنف ابن ابی شیبہ: من کان یوتر بثلاث او اکثر: ۶۹۰۴. لا بأس به فی المتابعات: اعلاء السنن ۶/ ۵۰

(۲) طحاوی: باب الوتر: ۱۷۴۴. صحیح: آثار السنن: ۱/ ۱۲. ابواب الوتر

(۳) طحاوی: باب الوتر: ۱۷۴۴. صحیح: آثار السنن: ۱/ ۱۲. ابواب الوتر

(۴) مسلم: باب ما یجمع صفة الصلاة: ۱۱۳۸

(۵) طبرانی کبیر: ۱۹۳۱۲. ایک راوی مختلف فیہ ہیں تاہم انہیں ثقہ قرار دیا گیا ہے. مجمع الزوائد: باب التشهد: ۲۸۳۹

(۶) ترمذی باب التخشع فی الصلوة: ۳۸۵ صحیح: اعلاء السنن ۶/ ۵۲

کہ) صرف آٹھویں رکعت پر (جو وتر کی دوسری رکعت ہوتی تھی اور چھ رکعت شروع کے نمازِ تہجد) بیٹھتے تھے، ذکر، حمد اور دعا کرتے پھر کھڑے ہوجاتے، سلام نہ پھیرتے نویں رکعت (جو وتر کی تیسری رکعت ہوتی تھی) ادا کرتے پھر سلام پھیرتے۔(۱)

اخیر رکعت میں قرأت:

تاہم وتر کی نماز اور نماز مغرب میں ایک فرق ادائیگی کے لحاظ سے یہ ہے کہ وتر کی تیسری رکعت میں قرأت کرنا ضروری ہے، پھر قرأت سے فارغ ہونے کے بعد تکبیر کہہ کر دعائے قنوت پڑھنا ہے۔

حضرت ابوالعالیہؒ کہتے ہیں: اصحاب رسول اللہ ﷺ نے ہمیں یہ سکھلایا کہ نماز وتر، مغرب کی نماز ہی کے مانند ہے سوائے اس کے کہ (وتر میں) تیسری رکعت میں بھی قرأت کرنا۔(۲)

---

(۱)مسلم باب جامع صلاۃ اللیل : ۱۷۷۳ :مع فتح الملھم : ۲/ ۳۰۳

(۱)طحاوی :باب الوتر: ۱۷۴۳ . صحیح:اٰثار السنن: ۲/ ۱۳

بعض روایات میں ایک رکعت وتر کا تذکرہ بھی آیا ہے تاہم اس کا مفہوم ومصداق سابقہ روایات کی روشنی میں، وہ ایسی ایک رکعت ہے جو دوگانہ کے ساتھ ملی ہوئی ہو، یعنی تین رکعت کا مجموعہ مگر ان تین رکعتوں میں سے وتر اور طاق رکعت حقیقت میں چوں کہ اخیر والی رکعت ہی ہے، اس لئے اس پورے مجموعہ پر وتر کا اطلاق کرنے کے بجائے صرف اخیر والی رکعت کو وتر سے تعبیر کردیا گیا ہے۔(طحاوی باب الوتر: ۱۷۱۳. ۱۷۱۲) اس کی تائید اس سے بھی ہوتی ہے کہ نبی ﷺ نے تنہاء ایک رکعت پڑھنے سے منع فرمایا ہے حضرت ابوسعید خدریؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اکہری رکعت سے منع فرمایا ہے کہ آدمی بس ایک رکعت پڑھے جسے وتر بنالے۔(التمھید لابن عبدالبر:باب النون:نافع بن جرجیس: ۱۳/ ۲۵۴۔سند کے ایک راوی پر صرف علامہ عقیلیؒ نے خفیف جرح کی ہے، تاہم امام حاکمؒ نے مستدرک میں اس راوی کے واسطے سے بھی حدیث تخریج کی ہے۔الجوھر النقی: ۳/۲۷)

حضرت ابن مسعودؓ کو اطلاع ملی کہ حضرت سعدؓ صرف ایک رکعت وتر پڑھتے ہیں تو اس پر حضرت ابن مسعودؓ نے فرمایا: ایک رکعت کبھی کافی نہیں ہوگی۔(طبرانی کبیر: ۹۴۱۲ . حسن: مجمع الزوائد:باب عدد الوتر: ۳۴۵۷ .

حضرت حسن بصریؒ سے عرض کیا گیا کہ: حضرت ابن عمرؓ وتر کی رکعتوں پر سلام پھیر دیا کرتے تھے، اس پر حضرت حسن بصریؒ نے جواب دیا: حضرت عمرؓ ان سے زیادہ فقیہ تھے وہ تو تیسری رکعت کے لئے تکبیر کہہ کر کھڑے ہوجاتے تھے۔(مستدرک حاکم : ۱۱۴۱ کتاب الوتر سکت عنه الحاکمؒ والذھبی)

رکوع سے قبل دعائے قنوت پڑھنا:

حضرت براء بن عازبؓ نے وتر میں قنوت پڑھنے کو شریعت کا جاری وساری طریقہ قرار دیا ہے۔(۱)

حضرت ابی ابن کعبؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ تین رکعات وتر پڑھا کرتے تھے، پہلی رکعت میں سورۃ اعلی، دوسری رکعت میں سورۃ کافرون اور تیسری رکعت میں سورۃ اخلاص پڑھتے تھے، اور دعائے قنوت رکوع سے پہلے پڑھا کرتے تھے۔(۲) اس روایت سے نماز وتر کا تین رکعت ہونا اور اس میں دائمی طور پر دعائے قنوت کا پڑھنا ثابت ہوتا ہے۔

حضرت علقمہؒ کہتے ہیں کہ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ اور دیگر اصحاب رسول اللہ ﷺ وتر میں رکوع سے قبل قنوت پڑھا کرتے تھے۔(۳)

ابراہیم نخعیؒ کہتے ہیں کہ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ ہر رات مکمل سال نماز وتر میں رکوع سے قبل دعائے قنوت پڑھا کرتے تھے۔(۴)

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کی والدہ محترمہ جو بطور خاص، رسول اللہ ﷺ کی نماز وتر کی کیفیت کا مشاہدہ کرنے اپنے لائق وذی احترام فرزند کی درخواست پر، شب کے اوقات میں رسول اللہ ﷺ کے یہاں قیام پذیر تھیں، وہ فرماتی ہیں کہ نبی ﷺ منشأ خداوندی کے مطابق، شب کی گھڑیوں میں نماز پڑھتے رہے، یہاں تک کہ اخیر شب کا وقت آیا اور آپ ﷺ وتر پڑھنے کے لئے کھڑے ہوئے تو پہلی رکعت میں سورۂ اعلی پڑھی اور دوسری رکعت میں سورۃ کافرون تلاوت فرمائی دوسری رکعت پر قعدہ فرمایا اور سلام پھیرے بغیر تیسری

(۱)مسند السراج لمحمد بن اسحاق بن ابراھیم السراج الثقفی النیسا بوری:۱۳۳۳،دارالنشر:ادارۃالعلوم الاثریہ باکستان.صحیح ابن خزیمہ: کتاب الوتر:۱۰۹۷.حسن:اثار السنن:۱۵/۲

(۲)نسائی تحقیق الالبانی:ذکر اختلاف الناقلین لخبر ابی بن کعب فی الوتر: ۱۶۹۹. صحیح

(۳)مصنف ابن ابی شیبہ :فی القنوت قبل الرکوع او بعدہ: ۶۹۸۳ .صحیح:اثار السنن:۱۷/۲

(۴) کتاب الأثار لامام محمد:باب القنوت فی الصلاۃ:۲۰۹.مرسل جید:اثار السنن:۱۷/۲

رکعت کے لئے کھڑے ہو گئے پھر اس میں سورۃ اخلاص کی تلاوت فرمائی، بعدازاں تکبیر کہی پھر قنوت ودعا پڑھی پھر تکبیر کہی اور رکوع فرمایا۔(۱)

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کے بارے میں مروی ہے کہ وہ وتر کی اخیر رکعت میں **قل ھو اللہ احد** پڑھتے پھر اپنے دونوں ہاتھوں کو اٹھاتے اور رکوع سے قبل دعائے قنوت پڑھتے ۔(۲) ابراہیم نخعیؒ سے منقول ہے کہ دعائے قنوت، رمضان وغیر رمضان دونوں میں، رکوع سے قبل پڑھنا واجب ہے، لہذا جب تم قنوت پڑھنے کا ارادہ کرو تو تکبیر کہو اور جب رکوع کرنا ہو تب بھی تکبیر کہو۔(۳)

---

(۱) شرح مسند ابی حنیفہ : ۱/ ۴۶۸.مصدر الکتاب موقع یعسوب.حسن:اعلاء السنن: ۸۳/۶

(۲)جزء رفع الیدین للبخاریؒ: ۹۱.صحیح:امام بخاریؒ

(۳) کتاب الآثار لامام محمد:باب القنوت فی الصلاۃ: ۲۱۰.صحیح: اثار السنن : ۱۷/۲

فائدہ (۱) حضرت ابی بن کعب کے بارے میں منقول ہے کہ وہ، رمضان کے نصف اخیر میں قنوت پڑھا کرتے تھے۔(ابو داؤدتحقیق الالبانی:باب القنوت فی الوتر: ۱۴۳۰.ضعیف) تاہم حضرت ابی بن کعبؓ کا یہ عمل کئی وجہ سے قابل حجت نہیں (الف) ان کا یہ عمل، انہی کے حوالے سے سابق میں ذکر کردہ اس مرفوع راویت کے معارض ہے جس سے دائمی طور پر رسول اللہ ﷺ کا نماز وتر میں قنوت پڑھنا معلوم ہوتا ہے، (ب) روایت مذکور کی سند منقطع اور ضعیف ہے(امام نوویؒ خلاصۃ الاحکام: کتاب الوتر:۱۹۱۵) (ج) بفرض صحت: رمضان کے نصف اخیر میں قنوت پڑھنے کا مطلب قیام کو طویل کرنا ہے جو رمضان کے مہینے میں بالخصوص اخیر نصف میں محمود وپسندیدہ ہے(فتح القدیر : ۳۷۵/۱،باب صلاۃ الوتر اور قیام پر قنوت کا اطلاق بالاتفاق حدیث سے ثابت ہے ارشاد نبوی ﷺ ہے افضل ترین نماز، طویل قنوت (قیام) والی ہوتی ہے۔(مسلم شریف :باب افضل الصلاۃ طول القنوت:۱۸۰۴)

فائدہ (۲) وتر کے سوا کسی اور نماز میں دائمی طور پر قنوت پڑھنا ثابت نہیں، البتہ اگر مسلمان کہیں عمومی مصیبت مں گرفتار ہو گئے ہوں تو اس مصیبت کے ہٹنے تک عارضی طور پر نماز فجر میں قنوت نازلہ کا پڑھنا ثابت ہے، حضرت انسؓ فرماتے ہیں: رسول اللہ ﷺ نے بس ایک ماہ تک نماز فجر میں قنوت پڑھا تھا، جس میں آپ ﷺ ان لوگوں کو بددعا فرمائے تھے جنہوں نے قراءِ صحابہ کو قتل کردیا تھا، (بخاری :باب القنوت قبل الرکوع وبعدہ:

۱۰۰۱۔۱۰۰۲) اس پر بعض حضرات نے حضرت انسؓ سے عرض کیا کہ چند لوگوں کا خیال ہے کہ رسول۔۔۔۔
۔۔۔۔اللہ ﷺ دائمی طور پر نماز فجر میں قنوت پڑھا کرتے تھے، حضرت انسؓ نے جواب دیا: ان لوگوں کا خیال غلط ہے، رسول اللہ ﷺ نے تو بس ایک ماہ تک قنوت پڑھا تھا جس میں آپ ﷺ بعض قبائل مشرکین کے لئے بددعاء فرمایا کرتے تھے۔(التلخيص الحبير : ۵۹۹/۱. حسن:اعلاء السنن: ۹۳/۶)

حضرت قتادہؒ سے روایت ہے کہ حضرت انسؓ نے فرمایا: رسول اللہ: (نماز فجر میں) قنوت نہیں پڑھتے تھے الا یہ کہ کسی قوم کے حق میں یا کسی قوم کے خلاف دعا کرنی ہو۔(صحيح ابن خزيمه :باب ذكر بيان ان النبي صلى الله عليه وسلم لم يكن يقنت دهره كله: ۶۲۰. صحيح:الدرايه: ۱۹۵/۱)

اس مفہوم کو حضرت انسؓ نے ایک اور روایت میں اس طرح بیان فرمایا کہ رسول اللہ ﷺ دنیا سے پردہ فرمانے تک (خاص حالات میں) نماز فجر میں قنوت (نازلہ) پڑھا کرتے تھے(مصنف عبد الرزاق:باب القنوت: ۲۹۶۴.في اسناده مقال:اثار السنن:۱۸/۲)

چنانچہ حضرت انسؓ کا خود اپنا عمل یہ تھا کہ وہ پرامن حالات میں نماز فجر میں قنوت نہیں پڑھا کرتے تھے، غالب بن فرقد کہتے ہیں، میں حضرت انس بن مالکؓ کے یہاں دو ماہ رہا مگر انہوں نے نماز فجر میں قنوت نہیں پڑھی۔(طبراني كبير: ۶۹۲.حسن:اثار السنن:۲۱/۲)

علامہ ابن القیمؒ فرماتے ہیں کہ نبی ﷺ کا نماز فجر میں تاحیات قنوت پڑھنے کا مطلب یہ ہے کہ آنحضرت ﷺ زندگی بھر نماز فجر میں طویل قیام فرمایا کرتے تھے، کیوں کہ بعض احادیث میں طول قیام کو بھی قنوت سے تعبیر کیا گیا ہے(زاد المعاد :فصل في هديه في الصلاة: ۲۸۲/۱)

مسلمانوں پر غیر معمولی حالات ومصائب پیش آنے کے موقعہ پر امام نماز فجر میں قنوت نازلہ پڑھتا ہے تو مقتدی بھی اس کی پیروی کریں، اگر وہ آہستہ آواز میں قنوت نازلہ پڑھتا ہے تو مقتدی بھی قنوت نازلہ پڑھیں ،اور اگر وہ بآواز بلند پڑھتا ہے تو مقتدی آمین کہیں(شامي : ۴۹۶/۱)

حضرت ابن عباسؓ سے مروی ہے کہ نبی ﷺ نے لگاتار ایک ماہ تک قنوت پڑھا اور مقتدی امین کہتے رہے۔(ابوادود تحقيق الالباني:باب القنوت في الصلوات: ۱۴۴۵ : حسن) تاہم قنوت نازلہ کو آہستہ آواز میں پڑھنا بہتر ہے کہ یہ ایک دعا ہے اور دعا میں آواز کو پست رکھنا مطلوب ہے (الاعراف : ۵۵)

اور اگر کوئی امام معتدل ومعمول کے حالات میں نماز فجر میں قنوت پڑھتا ہے تو مقتدی پڑھنے میں ساتھ نہ دیں بلکہ ساکت کھڑے رہیں۔طحطاوي على المراقي : ۳۸۵

دعائے قنوت کے الفاظ:

اللھم انا نستعینک ونستغفرک ونؤمن بک، ونتوکل علیک ونثنی علیک الخیر ونشکرک ولانکفرک ونخلع ونترک من یفجرک اللھم ایاک نعبد ولک نصلی ونسجدوالیک نسعی ونحفد ونرجو رحمتک ونخشی عذابک ان عذابک بالکفار ملحقٌ۔(۱)

دعائے قنوت آہستہ پڑھنا:

دعا کے عام آداب کے مطابق دعاء قنوت کو بھی آہستہ پڑھنا بہتر ہے (واجب نہیں) (۲) ارشاد ربانی ہے: اپنے پروردگار کو عاجزی کے ساتھ اور خفیہ طور پر پکارو۔ (۳)

وتر کے بعد نفل پڑھنا:

آنحضرت ﷺ نماز وتر کے بعد بیٹھ کر ہی دو رکعتیں ہلکی پھلکی پڑھ لیا کرتے تھے (۴)

حضرت ثوبانؓ سے مروی ہے کہ ہم رسول اللہ ﷺ کے ہمراہ کسی سفر میں تھے آپ نے ارشاد فرمایا: سفر، مشقت وتکلیف کا نام ہے، لہذا تم میں سے جب کوئی وتر پڑھنے لگے تو ساتھ میں دو رکعت بھی ادا کرلے، اگر (اخیر شب میں تہجد کے لئے) آنکھ کھلی تو بہت خوب ورنہ تو یہ دو رکعتیں اس کے لئے ہوجائیں گی۔ (۵) حضرت ابوامامہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ وتر کے بعد کی دو رکعتیں بیٹھ کر ادا کرتے تھے، جن میں سورۃ زلزال اور سورۃ کافرون پڑھتے تھے۔ (۶)

---

(۱) مصنف ابن ابی شیبه فی قنوت الوتر من الدعاء: ۶۹۶۵، سکت علیه المحقق محمد عوامه

(۲) شامی: ۲/۷

(۳) اعراف: ۵۵

(۴) مسلم: باب صلاۃ اللیل: ۱۷۵۸، ابن ماجه: تحقیق الالبانی: باب ما جاء فی الرکعتین بعد الوتر جالساً: ۱۱۹۵. صحیح

(۵) دارقطنی باب فی الرکعتین بعد الوتر: ۱۷۰۰. صحیح: مسند احمد تحقیق شعیب الارنووط: ۳۶/۶۵۳

(۶) مسند احمد تحقیق شعیب الارنووط: ۲۲۳۱۳. صحیح لغیره

اس سے معلوم ہوا کہ وتر کے بعد نفل نماز پڑھنے میں کوئی مضائقہ نہیں، البتہ ان نوافل کو بے عذر اگر بیٹھ کر ادا کرے گا تو ثواب میں کمی واقع ہوگی، اس بارے میں نبی ﷺ کا معاملہ خاص ہے کہ آپ ﷺ کے حق میں ثواب کی ایسی کوئی کمی نہیں ہوتی۔

حضرت عبداللہ بن عمروؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کے اس فرمان کا مجھے علم تھا کہ بیٹھ کر نماز پڑھنے والے کا ثواب آدھا ہوتا ہے لیکن ایک دفعہ جب میں حاضر خدمت ہوا تو دیکھا کہ آپ ﷺ بیٹھ کر نماز ادا فرما رہے ہیں، اس پر میں اپنا سر پکڑ لیا، آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: اے عبداللہ تجھے کیا ہو گیا؟ میں نے اپنی پریشانی بیان کی تو آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ ہاں مسئلہ تو وہی ہے (کہ بیٹھ کر نماز پڑھنے والے کو آدھا ثواب ملتا ہے) لیکن میں تمہاری طرح نہیں ہوں۔(۱)

فائدہ: بعض روایات میں یہ حکم آیا ہے کہ رات کی اپنی آخری نماز وتر کو بناؤ (۲) حافظ ابن حجرؒ فرماتے ہیں کہ بعض علماء کا خیال یہ ہے کہ اس کے مخاطب وہ لوگ ہیں جو رات کے اخیر حصے میں وتر ادا کرتے ہیں، باقی جو لوگ شروع رات وتر پڑھ لیتے ہیں ان کے لئے بعد وتر نوافل پڑھنے میں کوئی مضائقہ نہیں۔(۳) علامہ نوویؒ کا خیال یہ ہے کہ یہ حکم، استحباب کے طور پر ہے اور بعد وتر نوافل پڑھنا، جواز کے دائرہ میں آتا ہے (۴)

علامہ ظفر احمد عثمانیؒ کا خیال یہ ہے کہ اس حکم کا مطلب: دو مرتبہ وتر پڑھنے سے منع کرنا ہے اس لئے کہ جب دو دفعہ وتر پڑھی جائے گی تو رات کی نماز وتر نہیں بلکہ جفت ہو جائے گی؛ چنانچہ بعض احادیث میں صراحت کے ساتھ ایک رات میں دو وتر پڑھنے سے منع کیا گیا ہے۔(۵)

---

(۱) مسلم: باب جواز النافلة قائما وقاعداً: ۱۲۷۹

(۲) بخاری: باب لیجعل آخر صلاۃ وتراً: ۹۹۸

(۳) فتح الباری: ۲/۴۸۰ باب ما جاء فی الوتر

(۴) شرح مسلم نووی باب صلاۃ اللیل: ۶/ ۲۱

(۵) ابو داؤد تحقیق الالبانی: باب فی نقض الوتر: ۱۴۴۱. صحیح. اعلاء السنن: ۶/۱۲۶

سنن ونوافل کا بیان

دن رات کی بارہ رکعتیں

حضرت ام حبیبہؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے ارشاد فرمایا: جو شخص دن رات میں بارہ رکعتیں پڑھتا رہے اس کے لئے جنت میں ایک گھر بنایا جاتا ہے۔

(الف) چار رکعت ظہر سے پہلے (ب) دو رکعت ظہر کے بعد (ج) دو رکعت مغرب کے بعد (د) دو رکعت عشاء کے بعد (ہ) دو رکعت فجر سے پہلے (۱)

عائشہؓ فرماتی ہیں: رسول اللہ ﷺ ظہر سے پہلے کی چار رکعت اور فجر سے پہلے کی دو رکعتیں (کبھی) نہیں چھوڑتے تھے۔ (۲)

عبداللہ بن شقیقؒ سے روایت ہے کہ میں نے حضرت عائشہؓ سے نبی ﷺ کی سنن ونوافل کے بارے میں دریافت کیا تو حضرت عائشہؓ نے جواب میں فرمایا: نبی ﷺ ظہر سے قبل چار رکعت میرے حجرے میں پڑھا کرتے تھے پھر باہر تشریف لے جاتے، لوگوں کو نماز پڑھاتے پھر حجرہ میں داخل ہوتے اور دو رکعت ادا فرماتے ایسے ہی لوگوں کو مغرب کی نماز پڑھاتے پھر حجرہ میں داخل ہوتے اور دو رکعت ادا کرتے عشاء کی نماز پڑھاتے پھر میرے حجرہ میں داخل ہوتے اور دو رکعت ادا فرماتے، اسی طرح جب صبح صادق طلوع ہوتی تو دو رکعت ادا کرتے۔ (۳)

ان روایات سے مذکورہ بالا، بارہ رکعتوں کا سنت مؤکدہ ہونا ثابت ہوتا ہے عصر سے قبل کی چار رکعت کے بارے میں اتنا اہتمام منقول نہیں، ہاں اس کا لحاظ رکھنے والے کو دعائے رحمت دی گئی ہے، حضرت ابن عمرؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: اللہ اس بندہ پر رحم

(۱) ترمذی تحقیق الالبانی: باب ماجاء فیمن صلی فی یوم و لیلة ثنتی عشرة رکعة من السنة: ۴۱۴، صحیح

(۲) بخاری: باب الرکعتین قبل الظہر: ۱۱۸۲

(۳) مسلم: باب جواز النافلة قائما وقاعداً: ۱۷۳۳

کرے جو عصر سے قبل چار رکعت پڑھتا ہے۔(۱) پس عصر سے قبل کی چار رکعت سنت غیر مؤکدہ کے درجہ میں ہیں۔

عشاء سے قبل کی چار رکعت کا درجہ اور کم ہے، اسلاف یعنی صحابہؓ و تابعینؒ: عشاء سے قبل ان چار رکعتوں کے پڑھنے کو اچھا و مستحب خیال کرتے تھے۔(۲)

فائدہ (۱) بارہ رکعت سنت مؤکدہ میں سے بھی: نماز فجر سے قبل کی سنتیں نہایت تاکیدی اہمیت کی حامل ہیں، نبی ﷺ نے ان دو رکعتوں کو دنیا و مافیھا سے بہتر قرار دیا ہے(۳)

حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں: اتنا سخت اہتمام نبی ﷺ کسی اور نفل و سنت نماز کا نہیں فرمایا کرتے تھے۔(۴) فجر کی ان دو سنتوں کے بارے میں یہاں تک آپ ﷺ نے فرمایا ہے کہ اگرچہ دشمن کے گھوڑے تمہیں روند رہے ہوں تب بھی تم ان دو رکعتوں کو نہ چھوڑو۔(۵) اسی اہمیت و تاکید کے پیش نظر جماعت کھڑی ہو جانے کے باوجود علیحدہ و کنارہ ہو کر جلد جلد ان کو پڑھ لینے کی تعلیم دی گئی ہے، تاہم اس کا موقع بھی نہ مل سکے اور جماعت فوت ہونے کا خطرہ ہو تو فی الحال جماعت میں شریک ہو جانے اور بعد طلوع آفتاب ان دو سنت فجر کی قضا کا حکم دیا گیا ہے۔

نبی ﷺ کا ارشاد ہے: جب نماز کھڑی ہو جائے تو فرض نماز کے علاوہ کوئی اور نماز نہیں ہے۔(۶) بیہقی کی روایت میں یہ اضافہ موجود ہے کہ سوائے فجر کی دو رکعت (سنت) کے(۷) حضرت علیؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ اقامت کے وقت دو رکعت (سنت فجر)

(۱) ترمذی : باب ماجاء فی الاربع قبل العصر: ۴۳۰. حسن : امام ترمذیؒ

(۲)(مختصر قیام اللیل : یصلی بین المغرب والعشاء اربع رکعات: ۷۰)

(۳)(مسلم : باب استحباب رکعتی سنة الفجر: ۱۷۲۱)

(۴)بخاری: باب تعاهد رکعتی الفجر: ۱۱۶۹

(۵)ابوداؤد: باب فی تخفیف رکعتی الفجر: ۱۲۶۰. صحیح: اثار السنن: ۲/۲۹

(۶)مسلم : باب کراهة الشروع فی نافلة بعد شروع الموذن: ۱۶۷۸)

(۷)السنن الکبری للبیهقی: باب کراهية الاشتغال بهما بعد ما اقيمت الصلاة: ۴۲۷۹. حسن: اعلاء السنن: ۷/۱۱۰

پڑھا کرتے تھے(۱)

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کے بارے میں مروی ہے کہ آپؓ ایسے وقت مسجد میں تشریف لائے کہ امام نماز فجر شروع کر چکا تھا، ابھی آپؓ نے سنت فجر نہیں پڑھی تھی تو آپؓ نے ایک ستون کی اوٹ میں ہو کر ان کو ادا فرمایا۔(۲)

حضرت ابو الدرداءؓ کے بارے میں مروی ہے کہ بسا اوقات آپؓ ایسے وقت تشریف لاتے کہ لوگ نماز فجر کے لئے صفیں باندھ چکے ہوتے، ایسے موقع پر آپؓ مسجد کے کسی گوشے میں دو رکعت ادا کر لیتے پھر لوگوں کے ساتھ جماعت میں شریک ہو جاتے (۳) حضرت عبداللہ بن عمرؓ، حضرت عبداللہ بن عباسؓ اور دیگر صحابہ وتابعین کا بھی معمول یہی تھا۔(۴)

مسجد میں صفوں کے پر ہونے یا جماعت فوت ہو جانے کے خطرہ کی بنا پر فجر کی سنتیں رہ گئی ہوں تو بعد طلوع آفتاب ان کی قضا کر لی جائے، فرض کی ادائیگی کے فوری بعد ان کی قضا مکروہ ہے۔

حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے ارشاد فرمایا: جس نے فجر کی رکعتیں نہ پڑھی ہوں، وہ طلوع آفتاب کے بعد ان کو ادا کر لے (۵) حضرت عبداللہ بن عمروؓ کے بارے میں آتا ہے کہ جب ان کی سنت فجر رہ جاتی تو وہ آفتاب نکلنے کے بعد ان کو پڑھتے تھے۔(۶)

نبی ﷺ نے عصر کی نماز کے بعد آفتاب کے غروب ہونے تک اور فجر کی نماز کے بعد آفتاب کے طلوع ہونے تک نماز پڑھنے سے منع فرمایا ہے۔(۷)

(۱)ابن ماجه باب ما جاء في الركعتين قبل الفجر: ۱۱۴۷ حسن: اعلاء السنن: ۱۰۵/۷

(۲)طبرانی کبیر: ۹۲۷۹ . رجاله موثقون: مجمع الزوائد باب اذا اقيمت الصلاة هل يصلي غيرها: ۲۳۹۲

(۳)طحاوی: باب الرجل يدخل المسجد والامام في صلاة الفجر: ۲۲۰۵ . حسن: آثار السنن: ۳۲/۲

(۴)حواله سابق

(۵)ترمذی تحقيق الالبانی باب ماجاء في اعادتهما بعد طلوع الشمس: ۴۲۳ . صحيح

(۶)مؤطا مالک: باب ماجاء في ركعتي الفجر: ۲۸۶

(۷)بخاری: باب لايتحرى الصلاة قبل غروب الشمس: ۵۸۶

(فائدہ:۲) ظہر کی سنن قبلیہ کسی وجہ سے نہیں پڑھی جا سکیں تو ظہر کے بعد ان کو پڑھ لینا چاہئے، حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ جب کسی وجہ سے نبی ﷺ ظہر سے پہلے کی چار رکعتیں نہیں پڑھے ہوتے تو نماز کے بعد ان کو پڑھ لیا کرتے تھے۔(۱)

سنن ابن ماجہ میں اتنا اضافہ اور بھی ہے کہ ان چار رکعتوں کو آپ ﷺ ظہر کی دو سنتوں کے بعد ادا کرتے تھے۔(۲)

وقت نکلنے کے بعد ظہر کی سنتوں کی قضا نہیں ہے۔ حضرت ام سلمہؓ نے ایک دفعہ رسول اللہ ﷺ کو عصر کے بعد دو رکعت پڑھتے دیکھا تو تعجب سے پوچھا: یا رسول اللہ ﷺ یہ کونسی دو رکعتیں ہیں جنہیں آپ ﷺ نے پڑھا ہے؟ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا یہ دو رکعتیں وہ ہیں جو میں نماز ظہر کے بعد پڑھا کرتا ہوں کہیں سے مال کی آمد کی وجہ سے میں انہیں نہ پڑھ سکا تھا تو اب میں نے انہیں پڑھ لیا! حضرت ام سلمہؓ نے عرض کیا! یا رسول اللہ کیا ہم بھی ان کی قضا کر سکتے ہیں جب وہ ہم سے فوت ہو جائیں؟ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: نہیں!(۳)

اس حدیث سے دو باتیں صاف معلوم ہوتی ہیں (الف) وقت ختم ہونے کے بعد ظہر کی سنتوں کی قضا نہیں اور دیگر نمازوں کی سنتوں کا بھی یہی حکم ہے (ب) عصر کے بعد نفل پڑھنا خواہ وہ سنتوں کی قضا ہی کیوں نہ ہو ممنوع ہے، سنت فجر کی قضا کا بھی یہی حکم ہوگا۔

فائدہ (۳) بعض روایات سے نماز فجر کی سنت اور فرض کے درمیان ''داہنی کروٹ پر لیٹنا'' عمل نبی ﷺ ہونا معلوم ہوتا ہے۔(۴) اس بارے میں ایک حدیث قولی بھی موجود ہے کہ جب تم میں سے کوئی فجر کی دو رکعت سنت پڑھے تو داہنی کروٹ پر لیٹ جائے۔(۵) مگر یہ قولی روایت

(۱) ترمذی: تحقیق الالبانی باب ماجاء فی الرکعتین بعد الظهر: ۴۲۶. حسن

(۲) ابن ماجه: باب من فاتتة الاربع قبل الظهر: ۱۱۵۸، فیه قیس بن الربیع وقد وثق و بقیة الاسناد ثقات. فتح الغفار: ۵/۲۰۲

(۳) مسند ابو یعلی: تحقیق حسین سلیم اسد: ۷۰۲۸. صحیح

(۴) بخاری: باب الضجعة علی الشق الایمن: ۱۱۶۰

(۵) ابو داؤد: باب الاضطجاع بعدها: ۱۲۶۳

محدثین کی نظر میں لائق اعتبار نہیں، کیوں تمام ثقہ راویوں نے اسے عمل نبوی کے طور پر روایت کیا ہے، تنہا ایک راوی نے اسے فرمان نبوی کے طور پر نقل کیا ہے، اصول حدیث کی رو سے ایسی روایت مردود و نا قابل استدلال قرار پاتی ہے(۱) شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ نے بھی قولی روایت کو باطل قرار دیا ہے اور فعلی روایات کی تصحیح کی ہے۔(۲)

رہا عمل نبوی ﷺ تو یہ بطور عبادت کے نہیں بلکہ بغرض استراحت ہوا کرتا تھا، پھر مسجد میں نہیں بلکہ حجرہ عائشہؓ میں یہ صورت ہوا کرتی تھی، حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں: اگر میں اس موقع پر جاگ رہی ہوتی تو آپ ﷺ مجھ سے بات چیت کرتے ورنہ تو لیٹ جاتے۔(۳)

ایک روایت میں حضرت عائشہؓ سے صاف مذکور ہے کہ رسول اللہ ﷺ کا یہ لیٹنا بطور سنت کے نہیں ہوا کرتا تھا بلکہ بات یہ تھی کہ (شب بیداری کی وجہ سے) آپ ﷺ تھکے ہارے ہوتے تھے تو (کچھ دیر) استراحت کرلیا کرتے تھے۔(۴) یہی وجہ ہے کہ جو آدمی اس کو سنت سمجھتا یا مسجد میں یہ کام انجام دیتا تو صحابہ کرام اس پر سخت نکیر فرماتے۔

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے ایسے آدمی کے بارے میں فرمایا اسے کیا ہو گیا ہے کہ دو رکعت پڑھنے کے بعد، جانوروں اور گدھوں کی طرح لوٹتا ہے(۵) حضرت عمرؓ نے مسجد میں اس عمل کے انجام دینے والے کو کنکریوں سے مارا ہے(۶) اور حضرت ابن عمرؓ نے اس عمل کو سنت خیال کرنے والے کو باخبر کیا کہ یہ بدعت ہے۔(۷)

---

(۱) تدریب الراوی : ۱۴۸

(۲)زاد المعاد : فصل ضجعته بعد سنة الفجر : ۱/ ۱۷۰

(۳) مسلم :باب صلاة الليل: ۱۷۶۶

(۴)مصنف عبد الرزاق :باب الضجعة بعد الوتر : ۴۷۲۲.حسن:اعلاء السنن:۷/ ۲۶

(۵)(۶)(۷) مصنف ابن ابی شیبه:من كره الاضطجاع بعد ركعتى الفجر :۶۴۴۸. ۶۴۴۹. ۶۴۵۵ .سکت علیها المحقق محمد عوامه والعلامه ابن القيم فى زاد المعاد: ۱/ ۱۷۰ ،فصل ضجعته بعد سنة الفجر

جمعہ کی سنتیں

جمعہ سے قبل چار رکعت، جمعہ کے بعد چار پھر دو رکعت پڑھنا سنت ہے، تاہم اخیر کے دو رکعت کا درجہ سنت غیر مؤکدہ کا ہے۔

حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے ارشاد فرمایا: جو آدمی غسل کرے پھر جمعہ میں حاضر ہو پھر جو میسر ہو اتنی نماز پڑھے پھر خطیب کے خطبہ سے فارغ ہونے تک خاموش رہے پھر اس کے ہمراہ نماز پڑھے تو اس جمعہ سے آئندہ جمعہ تک کے گناہ بلکہ مزید تین دن کے گناہ بخش دیئے جاتے ہیں۔(۱) ابو عبدالرحمٰن السلمیؒ کہتے ہیں: حضرت عبداللہ بن مسعودؓ ہم کو جمعہ سے پہلے چار اور جمعہ کے بعد چار رکعت پڑھنے کا حکم دیا کرتے تھے۔(۲)

حضرت عبداللہ بن عباسؓ فرماتے ہیں: رسول اللہ ﷺ جمعہ سے قبل چار رکعت اور جمعہ کے بعد چار رکعت ایک ایک سلام سے پڑھا کرتے تھے(۳)

ابو عبدالرحمٰن السلمیؒ کہتے ہیں: عبداللہ بن مسعودؓ ہم کو جمعہ کے بعد چار رکعت پڑھنے کی تعلیم دیتے تھے یہاں تک کہ ہم نے حضرت علیؓ کا فرمان سنا کہ چھ رکعت پڑھو(۴)

نماز اشراق

حضرت ابو ذرؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ اللہ تبارک وتعالی ارشاد فرماتے ہیں: اے ابن آدم تو دن کے شروع حصہ میں چار رکعت پڑھ لے میں دن کے ختم ہونے تک تیری کفالت کروں گا۔(۵)

---

(۱) مسلم: باب فضل من استمع وانصت فی الخطبة: ۲۰۲۴

(۲) مصنف عبدالرزاق: باب الصلوة قبل الجمعة وبعدها: ۵۵۲۵ صحیح: اثار السنن: ۹۶/۲

(۳) طبرانی کبیر: ۱۲۵۰۶. حسن: اعلاء السنن: ۱۴/۷

(۴) طحاوی: باب التطوع بعد الجمعة کیف هو: ۱۹۷۹. صحیح: اثار السنن: ۹۶/۲

(۵) ترمذی: تحقیق الالبانی: باب صلاة الضحی: ۴۷۵ صحیح

حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا جس شخص نے فجر کی نماز باجماعت ادا کی پھر آفتاب کے طلوع ہونے تک اللہ کا ذکر کرتے بیٹھ گیا، پھر دو رکعت نماز پڑھی تو اس کے لئے ایک حج وعمرہ کا کامل ثواب ملتا ہے۔(۱)

نماز چاشت:

سورج میں گرمی آجانے کے بعد زوال سے قبل دو، چار، آٹھ رکعت پڑھتے ہیں اس کو صلاۃ الضحیٰ کہتے ہیں۔

حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں: رسول اللہ ﷺ چار رکعات صلوۃ الضحیٰ ایک سلام سے پڑھا کرتے تھے(۲)

حضرت ام ہانیؓ بنت ابی طالب فرماتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فتح مکہ کے دن آٹھ رکعات چاشت کی نماز پڑھی اور ہر دو رکعت پر سلام پھیرا۔(۳)

حضرت ابو الدرداء سے مروی ہے رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: جو آدمی چاشت کی دو رکعت نماز پڑھے وہ غافلوں میں سے شمار نہیں ہوتا اور جو چار پڑھے وہ عبات گذاروں میں شمار ہوتا ہے اور جو چھ پڑھے اسکا پورا دن سلامتی کے ساتھ گذرتا ہے اور جو آٹھ پڑھے اللہ اسے فرمانبرداروں میں سے لکھ دیتے ہیں اور جو بارہ پڑھے اللہ اس کے لئے جنت میں ایک محل بنا دیتے ہیں۔(۴)

(۱) ترمذی: تحقیق الالبانی باب ذکر ما یستحب من الجلوس فی المسجد بعد صلاۃ الصبح حتی تطلع الشمس : ٥٨٦ . حسن .

(۲) مسند ابویعلی:تحقیق حسین سلیم اسد : ۴۳۶۶. صحیح.

(۳)ابوداؤد : باب صلاۃ الضحی : ۱۲۹۲ . اسناده علی شرط البخاری : التلخیص الحبیر : باب صلوۃ التطوع : ٥٣٦

(۴)مجمع الزوائد : باب صلاۃ الضحی : ۳۴۱۹. حسن : اعلاء السنن : ۳۵/۷

نماز اوابین

حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے ارشاد فرمایا جو شخص بعد نماز مغرب چھ رکعت اس انداز سے پڑھے کہ درمیان میں کوئی بات نہ کرے تو یہ عمل بارہ سال کی عبادت کے برابر ہے(۱)

فائدہ: صحیح روایات میں صلوۃ الاوابین کا لفظ نماز چاشت کے لئے استعمال ہوا ہے تاہم محمد بن المنکد ر کی مرسل روایت میں مغرب وعشاء کے مابین پڑھی جانے والی نماز کو بھی صلوۃ الاوبین کہا گیا ہے۔(۲)

نماز تہجد

نماز تہجد کی بے حد فضیلت اور بے شمار فائدے ہیں

ارشاد خداوندی ہے: اور رات کے کچھ حصے میں تہجد پڑھا کرو(۳)

حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے: نبی ﷺ نے ارشاد فرمایا فرض نمازوں کے بعد افضل ترین نماز، نماز تہجد ہے(۴) تہجد کی چار چھ آٹھ دس رکعات ثابت ہیں، عام معمول نبوی ﷺ آٹھ رکعات تہجد پڑھنے کا تھا(۵) انسان اپنی بشاشت ونشاط کے مطابق عمل کرسکتا ہے۔

نماز کسوف

سورج گرہن ہوجائے تو عام نوافل کی طرح امام لوگوں کو دو رکعت نماز پڑھائے، جس میں طویل قرأت کرے خواہ سراً ہو یا جہراً ہو۔

(۱) ترمذی : باب ماجاء فی فضل التطوع وست رکعات بعد المغرب : ۴۳۵. صحیح : اعلاء السنن :۷/ ۱۹)

(۲) مختصر قیام اللیل : باب الترغیب فی الصلوۃ مابین المغرب والعشاء : ۶۸. ۶۳. سکت علیه العراقی فی تخریج احادیث الاحیاء : ۵۹۸

(۳) بنی اسرائیل : ۷۹

(۴) ترمذی : فضل صلاۃ اللیل : ۴۳۸. حسن صحیح : امام ترمذیؒ

(۵) مسلم شریف باب صلوۃ اللیل مع فتح الملهم : ۲/ ۲۸۷. ۳۲۰

حضرت ابوبکرہؓ فرماتے ہیں: عہد رسالت میں سورج گرہن ہوا تو رسالتمآب ﷺ بے قراری کے عالم میں مسجد تشریف لائے ہم بھی مسجد پہنچے تو آپ ﷺ نے ہمیں (عام نوافل کی طرح) دو رکعتیں پڑھائیں، یہاں تک کہ سورج کھل گیا۔(۱)

ایک روایت میں ہے کہ آپ ﷺ نے (عام نوافل کی طرح) دو رکعت نماز پڑھائی البتہ اس میں خوب طویل قیام فرمایا پھر نماز سے فارغ ہوئے، سورج بھی کھل چکا تھا، اس وقت آنحضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا بلاشبہ یہ اللہ کی نشانیاں ہیں، جن سے اللہ عزوجل ڈراتے ہیں؛ لہذا جب تم اس کو دیکھو تو اس تازہ فرض نماز (نماز فجر) کی طرح جسے تم پڑھ کر فارغ ہو چکے ہو، نماز کسوف بھی پڑھو۔(۲)

سمرۃ بن جندب کی روایت میں ہے کہ کسوف کے موقع سے آپ ﷺ نے ہمیں نماز پڑھائی تو اتنا طویل قیام فرمایا کہ ایسا کسی نماز میں بھی نہیں فرمایا آپ ﷺ کی کوئی آواز ہم نہیں سنتے تھے، رکوع وسجدہ کا حال بھی یہی تھا۔(۳)

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ آپ ﷺ سرّی قرأت فرمارہے تھے، بعض روایات سے جہراً قرأت کرنا بھی ثابت ہے چنانچہ حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ نماز کسوف میں نبی ﷺ نے جہراً قرأت فرمائی۔(۴)

علامہ شبیر احمد عثمانیؒ فرماتے ہیں: ممکن ہے آنحضرت ﷺ نے ایک دو آیتیں جہراً پڑھ دی ہو جیسا کہ کبھی کبھار آپ ﷺ ایسا فرمایا کرتے تھے اور باقی سورۃ آہستہ ہی پڑھی ہو،

---

(۱)بخاری : باب الصلوۃ فی کسوف الشمس : ۱۰۴۰

(۲)مستدرک حاکم مع تعلیقات الذہبی : کتاب الکسوف : ۱۲۳۸ . صحیح

(۳)(ابوداؤد : باب من قال اربع رکعات :۱۱۸۶ . ترمذی : باب ماجاء فی صفة القرأة فی الکسوف : ۵۶۲ . حسن صحیح امام ترمذیؒ

(۴)بخاری : باب الجهر بالقرأة فی الکسوف : ۱۰۶۵

حضرت عائشہؓ نے خاص انہی ایک دو آیتوں کے اعتبار سے نماز کسوف میں جہری قرأت ہونے کو بیان فرمایا ہے۔

اس کی تائید اس سے بھی ہوتی ہے کہ حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں: سورج گہن کے دن میں نے آپ ﷺ کے پہلو میں نماز پڑھی مگر آپ ﷺ سے کسی قسم کی قرأت کو نہیں سنا۔(۱)

یہ روایت سنداً کمزور ہے تاہم اوپر ذکر کردہ سنن ابوداود کی روایت نیز دن کی نمازوں میں سری قرأت ہونے کو بیان کرنے والی عام احادیث، اس روایت کی موافقت کرتی ہیں، پس ثابت ہوا کہ کسوف میں قرأت سراً کرنا بہتر ہے۔☆

نماز استسقاء

استسقاء کہتے ہیں اللہ تعالی سے بارش مانگنا، بارش اللہ تعالی کی عظیم نعمت ہے جب لوگ زیادہ گناہ کرنے لگتے ہیں تو کبھی کبھی تنبیہ کے لئے اللہ تعالی بارش کو روک دیتا ہے، ایسے موقع پر دعا اور استغفار کرنا چاہئے۔

ارشاد ربانی ہے: اپنے پروردگار سے مغفرت مانگو، یقین جانو وہ بہت بخشنے والا ہے، وہ تم پر آسمان سے خوب بارشیں برسائے گا، اور تمہارے مال اور اولاد میں ترقی دے گا اور تمہارے لئے باغ پیدا کرے گا اور تمہاری خاطر نہریں مہیا کردے گا۔(۲)

استسقاء کے لئے لوگ معمولی لباس میں عاجزی کے ساتھ گڑگڑاتے ہوئے، جنگل یا عیدگاہ روانہ ہوں، بلا اذان واقامت کہے پہلے امام دو رکعت نفل جماعت کے ساتھ، عام نمازوں کی طرح پڑھائے پھر خطبہ دے، پھر امام قبلہ کی طرف منہ کر کے کھڑا ہو اور ہاتھ اچھی طرح اٹھا کر دعا

---

(۱) طبرانی کبیر : ۱۱۶۱۲۔ حسن: اثار السنن : ۲/۱۱۴

(۲)سورۃ نوح : ۱۰تا۱۲

☆یہی ائمہ ثلاثہ کا مسلک ہے، البتہ امام احمدؒ وصاحبینؒ کے نزدیک جہراً قرأت کرنی چاہئے۔(۱)فتح الملهم : ۴۷۵/۲

کرے اور چادر پلٹ دے اور مقتدی بیٹھ کر دعا کریں۔(۱)

حضرت ابن عباسؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ : (استسقاء کے لئے) نہایت خستہ ،درماندہ اور آہ وزاری کی حالت میں (آبادی سے) باہر نکلے۔(۲)

نماز حاجت:

حضرت عبداللہ بن ابی اوفیٰؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے ارشاد فرمایا: جو شخص اللہ سے یا کسی انسان سے اپنی کوئی ضرورت پوری کرانا چاہتا ہو، اسے اچھی طرح وضو کر کے دو رکعت نماز پڑھنی چاہئے، پھر اللہ تعالی کی حمد وثنا اور نبی ﷺ پر درود پڑھنے کے بعد یہ دعا کرنی چاہئے:

لا الـه الاّ اللّـه الحليم الكريم سبحان اللّـه ربّ العرش العظيم الحمد لله رب العالمين أسألك موجبات رحمتك وعزائم مغفرتك والغنيمة من كلّ بر والسلامة من كلّ إثم لا تدع لي ذنبا الّا غفرته ولا هما الّا فرجته ولاحاجة هي لك رضا الّا قضيتها يا ارحم الراحمين (۳)

اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں وہی برد باری اور کرم کرنے والا ہے، بڑے عرش کا مالک اللہ پاک ہے، حمد وثنا جہانوں کے رب اللہ ہی کے لئے ہے، اے اللہ میں تجھ سے ان کاموں کے کرنے کی توفیق چاہتا ہوں جو تیری رحمت ومغفرت کا باعث ہوں، میں تجھ سے تیری اطاعت کرنے اور ہر گناہ سے بچا رہنے کی توفیق چاہتا ہوں، میرا جو گناہ ہے اسے بخش دے، میرے دل میں جو فکر وپریشانی ہے اسے دور کر دے اور میری ہر حاجت جو تیرے نزدیک پسندیدہ ہے اسے پورا کر دے، اے سب سے بڑے رحم کرنے والے میری دعا قبول فرما!

---

(۱)مسند احمد : تحقیق شعیب الارنووط، ۸۳۲۷. صحیح لغیرہ

(۲)ابوداؤد : تحقیق الالبانی : الاستسقاء : ۱۱۶۷ . حسن

(۳)ترمذی :صلاۃ الحاجۃ : ۴۷۹. للحدیث طرق اخری : فتح الغفار : کتاب الصلوۃ : ۲۳۹/۵

صلوۃ التسبیح

رسول اللہ ﷺ نے اپنے چچا حضرت عباس ؓ کو یہ نماز خاص اہتمام سے سکھائی تھی، اور یہ فرمایا تھا کہ اس سے تمہارے چھوٹے بڑے گناہ سب معاف ہو جائیں گے، اگر ہو سکے تو ہر روز پڑھ لیا کرو اور ہر روز نہ پڑھ سکو تو ہفتہ میں ایک بار پڑھ لیا کرو، ہر ہفتہ نہ پڑھ سکو تو مہینہ میں ایک بار پڑھ لیا کرو، ہر مہینہ نہ پڑھ سکو تو سال میں ایک بار پڑھ لو اور اگر یہ بھی نہ ہو سکے تو ساری عمر میں ایک دفعہ پڑھ لو، (۱)

نماز تسبیح کا طریقہ: چار رکعت نفل کی نیت باندھے اور ثنا و سورۃ فاتحہ پڑھ کر پندرہ مرتبہ **سبحان اللہ والحمد للہ ولا الہ الا اللہ واللہ اکبر** پڑھے، پھر رکوع میں **سبحان ربی العظیم** کے بعد دس مرتبہ یہ کلمے پڑھے پھر رکوع سے کھڑے ہو کر **سمع اللہ لمن حمدہ** کے بعد دس مرتبہ پڑھے پھر پہلے سجدے میں **سبحان ربی الاعلی** کے بعد دس مرتبہ پڑھے، پھر دو سجدوں کے درمیان بیٹھے تو دس مرتبہ پڑھے پھر دوسرے سجدے میں **سبحان ربی الاعلی** کے بعد دس مرتبہ پڑھے پھر دو سجدوں کے درمیان بیٹھے تو دس مرتبہ پڑھے دوسرے سجدے میں **سبحان ربی الاعلی** کے بعد دس مرتبہ پڑھے، پھر دوسرے سجدے سے اللہ اکبر کہہ کر اٹھے اور بیٹھ جائے اور دس مرتبہ یہ کلمے پڑھ کر اللہ اکبر کہے بغیر کھڑا ہو جائے اسی طرح دوسری رکعت پڑھے اور جب دوسری رکعت میں التحیات کے لئے بیٹھے تو پہلے دس مرتبہ یہ کلمے پڑھے پھر التحیات پڑھے اسی طرح چار رکعتیں پڑھے۔(۲)

دوسرا طریقہ

تکبیر تحریمہ کہہ کے ثنا پڑھنے کے بعد، سورۃ فاتحہ سے پہلے پندرہ مرتبہ یہ کلمے پڑھے پھر الحمد للہ اور ضم سورۃ کے بعد دس مرتبہ پڑھے اور باقی سب جگہ پہلے طریقہ کے موافق پڑھے البتہ دوسرے سجدے کے بعد بیٹھ کر نہ پڑھے اور نہ التحیات کے ساتھ پڑھے (۳)

---

(۱)(۲) ابوداؤد: تحقیق الالبانی باب صلوۃ التسبیح : ۱۲۹۹ صحیح

(۳) مستدرک حاکم مع تعلیقات الذھبی : کتاب صلاۃ التطوع : ۱۱۹۷ . رواۃ ھذا الحدیث عن ابن المبارک کلھم ثقات اثبات ولا یتھم عبد اللہ ان یعلمہ مالم یصح عندہ سندہ . امام حاکم

نماز استخارہ:

اگر کوئی کام پیش آجائے مگر اس کے کرنے یا نہ کرنے میں تردد ہو اور فیصلہ نہ کر سکے کہ کروں یا نہ کروں یا ابھی کروں یا کچھ دن بعد، تو دو رکعت استخارہ پڑھے پھر دعا پڑھے، پھر جس طرف رجحان پیدا ہو وہ کام کرے۔ (نیند لینا پھر نیند میں خواب دیکھنا ضروری نہیں)

دعائے استخارہ:

اَللّٰهُمَّ اِنِّیْ اَسْتَخِیْرُکَ بِعِلْمِکَ وَاَسْتَقْدِرُکَ بِقُدْرَتِکَ وَاَسْأَلُکَ مِنْ فَضْلِکَ الْعَظِیْمِ فَاِنَّکَ تَقْدِرُ وَلَا اَقْدِرُ وَتَعْلَمُ وَلَا اَعْلَمُ وَاَنْتَ عَلَّامُ الْغُیُوْبِ . اَللّٰهُمَّ اِنْ کُنْتَ تَعْلَمُ اَنَّ هٰذَا الْاَمْرَ خَیْرٌ لِّیْ فِیْ دِیْنِیْ وَمَعَاشِیْ وَعَاقِبَةِ اَمْرِیْ فَاقْدُرْهُ لِیْ وَیَسِّرْهُ لِیْ ثُمَّ بَارِکْ لِیْ فِیْهِ وَاِنْ کُنْتَ تَعْلَمُ اَنَّ هٰذَا الْاَمْرَ ..... شَرٌّ لِیْ فِیْ دِیْنِیْ وَمَعَاشِیْ وَعَاقِبَةِ اَمْرِیْ فَاصْرِفْهُ عَنِّیْ وَاصْرِفْنِیْ عَنْهُ وَاقْدُرْ لِیَ الْخَیْرَ حَیْثُ کَانَ ثُمَّ اَرْضِنِیْ بِهٖ .

(ترجمہ) اے اللہ! میں تیرے علم کے ذریعہ تجھ سے خیر طلب کرتا ہوں اور تیری قدرت کے ذریعہ قدرت طلب کرتا ہوں، میں تجھ سے تیرا فضل عظیم مانگتا ہوں، اس لئے کہ تو قدرت رکھتا ہے میں قدرت نہیں رکھتا اور تو جانتا ہے اور میں نہیں جانتا اور تو ہی غیب کے کاموں کو جاننے والا ہے، اے اللہ! اگر تیرے علم کے مطابق یہ کام میرے لئے میرے دین، میری معاش اور میرے انجام کار میں بہتر ہو تو اسے میرے لئے مقدر فرمادے، اسے میرے لئے آسان کردے اور اس میں میرے لئے برکت پیدا کردے اور اگر تیرے علم کے مطابق یہ کام میرے لئے میرے دین میری معاش اور انجام کار میں برا ہے تو اسے مجھ سے اور مجھے اس سے پھیر دے اور میرے لئے جہاں بھی خیر ہے مقدر کردے اور پھر مجھے اس پر راضی و مطمئن کردے۔ لفظ ان هذا الامر پر اپنی حاجت کا ذکر کرے یا خیال کرلے۔(۱)

---

(۱) بخاری: باب ماجاء في التطوع مثنى مثنى : ۱۱۶۲

نماز تراویح

نماز تراویح سنت مؤکدہ ہے: رسول اللہ ﷺ نے اپنی حیات مبارکہ میں دو یا تین رات نماز تراویح پڑھائی ہے جس میں صحابہ کرام نے بڑے ذوق وشوق کے ساتھ شرکت فرمائی تھی، رسول اللہ ﷺ کو خدشہ لاحق ہوا کہ کہیں اس کی بنا پر یہ نماز امت پر فرض نہ کردی جائے پھر امت مشقت میں پڑ جائے، اس اندیشے سے آنحضرت ﷺ نے تراویح پڑھانے کا اہتمام ترک فرمایا: (۱) تاہم اس کے باوجود آنحضرت ﷺ لوگوں کو انفرادی طور پر قیام رمضان کی تلقین فرمایا کرتے تھے، چنانچہ ارشاد گرامی ہے، جو شخص بحالت ایمان اور بامید ثواب، قیام رمضان کا اہتمام کرے تو اللہ تبارک وتعالی اس کے گذشتہ گناہوں کو بخش دیتے ہیں۔(۲)

چوں کہ رسول اللہ نے ایک مصلحت سے تراویح کے اہتمام واظہار کو بالکل ترک فرمادیا تھا، اس لئے اس بارے میں، معمول نبوی ﷺ بھی مشہور نہ ہوسکا، نماز تراویح اور اس کی رکعات سے متعلق احادیث کم ہیں، بلکہ اکابر صحابہؓ سے اس بارے میں حضور ﷺ کا کوئی معمول منقول نہیں ہے۔

ہاں چند ایک صحابہ نے رسول اللہ ﷺ سے بیس رکعت کا پڑھنا نقل کیا ہے مگر محدثین کو ان روایات میں کلام ہے حضرت صدیق اکبرؓ کے دور خلافت اور فاروق اعظم کے شروع کے دور تک بھی یہی صورتحال رہی، پھر آگے چل کر دور فاروقی ہی میں تراویح کا مسئلہ صاف ہوگیا اور صحابہ کرام وسلف صالحین کا اس پر اجماع ہوا کہ تراویح کی رکعات بیس ہیں، اس کے ساتھ ہی یہ یقین بھی ہوگیا کہ رکعات تراویح کے تعلق سے سنت نبوی ﷺ بھی بیس رکعت ہی ہے، کیوں کہ یہ بات محال ہے کہ صحابہ کرام نے کسی ایسے عمل پر اجماع کرلیا ہو جو سنت نبوی کے مخالف ہو۔

واقعہ یہ ہے کہ ایسے ہی نازک موڑ پر آثار صحابہ اور تعامل اسلاف راحت ورہنمائی کا کام دیتے ہیں انہی موقعوں پر رسول اللہ ﷺ کے ان ارشادات کی اہمیت وضرورت سمجھ میں آتی ہے جس

---

(۱)(مسلم :باب الترغیب فی قیام رمضان :۱۸۱۹،۱۸۲۰)

(۲)(مسلم :باب الترغیب فی قیام رمضان وھو التراویح: ۱۸۱۵،۱۸۱٦)

میں آنحضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا تم پر لازم ہے کہ میری سنت اور ہدایت یافتہ خلفاء راشدین کی سنت پر عمل کرو اور اسے مضبوطی سے تھام لو اور دانت سے مضبوطی سے پکڑ لو یعنی اس پر سختی سے عمل پیرا رہو۔(۱)

میرے صحابہ ستاروں کے مانند ہیں، ان میں سے جن کی بھی تم پیروی کرو گے راہ یاب ہو جاؤ گے(۲) میری امت گمراہی پر مجتمع نہیں ہو سکتی۔(۳)

وہ لوگ جو صحابہ کرام کو خاطر میں نہیں لاتے، اثار صحابہ کو ٹھکرا دیتے ہیں، ان پر ایک مسئلہ تراویح کیا، بہت سارے ضروریات دین کو بھی ثابت کرنا مشکل ہے، ایسے لوگ بہت جلد گمراہی کا شکار ہو کر بجائے شریعت کے خواہش نفس کے متبع ہو کر رہ جاتے ہیں اور اس آیت کریمہ کی عملی تصویر بن جاتے ہیں: پھر کیا تم نے اسے بھی دیکھا جس نے اپنا خدا اپنی نفسانی خواہش کو بنالیا ہے اور علم کے باوجود اللہ نے اسے گمراہی میں ڈال دیا اور اس کے کان اور دل پر مہر لگا دی اور اس کی آنکھ پر پردہ ڈال دیا، اب اللہ کے بعد کون ہے جو اسے راستے پر لائے؟ کیا پھر بھی تم لوگ سبق نہیں لیتے؟(۴)

ذیل میں تراویح کی بیس رکعات کے تعلق سے بعض احادیث وآثار کو نقل کیا جاتا ہے:

حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ رمضان کے مہینے میں بیس رکعات تراویح اور وتر پڑھا کرتے تھے۔(۵)

اس روایت کی سند کے تمام راوی علاوہ ابراہیم بن عثمانؒ کے ثقہ ہیں، تاہم ائمہ جرح وتعدیل کی آراء کی روشنی میں ابراہیم بن عثمانؒ کا کم از کم حسن الحدیث ہونا ثابت ہوتا ہے، اس لئے

---

(۱)ابوداود : تحقیق الالبانی : باب لزوم السنة : ۴۶۰۹ صحیح

(۲)مشکوة : باب مناقب الصحابة : ۶۰۱۸ الحدیث الصحیح یؤدی بعض معناه : الاعتقاد للامام بیهقیؒ ۰ باب القول فی اصحاب رسول الله : ۲۹۲

(۳)ابن ماجه : تحقیق الالبانی : باب السواد الاعظم : ۳۹۵۰. صحیح

(۴)سورة الجاثیه : ۲۳

(۵)مصنف ابن ابی شیبه : باب کم یصلی فی رمضان من رکعة: ۷۷۷۴

یہ روایت گو صحیح کے خانہ میں نہ آتی ہو مگر حسن ضرور ہے خاص کر جب کہ آثار صحیحہ سے اس روایت کی تائید بھی ہوتی ہے۔(۱)

اپنے زمانہ خلافت میں حضرت عمرؓ رمضان کی کسی رات مسجد تشریف لے گئے، دیکھا کہ لوگ چیدہ چیدہ بے نظمی سے نمازیں پڑھ رہے ہیں کوئی تنہاء ہے تو کوئی کسی قاری کے پیچھے نماز پڑھ رہا ہے، یہ صورتحال دیکھ کر حضرت عمرؓ نے ارشاد فرمایا اگر میں انہیں ایک امام وقاری کے پیچھے جمع کردوں تو خوب رہے گا، چنانچہ حضرت عمرؓ نے بعد ازاں حضرت ابی ابن کعبؓ کے پیچھے سب کو جمع کردیا۔(۲)

اس سے معلوم ہوا کہ تراویح کا معمول عہد رسالت ہی سے چلا آرہا ہے، حضرت عمرؓ کا کارنامہ صرف یہ ہے کہ آپؓ نے تمام لوگوں کو ایک امام کے پیچھے جمع کردیا، گویا باجماعت تراویح کا طریقہ رائج فرمایا، اس لئے یہ کہنا بے جا ہے کہ تراویح (اور اس میں بیس رکعات) سنت نبوی ﷺ نہیں بلکہ سنت عمریؓ ہے (بلکہ بعض دریدہ دہنوں کے مطابق بدعت عمریؓ ہے)۔(۳)

حضرت ابن عباسؓ سے مروی ہے کہ نبی ﷺ رمضان میں بیس رکعات اور وتر پڑھا کرتے تھے۔(۴) حضرت یزید بن رومانؒ کہتے ہیں کہ حضرت عمرؓ کے زمانہ میں لوگ تیئس رکعات (۲۰ر تراویح ۳ وتر) پڑھا کرتے تھے۔(۵)

حضرت سائب بن یزیدؓ سے راویت ہے کہ ہم لوگ حضرت عمرؓ کے زمانے میں قیام لیل (تراویح) سے فارغ ہوتے تو فجر کا وقت قریب ہوتا اور قیام اللیل حضرت عمرؓ کے زمانہ میں تیئس

---

(۱)اعلاء السنن : ۸۲/۷

(۲) بخاری : باب فضل من قام رمضان : ۲۰۰۹۔ ۲۰۱۰

(۳)اعلاء السنن : ۶۶/۷

(۴)مصنف ابن ابی شیبہ : کم یصلی فی رمضان من رکعة : ۷۷۴۔ حسن : اعلاء السنن : ۸۳/۷

(۵)مؤطا امام مالک : باب ماجاء فی قیام رمضان) (مرسل قوی : اثار السنن : ۵۵/۲

رکعت ہوتا تھا (بیس رکعات تراویح اور ۳ رکعت وتر) (۱) حضرت عبدالعزیز بن رفیعؒ فرماتے ہیں: حضرت ابی بن کعبؓ رمضان المبارک میں مدینہ طیبہ میں لوگوں کو بیس رکعات پڑھایا کرتے تھے اور وتر تین رکعت۔ (۲)

حضرت یحیی بن سعیدؒ کہتے ہیں: حضرت عمرؓ نے ایک آدمی کو اس پر مامور فرمایا تھا کہ وہ لوگوں کو بیس رکعتیں پڑھائے۔ (۳)

حضرت عثمانؓ کے دور خلافت میں بھی امت کا تعامل بیس رکعات تراویح پڑھنے ہی کا رہا، عہد عثمانیؓ میں بسا اوقات لوگ، قیام کی شدت اور قرأت کی طوالت کی وجہ سے لاٹھیوں کا سہارا لیا کرتے تھے۔ (۴)

ابوعبدالرحمٰن السلمیؒ کہتے ہیں کہ حضرت علیؓ نے رمضان میں قاریوں کو بلایا پھر ایک شخص کو حکم دیا کہ وہ لوگوں کو بیس رکعات پڑھایا کرے اور حضرت علیؓ خود ان کو وتر پڑھاتے تھے۔ (۵)

حضرت عطاءؒ کہتے ہیں کہ: میں نے لوگوں کو وتر سمیت تیئیس رکعات پڑھتے پایا ہے۔ (۶)

---

(۱) مصنف عبد الرزاق : باب قیام رمضان : ۷۷۳۳. بعضها یقوی بعضا : اثار السنن : ۵۶/۲

(۲) مصنف ابن ابی شیبه : کم یصلی فی رمضان من رکعة : ۷۷۶۶. مرسل قوی : اثار السنن : ۵۵/۲

(۳) مصنف ابن ابی شیبه : کم یصلی فی رمضان من رکعة : ۷۷۶۴ . مرسل قوی : اثار السنن : ۵۵/۲

(۴) السنن الکبری للبیهقی : باب ماورد فی عدد رکعات القیام فی رمضان : ۴۸۰۱: اسناده صحیح قد صحح اسناده غیر واحد من الحفاظ کالنووی فی الخلاصة وابن العراقی فی شرح التقریب والسیوطی فی المصابیح . التعلیق الحسن : ۵۴/۲

(۵) السنن الکبری للبیهقی : باب ماورد فی عدد رکعات القیام فی رمضان : ۴۸۰۴: حسن: اعلاء السنن : ۸۸/۷

(۶) مصنف ابن ابی شیبه : کم یصلی فی رمضان من رکعة : ۷۷۷۰ . حسن : اثار السنن : ۵۵/۲

ان خلفاء راشدین، صحابہ کرام کے علاوہ اجلہ تابعین سے تراویح کی بیس رکعات منقول ہیں، اور اسی کو ان بزرگان نے امت محمدیہ کا عام تعامل بتایا ہے، ذیل میں چند نام شمار کرائے جاتے ہیں، (علماء مکہ میں سے) حضرت عطاءؒ، حضرت سعید بن جبیرؒ، حضرت ابن ابی ملیکہؒ (علماء کوفہ میں سے) حضرت سوید بن غفلہ، حضرت علی بن ربیعہؒ، حضرت حارث اعور، (۱) امام ترمذیؒ فرماتے ہیں کہ اکثر اہل علم ۲۰ رکعت تراویح کے قائل ہیں، جیسا کہ حضرت عمرؓ، حضرت علیؓ اور نبی ﷺ کے دیگر صحابہ رضی اللہ عنھم سے منقول ہے، یہی سفیان ثوریؒ اور حضرت عبداللہ بن مبارکؒ کا قول ہے، حضرت امام شافعیؒ فرماتے ہیں کہ میں نے اپنے شہر مکہ میں ایسے ہی پایا ہے کہ وہاں لوگ بیس رکعت پڑھتے تھے۔ (۲)

مدینہ منورہ میں حضرت عمرؓ ہی کے عہد سے ۲۰ ر رکعت تراویح ہوتی تھی اور ہر ترویحہ پر چار چار رکعت نفل پڑھی جاتی تھی اور پھر تین رکعت وتر اور وتر کے بعد کی دو رکعت، اس طرح اکتالیس رکعتیں ہو جاتی تھیں، امام ترمذیؒ نے اکتالیس والا قول نقل کر کے لکھا ہے کہ یہی اہل مدینہ کا قول ہے اور اس پر ان کا عمل ہے۔ (۳) گویا صحابہؓ اور اس کے بعد کے ادوار میں، مکہ اور کوفہ جیسے علمی مراکز میں بیس رکعات تراویح ہی کا معمول رہا ہے اور یہی تین شہر عہد صحابہ و تابعین میں علوم اسلامی اور بالخصوص فن حدیث کے مراکز رہے ہیں۔

بعض حضرات کو حضرت عائشہؓ کی اس راویت سے کہ نبی ﷺ رمضان و غیر رمضان میں گیارہ رکعت سے زیادہ نہیں پڑھتے تھے، (۴) یہ شبہ ہوا کہ تراویح صرف آٹھ رکعات ہے۔

---

(۱) ملاحظہ ہو: مصنف ابن ابی شیبہ باب کم یصلی فی رمضان من رکعۃ: و اثار السنن: ۵۵/۲

(۲) ترمذی: ۸۰۶ باب ماجاء فی قیام شھر رمضان

(۳) ترمذی حوالہ سابق

(۴) بخاری: باب فضل من قام رمضان: ۲۰۱۳

حالاں کہ اس روایت کو نہ ہی تعداد رکعات کے معاملہ میں قانون کلی قرار دیا جاسکتا ہے، نہ ہی تراویح وغیر تراویح (تہجد) میں اس کے عموم کو تسلیم کیا جاسکتا ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ نبی ﷺ سے شب میں آٹھ رکعات سے کم وبیش (چار۔ چھ۔ دس) (۱) بلکہ حافظ ابن حجرؒ کے مطابق، دن رات کی فرض رکعات کے بقدر ۱۷ رکعتیں (۲) پڑھنا نیز رمضان المبارک میں عبادت وریاضت (۳) دعا اور نمازوں کی کثرت کر دینا (۴) صحیح و مستند روایات سے ثابت ہے، ایسی صورت میں حضرت عائشہؓ کی مذکورہ روایت سے یہ نتیجہ اخذ کرنا خلاف انصاف ہوگا کہ آنحضرت ﷺ شب میں آٹھ رکعات ہی پڑھا کرتے تھے اور یہ نماز نمازِ تراویح ہوا کرتی تھی، صحیح بات یہ ہے کہ روایات کے مجموعہ سے حدیث مذکور کا مفہوم یہ نکلتا ہے کہ عموماً نبی ﷺ شب کو آٹھ سے زیادہ رکعات نہیں پڑھا کرتے تھے اور یہ معمول نماز تہجد کا تھا، باقی رمضان المبارک میں آنحضرت ﷺ (علاوہ نماز تہجد کے) نمازوں کی کثرت فرمادیا کرتے تھے، جن کی تعداد بشکل تراویح ۲۰/ رکعات ہوا کرتی تھی، اور یہ معاملہ رمضان کے ساتھ خاص ہوا کرتا تھا، واللہ اعلم۔

فائدہ: نماز تراویح میں ہر چار رکعت پر ترویحہ کرنا (یعنی بقدر چار رکعت راحت وآرام سے بیٹھنا) مستحب ہے، ابوالحسناء سے روایت ہے کہ حضرت علیؓ نے ایک شخص کو حکم فرمایا کہ وہ لوگوں کو پانچ ترویحہ کے ساتھ۔ ۲۰/ رکعت پڑھائے۔ (۵)

---

(۱) ابو داود تحقیق الالبانی : باب فی صلاۃ اللیل : ۱۳۶۴ . صحیح

(۲) التلخیص الحبیر : ۲/ ۱۴ باب صلوۃ التطوع

(۳) مسلم : باب الاجتهاد فی العشر الاواخر من رمضان : ۲۸۴۴ .

(۴) بیهقی شعب الایمان : باب فضائل شهر رمضان . ۳۶۲۴

(۵) مصنف ابن ابی شیبه : کم یصلی فی رمضان من رکعة : ۷۷۶۳ .سند کے ایک راوی غیر معروف هیں . اثار السنن : ۲/ ۵۷

فائدہ: نماز تراویح میں کم از کم ایک قرآن ختم کرنا سنت ہے

ثعلبہ ابن ابی مالکؓ کہتے ہیں کہ رمضان میں کسی رات رسول اللہ ﷺ نے دریافت کیا کہ یہ لوگ کیا کر رہے ہیں، کسی نے جواب میں عرض کیا: یا رسول اللہ ﷺ ان لوگوں کو قرآن یاد نہیں (یعنی مکمل قرآن یہ معنی نہیں کہ ان کو اتنا قرآن بھی نہیں آتا جس سے وہ از خود نماز پڑھ سکیں کہ یہ حضرات صحابہ کی شان سے نہایت بعید ہے) اور ابی ابن کعبؓ قرآن پڑھ رہے ہیں اور لوگ ان کی اقتداء میں نماز پڑھ رہے ہیں، اس پر نبی ﷺ نے ارشاد فرمایا: ان لوگوں نے بہت خوب کیا اور بہت ٹھیک کام کیا اور آپ ﷺ نے کوئی ناپسندیدگی ظاہر نہیں فرمائی۔(۱) معلوم ہوا کہ تراویح میں ایک ختم قرآن کرنا منشائے نبوی ﷺ بھی ہے۔

---

(۱) معرفة السنن والآثار للبيهقي : باب قيام رمضان: ۱۴۴۱ : سند جید ہے اثار السنن: ۲/۴۹، ۵۰
اعلاء السنن : ۷/۷۴

فوت شدہ نمازوں کی قضا کا بیان

قضا نمازوں کی ادائیگی انسان کے ذمہ ضروری ہے ورنہ وہ اس کے ذمہ رہ جائیں گی، حضرت انس بن مالکؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے ارشاد فرمایا جو آدمی نماز پڑھنا بھول جائے تو جب اسے یاد آجائے پڑھ لے، یہی اس کا کفارہ ہے (ارشاد ربانی ہے) اور مجھے یاد رکھنے کے لئے نماز قائم کرو۔ (سورۃ طہ:۱۴)(۱)

ایک موقع پر نبی ﷺ نے ارشاد فرمایا: اللہ کا قرض پابجائی کا زیادہ مستحق ہے۔ (۲)

قضا اور ادا نماز کے درمیان ترتیب:

کسی کی کوئی نماز فوت ہوگئی ہو یا چند نمازیں فوت ہوگئی ہوں تو اس کے ذمہ ضروری ہے کہ وہ پہلے فوت شدہ نماز کی قضا کرے پھر وقتیہ نماز پڑھے نیز متعدد نمازوں کے فوت ہونے کی صورت میں یہ بھی ضروری ہے کہ بالترتیب ان کی قضا کرے۔

حضرت جابرؓ سے روایت ہے کہ حضرت عمرؓ جنگ خندق کے دن، کفار ومشرکین کو برا بھلا کہنے لگے اور عرض کیا یا رسول اللہ: میں نماز عصر نہیں پڑھ سکا، یہاں تک کہ آفتاب بھی غروب ہوگیا، رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: قسم بخدا میں بھی نماز عصر نہیں پڑھ سکا پھر ہم وادیٔ بطحان آئے، آپ ﷺ نے وضو فرمایا اور ہم نے بھی پھر غروب آفتاب کے بعد آپ ﷺ نے عصر پہلے پڑھی پھر مغرب۔ (۳) حالاں کہ مغرب کی نماز میں کسی قدر تاخیر کرنے کو بھی، آنحضرت ﷺ نے کبھی گوارا نہ فرمایا، یہاں اس موقع سے جب نماز عصر کی قضا کی خاطر اس میں تاخیر گوار کی

---

(۱) بخاری :باب من نسي صلاة فليصلها إذا ذكرها : ۵۹۷

(۲) بخاری :باب الحج والنذور عن الميت : ۱۸۵۲

(۳) بخاری : باب قضاء الصلوات الأولى فالأولى : ۵۹۸

گئی تو معلوم ہوا کہ فوت شدہ اور وقتیہ نماز میں ترتیب قائم رکھنا ضروری ہے، ارشاد نبوی ہے:
تم ایسے نماز پڑھو جیسے تم مجھے پڑھتا دیکھتے ہو۔(۱)

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ فرماتے ہیں خندق کے دن مشرکین نے آنحضرت ﷺ کو چار نمازوں کے پڑھنے سے روک دیا، بعد ازاں آپ ﷺ کو فرصت ملی تو آپ ﷺ نے حضرت بلالؓ کو اذان واقامت کہنے کا حکم فرمایا اور نماز ظہر پڑھی پھر حضرت بلالؓ نے اقامت کہی تو آپ ﷺ نے نماز عصر پڑھی پھر حضرت بلالؓ نے اقامت کہی تو آپ ﷺ نے نماز مغرب پڑھی پھر حضرت بلالؓ نے اقامت کہی تو آپ ﷺ نے نماز عشاء پڑھی، (۲) معلوم ہوا کہ قضا نمازوں کو ترتیب وار پڑھنا ضروری ہے۔

قضا اور ادا نمازوں کے درمیان ترتیب کا ضروری ہونا اس سے بھی ثابت ہوتا ہے کہ نبی ﷺ نے اس شخص کے بارے میں جو بھول کر امام کے ساتھ، وقتیہ نماز میں شریک ہو گیا پھر دوران نماز اسے اپنی فوت شدہ نماز یاد آئی ہو، یہ فرمایا کہ وہ امام کے ساتھ نماز مکمل کرلے پھر اپنی بھولی ہوئی قضا نماز پڑھے پھر امام کے ساتھ پڑھی گئی وقتیہ نماز کا اعادہ کرلے۔ (۳) ہاں تین اعذار سے یہ ترتیب ساقط ہو جاتی ہے:

(الف) بالکل بھول گیا کہ ذمہ میں قضا نماز باقی ہے، تا آنکہ وقتیہ نماز پڑھ کر فارغ ہو چکا، نبی ﷺ نے ارشاد فرمایا: قضا نماز اس وقت پڑھ لے جب یاد آئے، (۴) جب یاد نہیں آیا اور وقتیہ نماز پڑھ لی تو وہ معذور ہے۔

---

(۱) صحيح ابن حبان تحقيق شعيب الأرنؤوط : باب الأذان : ۱۶۵۸ – صحيح

(۲) نسائي تحقيق الالباني : باب الاجتزاء لذلک كله بأذان واحد والإقامة لكل واحدة منهما : ۶۲۲ – صحيح لغيره

(۳) الاوسط للطبراني : ۵۱۳۲ – رجاله ثقات : إعلاء السنن : ۱۴۴/۷

(۴) بخاري : باب من نسي صلاة : ۵۹۷

(ب) وقت اس قدر تنگ ہوگیا کہ فوت شدہ نماز پڑھ کر وقتیہ نماز پڑھی جاتی ہے تو خطرہ ہے کہ وقتیہ نماز بھی قضا ہو جائے، ارشاد ربانی ہے: بلاشبہ نماز مسلمانوں کے ذمہ ایک ایسا فریضہ ہے جو وقت کا پابند ہے، (۱) جس کا تقاضا یہ ہے کہ نماز کو وقت سے ٹالا نہ جائے اور احادیث کی تعلیم یہ ہے کہ وقتیہ نماز سے پہلے فوت شدہ نماز پڑھی جائے، دونوں باتوں کو مدنظر رکھنے سے نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ فوت شدہ نماز کو وقتیہ نماز سے مقدم رکھنا اس صورت میں ہے جب کہ اس کی وجہ سے وقتیہ نماز قضا نہ ہو۔ (۲)

(ج) جب فوت شدہ نمازیں چھ یا اس سے زیادہ ہوگئی ہوں کہ اس صورت میں بجائے وقتیہ نماز پڑھنے کے انسان اگر فوت شدہ نمازوں کی قضا میں لگ جاتا ہے تو وقتیہ نماز خطرہ میں پڑسکتی ہے، جس کا نامناسب ہونا قبل ازیں ثابت ہو چکا ہے۔

---

(۱) سورة النساء : ۱۰۳

(۲) البحر الرائق : ۸۸/۲

سجدہ سہو کا بیان

سجدہ سہو کا طریقہ:

سجدہ سہو کا طریقہ یہ ہے کہ ایک جانب سلام پھیر کر دو سجدے کرے، دوبارہ تشہد پڑھے پھر دونوں جانب سلام پھیر کر نماز ختم کرے۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو ایک موقع پر نماز کی رکعات میں سہو ہوا، صحابہ کرام نے اس جانب توجہ دلائی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے سلام پھیر کر دو سجدے فرمائے، (دوبارہ تشہد پڑھا)، پھر سلام پھیرا (۱) بخاری کی روایت میں بھی سجدہ سہو کے اسی طریقہ کی تعلیم کی گئی کہ سلام پھیرے پھر دو سجدے کرے۔ (۲) نسائی کی روایت میں بھی بصراحت سجدۂ سہو کے لئے الگ سلام اور ختم نماز کے لئے الگ سلام کا ذکر موجود ہے۔ (۳)

حضرت عمران بن حصین رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں کو نماز پڑھائی، نماز میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو سہو لاحق ہوا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے (سلام پھیر کر) (۴) دو سجدے فرمائے پھر تشہد پڑھا پھر سلام پھیرا۔ (۵)

---

(۱) مسلم : باب السهو في الصلاة : ۱۳۱۶

(۲) بخاری : باب التوجه نحو القبلة حيث كان : ۴۰۱

(۳) نسائي تحقيق الباني : السلام بعد سجدتي السهو : ۱۳۳۰ — حسن صحيح

(۴) مسلم : باب السهو في الصلاة : ۱۳۱۶

(۵) ترمذی : باب ما جاء في التشهد في سجدتي السهو : ۳۹۵ — حسن امام ترمذی، مستدرک حاکم مع تعليقات الذهبي : كتاب السهو : ۱۲۰۷. صحيح

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کا ارشاد ہے، جو آدمی قعدہ کی جگہ قیام یا قیام کی جگہ قعدہ کردے یا دو رکعت پر سلام پھیر دے تو وہ اپنی نماز مکمل کرے پھر اخیر میں سلام پھیر کر سجدہ سہو کرے، تشہد پڑھے پھر سلام پھیرے۔(۱)☆

سجدۂ سہو کا وجوب امام کے سہو سے نہ کہ مقتدی کے سہو سے:

حضرت عمرؓ سے روایت ہے: نبی ﷺ نے ارشاد فرمایا مقتدی پر سہو نہیں ہوتا بلکہ سہو اگر امام سے ہو تو سجدۂ سہو کا لزوم اس پر بھی ہوگا اور مقتدی پر بھی اور اگر سہو مقتدی سے ہوا تو وہ سہو معتبر نہیں، امام اس کے لئے کافی ہے۔(۲)

قعدۂ اولی سے سہو:

قعدۂ اولی کو کوئی بھول جائے تو حکم یہ ہے کہ اگر وہ قیام کے نزدیک ہو چکا ہے تو قعدۂ اولی کی جانب نہ لوٹے بلکہ قیام ہی کو جاری رکھے اور ختم نماز پر سجدہ سہو کرے اور اگر قعدہ ہی کے قریب ہے تو قعدہ اولی کی جانب لوٹ آئے اس صورت میں اس پر سجدہ سہو نہیں۔

حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے لوگوں کو ظہر یا عصر کی نماز پڑھائی، جس میں (بھولے سے) دو رکعت پر کھڑے ہوگئے، لوگوں نے آپ ﷺ (کو آگاہ کرنے) کے لئے تسبیح کہی مگر آپ ﷺ نے اپنی نماز جاری رکھی، (واپس نہیں لوٹے) پھر آپ ﷺ نماز مکمل کر چکے تو سجدہ سہو فرمایا پھر سلام پھیرا۔(۳)

---

(۱)المدونة الکبری : ۱/۱۳۶، ۲۲۰ : حسن جید : اعلاء السنن ۷/۱۶۴

☆فائدہ: بعض روایات میں سجدہ سہو کا سلام سے قبل ہونا بھی مذکور ہے لیکن سابقہ روایات کی روشنی میں اس سلام سے مراد ختم نماز کا سلام ہے یا دونوں جانب کا سلام مراد ہے یعنی سجدۂ سہو ختم نماز کے سلام سے قبل صرف ایک جانب سلام پھیر کر کیا جاتا ہے(اعلاء السنن:۷/۱۵۳۔۱۶۶)

(۲)سنن دار قطنی :باب لیس علی المقتدی سهو : ۱۴۲۹ – حسن مجموعی اعتبار سے : إعلاء السنن : ۷/۱۶۸

(۳)مسند بزار بحوالة مجمع الزوائد :باب السهو في الصلاة : ۲۹۱۵ –رجاله ثقات

حضرت مغیرہ بن شعبہؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے ارشاد فرمایا: جب تم میں سے کوئی نماز پڑھے اور قعدہ کی جگہ کھڑے ہوجائے تو اگر مکمل کھڑا نہیں ہوا ہے (بلکہ قعدہ کے قریب ہی ہے) تو بیٹھ جائے اور اس پر سجدۂ سہو نہیں ہے، اور اگر سیدھے کھڑے ہوگیا ہے تو اپنی نماز جاری رکھے پھر (ختم نماز پر) بیٹھ کر دو سجدے کرلے۔(۱)

قعدہ اخیرہ سے سہو:

قعدہ اخیرہ سے سہو واقع ہوگیا مثلاً نماز ظہر یا عصر میں چوتھی رکعت پر بیٹھنے کے بجائے کھڑا ہوگیا تو مسئلہ یہ ہے کہ جب تک پانچویں رکعت کا سجدہ نہ کرے، قعدہ اخیرہ کی طرف واپس لوٹ آئے اور سجدۂ سہو کرے اور اگر قعدۂ اخیرہ کئے بغیر پانچویں رکعت مکمل کرلی تو اس کی فرض نماز باطل ہوگئی، از سر نو نماز پڑھنا ہوگا۔

یحیی بن سعید کہتے ہے کہ: حضرت انسؓ نے سفر کے دوران ساتھیوں کو نماز (عصر) پڑھائی (دوسری رکعت میں) دو سجدے کرنے کے بعد، کھڑے ہونے کے قریب ہوگئے، اس پر بعض ساتھیوں نے تسبیح کہی تو حضرت انسؓ واپس قعدہ کی جانب لوٹ گئے پھر نماز مکمل کرکے دو سجدے (سہو کے) فرمائے۔(۲)

نبی ﷺ کا رشاد گرامی ہے: جب تم میں سے کسی کو اپنی نماز میں (تعداد رکعات میں) شک واقع ہوجائے تو شک کو خاطر میں نہ لائے اور یقین پر اعتماد کرے، (مثلاً تیسری یا چوتھی رکعت ہونے میں شک ہوگیا تو تیسری رکعت مانے) پھر جب یقین کے ساتھ نماز مکمل کرلے تو دو سجدے سہو کے کرے، اس صورت میں اگر واقع میں اس کی نماز مکمل ہوچکی ہو تو یہ ایک رکعت اور دو سجدہ سہو نفل کے کھاتے میں ہوں گے اور

---

(۱) طحاوی : باب سجود السهو في الصلاة : ۲۵۶۲ : صحيح : إعلاء السنن : ۷/ ۱۷۲

(۲) موطا محمد :باب السهو في الصلاة : ۱۴۳ : صحيح : إعلاء السنن : ۷/ ۱۶۹

اگر واقع میں ایک رکعت فرض نماز کی رہ گئی ہو تو یہ ایک رکعت اس کی نماز کی تکمیل کرے گی اور دو سجدے شیطان کو ذلیل کرنیوالے ہو جائیں گے۔(۱)

یہاں اس روایت میں، زائد رکعت کو (جب کہ واقع میں نماز مکمل ہو چکی ہو) نفل قرار دیا گیا ہے، معلوم ہوا کہ پانچویں رکعت مکمل ہونے کے ساتھ ہی آدمی ایک نماز سے دوسری نماز میں منتقل ہو جاتا ہے اور ظاہر ہے ایک نماز کے نقصان کی تلافی، دوسری نماز میں نہیں کی جا سکتی، پس اگر کسی نے قعدہ اخیرہ کئے بغیر پانچویں رکعت کو ملایا ہے تو چوں کہ ایک رکن فرض نماز کا اس کے ذمہ باقی رہ گیا ہے، جس کی تلافی، اس زائد رکعت میں نہیں ہو سکتی، اس لئے اس صورت میں اس کی فرض نماز سرے سے ہوئی ہی نہیں، ہاں اگر قعدۂ اخیرہ کئے ہوئے ہوتا تو اس زائد رکعت کے ملانے سے اس کی فرض نماز میں فساد پیدا نہ ہوتا؛(۲) چنانچہ حضرت ابن مسعودؓ سے مسافر کے بارے میں منقول ہے کہ اگر وہ دو رکعت پڑھنے کے بجائے (بے قعدہ کئے) چار رکعت پڑھ لے تو نماز کا اعادہ کرے۔(۳)

سجدۂ سہو کو واجب کرنے والے امور:

بھول کر کسی واجب کو ترک کرنے یا کسی واجب یا فرض کو اس کی جگہ سے ہٹا دینے پر سجدۂ سہو واجب ہوتا ہے، مثلاً قعدۂ اولی یا تشہد کو بھولے سے ترک کر دیا یا جہری نمازوں میں سراً قرأت کر دیا یا اس کے برعکس، یا شک پیدا ہو گیا کہ سجدۂ اولی کیا بھی ہے یا نہیں، جس کی بنا پر ایک سجدہ زائد کر لیا تو ان ساری صورتوں میں ختم نماز پر سجدۂ سہو کرے۔

---

(۱) ابوداؤد تحقیق الالبانی : باب إذا شک في الثنتين والثلاث من قال يُلقي الشک : ۱۰۲۶ – حسن صحيح

(۲) بدائع الصنائع: ۲/ ۲۹۹

(۳) طبراني كبير : ۹۳۴۸ : صحيح : إعلاء السنن : ۳۰۵/۷

حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے: نبی ﷺ نے ارشاد فرمایا: جس کسی کو اپنی نماز میں کوئی بھول چوک واقع ہو جائے تو وہ ان دو سجدوں کی طرح سجدۂ سہو کرے۔(۱) حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے مروی ہے کہ نبی ﷺ نے ارشاد فرمایا: جب آدمی (اپنی نماز میں) کوئی کمی بیشی کردے تو دو سجدے کرے۔(۲)

حضرت ابراہیم نخعیؒ سے منقول ہے کہ کوئی آدمی، جہری نمازوں میں سرأ قرأت کرے یا سری نمازوں میں جہری قرأت کرے تو سجدۂ سہو کرے۔(۳)

البتہ ایک آدھ آیت جہراً یا سراً پڑھنے سے سجدۂ سہو واجب نہیں ہوتا کہ اس میں حرج ہے، حضرت ابوقتادہؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ ظہر کی پہلی دو رکعتوں میں سورۃ فاتحہ اور ضم سورۃ پڑھا کرتے تھے اور اخیر کی دو رکعتوں میں صرف سورۃ فاتحہ پڑھتے اور کبھی کبھار آپ ﷺ ہمیں کوئی آیت سنا دیا کرتے تھے۔(۴)

اسی طرح اذکار و اوراد کو بآواز بلند پڑھنے سے سجدۂ سہو واجب نہیں ہوتا، نبی ﷺ نے ایک نماز میں ''سَمِعَ اللّٰهُ لِمَنْ حَمِدَهُ'' کہا تو کسی صاحب نے (مقتدیوں میں سے) بآواز بلند یہ کلمات کہے: ''رَبَّنَا وَلَکَ الْحَمْدُ حَمْدًا كَثِيْرًا طَيِّبًا مُبَارَكًا فِيْهِ'' نماز کے بعد نبی ﷺ نے ان صاحب کو نہ اعادہ کا حکم دیا نہ سجدۂ سہو کا بلکہ ان کی اس پر تعریف و توصیف فرمائی۔(۵)

---

(۱)نسائی : باب ما يفعل من نسي شيئا من صلاته : ۱۲۶۰ - سند جيد : الجوهر النقی : ۳۴۴/۲ - باب سجود السهو

(۲)مسلم : باب السهو في الصلاة : ۱۳۱۴

(۳)المدونة الكبرى: ۳۶۳/۱

(۴)مسلم : باب القراءة في الظهر : ۱۰۴۰ - ۱۰۴۱

(۵)مسلم : باب فضل اللهم ربنا لک الحمد : ۷۹۹

حضرت عمرؓ نے ایک موقع پر نماز میں ''سُبْحَانَکَ اللّٰھُمَّ وَبِحَمْدِکَ وَتَبَارَکَ اسْمُکَ وَتَعَالٰی جَدُّکَ وَلاَ اِلٰهَ غَیْرُکَ'' بلند آواز سے پڑھا، تاہم سجدۂ سہو وغیرہ نہیں کیا۔(۱)

حضرت ابراہیم نخعیؒ سے منقول ہے کہ جس آدمی کو سجدۂ اولی میں یا تشہد وغیرہ میں شک واقع ہو جائے تو وہ اس جزء کی قضا کر لے جس میں شک ہوا تھا پھر اخیر میں اس کی وجہ سے سجدۂ سہو کرے نیز فرمایا: میرے نزدیک ایک سجدۂ سہو کو ترک کرنے کے مقابلہ میں غیر لازمی جگہ سجدۂ سہو کر لینا پسندیدہ ہے۔(۲)

تعداد رکعات میں شک:

کسی کو نماز کی رکعات کی تعداد میں شک پیدا ہو جائے کہ تین پڑھی ہے یا چار، تو حکم یہ ہے کہ اگر یہ صورت، پہلی بار یا کبھی کبھار پیش آتی ہے تو نماز کو دوبارہ پڑھے اور اگر یہ صورت بار بار پیش آتی ہے تو گمان غالب پر عمل کرے، جب کہ گمان غالب قائم کر سکتا ہو اور اگر گمان غالب قائم کرنے کے موقف میں نہ ہو تو یقین پر عمل کرے، یعنی کم رکعات مانتے ہوئے نماز پوری کرے۔

اصل بات یہ ہے کہ اس مسئلہ میں تین قسم کی احادیث پائی جاتی ہیں، بعض احادیث میں ہے کہ تعداد رکعات میں شک واقع ہو جائے تو نماز کا اعادہ کرے۔(۳)

---

(۱)مصنف ابن ابی شیبه :باب فیما یفتتح به الصلاة : ۲۴۰۲ - ۲۴۰۳ - صحیح ثابت عن عمر رضی الله عنه : محمد عوامه

(۲) کتاب الآثار: امام محمد :باب السهو في الصلاة : ۱۷۰ - صحیح

(۳)طبرانی کبیر : ۲۰۵۹۰ : مجمع الزوائد : باب السهو في الصلاة : ۲۹۲۳ - حسن : باعتبار مجموعی : إعلاء السنن : ۱۷۶/۷

اور بعض احادیث میں ہے کہ اس صورت میں درست اندازہ قائم کر کے نماز پوری کرے (۱)
اور بعض احادیث میں ہے کہ اس صورت میں یقین پر عمل کرے۔ (۲)

فقہاء احناف کا طرز اجتہاد چوں کہ شروع ہی سے مجموعی احادیث پر عمل کرنے کا ہے اس لئے انہوں نے پہلی قسم کی احادیث کو پہلی صورت پر دوسری قسم کی احادیث کو دوسری صورت اور تیسری قسم کی احادیث کو تیسری صورت پر محمول کیا ہے۔

---

(۱) مسلم : باب السهو في الصلاة : ۱۳۰۰ – ۱۳۰۲ ، ترمذی : باب الرجل يصلي فيشك : ۳۹۸ – حسن صحيح : امام ترمذی

(۲) حوالہ سابق

بیمار کی نماز کا بیان

جو شخص بیماری کی وجہ سے کھڑے ہونے پر قادر نہیں، نہ خود سے، نہ کسی سہارے سے، تو وہ بیٹھ کر رکوع سجدہ کرے، رکوع کے لئے کم اشارہ کرے اور سجدہ کے لئے اس کے مقابلہ میں زیادہ، اس پر بھی قادر نہیں تو چت لیٹ کر (اس طور پر کہ سر کے نیچے تکیہ ہو اور چہرہ اور پیر قبلہ رخ ہوں) یا سیدھی کروٹ پر (اس طریقے سے کہ چہرہ قبلہ کی جانب ہو) نماز پڑھے، اس پر بھی قادر نہیں، تو نماز اس سے ملتوی ہو جائے گی، پھر اگر یہ بے بسی ایک دن رات سے کم تک رہی تو طاقت حاصل ہونے پر اس حالت کی نمازوں کی قضا ضروری ہے ہاں اگر اس بے بسی کی حالت میں موت ہوگئی اور طاقت بالکل نصیب نہیں ہوئی تو یہ نمازیں اس کے ذمہ لازم نہیں، ان کے فدیہ کی وصیت کرنا بھی اس پر ضروری نہیں ہے، اور اگر اشارہ سے بے بسی کی حالت، ایک دن رات سے زیادہ تک رہی خواہ ہوش حواس برقرار ہوں تو اس حالت کی نماز اس سے ساقط و معاف ہیں، قدرت حاصل ہونے پر بھی ان کی قضا اس کے ذمہ ضروری نہیں۔ (۱)

حضرت عمران بن حصینؓ سے روایت ہے: مجھے بواسیر کی بیماری تھی، تو میں نے رسول اللہ ﷺ سے نماز کے بارے میں دریافت کیا؟ اس پر آنحضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا: کھڑے ہو کر نماز پڑھا کرو اگر اس کی استطاعت نہ ہو تو بیٹھ کر نماز پڑھو اور اگر اس پر بھی قدرت نہ ہو تو کروٹ لیٹ کر نماز پڑھو۔ (۲)

حضرت ابن عمرؓ نے (بیٹھنے سے معذور آدمی کی نماز کا عمومی طریقہ یہ) بیان فرمایا کہ بیمار آدمی چت لیٹ کر نماز پڑھے اور اس کے دونوں قدم قبلہ کی جانب ہوں۔ (۳)

(۱) شامی : ۱/ ۵۶۲

(۲) بخاری شریف : ۱۱۱۷ باب اذا لم یطق قاعداً صلی علی جنب

(۳) سنن دار قطنی : باب صلاۃ المریض : ۱۷۲۶۔ رجالہ ثقات : اعلاء السنن: ۷/ ۲۹۶

حضرت جابر بن عبد اللہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: بیمار آدمی بھی کھڑے ہوکر نماز پڑھے لیکن اگر اسے دشواری ہوتو بیٹھ کر نماز پڑھے اور اگر اس میں بھی دشواری ہوتو سر کے اشارہ کے ذریعہ نماز پڑھے پھر اگر اس پر بھی قدرت نہ ہوتو تسبیح پڑھ لے (نماز اس سے ملتوی ہوگئی) (۱)

حضرت ام قیس بنت محصنؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ جب سن رسیدہ اور بھاری بھرکم ہوگئے تو اپنی نماز گاہ میں ایک ستون بنالیا جس پر آپ ﷺ ٹیک لگایا کرتے تھے (۲) معلوم ہوا کہ سہارے کے ذریعہ کھڑے ہوسکنا بھی قیام پر قدرت کے حکم میں ہے۔ (۳)

حضرت جابر بن عبد اللہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک مریض کی عیادت فرمائی، میں بھی ہمراہ تھا، آنحضرت ﷺ نے اسے دیکھا کہ وہ نماز پڑھ رہا ہے اور تکیہ (اونچا کر کے اس) پر سجدہ کر رہا ہے تو آپ ﷺ نے اسے منع فرمایا اور ارشاد فرمایا کہ اگر تم زمین پر سجدہ کر سکتے ہوتو کرو ورنہ تو اشارہ سے نماز پڑھو اور سجدہ کے اشارہ کو رکوع کے اشارہ سے پست رکھو (۴)

فائدہ: بے ہوشی ایک دن رات یا اس سے کم تک رہی تو اس دوران فوت ہوئی نمازوں کی قضا کرنا ضروری ہے، اور اگر ایک دن رات سے زیادہ بے ہوشی طاری رہی تو قضا نہیں ہے، نماز معاف ہوگئی۔

حضرت عبد اللہ بن عمرؓ نے ایک دن ایک رات بے ہوش آدمی کے بارے میں فرمایا کہ وہ فوت شدہ نمازوں کی قضا کرے گا (۵) اور اگر ایک دن رات سے زیادہ بے ہوشیطاری رہی تو قضا نہیں کرے گا۔ (۶)

---

(۱) طبرانی اوسط: ۳۹۹۷. حسن : اعلاء السنن : ۱۹۸/۷

(۲) ابو داؤد تحقیق الالبانی باب الرجل یعتمد فی الصلوۃ علی عصا: ۹۴۹ صحیح

(۳) (بذل المجهود : ۱۰۹/۲)

(۴) مسند ابو یعلی : ۱۸۱۱. کشف الاستار عن زوائد البزار : ۲۲۴/۱ صحیح: مجمع الزوائد : باب صلاة المریض : ۲۸۹۴

(۵) کتاب الاثار امام محمد باب صلاة المغمی علیه : ۱۶۹ صحیح : اعلاء السنن : ۲۱۹/۷

(۶) کتاب الاثار لابی یوسف : ۲۸۲. وسنده کسند الحدیث السابق

حضرت ابراہیم نخعیؒ سے اس بیمار کے بارے میں مسئلہ دریافت کیا گیا جس پر بے ہوشی طاری ہوگئی ہو جس کی بنا پر وہ نماز چھوڑ دیتا ہے؟ حضرت نے جواب دیا: اگر یہ ایک دن کی بات ہے تو میں یہ پسند کرتا ہوں کہ وہ اس دوران فوت ہوئی نمازوں کی قضا کر لے اور اگر ایک دن سے زیادہ کا معاملہ ہو تو وہ انشاء اللہ معذور سمجھا جائے گا۔(۱)

کشتی میں نماز:

ٹھہری ہوئی کشتی میں متفقہ طور پر بے عذر بیٹھ کر نماز پڑھنا جائز نہیں، بلکہ کھڑے ہو کر پڑھنا ضروری ہے، حضرت عبداللہ بن ابی عتبہؒ کہتے ہیں کہ میں حضرت جابر بن عبداللہؓ، حضرت ابوسعید الخدریؓ اور حضرت ابو ہریرہؓ کے ساتھ ایک (ٹھہری ہوئی) کشتی میں تھا، ان حضرات نے کھڑے ہو کر باجماعت نماز ادا کی، حالاں کہ وہ ساحل پر اتر سکتے تھے۔(۲)

چلتی ہوئی کشتی ہو تب بھی احتیاط اسی میں ہے کہ بے عذر بیٹھ کر نماز نہ پڑھے، ہاں اگر عذر ہو تو کوئی مضائقہ نہیں۔

حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے روایت ہے کہ کسی نے نبی ﷺ سے پوچھا کہ میں کشتی میں کیسے نماز پڑھوں؟ ارشاد فرمایا! کھڑے ہو کر نماز پڑھو الا یہ کہ تم کو غرق ہونے کا اندیشہ ہو(۳)

حضرت سعید بن المسیبؒ و ابراہیم نخعیؒ فرماتے ہیں کہ: آدمی کشتی میں کھڑے ہو کر نماز پڑھے لیکن اگر اس کی قدرت نہ ہو تو بیٹھ کر جدھر کشتی گھومے ادھر ہی قبلہ کی طرف متوجہ ہوتا جائے۔(۴)

---

(۱) کتاب الآثار باب صلوۃ المغمی علیه : ۱۶۸ صحیح : اعلاء السنن : ۲۲۲/۷

(۲) مصنف ابن ابی شیبه من قال صلی فی السفینة قائماً: ۶۶۲۶. صحیح :عمدة القاری : باب الصلوة علی الحصیر : ۱۰۹/۴

(۳) مستدرک حاکم مع تعلیقات الذهبی : باب التامین : ۱۰۱۹ صحیح علامه حاکمؒ و ذهبیؒ

(۴) مصنف ابن ابی شیبه : من قال صلی فی السفینة قائماً : ۶۶۳۰، ۶۶۳۳ سکت علیه المحقق . محمد عوامه

سجدۂ تلاوت کا بیان

قرآن کریم میں چودہ ایتیں ہیں جن کے پڑھنے یا سننے سے سجدہ کرنا واجب ہوتا ہے، ان کو سجدۂ تلاوت کہتے ہیں۔

حضرت ابوالدرداء کہتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کے ساتھ گیارہ سجدہ تلاوت کئے ہیں جو درج ذیل سورتوں میں ہیں (۱) اعراف (۲) رعد (۳) نحل (۴) بنی اسرائیل (۵) مریم (۶) حج (۷) فرقان (۸) نمل (۹) الم سجدہ (۱۰) ص (۱۱) حم سجدہ (۱) (۱۲) سورہ نجم (۲) (۱۳) سورہ انشقاق (۱۴) سورہ علق۔ (۳)

حضرت ابن عمرؓ سے مروی ہے کہ ہم رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر رہتے اور رسول اللہ ﷺ ایت سجدہ کی تلاوت فرماتے تو آپ ﷺ بھی سجدہ فرماتے اور ہم تمام بھی ساتھ میں سجدہ کرتے جس کی وجہ سے اس قدر بھیڑ اور ازدحام ہوجاتا کہ سجدہ کے لئے پیشانی رکھنے کی جگہ بھی نہ ملتی تھی۔ (۴) سجدہ تلاوت کی خاطر، اس قدر اہتمام وتاکید، اس کے واجب ہونے پر دلالت کرتی ہے۔

حضرت ابن عمرؓ کا ارشاد ہے (آیت سجدہ) جو سنے اس پر سجدہ تلاوت ہے (۵) حضرت سعید بن جبیرؒ، حضرت ابراہیم نخعیؒ، اور حضرت نافعؒ فرماتے ہیں کہ جو شخص ایت سجدہ سنے تو اس پر سجدہ کرنا (لازم) ہے۔ (۶)

---

(۱) ابن ماجة : باب عدد سجود القرآن: ۱۰۵۶ . الحديث وان كا سنده ضعيفاً ولكنه تايد باجماع اهل المدينة عليه . اعلاء السنن :۷/۲۴۵.

(۲) بخاری : باب سجدة النجم : ۱۰۷۰

(۳) ابن ماجه تحقيق الالباني : باب عدد سجود القرآن : ۱۰۵۸ : صحيح

(۴) مسلم باب سجود التلاوة : ۱۳۲۴

(۵) مصنف ابن ابی شيبه : من قال السجدة على من جلس لها ومن سمعها : ۴۲۵۲. حسن او صحيح : اعلاء السنن : ۷/ ۲۲۷۔

(۶) مصنف ابن ابی شيبه : من قال السجدة على من جلس لها ومن سمعها : ۴۲۴۹. حسن : اعلاء السنن : ۷/ ۲۲۷

سجدہ تلاوت کا طریقہ:

سجدہ تلاوت کا طریقہ یہ ہے کہ ہاتھ اٹھائے بغیر اللہ اکبر کہہ کر سجدہ میں چلا جائے پھر تکبیر کہہ کر سر اٹھائے، نہ تشہد پڑھے نہ سلام پھیرے، سجدہ تلاوت کی ادائیگی کے لئے وضو بھی ضروری ہے۔

رسول اللہ ﷺ جب ایت سجدہ پڑھتے تو اللہ اکبر کہتے پھر سجدہ کرتے (۱) سعید بن جبیرؒ کے بارے میں منقول ہے کہ وہ سجدہ تلاوت کرتے پھر اپنے سر کو اٹھاتے مگر سلام نہیں پھیرتے۔(۲) حضرت ابن عمرؓ فرماتے ہیں کہ آدمی پاکی کی حالت ہی میں سجدہ کرے۔(۳)

فائدہ: کسی نے ایک ہی ایت سجدہ کو ایک ہی مجلس میں بار بار پڑھی تو اس کے لئے ایک ہی سجدہ کر لینا کافی ہے، حضرت ابو عبد الرحمٰنؒ کے بارے میں منقول ہے کہ وہ ایت سجدہ پڑھتے پھر ایک دفعہ سجدہ کرتے پھر اسی مجلس میں بار بار اسے پڑھتے لیکن دوبارہ سجدہ نہ کرتے حضرت مجاہدؒ وابراہیم نخعیؒ سے بھی یہی منقول ہے۔(۴)

---

(۱)ابو داؤد : باب فی الرجل یسمع السجدة : ۱۴۱۵ . وسکت عنه.

(۲) مصنف ابن ابی شیبه من کان لا یسلم فی السجدة :۴۲۰۷. سکت علیه المحقق محمد عوامه

(۳)السنن الکبری للبیهقی : باب لا یسجد الا طاهراً : ۳۹۴۰. صحیح : فتح الباری : ابواب سجود القرآن : ۵۵۴/۲

(۴) مصنف ابن ابی شیبه الرجل یقرأ السجدة ثم یعید قرأتها کیف یصنع :۴۲۲۳، ۴۲۲۴، ۴۲۲۵. سکت علیها المحقق محمد عوامه

مسافر کی نماز کا بیان

سفر، ایک ایسی حالت کا نام ہے جس میں انسان کو استقرار وسکون حاصل نہیں رہتا، مشقت وتکلیف اس کا جزءِ لازم ہے، (۱) آدمی کے سارے معمولات، کھانے، پینے، اورسونے جاگنے کا سارا نظام درہم برہم ہوجاتا ہے، (۲) یکسوئی اور جمعیت خاطر متاثر ہوجاتی ہے، سفر کی انہی تمام مشکلات کو پیش نظر رکھتے ہوئے شریعت نے نماز کے باب میں بھی مسافر کو سہولت وتخفیف دے رکھی ہے، چار رکعت والی فرض نماز، اس کے حق میں دو کردی گئیں، سنن ونوافل کا معاملہ، اس کی رائے وصوابدید پر چھوڑ دیا گیا، سفر شرعی سے واپسی تک مسافر کو یہ مراعات حاصل رہتی ہیں۔

مسافت سفر:

صبح سے دوپہر تک کے وقت میں، آدمی اوسط رفتار سے چل کر تین دن میں جتنی مسافت طے کرسکتا ہے اتنی مسافت، مسافت سفر کہلاتی ہے، عموماً ایک دن میں اوسط چال سے آدمی، صبح سے دوپہر تک میں سولہ (۱۶) میل چل سکتا ہے، اس اعتبار سے تین دن میں اڑتالیس (۴۸) میل ہوتے ہیں، یہی مسافت سفر ہے۔

حضرت عبد اللہ بن عمرؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے ارشاد فرمایا، خدا اور یوم آخرت، پر ایمان رکھنے والی عورت کے لئے یہ حلال نہیں کہ وہ تین دن یا اس سے زیادہ کا سفر اپنے باپ یا بیٹے یا شوہر یا بھائی یا اپنے محرم کے بغیر کرے۔ (۳) اس حدیث میں جس مسافت کو سفر کی مسافت قرار دیا گیا ہے، وہ تین دن کی مسافت ہے۔

---

(۱)دارقطنی باب ما یقرأ فی رکعات الوتر : ۱۷۰۲. اسناده صحیح : شعیب الارنووط فی تعلیقاته علی مسند احمد :۲۲۳۱۳

(۲)مسلم باب السفر قطعة من العذاب : ۵۰۷۰

(۳)بخاری : باب فی کم یقصر الصلاة : ۱۰۸۷. مسلم : باب سفر المرأة مع محرم : ۳۳۴۲

نبی ﷺ نے مسافر کے لئے تین دن اور تین رات اور مقیم کے لئے ایک دن ایک رات موزوں پر مسح کرنے کی مدت مقرر فرمائی ہے(۱) معلوم ہوا کہ تین دن تین رات، موزوں پر مسح کی رخصت اس مسافر کے لئے ہے جو تین دن ورات کی مسافت کم از کم قطع کرے۔

حضرت عبداللہ بن عمرؓ وعبداللہ بن عباسؓ کے بارے میں منقول ہے کہ وہ چار برید کے سفر میں، جو سولہ فرسخ کے برابر ہوتے ہیں، نماز قصر کرتے تھے اور روزے افطار کرتے تھے۔(۲)

ایک فرسخ تین میل کا ہوتا ہے اس اعتبار سے سولہ فرسخ اڑتالیس میل ہوتے ہیں، جن کا حساب موجودہ کیلومیٹر سے 1/2 77 یا بعض اہل علم کے مطابق ۸۶ء۸۷ کیلومیٹر ہوتے ہیں پس جس کا ارادہ اتنی مسافت طئے کرنے کا ہو وہ شرعاً مسافر ہو جاتا ہے۔

مسافر کی فرض نماز، چار کے بجائے دو رکعت:

کئی احادیث سے ثابت ہے کہ آپ ﷺ نے اور صحابہؓ نے چار رکعت والی نماز دو رکعت ہی پڑھی ہے، اس لئے سفر کی نماز دو رکعت ہی ہے، اس سے زیادہ پڑھنا جائز نہیں ہے، فجر ومغرب کی نماز میں کوئی کمی نہیں ہے۔(۳)

حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ اللہ تعالی نے تمہارے نبی ﷺ کی زبانی، مسافر پر دو رکعت اور مقیم پر چار رکعتیں فرض فرمائی ہیں۔(۴) اس حدیث سے معلوم ہوا کہ سفر میں فرض نماز دو رکعت ہی ہے، اس لئے اس سے زیادہ پڑھنا جائز نہیں، حضرت انسؓ سے مروی ہے کہ ہم رسول اللہ ﷺ کے ہمراہ، مدینہ سے مکہ روانہ ہوئے، واپس ہونے تک نبی ﷺ نے دو دو رکعت نماز پڑھی، سائل نے دریافت کیا کہ تم مکہ میں کتنی مدت ٹھہرے؟ حضرت انسؓ نے فرمایا دس دن۔(۵)

---

(۱) مسلم باب التوقيت في المسح على الخفين: ۲۷۱

(۲) بخاری: تعليقا باب في كم يقصر الصلاة: ۱۰۸۶

(۳) مسند احمد تحقيق الارنووط: ۲۶۲۸۲. رجاله ثقات مجمع الزوائد باب صلاة المسافر: ۲۹۳۳

(۴) مسلم باب صلاة المسافرين: ۷۰۵

(۵) بخاری باب ماجاء في التقصير: ۱۰۸۱

حضرت ابن عمرؓ فرماتے ہیں: میں رسول اللہ ﷺ کی صحبت میں رہا تو آپ ﷺ سفر میں دو رکعت سے زیادہ نہیں پڑھتے تھے، اسی طرح حضرت ابوبکرؓ و عمرؓ و عثمانؓ بھی کیا کرتے تھے (۱) حضرت ابن عمرؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا سفر کی نماز دو رکعت ہے جو اس طریقہ کی مخالفت کرے تو اس نے کفر کیا (۲) کسی نے بجائے دو کے چار رکعت پڑھی اور دوسری رکعت پر قعدہ بھی نہیں کیا تو اس کی نماز نہیں ہوئی۔ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ فرماتے ہیں: جس نے سفر میں چار رکعت نماز پڑھی تو وہ نماز کو دوبارہ پڑھے (۳)

سفر میں سنن ونوافل:

سفر کی حالت میں، سنن مؤکدہ کی تاکید میں کمی واقع ہوجاتی ہے گویا وہ سنن غیر مؤکدہ کے درجہ میں ہوجاتے ہیں البتہ نماز فجر سے قبل کی دو سنتیں یہ بدستور سنت مؤکدہ برقرار رہتی ہیں کیوں کہ فجر سے قبل کی سنتوں کی بے حد تاکید ارشاد نبوی ﷺ میں وارد ہوئی ہے، جہاں تک نوافل کی بات ہے تو یہ مکمل طور پر انسان کے اپنے ذوق وشوق پر منحصر ہے، ویسے نبی ﷺ سے بحالت سفر، ظہر کے بعد کی دو سنتیں، مغرب وعشاء کے بعد دو سنتیں پڑھنا ثابت ہے (۴) ایسے ہی رات کی نمازیں پڑھنا بھی ثابت ہے، حضرت عامر بن ربیعہؓ سے مروی ہے کہ انہوں نے نبی ﷺ کو دوران سفر رات کے اوقات میں سواری کی پشت پر نفل پڑھتے دیکھا ہے۔ (۵)

---

(۱) بخاری باب من لم یتطوع فی السفر: ۱۱۰۲

(۲) السنن الکبری للبیھقی: باب کراھیة ترک التقصیر: ۵۶۲۴۔ مصنف عبد الرزاق باب الصلوۃ فی السفر: ۴۲۸۱۔ اسنادہ صحیح: المطالب العالیة: باب قصر الصلوۃ فی السفر: ۷۳۶

(۳) طبرانی کبیر: ۹۳۴۸۔ صحیح: اعلاء السنن: ۳۰۵/۷

(۴) ترمذی باب التطوع فی السفر: ۵۵۲ حسن۔ امام ترمذی۔ طحاوی باب صلاۃ المسافر: ۲۴۱۰ حسن۔ اعلاء السنن: ۳۳۰/۷

(۵) مسلم باب جواز النافلة علی الدابة فی السفر: ۱۶۵۳

قصر کا آغاز کب سے کب تک؟

مسافر جب حدود شہر اور آبادی سے باہر نکل جائے تو قصر کا آغاز کر سکتا ہے اس سے پہلے نہیں، حضرت انس بن مالکؓ سے روایت ہے کہ میں نے ظہر کی نماز آنحضرت ﷺ کے ساتھ مدینہ میں چار رکعت پڑھی اور عصر کی نماز ذوالحلیفہ میں دو رکعت پڑھی (۱) معلوم ہوا کہ جب تک آدمی اپنے شہر میں رہے، پوری نماز پڑھتا رہے، جب شہر سے باہر نکل جائے تب قصر کرے۔

حضرت ابو ہریرہؓ سے راویت ہے کہ میں نے رسول اللہ ﷺ اور حضرت ابو بکرؓ و عمرؓ کے ہمراہ سفر کیا ہے، یہ سارے حضرات مدینہ سے نکلنے کے بعد مدینہ واپسی تک، راستے میں اور مکہ کے قیام میں دو دو رکعت پڑھتے تھے۔ (۲)

حضرت علیؓ کے بارے میں منقول ہے کہ وہ ایک دفعہ بصرہ سے باہر نکلے تو ظہر کی چار رکعات ادا کی پھر فرمایا: جب ہم اس جھونپڑے سے آگے بڑھ جائیں تو دو رکعت پڑھیں گے (۳)

مسافر کب مقیم کے حکم میں ہو جاتا ہے؟

مسافر کسی ایک شہر میں پندرہ دن تک ٹھہرنے کی نیت کرے گا تو وہ اس کا وطن اقامت ہو جائے گا اور ایسا آدمی مکمل نماز پڑھے گا، قصر جائز نہیں، ہاں کسی شہر میں پندرہ دن سے کم ٹھہرنے کی نیت ہے تو قصر ہی کرتا رہے گا۔

حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ فتح مکہ کے موقع پر مکہ میں پندرہ روز ٹھہرنے اور نماز کو قصر کرتے رہے۔ (۴) حضرت ابن عمرؓ کے بارے میں منقول ہے کہ جب وہ پندرہ دن ٹھہرنے کا عزم مصمم کر لیتے تو چار رکعت پڑھتے۔ (۵)

---

(۱) بخاری باب یقصر اذا خرج من موضعه : ۱۰۸۹

(۲) مسند ابویعلی : ۵۸۶۲ صحیح مجمع الزوائد باب صلوة السفر : ۲۹۴۶

(۳) مصنف ابن ابی شیبه من کان یقصر الصلاة : ۸۲۵۳ . رواته ثقات . اثار السنن : ۶۴/۲

(۴) ابو داؤد باب متی یتمم المسافر : ۱۲۳۳ رواتها ثقات : فتح الباری ابواب التقصیر : ۵۶۲/۲

(۵) مصنف ابن ابی شیبه : من قال اذا اجمع علی اقامة خمس عشرة اتم : ۸۳۰۲ صحیح . اثار السنن : ۶۶/۲

حضرت عبداللہ بن عمرؓ ہی کا ارشاد ہے کہ جب تم مسافر ہو اور کسی جگہ پندرہ دن ٹھہرنے کا پختہ ارادہ کر چکے ہو تو اب مکمل نماز پڑھو اور اگر تم (اپنے ٹھہرنے کے بارے میں) کچھ نہ جانتے ہو تو قصر کرتے رہو۔(۱)

اس سے معلوم ہوا کہ اگر کسی جگہ پندرہ دن تک ٹھہرنے کا پختہ ارادہ کرے تو آدمی مقیم ہو جاتا ہے اور اگر اس سے کم مدت ٹھہرنے کا ارادہ ہے یا کتنا زمانہ ٹھہرنا ہے، غیر یقینی ہے تو ان دونوں صورتوں میں قصر ہی کرنا ہوگا۔ حضرت جابر بن عبداللہؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ تبوک میں بیس دن ٹھہرے رہے اور نمازوں کا قصر کرتے رہے۔ (۲) وجہ ظاہر ہے کہ جنگ کی حالت میں رکنے اور واپس ہونے کی مدت قطعی نہیں ہوتی، لہذا ایسی غیر یقینی صورتحال میں قصر کرنے ہی کا حکم ہے۔

مسافر کی نماز، مقیم کی اقتداء میں یا اس کے برعکس:

مسافر، کسی نماز کے وقت میں مقیم کی اقتداء کرے تو وہ بھی مقیم کی طرح مکمل نماز پڑھے گا اور اگر وہ امام بنے تو دو رکعت ہی پڑھائے گا، مقتدیوں میں جو مقیم ہوں وہ باقی دو رکعت، امام کے سلام پھیرنے کے بعد ادا کرلیں گے۔

حضرت عبداللہ بن عمرؓ کے بارے میں منقول ہے کہ وہ منیٰ میں جب امام کے پیچھے نماز پڑھتے تو چار رکعت پڑھتے اور جب تنہا پڑھتے تو دو رکعت پڑھتے (۳) فتح مکہ کے موقع پر نبی ﷺ دو دو رکعت پڑھایا کرتے تھے اور (نماز کے بعد) فرماتے تھے، اے شہر کے لوگو! تم لوگ چار رکعت پڑھو کیوں کہ ہم مسافر لوگ ہیں۔ (۴) بہتر یہ ہے کہ امام نماز کے شروع اور ختم دونوں موقع پر اپنے مسافر ہونے کا اعلان کردے۔(۵)

(۱) کتاب الاثار امام محمد باب الصلوة فی السفر: ۱۸۷. حسن :اثار السنن : ۶۶/۲
(۲)ابو داؤد تحقیق الالبانی : باب اذا اقام بارض العدویقصر:۱۲۳۷. صحیح
(۳)موطا مالک باب صلاةالمسافر اذا كان اماماً او كان وراء امام: ۳۵۱
(۴)مسنداحمد : ۹۸۷۸ ا تحقیق شعیب الارنووط : اسناده ضعیف ولبعضه شواهد
(۵)مراقی الفلاح :۲۴۸

فائدہ (۱) اگر کسی انسان نے اپنی اصل جائے سکونت کو خیر باد کہہ کر کسی اور جگہ کو اپنا مستقل وطن بنالیا ہے تو اس کا سابقہ وطن باطل ہو جائے گا اور موجودہ وطن ہی اس کا اصل وطن کہلائے گا، لہذا اگر کسی ضرورت سے وہ اپنے سابقہ وطن جائے اور پندرہ دن ٹھہرنے کی نیت نہ تو وہاں مسافر کے حکم میں رہے گا اور قصر کرتا رہے گا۔

رسول اللہ ﷺ نے مکہ مکرمہ کو خیر باد کہہ کر مدینہ منورہ کو اپنا مسکن بنالیا تھا پھر فتح مکہ کے موقع سے جب مدینہ سے مکہ تشریف لائے تو اپنے کو مسافر شمار فرمایا اور قصر فرماتے رہے۔(۱)

فائدہ (۲) کسی انسان کی الگ الگ شہروں میں مستقل رہائش گاہیں ہوں، جہاں وہ اور اس کے اہل وعیال رہتے ہوں تو یہ دو یا زائد شہر اس کے وطن اصلی کہلائیں گے، ان شہروں میں اس کے لئے قصر کی اجازت نہیں ہوگی۔

حضرت عثمان بن عفانؓ کے بارے میں منقول ہے کہ انہوں نے منی میں چار رکعت پڑھی تو لوگوں نے ان پر نکیر کی، اس پر حضرت عثمانؓ نے فرمایا: اے لوگوں میں جب سے آیا ہوں، یہاں اپنے اہل وعیال کر لئے ہیں، اور میں نے رسول اللہ ﷺ سے سنا ہے کہ جو شخص کسی شہر میں شادی کرے (اہل وعیال کرے) تو وہ مقیم کی نماز پڑھے۔(۲)

فائدہ (۳) مسافر کو ایک ہی وقت میں دو نمازوں کو جمع کر کے پڑھنا جائز نہیں، البتہ ایسا کرسکتا ہے کہ ظہر کی نماز کو اخیر وقت میں اور عصر کی نماز کو اول وقت میں پڑھ لے، اسی طرح مغرب کی نماز کو موخر کر کے اخیر وقت میں پڑھے اور عشاء کی نماز اول وقت میں، اس طرح کرنا خود نبی ﷺ سے ثابت ہے، اس طریقہ کے مطابق دو نمازوں کو جمع کرنا، کہنے کو تو دو نمازوں کو جمع کرنا ہے، لیکن حقیقت میں ہر نماز کو اپنے اپنے وقت میں پڑھنا ہے۔

---

(۱) مسند احمد: ۱۹۸۷۸

(۲) مسند احمد: ۴۴۳، حسن: اعلاء السنن: ۳۲۸/۷

ارشاد ربانی ہے: نماز مسلمانوں کے ذمہ ایسا فریضہ ہے جو وقت کا پابند ہے۔(۱)

حضرت عبداللہ بن مسعود سے مروی ہے کہ نبی ﷺ مزدلفہ کی نمازوں کے علاوہ ہر نماز اپنے وقت پر ہی پڑھا کرتے تھے۔(۲)

حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ کو جب سفر کی جلدی ہوتی تو ظہر کو عصر کے اول وقت تک موخر کرتے پھر دونوں کو جمع کرتے اور مغرب کو موخر کرتے پھر شفق غائب ہونے کے قریب مغرب وعشاء کو جمع کرتے۔ (۳)

حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ سفر کے دوارن نماز ظہر کو موخر کرتے اور عصر کو اول وقت میں پڑھ لیتے اور مغرب کو موخر کرتے اور عشاء کو اول وقت میں پڑھ لیتے۔(۴)

حضرت عبداللہ بن عمرؓ۔ حضرت علیؓ۔ حضرت سعد بن مالکؓ۔ حضرت انسؓ وغیرہ صحابہؓ سے بھی سفر میں اسی طریقہ پر دو نمازوں کو جمع کرنا منقول ہے۔(۵)

---

(۱)سورۃ نساء : ۱۰۳

(۲)نسائی : تحقیق الالبانی : الوقت الذی یصلی فیه الصبح بمزدلفة : ۳۰۳۸.صحیح

(۳)مسلم باب جواز الجمع بین الصلاتین فی السفر : ۱۲۶۱

(۴)طحاوی باب الجمع بین الصلاتین کیف هو : ۹۸۵.اسناده حسن : اثار السنن : ۲/۷۳

(۵)آثار السنن : ۲/ ۷۲. ۷۵

نماز جمعہ کا بیان

جمعہ کے دن کو باقی ایام پر نمایاں فضیلت حاصل ہے، نبی ﷺ نے اسے بہتر ترین دن قرار دیا ہے، اسی میں ابوالبشر حضرت سیدنا آدم علی نبینا وعلیہ والسلام کی تخلیق ہوئی ہے(۱) دنوں کا یہ سردار ہے، بارگاہ الٰہی میں اس کی بزرگی، عیدالفطر وعیدالاضحیٰ کے دن سے بھی زیادہ ہے(۲) اس دن کی دعائیں مقبول ہوتی ہیں، خصوصاً عصر بعد کی(۳) اس دن کے خاص اعمال مثلاً تلاوت سورۃ کہف(۴) درود وسلام کی کثرت(۵) صفائی وستھرائی کا اہتمام، خوشبو وتیل کا استعمال(٦) احادیث میں بیان ہوئے ہیں، رسالتمآب ﷺ، جمعہ کے دن کا خاص اہتمام فرمایا کرتے تھے، جو آدمی پورے آداب وشرائط کے ساتھ نماز جمعہ ادا کرتا ہے، اس کے ایک ہفتہ کے گناہ بخش دیئے جاتے ہیں(۷) بلکہ ایک روایت کے مطابق: مزید تین دن کے گناہوں کی معافی ہوجاتی ہے۔(۹) اس کے برخلاف جو لوگ بے عذر نماز جمعہ چھوڑ دیتے ہیں، ان کے لئے سخت وعیدیں وارد ہوئی ہیں، نبی ﷺ نے ارشاد فرمایا: لوگ نماز جمعہ کو ترک کرنے سے باز آجائیں، ورنہ تو اللہ تعالیٰ ان کے دلوں پر مہر لگادے گا پھر وہ غافلوں میں سے ہوجائیں گے(۱۰) نیز ارشاد ہے: جو شخص محض سستی کی بنا پر تین جمعے چھوڑ دے، اللہ تعالیٰ اس کے دل پر مہر لگادیتے ہیں۔(۱۱)

(۱)مسلم باب فضل یوم الجمعة : ۲۰۱۳

(۲)مسند احمد تحقیق شعیب الارنووط : ۱۵۵۸۷ ،ایک راوی مختلف فیہ ہیں جس کی بناء پر سند ضعیف ہے

(۳) مسند احمد تحقیق الارنووط : ۷۶۷۴صحیح . بشواهده

(۴)مستدرک حاکم مع تعلیقات الذهبی : تفسیر سورة الکهف: ۳۳۹۲. صحیح

(۵)مسند احمد تحقیق الارنووط : : ۱۶۲۰۷ . صحیح

(٦)بخاری باب لایفرق بین اثنین یوم الجمعة ۹۱۰

(۷)بخاری باب لایفرق بین اثنین یوم الجمعة ۹۱۰

(۹)مسلم : باب فضل من استمع وانصت فی الخطبة :۲۰۲۴

(۱۰)مسلم : باب التغلیظ فی ترک الجمعة :۲۰۳۹

(۱۱)ابوداؤد : تحقیق الالبانی : باب التشدید فی ترک الجمعة :۱۰۵۴. حسن صحیح

نماز جمعہ کی رکعات اور اس میں قرأت مسنونہ:

حضرت عمرؓ فرماتے ہیں نماز جمعہ کی دو رکعتیں ہیں۔(۱)

نبی ﷺ نماز جمعہ میں سورۃ جمعہ اور سورۃ منافقون پڑھا کرتے تھے(۲) اسی طرح: سورۃ اعلیٰ اور سورۃ غاشیہ بھی پڑھا کرتے تھے(۳)

کن لوگوں پر جمعہ واجب ہے:

حضرت طارق بن شہاب سے مروی ہے کہ نبی ﷺ نے ارشاد فرمایا جمعہ کی نماز باجماعت پڑھنا ہر مسلمان پر واجب ہے، سوائے چار لوگوں کے (۱) غلام (۲) عورت (۳) بچہ (۴) بیمار۔(۴)

بعض روایات میں، مسافر اور اہل دیہات کا استثناء بھی وارد ہوا ہے۔(۵)

تاہم اگر یہ حضرات نماز جمعہ پڑھ لیتے ہیں تو ان کی نماز جمعہ معتبر ہو جاتی ہے اور ظہر پڑھنے کی ضرورت نہیں رہتی (۶)

فائدہ (۱) وہ لوگ جن پر جمعہ واجب نہیں یا جن کی نماز جمعہ فوت ہو گئی ہو، وہ جمعہ کے روز نماز ظہر بے جماعت کے پڑھ لیں، جماعت نہ بنائیں۔

---

(۱) نسائی تحقیق الالبانی : عدد صلاة الجمعة: ۱۴۲۰ . صحیح .

(۲) نسائی تحقیق الالبانی : القرأة فی صلاة الجمعة . ۱۴۲۱ . صحیح .

(۳) نسائی تحقیق الالبانی : . القرأة فی صلاة الجمعة . ۱۴۲۲ . صحیح

(۴) ابوداؤد : تحقیق الالبانی باب الجمعة للملوک والمرأة : ۱۰۶۹ . صحیح

(۵) طبرانی اوسط : ۲۰۲ . ایک راوی کو امام بیهقی نے ضعیف قرار دیا ہے . مجمع الزوائد : باب فرض الجمعة : ۳۰۳۳

(۶) طبرانی کبیر : ۱۰۲۹۶ . صحیح . اعلاء السنن : ۸/۷۸

حضرت علیؓ سے مروی ہے کہ جمعہ کے روز سوائے امام کے ساتھ جماعت کرنے کے کوئی اور جماعت نہیں ہے۔(۱) حضرت علیؓ ہی سے مروی ہے کہ ایسی جگہ جہاں کے لوگوں پر جمعہ میں حاضر ہونا واجب ہے وہاں لوگ ظہر کی جماعت نہ بنائیں۔(۲)

فائدہ(۲) وہ لوگ جن پر جمعہ واجب ہے، وہ اگر کسی ضرورت سے زوال سے پہلے ہی سفر پر یا شہر سے باہر جانا چاہتے ہوں تو اس میں کوئی مضائقہ نہیں، ہاں زوال کے بعد بے جمعہ پڑھے سفر پر یا بیرون شہر چلے جانا سخت مکروہ ہے۔

اسود بن قیسؒ اپنے والد سے روایت کرتے ہیں کہ حضرت عمرؓ نے ایک شخص کو دیکھا جو آمادۂ سفر ہے لیکن جمعہ کا دن تھا تو اس نے یوں کہا کہ آج جمعہ کا دن ہے اگر یہ نہ ہوتا تو میں سفر پر چلا جاتا، اس پر حضرت عمرؓ نے فرمایا: جمعہ کسی مسافر کو سفر سے نہیں روکتا۔(۳) حضرت ابن عمرؓ سے مروی ہے کہ نبی ﷺ نے ارشاد فرمایا: جو شخص جمعہ کے روز (بعد زوال) سفر کرتا ہے تو ملائکہ اس کے لئے بددعا کرتے ہیں کہ اس کو سفر میں کوئی رفیق نہ ملے(۴)

فائدہ:۳) کسی آدمی کو جمعہ کی ایک رکعت ہی ملی یا صرف تشہد ملا تو اسے بھی جمعہ مل گیا لہذا وہ نماز جمعہ ہی مکمل کرے۔

حضرت ابن عمرؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے ارشاد فرمایا: جسے نماز جمعہ یا کسی اور نماز کی ایک رکعت ملی تو وہ ایک اور رکعت ملا لے اور اس کی نماز مکمل ہوگئی۔(۵) حضرت عبداللہ بن مسعودؓ فرماتے ہیں: جسے تشہد مل گیا اسے وہ نماز مل گئی۔(۶)

---

(۱)مصنف ابن ابی شیبہ :فی القوم یجمعون یوم الجمعة اذا لم یشھدوھا : ۵۴۴۱. حسن : اعلاء السنن :۷۹/۸

(۲) کنز العمال : فصل فی احکام الجمعة : ۲۳۳۰۹. قوی : اعلاء السنن : ۷۹/۸

(۳)مصنف عبد الرزاق : کنز العمال باب السفر یوم الجمعة : ۵۵۳۷ . رجاله ثقات :اعلاء السنن :۷۹/۸

(۴) کنز العمال : کتاب السفر ۱۷۵۴۰ .حسن: اعلاء السنن :۷۹/۸

(۵)ابن ماجه : تحقیق الالبانی : باب ماجاء فیمن ادرک من الجمعة رکعة :۱۱۲۳ : صحیح

(۶)مصنف ابن ابی شیبہ : فیما یکتب للرجل من التضعیف اذا ارادالصلاة :۴۱۸۸. متاید بحدیث صحیح : الجوهر النقی :۲۰۴/۳

نماز جمعہ کے شرائط

نماز جمعہ جیسے ہر آدمی پر فرض نہیں ہے، ایسے ہی ہر جگہ بھی نماز جمعہ صحیح نہیں ہوتی، اس کی چند شرطیں ہیں:

(۱) شہر ہونا

جمعہ کے درست ہونے کے لئے بنیادی شرط یہ ہے کہ جس جگہ جمعہ پڑھا جارہا ہے وہ شہر ہو، یا شہر کے حکم میں ہو جیسے قصبہ اور بڑا گاؤں، یعنی ایسی جگہ ہو جہاں ضروریات زندگی کی بسہولت تکمیل ہوتی ہو اور جہاں محکمہ قضا وافتاء موجود ہو۔(۱) حضرت عطاءؒ فرماتے ہیں قریہ جامعہ (بڑا گاؤں) وہ بستی کہلاتی ہے جہاں حاکم وقاضی ہو، جماعت قائم ہوتی ہو، ایک دوسرے سے متصل مکانات وبنگلے ہوں، جیسے جدّہ شہر۔(۲)

(الف) حضرت علیؓ سے مروی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلمنے ارشاد فرمایا: جمعہ اور تشریق (نماز عید الاضحیٰ) نہیں ہے مگر جامع وآباد شہر میں۔(۳) بعض لوگوں نے ناواقفیت کی بنا پر جامع شہر کے تحت، قریہ ودیہات کو بھی شامل مانا ہے؛ حالاں کہ لغت عرب کی رو سے

---

(۱) "وهو الاصح عند الاكثر" تحفة الفقهاء: ۱۶۲/۱

(۲) مصنف عبد الرزاق : باب القرى الصغار : ۵۱۷۹ – سكت عليه ابن حجر : تغليق التعليق : ۳۵۴/۲

(۳) مصنف ابن ابی شیبه :من قال لا جمعة ولا تشريق إلا في مصر جامع : ۵۰۹۸– صحيح : آثار السنن : ۸۷/۲ – سلسلة الآثار الصحيحة : ۳۴۴ – كتاب الآثار لابی يوسف مرفوعاً : باب صلاة العيدين : ۲۹۷

شہر پر تو قریہ کا اطلاق ہوسکتا ہے، جیسے مکہ وطائف پر قریہ کا اطلاق خود قرآن پاک میں موجود ہے۔(۱) جواثی نامی تاریخی شہر پر بھی قریہ کا اطلاق بعض روایات میں مذکور ہے؛(۲) لیکن دیہات پر مصر اور وہ بھی جامع کے اطلاق کی نظیر موجود نہیں ہے۔(۳)

(ب) حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ لوگ اپنے گھروں اور مدینہ کے (مشرقی سمت، جانب نجد کے) فراز علاقوں اور چڑھاؤ پر واقع محلوں سے باری باری جمعہ کے لئے آیا کرتے تھے، آتے آتے وہ غبار آلود اور پسینہ میں شرابور ہو جاتے تھے۔(۴)

مدینہ منورہ کے گردونواح کے دیہات میں اگر جمعہ جائز ہوتا تو لوگوں کا باری باری مقرر کر کے اور اتنی زحمت ومشقت کر کے شہر حاضر ہونے کا کوئی مطلب نہ ہوتا، پس اس حدیث سے معلوم ہوا کہ دیہات میں جمعہ جائز نہیں، نیز یہ بھی معلوم ہوا کہ اہل دیہات پر یہ واجب نہیں کہ وہ جمعہ کی خاطر شہر حاضر ہوں؛ کیوں کہ اگر ایسی بات ہوتی تو دیہات کے تمام لوگوں کے لئے جمعہ میں حاضر ہونے کا عام حکم نبوی صلی اللہ علیہ وسلم جاری ہوتا۔

(ج) حجۃ الوداع کے موقع پر جمعہ کے روز رسول اللہ ﷺ نے ایک جمع عظیم کے ساتھ میدان عرفات میں وقوف عرفہ فرمایا مگر جمعہ نہیں پڑھی بلکہ نماز ظہر ادا فرمائی،(۵) اگر جمعہ کے قائم کرنے کے لئے محض لوگوں کا اجتماع کافی ہوتا، شہر کا ہونا ضروری نہ ہوتا تو رسول اللہ عرفات کے میدان میں جمعہ ضرور پڑھتے۔

(د) حضرت حذیفہؓ نے ارشاد فرمایا: گاؤں والوں پر جمعہ نہیں، جمعہ تو شہر کے

---

(۱) سورة الزخرف : ۳۱

(۲) ابوداود: تحقيق الألباني : باب الجمعة في القرى : ۱۰۷۰ – صحيح

(۳) إعلاء السنن : ۸ / ۱۰

(۴) بخاري : باب من أين تؤتى الجمعة وعلى من تجب : ۹۰۲

(۵) مسلم : باب حجة النبي صلى الله عليه وسلم : ۳۰۰۹ – التعليق الحسن : ۸۶/۲

لوگوں پر ہے ۔ (ا) حضرت حسن بصریؒ اور حضرت محمد بن سرینؒ سے مروی ہے کہ ان دونوں حضرات نے ارشاد فرمایا: جمعہ تو شہروں میں ہوتا ہے۔(۲)

(ہ) نبی ﷺ نے ہجرت کے موقع سے قبا کی بستی میں چودہ روز قیام فرمایا مگر وہاں جمعہ نہیں پڑھا بلکہ ارباب سیر اس پر متفق ہیں کہ مدینہ کی تاریخ میں، سب سے پہلے جمعہ کا قیام بنوسالم کی بستی میں ہوا جو کچھ فاصلہ کے ساتھ مدینہ کے ہی محلوں میں کا ایک محلّہ تھا۔(۳) پھر اس کے بعد جمعہ کا قیام پورے مدینہ میں صرف مسجد نبوی ہی میں ہوتا رہا۔

(و) عہد رسالت میں عوالیٔ مدینہ، ذوالحلیفہ، سویداء اور مکہ ومدینہ کے درمیان واقع دور دراز دیہات میں جمعہ قائم نہیں ہوتا تھا اور نہ ہی وہاں کے لوگوں کے بارے میں عام طور پر یہ ثابت ہے کہ وہ جمعہ میں شرکت کی غرض سے مدینہ منورہ آیا کرتے تھے، یہ صاف اس بات کا ثبوت ہے کہ نہ دیہات میں جمعہ جائز ہے اور نہ ہی اہل دیہات پر یہ ضروری ہے کہ وہ جمعہ پڑھنے کے لئے شہر آیا کریں۔(۴)

امام بیہقیؒ سے مروی ہے کہ: ذوالحلیفہ کے باشندے (کبھی کبھار) مدینہ میں آکر جمعہ پڑھتے تھے اور یہ بات کہیں منقول نہیں کہ مدینہ کے قریبی دیہات میں سے کسی جگہ جمعہ کے قیام کی اجازت دی گئی ہو۔(۵) صحابہ کرامؓ نے بھی جمعہ کا قیام اور منبر کی تنصیب، شہروں اور گنجان علاقوں میں کی ہے، نہ کہ گاؤں اور دیہات میں۔(۶)

(ز) رسالتمآب ﷺ کے زمانے میں، ایک عرصہ تک صرف مکہ ومدینہ ہی میں

---

(۱)مصنف ابن ابی شیبہ : من قال لا جمعة ولا تشريق إلا في مصر جامع : ۵۱۰۰ - ۵۱۰۱ - صحیح : إعلاء السنن : ۳۰/۸ - آثار السنن : ۸۷/۲

(۲)حوالۂ سابق

(۳)بخاری شریف مع الفتح : ۲۰۷/۲، آثار السنن : ۸۲/۲

(۴)اعلاء السنن : ۲۴/۸

(۵)التلخيص الحبير: ۱۳۶/۲ . ۵۵

(۶)اعلاء السنن : ۸/۸

جمعہ قائم کیا جاتا تھا، اس لئے قیام جمعہ کے اعتبار سے مقامات وامکنہ کی تعریف وتحدید میں یہ دونوں شہر اصل کا درجہ رکھتے ہیں، جو مقامات، سماجی ضروریات کے لحاظ سے ان دوشہروں کے ہم مثل ہوں، ان کو مصر اور شہر کا نام دیا جائے گا، وہاں جمعہ درست ہوگی اور جوان کے ہم مثل نہ ہوں، وہ مصر وشہر کے حکم میں داخل نہیں اور وہاں جمعہ درست نہیں۔

مدینہ منورہ کی آبادی، وہاں کے اسباب ووسائل کا اندازہ رسالتمآب ﷺ کے مدینہ منورہ، تشریف آوری کے منظر سے لگایا جاسکتا ہے، قبا سے رخت سفر باندھ کر جب آنحضرت ﷺ مدینہ میں جلوہ افروز ہوئے تو انصار کا کوئی قبیلہ ایسا نہ تھا جو آپ ﷺ کو مہمان بنانے کا مشتاق نہ رہا ہو، ہر قبیلہ کہتا: یارسول اللہ! میزبانی کا شرف ہمیں بخشیئے! ہمارے پاس طاقت ودولت ہے، باغات وکھیت ہیں، میٹھے پانی کے چشمے ہیں، قوت وقرابت ہے، خدارا یہاں سے قدم مبارک آگے نہ بڑھایئے! رسول پاک ﷺ ہر ایک کو اس کی اس پیش کشی پر دعاؤں اور کلمات تشکر سے نوازتے اور ارشاد فرماتے: اونٹنی کو راستہ دیدو! وہ خدائی حکم کی پابند ہے۔(۱)

مراسیل ابوداؤد میں ہے کہ صرف مدینہ میں نو مساجد تھیں (قریبی دیہات کی مساجد الگ تھیں) (۲) پھر آفتاب رسالت ﷺ کے مدینہ فروکش ہونے کے بعد تو مدینہ کی رونق وبہار اور بھی کئی چند ہوگئی تھی، وہاں، سارا دیوانی، فوجداری اور عائلی نظام قائم ہو چکا تھا۔ (۳) سرزمین مکہ کا حال بھی اس سے کچھ جداگانہ نہ تھا، وہاں بھی بالآخر مادی ومعنوی وسائل کی فراوانی ہوگئی تھی، فتح مکہ کے بعد مکمل طور پر وہ اسلام کے سایہ نگین ہو چکا تھا، دربار رسالت ﷺ سے وہاں عامل مقرر ہو چکے تھے۔

غرض مکہ اور مدینہ کی تمدنی حیثیت کو مدنظر رکھتے ہوئے، چھوٹے چھوٹے قریوں میں قیام جمعہ کی بات کرنا کوئی وزن نہیں رکھتا۔

---

(۱) خلاصة الوفاء بأخبار المصطفى : ۱/۱۹

(۲) مراسیل أبو داؤد ، حدیث نمبر : ۱۵

(۳) اعلاء السنن : ۸/۱۲-۱۴

(ح) حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے مروی ہے کہ مسجد نبوی کے بعد، پہلا جمعہ بحرین کے شہر جواثی میں واقع مسجد عبدالقیس میں ہوا ہے۔(۱)

وفد عبدالقیس کی آمد ۸ھ کی ہے جب کہ حج کی فرضیت ہوچکی تھی، حج کی فرضیت راجح قول کے مطابق ۶ھ میں ہوئی ہے اور وفد عبدالقیس کو جن تعلیمات اسلام سے واقف کروایا گیا تھا اس میں حج بیت اللہ کرنے کی تعلیم بھی دی گئی تھی اس سے قبل، بیشتر علاقے ودیہات، دامن اسلام میں آچکے تھے، لیکن ان سب میں جمعہ کے قائم کرنے کے اعتبار سے تقدم وفوقیت اہل جواثی کو حاصل ہوئی، جس کی وجہ یہ ہے کہ جواثی نہ صرف عہد اسلام میں بلکہ زمانہ جاہلیت میں بھی ممتاز شہروں میں شمار ہوتا تھا، حتیٰ کہ جاہلی شعراء کے کلام میں بھی اس شہر کی عظمت شان کا ذکر ملتا ہے، امرأالقیس نے تجارتی ساز وسامان کی کثرت کے بیان کے لئے تشبیہ کے طور پر جواثی شہر کا تذکرہ کیا ہے، دیوان امرأالقیس کے شارح تشریح کرتے ہوئے لکھتے ہیں: جیسے شہر جواثی سے واپس ہونے والا بامراد لوٹتا ہے، شکار اور خرمے سے اس کی جھولیاں لبریز ہوتی ہیں، ایسے ہی ہماری جھولیوں اور تھیلیوں کا حال ہے۔اس سے معلوم ہوا کہ جواثی چھوٹا موٹا گاؤں نہیں بلکہ مویشیوں اور کھجوروں کے حوالے سے عظیم ترین تجارتی منڈی اور ضرب المثل معاشی مرکز تھا۔

علامہ عینیؒ فرماتے ہیں کہ جواثی کی آبادی کم وبیش چار ہزار نفر پر مشتمل تھی، جغرافیا نویس علماء کے مطابق جواثی دراصل جواثا نامی قلعہ کی طرف منسوب ہے جو بحرین کا مضبوط ترین قلعہ سمجھا جاتا تھا، اس کی مضبوطی کا عالم یہ تھا کہ مرتدین کے خلاف جنگ کے دوران، یہ قلعہ مسلمانوں کی ایک محفوظ پناہ گاہ کا کام دیتا تھا،(۲) معلوم ہوا کہ جمعہ کا قیام انہی جیسے شہروں میں ہوسکتا ہے۔

(ط) بعض روایات میں، قیام جمعہ کے لئے امام یا اس کے نائب کی موجودگی ضروری قرار دی گئی ہے۔

---

(۱) بخاری: باب الجمعة في القرى والمدن: ۸۹۲

(۲) التعليق الحسن: ۲ / ۸۰

ارشاد نبوی ہے: بلاشبہ اللہ تعالیٰ نے تم پر جمعہ کو فرض کیا ہے، جو کوئی بے عذر، امام عادل یا ظالم کے ساتھ اسے پڑھنا ترک کر دے تو اللہ اسے متحد نہ رکھے اور نہ اس کے کاموں میں برکت ہو۔(۱) حضرت عبد اللہ بن عمرؓ سے مکہ و مدینہ کے درمیان واقع دیہات میں نماز جمعہ کے قیام کے تعلق سے پوچھا گیا تو فرمایا: جب ان پر کوئی امیر و حاکم مقرر ہو تو وہ جمعہ قائم کرے۔(۲)

حاکم و گورنر عموماً ایسے ہی مقام کو اپنا دار الحکومت بناتا ہے جو پورے علاقہ میں اسباب و سائل اور لوگوں کی نقل و حرکت کے اعتبار سے آباد و گنجان ہو، جہاں ضروریات زندگی کا سامان فراوانی کے ساتھ موجود ہو اور دور دراز قصبہ جات و علاقوں کے لوگوں کو حاکم تک اپنی شکایات لے کر پہنچنے میں آسانی ہو، اگر بالفرض حاکم کا پڑاؤ کردہ مقام شروع میں ایسا نہ ہو تو اس کے قیام کے بعد چند ہی دنوں میں وہ جگہ یہ نقشہ خود بخود اختیار کر لیتی ہے۔(۳)

صحابہ کرام و تابعین عظام کے زمانے میں جہاں کہیں اقامت جمعہ کا ثبوت ملتا ہے، اس کا تعلق یا تو بڑے شہروں اور آبادیوں سے ہے یا پھر اس کے قائم کرنے والے حاکم و گورنر ہیں، متعلقہ روایات کو ملاحظہ کرنے سے یہ حقیقت بلا تکلف سامنے آتی ہے، اس لئے ہر چھوٹے بڑے دیہات میں علی الاطلاق جمعہ کے جائز ہونے پر اصرار کرنا ٹھیک نہیں۔

بعض حضرات جمعہ کے صحیح ہونے کے لئے، جائے قیام کا مطلق اعتبار نہیں کرتے، ان کے یہاں جمعہ جائز ہونے کے لئے کسی خاص جگہ کا ہونا ضروری نہیں بلکہ ہر خطہ زمین، حتیٰ کہ صحراء اور ویرانے میں بھی جمعہ پڑھنا جائز ہے، حالاں کہ جنگلات اور ویرانوں میں جمعہ کے جائز ہونے کا بالاجماع کوئی قائل نہیں کیوں کہ یہ بات مستند روایات سے ثابت ہے کہ نبی ﷺ نے میدان عرفات میں باوجود صحابہ کی جمعیت کثیرہ موجود ہونے کے جمعہ قائم نہیں فرمایا۔

---

(۱)طبرانی اوسط : ۱۲۶۱ – رجاله ثقات : إعلاء السنن : ۴۸/۸

(۲)السنن الکبری للبیهقي : باب العدد الذین إذا کانوا في قریة وجبت علیهم الجمعة : ۵۸۲۱ – وسکت علیه

(۳)آثار السنن : ۲ / ۸۵، نیز دیکھئے : اعلاء السنن : ۸ / ۱۴ . ۱۶

ان حضرات کو در حقیقت سورۃ جمعہ کی آیت کے سمجھنے میں مغالطہ ہوا ہے، آیت کریمہ یہ ہے:

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِيْنَ آمَنُوا إِذَا نُودِيَ لِلصَّلَاةِ مِن يَوْمِ الْجُمُعَةِ فَاسْعَوْا إِلَى ذِكْرِ اللَّهِ﴾(۱)

''اے ایمان والو! جب جمعہ کے دن نماز کے لئے پکارا جائے تو اللہ کے ذکر کی طرف لپکو''

ان کے مطابق آیت جمعہ میں جگہ کی کوئی تخصیص مذکور نہیں، لہذا ہر جگہ جمعہ درست ہے خواہ قصبہ ہو، دیہات ہو ویرانہ ہو، جنگل ہو، جب کہ آیت جمعہ کو صد فیصد عموم پر رکھنا نہ ہی منشائے شریعت ہے اور نہ ہی اتنا عموم ان حضرات کو بھی تسلیم ہوسکتا ہے، بلکہ یہ واقعہ ہے کہ آیت جمعہ میں کئی ایک اعتبار سے تخصیص واقع ہوئی ہے۔

(۱) نداء کے معنی صدا اور اعلان کے ہیں، خواہ کسی قسم کا ہو، تاہم سبھوں نے اس سے خاص صدا اذان مراد لیا ہے۔

(۲) صلوۃ کے تحت، جمعہ کے دن کی پانچوں نمازیں داخل ہیں، تاہم سبھوں نے خاص بوقت ظہر پڑھی جانیوالی نماز جمعہ مراد لیا ہے۔

(۳) نماز کی جانب سعی کرنے اور جمعہ کی طرف چلنے، کے عمومی حکم خداوندی کے مخاطب، بچے، بوڑھے، جوان، ادھیڑ، عورتیں، تندرست، بیمار، مقیم، مسافر وغیرہ سب ہیں؛ تاہم سبھوں نے یہاں بھی مخصوص مخاطبین مراد لئے ہیں، جب ان جہتوں سے آیت کریمہ میں تخصیص واقع ہوئی ہے، جس کا انکار خود یہ حضرات بھی نہیں کرسکتے، تو سابقہ دلائل کی روشنی میں آیت کریمہ کو جگہ و مکان کے اعتبار سے خاص مانا جاتا ہے تو اس سے کونسا آسمان ٹوٹ پڑتا ہے اور کیوں یہ بے بنیاد ہوّا کھڑا کیا جاتا ہے کہ احناف نعوذ باللہ قرآنی حکم کی خلاف ورزی کرتے ہیں۔

---

(۱) سورۃ الجمعۃ: آیت : ۹

اس کے علاوہ خود انہی کے اصول استدلال کی روشنی میں یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ اس حکم خداوندی کے مخاطب شہری لوگ ہیں نہ کہ دیہاتی لوگ، وجہ اس کی یہ ہے کہ آیت کریمہ میں جمعہ کی جانب لپکنے اور سعی کرنے کے حکم کو اذان جمعہ سے متعلق کیا گیا ہے کہ جب نماز کے لئے اذان کہی جائے تب جمعہ کی طرف دوڑو اور یہ بات محتاج دلیل نہیں کہ عہد نبوی ﷺ میں صرف وہی اذان رائج تھی جو خطیب کے روبرو ہوا کرتی تھی، ظاہر ہے ایسے وقت دوڑ کر جمعہ میں وہی شخص حاضر ہوسکتا ہے جو آس پاس کا ہو، دور دراز کے لوگوں کا ایسی صورت میں پہنچنا بالکل ناممکن ہے، معلوم ہوا کہ جمعہ پڑھنے کے مخاطب شہری لوگ ہیں، دیہاتی لوگ نہیں۔(۱)

الحاصل، اس پوری بحث سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ جمعہ کے جائز ہونے کے لئے شہر کا ہونا ضروری ہے، نیز یہ بھی ضروری ہے کہ وہاں مسلمان حاکم وامیر بھی موجود ہو، تاہم غیر اسلامی ممالک میں چوں کہ مسلمان حاکم وامیر کا تصور نہیں ہوسکتا، اس لئے ایسے ممالک میں ،مسلمان باتفاق اراء، جس کو اپنا بڑا وامیر تسلیم کرلیں وہ حاکم وامیر کے درجہ میں ہو جاتا ہے، اور وہاں کے شہروں میں جمعہ کا قائم کرنا، جائز ہو جاتا ہے۔(۲)

(۲) جماعت کا ہونا:

امام کے علاوہ کم از کم تین آدمیوں کا موجود رہنا، جمعہ کے صحیح ہونے کے لئے ضروری ہے، رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: جمعہ، مدائن جیسی ہر بستی میں واجب ہے، اگر چہ اس میں صرف چار (مسلمان) افراد ہی ہوں (ماباقی غیر مسلم)۔(۳) اس روایت کے ہم معنی ایک اور ضعیف روایت بھی موجود ہے کہ: جمعہ ہر بستی والوں پر واجب ہے اگر چہ وہاں تین (مسلمان) افراد ہی ہوں اور چوتھا ان کا امام وحاکم ہو۔(۴)

---

(۱) اعلاء السنن : ۸ / ۲۳.۶

(۲) فتاوی بزازیه : ۳۱۱/۶، فتاوی عزیزیه : ۳۲/۱

(۳) سنن الدار قطنی : باب الجمعة علی اهل القرية : ۱۶۱۱ – ۱۶۱۲ – ۱۶۱۳ – حسن – بعضها يقوی بعضا : إعلاء السنن : ۵۳/۸

(۴) حواله سابق

(۳) وقت ہونا:

حضرت سلمہؓ بن اکوع سے روایت ہے کہ ہم سورج کے زوال کے ساتھ ہی، رسول اللہ ﷺ کے ساتھ جمعہ پڑھتے تھے۔(۱)

حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ: سورج کے زوال کے وقت جمعہ پڑھا کرتے تھے۔(۲)

(۴) اذن عام ہونا:

جمعہ کے صحیح ہونے کے لئے، اجازت عامہ کا ہونا بھی شرط ہے، جمعہ کا قیام علی الاعلان ہونا چاہئے، ہر کس وناکس کو اس میں شامل ہونے کی اجازت رہنی چاہئے، بے وجہ کی رکاوٹ و پابندیاں جمعہ کی صحت کو متاثر کر دیتی ہیں۔

بعض روایات سے پتہ چلتا ہے کہ جمعہ کی نماز کا اجمالی حکم، مکہ ہی میں بذریعہ وحی مل چکا تھا، مگر نبی پاک ﷺ کو وہاں جمعہ کے قائم کرنے پر استطاعت نہ تھی، حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں: ہجرت سے قبل ہی نبی ﷺ نے (اہل مدینہ کو) جمعہ قائم کرنے کی، اجازت دے دی تھی، جب کہ خود نبی ﷺ مکہ میں جمعہ قائم نہ کر سکتے تھے۔(۳)

مکہ میں جمعہ قائم نہ کر سکنے کی وجہ ایک ہی سامنے آتی ہے کہ وہاں علی الاعلان، اذن عام کے ساتھ جمعہ کا قیام مشکل و پر خطر تھا، ورنہ تو جمعہ کے بقیہ شرائط مثلاً شہر ہونا، وقت ہونا، جماعت ہونا، خطبہ ہونا، سب موجود تھیں، معلوم ہوا کہ اذن عام کا ہونا بھی جمعہ کے لازمی شرائط میں سے ہے۔

---

(۱)مسلم : باب صلاة الجمعة حين تزول الشمس : ۲۰۲۹

(۲)بخاری :باب وقت الجمعة إذا زالت الشمس : ۹۰۴

(۳)التلخيص الحبير : ۲/ ۱۳۹، الدرالمنثور : ۱۴/ ۴۶۹

(۵) خطبہ کا ہونا:

حضرت عمرؓ سے مروی ہے کہ، خطبہ درحقیقت، دو رکعتوں کے قائم مقام ہے۔(۱) ایک اور روایت میں ہے کہ نماز جمعہ میں (رکعات کی) کمی خطبہ ہی کی جہ سے ہے۔(۲)

حضرت عمرؓ کے ان دونوں ارشادات سے خطبہ کی اہمیت وحیثیت ظاہر ہے کہ جیسے عام دنوں میں چار رکعت ظہر کے ادا کرنے ضروری ہیں، ایسے ہی جمعہ کے روز دو رکعت جمعہ اور خطبہ (جو دو رکعت کے قائم مقام ہے) کا انجام دینا بھی ضروری اور فرض ہے۔

علامہ ابن ہمامؒ فرماتے ہیں: جمعہ کے روز ظہر کی نماز کا ساقط ہو جانا، خلاف قیاس ہے، اور خلاف قیاس حکم میں اس کے سارے حدود وقیود ملحوظ ہوتے ہیں، جمعہ کا قیام جب سے ہوا ہے، جماعت وخطبہ کے ساتھ ہی ہوا ہے، لہذا یہ دونوں چیزیں، جمعہ کے لئے ضروری اور فرض ہوئیں۔(۳)

خطبہ کی سنتیں:

۱) طہارت ہونا یعنی بے وضو یا جنبی نہ ہونا۔(۴)

۲) خطبہ کا زیادہ لمبا نہ ہونا۔(۵)

۳) خطبہ کو اللہ کی حمد سے شروع کرنا۔(۶)

---

(۱) مصنف ابن ابی شیبہ : الرجل تفوته الخطبة : ۵۳٦۷ – سکت علیه المحقق محمد عوامه

(۲) التلخيص الحبير : ۲/ ٦٦۵

(۳) فتح القدير : ۲ / ۵٦

(۴) طبرانی اوسط : ۲۰۷۸ – ایک راوی ضعیف ہیں، مجمع الزوائد : باب الانصات والإمام يخطب : ۳۱۳۱

(۵) مسلم : باب تخفيف الصلاة والخطبة : ۲۰۴٦

(٦) صحيح البخارى : باب من قال في الخطبة بعد الثناء أما بعد : ۹۲۴ – ۹۲۷

۴) خطبہ میں کلمہ شہادت کا ہونا۔(۱)

۵) نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر درود شریف پڑھنا۔(۲)

۶) کھڑے ہو کر خطبہ دینا۔(۳)

۷) لوگوں کی طرف منہ کرنا۔(۴)

۸) لوگوں کو خطبہ سنانا۔(۵)

۹) وعظ و نصیحت کرنا۔(۶)

۱۰) قرآن مجید کی کوئی آیت خطبہ میں پڑھنا۔(۷)

۱۱) دونوں خطبوں کے درمیان بیٹھنا۔(۸)

۱۲) خطبہ خاموشی سے سننا۔(۹)

۱۳) دوسرے خطبہ کو بھی حمد و ثنا اور درود سے شروع کرنا۔(۱۰)

فائدہ(۱): خطیب کا منبر پر چڑھنے کے بعد سلام کرنا، مشروع اور جائز ہے۔

حضرت جابرؓ سے مروی ہے کہ نبی ﷺ جب منبر پر چڑھتے تو لوگوں کی طرف متوجہ

---

(۱)صحيح البخارى : باب من قال في الخطبة بعد الثناء أما بعد : ۹۲۴ – ۹۲۷

(۲)السنن الكبرى للبيهقي : باب ما يستدل به على وجوب ذكر النبي صلى الله عليه وسلم في الخطبة : ۵۹۸۱ – سكت عليه

(۳)بخارى : باب الخطبة قائما : ۹۲۰

(۴)بخارى : باب يستقبل الإمام القوم : ۹۲۱

(۵)مسلم : باب تخفيف الصلاة والخطبة : ۲۰۴۲ – ۲۰۴۳

(۶)أبو داؤد تحقيق الألباني : باب الخطبة قائما : ۱۰۹۶ – حسن

(۷)مسلم : باب تخفيف الصلاة والخطبة : ۲۰۴۸

(۸)بخارى : باب القعدة بين الخطبتين : ۹۲۸

(۹)مسلم : باب فضل من استمع وانصت في الجمعة : ۲۰۲۵

(۱۰) نسائى : تحقيق الألباني : باب القراءة في الخطبة الثانية والذكر فيها : ۱۴۱۸ – صحيح

ہوتے اور فرماتے، السلام علیکم، حضرت ابوبکرؓ وعمرؓ وعثمانؓ بھی ایسے ہی کرتے تھے۔(۱)

فائدہ (۲): منبر رسول میں تین سیڑھیاں تھیں۔(۲)

فائدہ (۳): خطیب کے لئے عصا لینا نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہے، تاہم یہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی دائمی سنت نہیں، بسا اوقات آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسا ضرور کیا ہے، مگر اس کا مقصد عصا پر ٹیک لگانا اور اس کے سہارے آرام لینا ہوتا تھا، حضرت حکمؓ فرماتے ہیں : ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس جمعہ میں حاضر ہوئے تو اس موقع پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم عصا یا کمان پر ٹیک لگائے خطبہ دے رہے تھے، (۳) پس عصا پکڑنے کو لازم وضروری سمجھنا درست نہیں۔

جمعہ کی دو اذانیں:

خطیب کے سامنے کہی جانے والی اذان سے قبل والی اذان اجماع صحابہؓ سے ثابت ہے اور اجماع صحابہ سے ثابت ہونے والے حکم کا درجہ بھی شریعت سے ثابت شدہ حکم کی طرح ہوتا ہے، اسے بھی ویسے ہی مضبوطی سے تھامنا ضروری ہے جیسے سنت رسول اللہ ﷺ کا تھامنا ضروری ہے، اس کی بے وقعتی کرنا یا اس کو بدعت کا نام دینا، کھلی گمراہی کا زینہ اور بے دینی کا پیش خیمہ ہے۔

حضرت سائب بن یزید سے روایت ہے کہ عہد رسالت اور عہد ابوبکرؓ وعمرؓ میں اذان اول اس وقت ہوتی تھی جب امام منبر پر بیٹھتا پھر جب حضرت عثمانؓ کے زمانے میں، آبادی کی کثرت ہوگئی (اور عین اس اذان کے موقع پر تمام لوگوں کو مسجد پہنچنا مشکل ہوگیا) تو حضرت عثمانؓ نے ایک اور اذان کہنے کا حکم فرمایا چنانچہ وہ اذان، زوراء نامی مقام پر دی جاتی تھی، پھر

---

(۱) مصنف ابن أبي شيبة : الإمام إذا جلس المنبر يسلم : ۵۲۳۸ – قوی : محمد عوامه

(۲) مجمع الزوائد : باب في المنبر : ۳۰۹۹

(۳) أبوداود : تحقيق الألباني : باب الرجل يخطب على قوسٍ : ۱۰۹۸ – حسن

معاملہ اسی پر ثابت وبرقرار ہو گیا۔(۱)

ایک سے زائد جگہوں پر جمعہ کا قیام:

بہتر تو یہ ہے کہ جمعہ صرف شہر کی جامع مسجد میں ہو، جہاں تمام اہل شہر اکٹھا ہوں کہ جمعہ کی شان اور اجتماعیت کا مظاہرہ اسی میں ہے، اسی مصلحت کی بنا پر حضرت عمرؓ نے، حضرت ابوموسی اشعریؓ، حضرت عمرو بن العاصؓ، حضرت سعد بن ابی وقاصؓ کو دو قسم کی مساجد بنانیکا حکم فرمایا تھا، ایک تو جامع مسجد اور ایک قبیلوں کی مسجد، لیکن جب جمعہ کا دن آئے تو سب لوگ جامع مسجد کی طرف اکٹھے ہو جائیں اور جمعہ میں موجود رہیں۔(۲)

تاہم اس کے باوجود، شہر کے متعدد مقامات پر جمعہ قائم کیا جاتا ہے تو اس کی بھی گنجائش ہے، ابواسحقؒ کہتے ہیں کہ حضرت علیؓ نے عید کے دن، ایک شخص کو حکم دیا کہ وہ ضعیف لوگوں کو مسجد میں دو رکعت (نماز عید) پڑھائے (اور خود عیدگاہ تشریف لے گئے)۔(۳) نماز عید اور نماز جمعہ کا معاملہ یکساں ہے، اس لئے معلوم ہوا کہ جمعہ بھی ایک سے زائد جگہوں پر پڑھا جا سکتا ہے۔

علامہ ابن تیمیہؒ، حضرت علیؓ کا یہ عمل نقل کرنے کے بعد کہتے ہیں: بوقت ضرورت، شہر میں دو جگہ جمعہ پڑھنا جائز ہے، جس طرح حضرت علیؓ نے بوقت ضرورت دو جگہ عید کی نماز قائم فرمائی، یہی امام احمد بن حنبلؒ کا مشہور مذہب ہے، اکثر فقہاء احناف اور متاخرین شوافع کی بھی یہی رائے ہے، یہ ائمہ، حضرت علیؓ کے فعل سے استدلال کرتے ہیں کیوں کہ وہ خلفاء راشدین میں سے ہیں۔(۴)

---

(۱) بخاری: باب التأذين عند الخطبة: ۹۱۶

(۲) التلخيص الحبير: ۶۱۱

(۳) كتاب الأم: باب الجمعة والعيدين: ۱۶۷/۷ — صحيح: خلاصة الأحكام: ۲۹۰۹

(۴) منهاج السنة: ۲۰۴/۳

عیدین کا بیان

خوشی منانا، آراستہ پیراستہ ہونا، سال کے کسی دن کو، خوشی و مسرت کے جذبات کے اظہار کے لئے مقرر کرنا، نوع انسانی کی قدیم سنت رہی ہے، اسلام نے بھی بڑے ہی توازن واعتدال کے ساتھ، ان انسانی احساسات کی رعایت رکھی ہے، آسمانی ہدایات سے بے پرواہ ہوکر خوشی منانا، بسا اوقات آوارگی وعیاشی کا ذریعہ بن جاتی ہے، جس کی بنا پر خوشیوں کا مظاہرہ کرنے والوں اور تماشائیوں، دونوں کو زحمت و نقصان اٹھانا پڑتا ہے۔

مذہب اسلام میں ایسے فضول ولا یعنی کاموں کا کوئی تصور نہیں، اسلام کی نظر میں عید کا دن ایسا مقدس دن ہے جس میں انسان کو خالق و مخلوق دونوں کا خیال رکھنا ضروری ہے، خالق کا خیال، اس کے حضور سجدہ ریز ہوکر کے اور مخلوق کا خیال انہیں اپنی خوشیوں میں شریک کر کے اور خورد نوش، لباس و پوشاک، طہارت و نظافت میں خاص اہتمام کر کے اپنی خوشیوں کو دوبالا کر سکتا ہے۔

حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ جب مکہ سے مدینہ پہنچے تو آپ ﷺ نے دیکھا کہ یہاں کے لوگوں نے سال میں دو دن کھیلنے اور تفریح کرنے کے لئے مقرر کر رکھے ہیں، آپ ﷺ نے دریافت فرمایا یہ دونوں دن کیسے ہیں؟ لوگوں نے بتایا کہ جاہلیت میں ہم ان میں کھیلتے اور خوشیاں منایا کرتے تھے! اس پر آنحضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا: اللہ تعالی نے تمہارے لئے ان دونوں کو ان سے بہتر دو دنوں سے بدل دیا ہے، ایک عید الفطر کا دن

اور دوسرا: عید الاضحیٰ کا دن۔(۱)

(۱) عید کے روز صفائی ستھرائی کا اہتمام کرنا:

حضرت عبداللہ بن عمرؓ کے بارے میں مروی ہے کہ وہ عیدین میں، (نہایت اہتمام سے) غسل فرمایا کرتے تھے۔(۲)

عبداللہ بن عمرؓ سے مروی ہے کہ ایک دفعہ حضرت عمرؓ بازار سے ایک ریشمی کام والا جبہ خدمت اقدس میں لے کر حاضر ہوئے اور عرض کیا: یارسول اللہ ﷺ اسے خرید لیجئے، تاکہ آپ ﷺ اس کے ذریعہ عیدین اور وفود کی آمد کے موقع پر آراستہ ہوسکیں۔(۳) معلوم ہوا کہ عید کے لئے اچھے کپڑے پہننا، زیب وزینت اختیار کرنا سنت ہے۔

(۲) عید الفطر میں نماز سے قبل اور عید الاضحیٰ میں نماز کے بعد کھانا:

حضرت انسؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ عید الفطر کے دن عید گاہ جانے سے قبل طاق عدد میں چند کھجور تناول فرمالیا کرتے تھے۔(۴)

حضرت بریدہؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ عید الفطر کے دن جب تک کھانہ لیتے عید گاہ تشریف نہ لے جاتے اور عید الاضحیٰ کے دن جب تک ذبح نہ کرتے، کچھ تناول نہ فرماتے (۵)

(۳) عید گاہ میں نماز عید ادا کرنا:

حضرت ابوسعید خدریؓ سے مروی ہے کہ نبی ﷺ عید الفطر وعید الاضحیٰ کو عید گاہ تشریف لے جاتے اور اس دن کا اولین عمل نماز ہوا کرتا تھا۔(۶) معلوم ہوا کہ عید گاہ

---

(۱) مشکوۃ: ۱۴۳۹، مستفاد: حجة الله البالغة: ۲/ ۹۹

(۲) موطا مالک: باب العمل في غسل العيدين: ۴۳۲

(۳) بخاری: باب في العيدين والتجمل فيه: ۹۴۸

(۴) بخاری: باب الأكل يوم الفطر قبل الخروج: ۹۵۳

(۵) ابن ماجه تحقیق الالبانی: باب الاكل يوم الفطر: ۱۷۵۶۔ صحیح۔ دار قطنی: العيدين: ۱۷۳۴

(۶) بخاری: باب الخروج إلى المصلى بغير منبر: ۹۵۶

میں نماز پڑھنا بہتر ہے تاہم عذر ہو تو مسجد میں بھی نماز عید پڑھی جا سکتی ہے، حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ عید کے دن (کسی سال) بارش ہوگئی تو نبی ﷺ نے لوگوں کو نماز عید مسجد میں ہی پڑھائی (۱)

(۴) راستہ میں تکبیر کہنا:

حضرت عبداللہ بن عمرؓ کے بارے میں مروی ہے کہ وہ (نماز فجر کی ادائیگی کے بعد) عیدین کے لئے مسجد سے باہر نکلتے تو عیدگاہ پہنچنے تک بلکہ امام کے آنے تک تکبیر کہتے رہتے (۲)

(۵) عیدگاہ جاتے اور آتے وقت راستہ تبدیل کرنا:

حضرت جابرؓ سے روایت ہے کہ عید کے روز نبی ﷺ عیدگاہ جاتے وقت اور واپس آتے قوت راستہ تبدیل فرمایا کرتے تھے۔ (۳)

(۶) نماز عید کا وقت:

نماز عید کا وقت طلوع آفتاب کے بعد سے زوال سے پہلے تک رہتا ہے، تاہم چاشت کے وقت سے پہلے نماز عید ادا کر لینا مستحب ہے، اس سے زیادہ تاخیر اچھا نہیں ۔ یزید بن خمیرؒ کہتے ہیں، ایک دفعہ صحابی رسول حضرت عبداللہ بن بسرؓ لوگوں کے ساتھ عید الفطر یا عیدالاضحیٰ کے لئے (عیدگاہ کی جانب) نکلے، امام نے آنے میں تاخیر کردی تو انہیں سخت ناگوار ہوا اور یوں فرمایا کہ ہم تو اس گھڑی نماز سے فارغ ہو جایا کرتے تھے، اور وہ چاشت کا وقت تھا۔ (۴)

عہد رسالت میں ایک موقع پر عید الفطر کی اطلاع زوال کے بعد ملی تھی، لوگوں نے

---

(۱) مستدرک حاکم مع تعليقات الذهبي: كتاب صلاة العيدين : ۱۰۹۴ – صحيح : امام حاکمؒ وامام ذهبیؒ

(۲) سنن دار قطنی : العيدين : ۱۷۳۱ – صحيح : ارواء الغليل : ۶۵۰

(۳) بخاری : باب من خالف الطريق إذا رجع يوم العيد : ۹۸۶

(۴) أبو داود تحقيق الألباني : باب وقت الخروج إلى العيد : ۱۱۳۷ – صحيح

روزہ رکھ لیا تھا، تو آپ ﷺ نے انہیں افطار کرنے کا حکم دیا اور دوسرے دن صبح عید کے لئے نکلنے کا حکم فرمایا۔(۱) معلوم ہوا کہ زوال کے بعد نماز عید نہیں پڑھی جا سکتی۔

(۷) نماز عید کی حیثیت:

عید کی نماز واجب ہے، نبی ﷺ نے زندگی بھر اس کی پابندی فرمائی ہے، کسی ایک وقت چھوڑنا بھی ثابت نہیں ہے، حتی کہ کسی سال عید کے دن بارش ہونے لگی تو آنحضرت ﷺ نے عید گاہ کے بجائے مسجد میں نماز عید پڑھائی مگر ترک کرنا گوارا نہیں فرمایا۔

ارشاد خداوندی ہے: تاکہ تم رمضان کے دن پورے کرو اور جو تم کو ہدایت دی اس پر اللہ کی تکبیر کرو۔(۲) تفسیر طبری میں ہے کہ اس آیت میں عید الفطر کے دن تکبیر کہنے کا تذکرہ ہے ظاہر ہے عید الفطر کے دن مخصوص تکبیر نماز عید میں ہی کہی جاتی ہیں، پس نماز عید الفطر کا حکم خداوندی ہونا آیت کریمہ سے ثابت ہوا۔(۳)

ارشاد خداوندی ہے، اپنے رب کے لئے نماز پڑھو اور قربانی کرو۔(۴) اس آیت میں تذکرہ ہے کہ پہلے عید الاضحیٰ کی نماز پڑھو پھر جانور کی قربانی کرو۔

حضرت ابو سعید خدریؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ (پابندی سے) عید الفطر و عید الاضحیٰ کے دن عید گاہ تشریف لے جایا کرتے تھے۔(۵)

ان آیات و احادیث کی روشنی میں معلوم ہوا کہ عیدین کی نماز واجب و ضروری ہے۔

---

(۱) أبو داؤد : تحقيق الألباني : باب إذا لم يخرج الإمام للعيدمن يومه يخرج من الغد : ۱۱۵۹ — صحيح

(۲) البقرة : ۱۸۵

(۳) تفسير طبری : ۳/۴۷۹، ۲۹۰۲

(۴) الكوثر : ۲

(۵) بخاری : باب الخروج إلى المصلى : ۹۵۶

(۸) نماز عید کی رکعات اور اس سے پہلے یا بعد نوافل

حضرت عبداللہ بن عباس ﷺ سے مروی ہے کہ نبی ﷺ عید الفطر کے لئے تشریف لے گئے پھر دو رکعت نماز عید ادا فرمائی، نہ اس سے پہلے کوئی (نفل) نماز پڑھی اور نہ ہی اس کے بعد۔(۱)

(۹) نماز عید کا طریقہ

نماز عید کا طریقہ وہی ہے جو عام نمازوں کا ہے البتہ اتنا فرق ہے کہ عیدین میں چھ زائد تکبیر کہی جاتی ہیں، پہلی رکعت میں تین زائد تکبیرات قرأت سے پہلے اور دوسری رکعت میں قرأت کے بعد رکوع میں جانے سے پہلے۔

حضرت قاسم ابوعبدالرحمٰن کہتے ہیں: مجھ سے بعض اصحاب رسول نے بیان کیا ہے کہ نبی ﷺ نے ہمیں نماز عید پڑھائی تو چار چار تکبیر کہیں، پھر نماز سے فارغ ہونے کے بعد ہماری طرف متوجہ ہو کر فرمایا: بھولنا نہیں جنازہ کی تکبیروں کی طرح ہے اور پھر انگلیوں سے اشارہ کیا اور انگوٹھے کو موڑے رکھا۔(۲) حضرت سعید بن العاص نے حضرت ابو موسی اشعریؓ اور حضرت حذیفہ بن یمانؓ سے دریافت کیا کہ نبی ﷺ: عید الفطر و عید الاضحیٰ کی نماز میں تکبیرات کیسے کہا کرتے تھے، حضرت ابو موسیٰؓ نے فرمایا:

رسول پاک ﷺ جنازہ کی تکبیروں کی طرح (ہر رکعت میں) چار تکبیریں کہا کرتے تھے۔(۳)

عبداللہ بن مسعودؓ کا ارشاد ہے: عیدین میں چار تکبیریں ہیں (ہر رکعت میں) نماز جنازہ کی تکبیروں کی طرح۔(۴) ایک اور روایت میں مزید وضاحت ہے کہ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے فرمایا: پہلی رکعت میں قرأت سے پہلے چار تکبیریں (مع تکبیر تحریمہ)

---

(۱) أبو داؤد تحقيق الألباني : باب الصلاة بعد صلاة العيد : ۱۱۶۱ – صحيح

(۲) طحاوی : باب صلاة العيدين كيف التكبير فيهما : ۷۲۷۳– حسن : امام طحاویؒ

(۳) أبو داؤد تحقيق الألباني : باب التكبير في العيدين : ۱۱۵۵ – حسن صحيح

(۴) طبرانی كبير: ۹۴۰۷ – رجاله ثقات : مجمع الزوائد : باب التكبير في العيد : ۳۲۵۱

کہو پھر قرأت کرو، جب قرأت سے فارغ ہو جاؤ تو تکبیر کہہ کر رکوع کرو، پھر دوسری رکعت میں کھڑے ہو جاؤ تو پہلے قرأت کرو پھر قرأت سے فارغ ہونے کے بعد چار تکبیریں (مع تکبیر رکوع) کہو۔(۱) عبداللہ بن حارث کہتے ہیں، حضرت ابن عباسؓ نے عید کے دن پہلی رکعت میں چار تکبیریں کہیں پھر قرأت فرمائی اور رکوع کیا پھر دوسری رکعت میں کھڑے ہوئے تو قرأت فرمائی پھر تین تکبیریں کہیں، رکوع کی تکبیر اس کے علاوہ تھی۔(۲)

(۱۰) عیدین کا خطبہ نماز کے بعد

حضرت ابن عمرؓ کہتے ہیں کہ نبی ﷺ اور حضرت ابوبکرؓ و عمرؓ خطبہ سے پہلے نماز عید پڑھا کرتے تھے۔(۳)

(۱۱) عید کی نماز فوت ہو جائے تو:

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے مروی ہے کہ جس آدمی کی نماز عید فوت ہو جائے وہ (بطور نفل کے) چار رکعت پڑھ لے۔(۴) یہ نماز عید کی قضا نہیں ہے بلکہ نماز چاشت کہلا گی۔(۵)

(۱۲) تکبیرات تشریق

نویں ذی الحجہ کی فجر سے تیرہویں تاریخ کی عصر تک تکبیرات تشریق کہنا ضروری ہے، حضرت جابرؓ بن عبداللہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ: نویں تاریخ کی فجر کے بعد سے

---

(۱) السنن الکبری للبیھقي : باب ذکر الخبر الذي روي في التکبیر أربعا : ۶۴۰۴ مصنف عبد الرزاق کتاب صلوۃ العیدین : ۵۶۸۷۔ صحیح : آثار السنن ۱۰۲/۲

(۲) محلّی ابن حزم : ۲۰۶/۳ – صحیح : إعلاء السنن : ۱۳۶/۸

(۳) بخاری : باب الخطبة بعدالعید : ۹۶۲

(۴) طبرانی کبیر : ۹۴۱۷ – ۹۵۳۲ – رجاله ثقات : مجمع الزوائد : ۳۲۵۳ – باب فیمن فاتته صلاة العید

(۵) شامی : ۱۷۱/۲

آخری ایام تشریق کی عصر تک، جب فرض نماز کا سلام پھیرتے تو تکبیر کہا کرتے تھے (۱)
تکبیرات تشریق آواز سے کہنا مسنون ہے۔(۲)

ارشاد خداوندی ہے: اور تم اللہ کا ذکر کیا کرو گنتی کے دنوں میں۔(۳) حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں: ان ایام سے مراد ایام تشریق ہیں۔(۴) یحی بن کثیرؒ فرماتے ہیں، اس سے مراد ایام تشریق میں نمازوں کے بعد تکبیر کہنا ہے۔(۵)

قاضی ابوبکر بن العربیؒ، اس آیت کی تفسیر کے ذیل میں لکھتے ہیں: فقہاء اسلام، مشہور صحابہؓ وتابعینؒ اس پر متفق ہیں کہ اس سے مراد ہر شخص کے لئے تکبیر (کہنے کا حکم کرنا) ہے خصوصاً نمازوں کے اوقات میں، لہذا ہر نمازی خواہ وہ جماعت سے نماز پڑھ رہا ہو یا تنہا، نماز کے ختم ہونے کے بعد ان ایام میں واضح طور پر تکبیر کہے۔(۶)

فائدہ (۱): عیدین کے خطبہ کے آغاز میں لگا تار نو تکبیر کہنا اور خطبہ ثانیہ کے شروع میں لگا تار نو تکبیریں کہنا مستحب ہے، پھر خطبہ کے درمیان جتنا اضافہ ہو، اچھا ہے، تاہم اس کا خیال رکھا جائے کہ یہ تکبیریں، باقی خطبہ سے زیادہ نہ ہونے پائیں۔(۷)

ارشاد نبوی ہے ان ایام میں تکبیر اور تہلیل وتسبیح کی کثرت رکھو۔(۸) نیز ارشاد ہے

---

(۱) الدر قطني: باب العيدين: ۱۷۵۴ - مستدرک حاکم مع تعليقات الذهبي: كتاب صلاة العيدين عن عليؓ وعمارؓ: ۱۱۱۱ - صحيح. موقوف روايات نهايت صحيح هيں: ارواء الغليل: ۶۵۳

(۲) بخاری تعليقا: باب التكبير أيام منى

(۳) البقرة: ۲۰۳

(۴) بخاری تعليقا: باب فضل العمل فی ايام التشريق

(۵) الدر المنثور: ۱/۴۶۸، البقرة: ۲۰۳

(۶) أحكام القرآن: ۱/ ۲۸۰ البقرة: ۲۰۳

(۷) شامی: ۶/ ۱۷۰

(۸) طبرانی كبير: ۱۰۹۵۳ - صحيح: مجمع الزوائد: باب في عشر ذي الحجة: ۵۹۳۲

اپنی عیدوں کو تکبیر کے ذریعہ رونق بخشو۔(۱)

حضرت عبید اللہ بن عبد اللہ بن عتبہ ؒ فرماتے ہیں، عید الفطر و عید الاضحیٰ میں، آغاز خطبہ سے پہلے، منبر پر تکبیر کی سنت یہ ہے کہ امام خطبہ شروع کرنے سے پہلے منبر پر کھڑے ہو کر مسلسل نو تکبیریں کہے پھر خطبہ دے پھر کچھ دیر کے لئے بیٹھ جائے پھر خطبہ ثانیہ کے لئے کھڑے ہو جائیں اور لگاتار سات تکبیریں کہے پھر خطبہ دے۔(۲)

فائدہ(۲) عیدین کے دن مبارکبادی دینا:

حضرت محمد بن زیاد کہتے ہیں: میں حضرت ابو امامہ باہلیؓ اور دیگر اصحاب رسول اللہ ﷺ کے ساتھ تھا، تو جب وہ (عیدگاہ سے) لوٹنے لگے تو ایک دوسرے سے کہنے لگے: تقبل الله منا و منک، (اللہ ہم سے اور تم سے قبول فرمائے)۔(۳)

---

(۱) طبرانی اوسط : حسن : إعلاء السنن : ۸/۱۶۱

(۲) السنن الكبرى للبيهقي : باب التكبير في الخطبة في العيدين : ۶۴۳۸ – ضعيف الإسناد : خلاصة الأحكام : ۲۹۶۰

(۳) الجوهر النقي : ۳/۳۱۹ – إسناده اسناد جيد قد ثبت ذلک من طرق أخرى أن الصحابة كانوا إذا التقوا يوم العيد يقول بعضهم لبعض تقبل الله منا ومنک – السلسلة الضعيفة مختصرة : ۵۶۶۶

جنائز کا بیان

جان کنی کے وقت کی ہدایات:

(الف) جب کسی آدمی کا آخری وقت آجائے تو اس کو داہنی کروٹ پر لٹا کر منہ قبلہ کی طرف کیا جائے (ب) اس کے قریب میں سورۃ یٰسٓ کی تلاوت کی جائے (ج) اور کوئی سمجھدار آدمی اس کے سرہانے بیٹھ کر کلمہ طیبہ کا ورد کرتا رہے، مرنے والے سے پڑھنے کو نہ کہے، پھر اگر وہ سن کر ایک دفعہ کلمہ طیبہ پڑھ لیتا ہے تو ورد کرنے والا چپ ہو جائے۔

(الف) حضرت ابو قتادہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی ﷺ جب مدینہ تشریف لائے تو حضرت براء بن معرور رضی اللہ عنہ کے بارے میں دریافت کیا تو لوگوں نے کہا: ان کا انتقال ہو گیا ہے اور انھوں نے یہ وصیت کی ہے کہ انہیں قبلہ رخ کیا جائے، اس پر رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: انہوں نے فطرت کے مطابق کیا ہے، پھر آپ ﷺ تشریف لے گئے اور ان پر نماز جنازہ پڑھی۔(۱)

(ب) حضرت ابو الدرداءؓ اور حضرت ابو ذرؓ سے مروی ہے کہ نبی ﷺ نے ارشاد فرمایا جس کسی مرنے والے کے قریب میں سورۃ یٰسٓ پڑھا جاتا ہے، اللہ تبارک وتعالی اس پر (موت کو) آسان کر دیتے ہیں۔(۲) معقل بن یسارؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد

---

(۱) مستدرک حاکم مع تعلیقات الذهبي : كتاب الجنائز : ۱۳۰۵ – صحیح : امام حاکم

(۲) ابو نعیم فی اخبار اصبهان : ۱/۱۸۸ : حسن أو صحيح : إعلاء السنن : ۸/۲۱۰

فرمایا: اپنے موتٰی کے پاس سورۂ یٰسٓ پڑھو۔(۱)

(ج) حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ اپنے مرنے والوں کو لاَ اِلٰـهَ اِلَّا اللّٰهُ کی تلقین کرو؛ کیوں کہ موت کے وقت جس کسی کا آخری کلام لاَ اِلٰـهَ اِلَّا اللّٰهُ ہوتا ہے وہ جنت میں داخل ہو جاتا ہے۔(۲)

حضرت ابوہریرہ ﷛ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: اپنے مرنے والوں کو لاَ اِلٰـهَ اِلَّا اللّٰـهُ کی تلقین کرو(۳) اور ان کو بیزار نہ کرو کیوں کہ وہ موت کی سختیوں میں ہوتے ہیں۔(۴)

جان نکلنے کے بعد:

جب انسان مرجائے تو اس کے اعضاء درست کردیں، آنکھیں بند کردیں اور چادر سے اس کے بدن کو ڈھانک دیں۔

حضرت ام سلمہؓ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم، حضرت ابوسلمہؓ کے پاس ان کی روح نکلنے کے بعد تشریف لائے، ان کی آنکھیں کھلی ہوئی تھیں تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں بند فرمایا۔(۵)

حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں: جب رسول اللہ ﷺ کی وفات ہوئی تو آپ ﷺ کا ایک یمنی چادر سے پردہ کردیا گیا تھا۔(۶)

---

(۱) مستدرک حاکم : کتاب فضائل القرآن : ۲۰۷۴ – سکت علیه الحاکم

(۲) صحیح بن حبان : فصل في المحتضر : ۳۰۰۴ – صحیح : شعیب الأرنؤوط

(۳) مسلم : باب تلقین الموتی : ۲۱۶۴

(۴) کنز العمال : ۴۲۲۰۳ – ضعیف : إعلاء السنن : ۲۰۹/۸

(۵) مسلم : باب فی اغماض المیت : ۲۱۶۹

(۶) بخاری : باب البرود والحبرة : ۵۸۱۴

مردے کو نہلانے کا مسنون طریقہ:

جس تختہ پر غسل دیا جائے اس کو تین دفعہ یا پانچ یا سات دفعہ لوبان کی دھونی دی جائے، حضرت جابرؓ سے مروی ہے کہ نبی ﷺ نے ارشاد فرمایا: جب تم میت کو خوشبو کی دھونی دو تو طاق عدد کی رعایت رکھو۔(۱)

میت کو اس پر اس طرح لٹایا جائے کہ قبلہ اس کے دائیں طرف ہو، سونے میں (۲) لیٹ کر نماز پڑھنے میں (۳) سکرات کی حالت میں (۴) یہی طریقہ بیان ہوا کہ قبلہ، داہنی جانب میں ہو، پس مرنے کے بعد تمام مراحل میں اسی طریقہ کو اختیار کیا جائے گا۔

پھر میت کے بدن کے کپڑے اتار لیا جائے اور ایک تہبند اس کے ستر پر ڈال کر اندر ہی اندر وہ کپڑے اتار لیں، یہ تہبند موٹے کپڑے کا ناف سے پنڈلی تک ہونا چاہئے تاکہ بھیگنے کے بعد بدن نظر نہ آئے، حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کے غسل کے موقع پر صحابہ کو تردد ہوا کہ آیا عام مردوں کی طرح، رسول اللہ ﷺ کے جسد اطہر کو بھی بے لباس کیا جائے یا جسم اطہر پر موجود کپڑوں کے ساتھ ہی غسل دیا جائے؟ پھر اشارۂ غیبی سے صحابہؓ نے رسول اللہ ﷺ کو جسم اطہر پر کپڑوں کے ہوتے ہوئے ہی غسل دیا۔(۵) معلوم ہوا کہ عام مردوں سے غسل کے موقع پر کپڑے اتار لینے کا دستور چلا آرہا ہے، ستر کی جگہ البتہ چھپی ہوئی رہے گی۔ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: کسی زندہ یا مردہ انسان کی ران نہ دیکھو۔(٦)

---

(۱) مسند ابو يعلى : ۲۳۰۰ : صحيح : محقق كتاب حسين سليم أسد

(۲) مسلم : باب ما يقول عند النوم : ۷۰۵۷

(۳) بخاری : باب إذا لم يطق قاعدا صلى على جنب : ۱۱۱۷

(۴) مستدرک حاکم : كتاب الجنائز : ۱۳۰۵ – صحيح : إمام حاكمؒ

(۵) أبو داؤد تحقيق الالبانى : باب في ستر الميت عند غسله : ۳۱۴۳ – حسن

(٦) مسند أحمد : تحقيق الأرنؤوط : ۱۲۴۸ – صحيح لغيره وهذا إسناد ضعيف

ایوب کہتے ہیں: میں نے انہیں (ابو قلابہ) مردہ کو غسل دیتے ہوئے دیکھا اورانہوں نے اس کی شرمگاہ پر ایک کپڑا ڈال رکھا تھا۔(۱)

غسل شروع کرنے سے پہلے بائیں ہاتھ میں دستانہ پہن کر اسے استنجاء کرائیں

حضرت عبداللہ بن حارثؓ کہتے ہیں: نبی ﷺ کو حضرت علیؓ نے غسل دیا اور آپؐ کے ہاتھ پر ایک کپڑا تھا، غسل دیتے ہوئے حضرت علیؓ نے اپنا ہاتھ قمیص کے نیچے داخل کیا اور قمیص آنحضرت ﷺ کے جسد اطہر پر موجود تھا۔(۲)

پھر وضو اس طرح کرائیں کہ نہ اس میں کلی ہو، نہ ناک میں پانی ڈالا جائے؛ بلکہ روئی کا پھایا تر کرکے ہونٹوں دانتوں اور مسوڑھوں پر پھیر کر پھینک دیجئے، اس طرح تین دفعہ کیجئے، پھر اسی طرح ناک کے دونوں سوراخوں کو روئی کے پھائے سے صاف کیجئے، پھر ناک اور منہ اور کانوں میں روئی رکھ دیجئے؛ تاکہ غسل کراتے وقت پانی اندر نہ جائے پھر منہ دھلائیے، پھر ہاتھ کہنیوں سمیت دھلائیے، پھر سر کا مسح کرائیے، پھر تین دفعہ دونوں پیر دھوئیے، حضرت سعید بن جبیرؒ سے مروی ہے کہ میت کو نماز کے وضو کی طرح وضو کرایا جائے مگر یہ کہ کلی اور ناک میں پانی نہ دیا جائے۔(۳)

جب وضو مکمل ہو جائے تو سر کو اور داڑھی کو صابن وغیرہ سے مل کر صاف کر دیجئے، حضرت اسودؒ کہتے ہیں میں نے حضرت عائشہؓ سے پوچھا کیا میت کے سر کو خطمی سے دھویا جائے؟

---

(۱) مصنف عبدالرزاق : باب غسل الميت : ٦٠٨١

(۲) مصنف ابن أبي شيبة : في الميت يغسل من قال يستر ولا يجرد : ١٠٩٩٤ ، طبرانی أوسط : ٢٩٠٨ – طبرانی كبير : ٦٢٨ – حسن : مجمع الزوائد : ١٤٢٦٦

(۳) مصنف ابن ابی شیبه :ما أول ما يبدأ به من غسل الميت : ١١٠٠٥ – سكت عليه المحقق محمد عوامه

تو حضرت عائشہؓ نے فرمایا کہ اپنے میت کے سلسلہ میں سختی اور تنگی سے کام مت لو۔(۱)

پھر میت کو بائیں کروٹ پر لٹایئے اور بیری کے پتوں میں پکایا ہوا نیم گرم پانی، دائیں کروٹ پر تین دفعہ یا پانچ دفعہ سر سے پیر تک اتنا ڈالئے کہ نیچے کی جانب بائیں کروٹ تک پہنچ جائے، پھر دائیں کروٹ پر لٹا کر اسی طرح سر سے پیر تک اتنا پانی ڈالئے کہ نیچے کی جانب دائیں کروٹ تک پہنچ جائے، اخیر دفعہ میں کافور ملا ہوا پانی استعمال کیا جائے، حضرت ام عطیہؓ فرماتی ہیں: رسالتمآب ﷺ اپنی صاحبزادی کی وفات پر ہمارے پاس تشریف لائے اور فرمایا: انہیں تین یا پانچ یا اگر مناسب دیکھو تو اس سے زیادہ بار غسل دو اور سیدھی جانب سے غسل کا آغاز کرنا اور اخیر دفعہ میں کافور کا استعمال کرنا۔(۲) حضرت محمد بن سرینؒ حضرت ام عطیہ سے میت کو غسل دینے کا طریقہ سیکھا کرتے تھے کہ شروع میں دو دفعہ بیری کی پتیوں والے پانی سے غسل دیا جائے پھر تیسری دفعہ میں کافور ملے ہوئے۔(پانی سے) غسل دیا جائے۔(۳)

اس کے بعد میت کو ٹیک لگا کر ذرا بٹھلانے کے قریب کیجئے اور اس کے پیٹ کو اوپر سے نیچے کی طرف آہستہ آہستہ دبایئے، اگر کچھ فضلہ خارج ہو تو صرف اسی کو پونچھ کر دھو دیجئے، وضو اور غسل دہرانے کی ضرورت نہیں ہے۔

حضرت ابراہیم نخعیؒ ارشاد فرماتے ہیں: میت کے پیٹ کو پہلی بار میں اور دوسری بار میں نرمی سے ملا جائے۔(۴) حضرت حمادؒ نے فرمایا: میت کے غسل سے فارغ ہونے کے بعد اس سے کوئی چیز نکلے تو صرف اس جگہ کو دھولیا جائے۔(۵) غسل شروع کرنے سے قبل

---

(۱) مصنف ابن ابی شیبہ :في الميت إذا لم يوجد له سدر يغسل بغيره : ۱۱۰۲۶ – سکت علیه المحقق محمد عوامه

(۲) مسلم : باب في غسل الميت : ۲۲۱۱ – ۲۲۱۸

(۳) أبو داؤد تحقيق الالباني : باب كيف غسل المبت : ۳۱۴۹ – صحيح

(۴) مصنف ابن ابی شیبہ :في عصر بطن الميت : ۱۱۰۴۲ – سکت علیه المحقق محمد عوامه

(۵) مصنف ابن ابی شیبہ : ما قالوا في الميت يخرج منه الشيء بعد غسله : ۱۱۰۳۹ – سکت علیه المحقق محمد عوامه

بھی یہ عمل کیا جاسکتا ہے، نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشادِ گرامی ہے: جو آدمی کسی مردے کو غسل دے تو وہ پہلے اس (کے پیٹ) کو دبائے۔(۱)

حضرت ام سلیمؓ سے مروی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: جب کوئی خاتون وفات پائے اور وہ حاملہ نہ ہو تو اس کو غسل دینے والوں کو چاہئے کہ وہ آغاز ہی میں اس کے پیٹ کو آہستہ سے ملیں۔(۲) بسا اوقات پیٹ میں نجاست جمی ہوئی حالت میں رہتی ہے، ایک دو دفعہ نعش پر پانی بہانے کے بعد وہ نرم پڑ جاتی ہے اور اب پیٹ کو دبایا جاتا ہے تو وہ آسانی سے خارج ہو جاتی ہے، میت کی حالت کو مدنظر رکھتے ہوئے ان دو طریقوں: یعنی غسل کے شروع میں یا غسل کے درمیان میں پیٹ دبانے کے عمل میں سے کسی کو بھی اختیار کیا جاسکتا ہے۔(۳)

اور میت کے اعضاء سجدہ پر بھی کافور مل دیجئے، حضرت ابن مسعودؓ فرماتے ہیں: میت کے اعضاء سجدہ پر کافور ملا جائے۔(۴)

فائدہ: عورت، اپنے شوہر کو غسل دے سکتی ہے مگر مرد اپنی بیوی کو غسل نہیں دے سکتا، عبداللہ بن ابی بکرؓ سے مروی ہے کہ حضرت اسماء بن عمیسؓ اہلیہ حضرت ابوبکر صدیقؓ نے حضرت ابوبکر صدیقؓ کو ان کی وفات پر غسل دیا تھا۔(۵)

حضرت عمرؓ نے اپنی اہلیہ کی وفات پر اہلیہ کے عزیز و اقارب سے فرمایا تھا کہ جب

---

(۱) السنن الكبرى للبيهقي : الجنائز : باب ما يؤمر به من تعاهد : ٦٨٦٧ – مرسل وروايه ضعيف امام بيهقيؒ

(۲) طبراني كبير : ۲۰۸۱۲ – رجاله ثقات : مجمع الزوائد : باب تجهيز الميت وغسله : ۴۰۷۴

(۳) إعلاء السنن : ۲۱٦/۸

(۴) مصنف ابن ابی شیبه : ما قالوا في الميت كم يغسل مرة وما يجعل في الماء : ۱۱۰۲۵ – سكت عليه الحافظ في الدراية : ۲۳۰/۱

(۵) موطا امام مالک : باب غسل الميت : ۵۲۵

تک وہ باحیات تھیں ہم اس کے زیادہ حقدار تھے مگر اب جبکہ وہ وفات پا چکیں تو تم اس کے (غسل دینے کے) زیادہ حقدار ہو۔(۱)

نبی ﷺ سے مروی ہے کہ جب کوئی عورت مردوں کے درمیان وفات پا جائے جہاں کوئی عورت موجود نہ ہو، یا کوئی مرد، عورتوں کے درمیان مر جائے جہاں کوئی مرد نہ ہو، تو ان دونوں کو فقط تیمّم کرا دیا جائے اور دفن کر دیا جائے۔(۲)

بیوی، جب مر جاتی ہے تو شوہر سے رشتۂ زوجیت بالکل منقطع ہو جاتا ہے یہی وجہ ہے کہ مذکورہ آدمی، بیوی کے مرنے کے بعد دوسرے ہی لمحہ، بیوی کی بہن سے شادی کرنا چاہے تو کر سکتا ہے، لیکن جب شوہر مرتا ہے تو بیوی، زوجیت سے بالکل علیحدہ نہیں ہوتی بلکہ عدت کے اندر اندر تک وہ زوجہ کے حکم میں رہتی ہے۔

پس معلوم ہوا کہ بیوی جب مر جاتی ہے تو شوہر اس کے حق میں مکمل اجنبی ہو جاتا ہے، وہاں اگر کوئی عورت دستیاب نہ ہو تو اس خاتون کو تیمّم کرا کے دفن کر دیا جائے گا اور شوہر جب مر جاتا ہے تو بیوی اس کے حق میں مکمل اجنبیہ نہیں ہوتی وہ اسے غسل دے سکتی ہے، جیسا کہ حضرت اسماء بنت عمیس رضی اللہ عنہا کے عمل سے بھی ثابت ہوتا ہے۔

بعض روایات میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کا حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کو غسل دینا مروی ہے لیکن اس کا مطلب عملاً غسل دینا نہیں بلکہ غسل کا بندوبست کرنا ہے، حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے سابقہ فرمان کی روشنی میں، روایت مذکورہ کا یہی مفہوم لئے بغیر چارہ کار نہیں۔(۳)

---

(۱) کتاب الآثار : امام محمد : باب غسل المرأة و كفنها : ۲۲۸ – مقبول : إعلاء السنن : ۲۲۵/۸

(۲) مراسيل أبي داؤد : باب ماجاء في غسل الميت : ۳۸۹ – صالح للاحتجاج :إعلاء السنن : ۲۲۷/۸

(۳) إعلاء السنن : ۲۲۴/۸

کفن کا بیان

کفن کا رنگ: کفن سفید کپڑوں کا ہونا چاہئے، نبی ﷺ کا رشاد گرامی ہے: سفید کپڑوں کو پہنا کرو کیوں کہ وہ تمہارے کپڑوں میں بہترین کپڑے ہیں، اور اپنے مرحومین کو انہی میں کفن دو۔(۱)

مرد کا کفن

مرد کے لئے تین کپڑے کفن میں مسنون ہیں: (۱) ازار (وہ کپڑا جو سر کے پاس سے پاؤں تک ہوتا ہے) (۲) قمیص (بے آستین: بغیر گریبان وکلی والا کرتہ جو گردن سے پاؤں تک ہوتا ہے) (۳) لفافہ: (اوپر کی لمبی چادر جو ازار سے قدرے بڑی ہوتی ہے)

اگر یہ تین کپڑے میسر نہ ہوں تو دو کپڑوں میں بھی کفن دیا جاسکتا ہے اگر یہ بھی نہ ہوں تو جتنا کپڑا دستیاب ہو اس میں کفن دے دیا جائے۔

حضرت عائشہؓ سے مروی ہے کہ نبی پاک ﷺ کو تین سفید سوتی کپڑوں میں کفن دیا گیا جو یمن کے تھے، ان میں (عام طرز کی آستین وگریبان والی) قمیص شامل نہ تھی اور نہ ہی عمامہ شامل تھا۔(۲) حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں: ایک آدمی عرفہ میں وقوف کررہا تھا کہ اپنے کجاوے سے گر گیا اور اس کی گردن ٹوٹ گئی، آنحضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا: اس کو پانی اور بیری کے پتے سے غسل دو اور دو کپڑوں میں کفن دو۔(۳) معلوم ہوا کہ دو کپڑوں میں بھی کفن دینا کافی ہے، حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاصؓ سے روایت ہے کہ میت کو پہلے قمیص پہنایا جائے گا، پھر ازار پہنائی جائے گی پھر تیسرے کپڑے سے لپیٹا جائے گا، پس اگر

---

(۱) ترمذی: باب ما یستحب من الاکفان: ۹۹۴ – حسن صحیح: امام ترمذیؒ

(۲) بخاری: باب الثیاب البیض للکفن: ۱۲۶۴

(۳) بخاری باب الکفن فی ثوبین: ۱۲۶۵

کپڑے نہ ہوں تو ایک ہی کپڑے میں کفنا دیا جائے گا۔(۱)

حضرت مصعب بن عمیرؓ کا کفن بھی ایک ہی نامکمل کپڑے کا تھا۔(۲)

کفنانے کا طریقہ: کفن دیتے وقت پہلے تخت پر لفافہ پھیلا دیا جائے، اس کے اوپر ازار اور ازار کے اوپر قمیص پھر میت کو قمیص پر رکھ کر اس کے سر کو قمیص کی پھٹن میں گھسا دیں اور قمیص کا اوپر والا حصہ میت پر ڈالدیں پھر قمیص پر ازار، پھر لفافہ لپٹیں، پہلے بائیں طرف کو لپٹیں پھر دائیں طرف کو تاکہ دایاں کنارہ اوپر رہے کہ اس میں دائیں جانب کا اعزاز اور حالت حیاۃ میں چادر اوڑھنے کے طریقہ سے مطابقت بھی ہے۔

عورت کا کفن اور اسے کفنانے کا طریقہ:

عورت کے لئے کفن میں پانچ کپڑے مسنون ہیں: (۱) سینہ بند (جو بغل سے رانوں تک باندھا جاتا ہے) (۲) قمیص (۳) سر بند یا ڈوپٹہ (جو سر اور بالوں پر ڈالا جاتا ہے) (۴) ازار (۵) لفافہ۔

حضرت لیلی بنت قانف الثقفیہؓ سے مروی ہے کہ میں ان عورتوں کے ساتھ شریک تھی، جنہوں نے حضرت ام کلثومؓ کو غسل دیا تھا، رسول اللہ ﷺ دروازہ ہی پر تشریف فرما تھے اور آپ ﷺ کے ہمراہ اپنی صاحبزادی کا کفن تھا جس میں سے ایک ایک کپڑا ہمارے حوالے فرما رہے تھے، پہلے چادر دی، پھر قمیص پھر ڈوپٹہ پھر سینہ بند (انہیں سمیٹ کر ہم ایک کے اوپر ایک رکھتے گئے جب کفن دینے کا موقع آیا تو پہلے سینہ بند باندھا گیا پھر سر پر ڈوپٹہ اوڑھایا گیا پھر قمیص پہنائی گئی پھر چادر) پھر اخیر میں انہیں ایک کپڑے

---

(۱) مؤطا مالک : باب ما جاء في كفن الميت : ۵۲۹

(۲) أبو داؤد تحقيق الالباني : باب في الكفن : ۳۱۵۷ – صحيح

(لفافہ) میں لپیٹ دیا گیا۔(۱) سینہ بند کو قمیص کے اوپر بھی باندھا جاسکتا ہے اسی طرح ازار کے اوپر بھی باندھا جاسکتا ہے۔(۲)

علامہ ظفر احمد عثمانیؒ نے مذکورہ حدیث کی تشریح میں ایک اور طریقہ یہ بیان فرمایا کہ ازار بالکل نیچے ہو، اس پر قمیص پہنائی جائے اور ڈوپٹہ اوڑھایا جائے پھر سینہ بند باندھا جائے پھر لفافہ میں لپیٹ دیا جائے۔(۳)

چوں کہ احادیث سے ایسی کوئی بات سامنے نہیں آتی کہ جس کی بنا پر کسی خاص ترتیب کے مطابق میت کو کپڑوں میں لپیٹنا ضروری اور واجب ہونا معلوم ہوتا ہو اس لئے ان طریقوں میں سے کسی طریقہ کو بھی اختیار کیا جاسکتا ہے۔(۴)

عورت کا کفن سنت یہی پانچ کپڑے ہیں، اگر یہ میسر نہ ہوں تو کم از کم تین کپڑوں میں کفن دیا جائے، ازار لفافہ اور سربند، محمدؒ کہا کرتے تھے کہ جو عورت بالغ ہو چکی ہو، اس کو کفن دیا جائے گا، پانچ کپڑوں میں یا تین کپڑوں میں،(۵) معلوم ہوا کہ تین کپڑوں سے بھی کام چل سکتا ہے، یہ بھی میسر نہ ہوں تو پھر جس قدر کپڑا دستیاب ہو اس میں کفن دے دیا جائے۔

عورت کے بال کی دو یا تین چوٹیاں بنا کر اس کے سینے پر یا پیٹھ کی طرف ڈالدیا جائے۔ حضرت ام عطیہؓ سے روایت ہے کہ ہم نے صاحبزادئ رسول ﷺ کے بالوں کی تین

---

(۱) ابو داؤد : باب في كفن المرأة : ۳۱۵۹ – سكت عليه – حسن : عون المعبود : باب كفن المرأة : ۳۰۱/۸

(۲) شامي : ۶۳۸/۱

(۳) اعلاء السنن : ۲۴۸/۸

(۴) اعلاء السنن : ۲۴۸/۸

(۵) مصنف ابن ابی شیبه : فی کم تکفن المرأة : ۱۱۱۹۶ – سکت علیه المحقق محمد عوامه

چوٹیاں بنائیں اور انہیں، ان کے پیچھے ڈال دیا۔(۱) یہ حضرت ام عطیہؓ نے اپنی صوابدید سے ایسا کر دیا تھا، تاہم اگر اس جانب غور کیا جائے کہ چوٹیوں کو پشت کی طرف ڈالنا، دراصل زندگی میں بغرض زینت ہوا کرتا ہے اور مرنے کے بعد زیب و زینت کا چوں کہ کوئی محل نہیں؛ اس لئے چوٹیوں کو سینہ پر رکھ دیا جاتا ہے تو یہ بھی نہایت موزوں ہے(۲)

یہاں یہ خیال رہے کہ چوٹیاں ڈالنا محض ہاتھ کے ذریعہ ہو، کنگھی کا استعمال مناسب نہیں، حضرت عائشہؓ نے دیکھا کہ میت کے سر کو کنگھا کیا جا رہا ہے تو انہوں نے فرمایا کہ اپنے میت کے بالوں کو کیوں سنوارتے ہو؟(۳)

میت کے ناخن بھی نہ کاٹے جائیں۔(۴)

---

(۱) بخاری : یلقی شعر المیت خلفها :۱۲۶۳

(۲) بدائع الصنائع : ۳۰۸/۱

(۳) کتاب الآثار : امام محمد : باب الجنائز : ۲۲۵ – صحیح : إعلاء السنن : ۲۱۹/۸

(۴) مصنف عبدالرزاق : باب شعر المیت وأظفاره : ۶۲۲۸ – رجاله رجال الصحیح : مسلم : باب استحباب النزول : ۳۲۲۷

نماز جنازہ کا بیان

نماز جنازہ کا طریقہ:

نماز جنازہ میں چار تکبیریں کہی جائیں، پہلی تکبیر کے بعد ثنا پڑھے دوسری تکبیر پر درود پڑھے اور تیسری تکبیر پر دعا پڑھے، چوتھی تکبیر کہہ کر سلام پھیر دے، ہاتھ صرف پہلی تکبیر پر اٹھائے جائیں گے، نبی ﷺ نے نجاشی کی نماز جنازہ پڑھائی تو چار تکبیریں کہیں، (۱) ایک دفعہ حضرت انسؓ نے جنازہ کی نماز پڑھائی اور تین تکبیریں کہیں پھر ان سے کہا گیا تو انہوں نے قبلہ رخ ہو کر چوتھی تکبیر کہی پھر سلام پھیرا، (۲) اس سے معلوم ہوا کہ نماز جنازۃ میں چار تکبیریں ہیں اور تکبیرات ہی جنازہ کی نماز میں اصل رکن ہیں، یہی وجہ ہے کہ حضرت انسؓ نے ایک تکبیر کے بھی چھوٹنے کو گوارا نہیں فرمایا بلکہ متنبہ ہونے کے بعد فوراً اسے ادا کرلیا۔ حضرت عمرؓ کے زمانہ خلافت تک بھی تکبیرات جنازہ کے بارے میں لوگوں کے درمیان اختلاف رائے پایا جاتا تھا، کچھ لوگ پانچ کچھ چھ اور کچھ لوگ چار تکبیریں کہتے تھے، حضرت عمرؓ نے اس صورتحال کی نزاکت کو بھانپ کر اس کی تحقیق کروائی کہ نبی ﷺ نے اپنی حیات میں جو آخری نماز جنازہ پڑھائی تھی اس میں کتنی تکبیریں کہی تھیں؟ معلوم ہوا کہ چار تکبیریں کہی تھیں، چنانچہ چار تکبرات کے ساتھ نماز جنازہ پر تمام صحابہ کا اتفاق ہوگیا۔ (۳)

حضرت ابوہریرہؓ فرماتے ہیں جب جنازہ رکھو تو تکبیر کہو اور اللہ کی تعریف کرو پھر (تکبیر کہہ کر) نبی ﷺ پر درود پڑھو پھر (تکبیر کہہ کر) یہ دعا پڑھو۔ (۴)

---

(۱) بخاری : باب الصفوف علی الجنازۃ : ۱۳۱۸

(۲) بخاری تعلیقًا : باب التکبیر علی الجنازۃ أربعا

(۳) كتاب الآثار لأبي يوسف : باب في غسل الميت وكفنه : ۳۹۰ – كتاب الآثار لإمام محمد : باب الصلاۃ علی الجنازۃ : ۲۳۸– صحيح : إعلاء السنن : ۲۶۴/۸

(۴) موطا مالک : باب ما يقول المصلي على الجنازۃ : ۷۷۵

حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز جنازہ پڑھائی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے دونوں ہاتھوں کو پہلی تکبیر میں اٹھایا پھر داہنے ہاتھ کو بائیں ہاتھ پر رکھ لیا۔(۱)

حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جنازہ کی نماز کی پہلی تکبیر کے ساتھ ہاتھ اٹھاتے پھر دوبارہ نہیں اٹھاتے۔(۲)

نماز جنازہ کی حقیقت:

نماز جنازہ درحقیقت، میت کے حق میں دعا کرنا ہے، نبی ﷺ نے ارشاد فرمایا: جب تم کسی میت کی نماز جنازہ پڑھو تو اس کے لئے اخلاص کے ساتھ دعا کرو۔(۳)

دعا کے آداب یہ ہیں کہ پہلے اللہ کی حمد وثنا کی جائے پھر رسول اللہ ﷺ پر درود بھیجا جائے پھر دعا کی جائے (۴) دعا کا ایک اہم ادب یہ بھی ہے کہ دعا آہستہ وپست آواز میں کی جائے۔(۵) نماز جنازہ میں دعا کی یہ ساری خصوصیات موجود ہیں؛ چنانچہ پہلی تکبیر کے بعد، حمد وثنا کرنا ہے خواہ معروف ثنا کے الفاظ کے ساتھ یا کچھ اور کلمات کے ساتھ خواہ سورۃ فاتحہ کے ذریعہ، دوسری تکبیر کے بعد درود وسلام پڑھنا ہے، اور تیسری تکبیر کے بعد میت کے لئے دعا کرنا خواہ کسی بھی دعا کے ذریعہ ہو یہ سب کچھ آہستہ وبے آواز پڑھنا ہے۔(٦)

---

(۱) ترمذی تحقیق الالبانی : رفع الیدین علی الجنازۃ : ۱۰۷۷ – حسن

(۲) دار قطنی : باب وضع الیمنی علی الیسری : ۱۸۵۴ – حسن : إعلاء السنن : ۸/۲٦۷

(۳) ابو داؤد :تحقیق الالبانی : باب الدعاء للمیت : ۳۲۰۱ – حسن

(۴) ترمذی : جامع الدعوات : تحقیق الالبانی : ۳۴۷۹ – صحیح

(۵) الاعراف : ۵۵

(٦) مصنف ابن أبي شیبة : ما یبدأ في التكبیرة الأولی في الصلاة علیه : ۱۱۴۹۳ – سکت علیه المحقق محمد عوامه

حضرت جابرؓ سے منقول ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز جنازہ میں کوئی خاص دعا یا قرأت مقرر نہیں فرمائی (۱) حضرت ابوامامہؓ فرماتے ہیں کہ نماز جنازہ میں سنت یہ ہے کہ پہلی تکبیر پر آہستہ آواز سے سورہ فاتحہ پڑھی جائے، تین تکبیریں کہی جائیں اور آخری تکبیر کے بعد سلام پھیرا جائے۔(۲) یہاں سورۃ فاتحہ کا پڑھنا بطور ثنا و دعا کے ہے، بطور قرأت کے نہیں کہ یہ ممنوع ہے، حضرت عبداللہ بن عمرؓ کے بارے میں منقول ہے کہ وہ نماز جنازہ میں قرأت نہیں فرمایا کرتے تھے۔(۳)

نماز جنازہ کی دعا:

نماز جنازہ میں یہ دعا پڑھنے کا معمول ہے:

" اَللّٰھُمَّ اغْفِرْلِحَیِّنَا وَمَیِّتِنَا وَشَاھِدِنَا وَغَائِبِنَا وَصَغِیْرِنَا وَکَبِیْرِنَا وَذَکَرِنَا وَاُنْثَانَا اَللّٰھُمَّ مَنْ اَحْیَیْتَہٗ مِنَّا فَاَحْیِہٖ عَلَی الاِسْلَامِ وَمَنْ تَوَفَّیْتَہٗ مِنَّا فَتَوَفَّہٗ عَلَی الاِیْمَانِ " (۴)

نابالغ بچہ ہو تو یہ دعا پڑھی جائے:

" اَللّٰھُمَّ اجْعَلْہُ لَنَا فَرَطًا وَّسَلَفًا وَاَجْرًا " (۵)

نابالغ لڑکی ہو تو یہی دعا مؤنث صیغوں کے ساتھ پڑھے یعنی:

" اَللّٰھُمَّ اجْعَلْھَا لَنَا فَرَطًا وَّسَلَفًا وَاَجْرًا "

---

(۱) مصنف ابن أبي شيبة : من قال ليس على الميت دعاء موقت : ۱۱۴۸۵ – ایک راوی مختلف فیہ ہیں : محقق محمد عوامہ

(۲) نسائی تحقیق الالبانی : عدد التكبير على الجنازة : الدعاء : ۱۹۸۹. صحيح

(۳) موطا مالک : باب ما يقول المصلي على الجنازة : ۵۴۱

(۴) مستدرک مع تعلیقات الذهبي : كتاب الجنائز : ۱۳۲۶ – صحيح : إمام حاکمؒ امام ذہبیؒ

(۵) بخاری تعليقا كتاب الجنائز

نماز جنازہ پڑھانے والا ، جنازہ کے سینہ کے مقابل میں کھڑے ہو، حضرت عطاؒ فرماتے ہیں جب کوئی آدمی جنازہ پر نماز پڑھے تو وہ اس کے سینہ پاس کھڑے ہو، حضرت حسنؒ فرماتے ہیں: عورت کے جنازہ پر اس کی چھاتیوں کے مقابل میں کھڑا ہو جائے اور مرد کے جنازہ میں اس کے کچھ اوپر۔(۱)

غائبانہ نماز جنازہ:

عام طور پر نبی ﷺ نے اسی میت پر نماز جنازہ پڑھی ہے جو سامنے حاضر و موجود ہو، صحابہ کرامؓ و سلف صالحینؒ کا بھی یہی عمل رہا، البتہ اس عام معمول کے برخلاف نبی ﷺ نے دو افراد پر غائبانہ بھی نماز جنازہ پڑھی ہے، ایک تو شاہ حبش نجاشیؓ پر اور دوسرے حضرت معاویہ المزنیؓ پر، لیکن اس کی بنیادی وجہ یہ تھی کہ بطور معجزہ ان دونوں افراد کے جنازے، نہ صرف نبی ﷺ بلکہ صحابہ کرام کے بھی روبرو کر دئے گئے تھے، درمیان کے سارے حجابات سمیٹ دئے گئے تھے۔

حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں نبی ﷺ کے لئے مدینہ سے حبشہ تک کے سارے حجابات اٹھا دئے گئے تھے تو آپ ﷺ نے نجاشیؓ کے تخت جنازہ کو دیکھا اور چار تکبیریں کہہ کر نماز جنازہ پڑھی۔(۲)

حضرت عمران بن حصینؓ سے مروی ہے کہ نماز جنازہ کے لئے نبی ﷺ کھڑے ہوئے صحابہ کرام نے بھی پیچھے صف لگائی اور انہیں ایسے ہی لگ رہا تھا کہ جنازہ سامنے رکھا ہے(۳) اور حضرت معاویہ مزنیؓ کے بارے میں منقول ہے کہ جب ان کی وفات ہوئی تو حضرت جبرئیل تشریف لائے اور عرض کیا کہ اے محمد ﷺ! معاویہ مزنیؓ کا انتقال ہو گیا ہے۔

---

(۱) مصنف ابن ابی شیبہ : في المرأة أين تقام منها في الصلاة : ۱۱۶۶۸ – ۱۱۶۷۱– سکت علیها المحقق محمد عوامه

(۲) اسباب النزول لأبي الحسن علی بن احمد الواحدی النیشابوری : ۹۳/۱

(۳) صحیح ابن حبان : ۳۱۰۲. سند صحیح

کیا آپ ﷺ ان پر نماز جنازہ پڑھنا چاہیں گے؟ آپ ﷺ نے جواب دیا ہاں! اس پر حضرت جبرئیل علیہ السلام نے اپنے دونوں بازو مارے تو درمیان کا کوئی ٹیلہ اور درخت ایسا نہ تھا جو بیٹھ نہ گیا ہو، پھر انہوں نے حضرت معاویہ مزنیؓ کے تخت کو بلند کیا یہاں تک وہ آپ ﷺ کو نظر آنے لگا، پھر آپ ﷺ نے ان پر نماز جنازہ پڑھی، آپ ﷺ کے پیچھے ملائکہ کی دو صفیں بھی نماز پڑھیں، ہر صف میں ۷۰ ہزار فرشتے تھے، آنحضرت ﷺ نے دریافت کیا: اے جبرئیل معاویہؓ کو یہ مرتبہ کیسے ملا؟ حضرت جبرئیلؑ نے کہا: انہیں سورۃ اخلاص بے حد پسند تھا وہ اسے آتے جاتے اٹھتے بیٹھتے ہر حال میں پڑھا کرتے تھے۔(۱)

معلوم ہوا کہ یہ دونوں انتہائی غیر معمولی قسم کے واقعات ہیں، ان کو عام شرعی حکم قرار دے کر غائبانہ نماز جنازہ کا جواز پیدا نہیں کیا جا سکتا، یہی وجہ ہے کہ نبی ﷺ کی، کسی صحابی نے نماز جنازہ غائبانہ نہ پڑھی اور نہ ہی خلفاءِ راشدین وغیرہ کی۔

مسجد میں نماز جنازہ پڑھنا

رسالتمآب ﷺ کے زمانے میں، مساجد میں نماز جنازہ پڑھنے کا رواج نہ تھا، جنت البقیع کے قریب میں ایک جنازہ گاہ موجود تھی جہاں جنازے پڑھے جاتے تھے،(۲) نبی ﷺ کا ارشاد گرامی ہے: جس نے مسجد میں نماز جنازہ پڑھی اس کے لئے کچھ (ثواب) نہیں ہے۔(۳) تاہم جنازہ گاہ موجود نہ ہونے کی وجہ سے یا بارش وغیرہ کے عذر سے مسجد میں نماز جنازہ پڑھی جائے تو کوئی مضائقہ نہیں۔

---

(۱) مسند ابو یعلی : ۴۲۶۸ : إسناده ضعیف : محقق حسین سلیم أسد

(۲) زاد المعاد : حکم الصلاة علی المیت في المسجد : ۱/ ۴۸۱ ، بخاری : باب الصلاة علی الجنائز بالمصلی : ۱۳۲۹

(۳) مسند أبو داؤد الطیالسي : ۲۴۲۹ – مسند أحمد : ۹۷۳۰ – حسن : عمدة القاری : باب الصفوف علی الجنازة : ۱۸/۸

حضرت سعد بن ابی وقاصؓ کی وفات ہوئی تو امہات المؤمنین کی خواہش یہ ہوئی کہ وہ بھی ان پر نماز جنازہ پڑھیں، اس غرض سے ان کا جنازہ پہلے مسجد میں، ان کے حجرات کے قریب لایا گیا جہاں حضرت عائشہؓ وغیرہ نے نماز جنازہ پڑھی، لوگوں نے (عام دستور کے خلاف ہونے کی وجہ سے) ان کے فعل پر اعتراض کیا۔

اور یوں کہا کہ جنازوں کو تو مسجد میں داخل نہیں کرنا چاہئے، حضرت عائشہؓ کو اس کی اطلاع ہوئی تو فرمایا: یہ لوگ ایسی چیز کے بارے میں جس کا انہیں علم بھی نہیں ہے، نکتہ چینی کرنے میں کس قدر جلد بازی کا مظاہرہ کر رہے ہیں، ہم پر یہ عیب لگاتے ہیں کہ جنازہ کو مسجد سے نہیں گذارنا چاہئے حالاں کہ نبی ﷺ نے تو سہیل بن بیضاءؓ کی نماز جنازہ، مسجد کے بیچوں بیچ پڑھی ہے(۱) معلوم ہوا کہ مسجد میں نماز جنازہ پڑھنا عام دستور اور طریق نبوی کے خلاف ہے، تبھی تو لوگوں نے اس صفائی کے ساتھ اعتراض کیا تھا، لیکن فی الجملہ نبی ﷺ سے چوں کہ مسجد میں نماز جنازہ پڑھنا بھی ثابت ہے جیسا کہ حضرت سہیل بن بیضاء کی نماز جنازہ مسجد میں پڑھی گئی تھی؛ اس لئے کوئی اور شکل موجود نہ ہو تو مسجد میں نماز جنازہ پڑھنے سے روکنا بھی مناسب نہیں۔

قبرستان کی طرف جنازہ لے جانا:

جنازہ کو قبرستان کی طرف تیز تیز قدموں سے لے جایا جائے، چار پائی کے چاروں پایوں کو کندھا دیا جائے اور سیدھی جانب سے آغاز کیا جائے، جب تک جنازہ کندھوں سے نہ اتارا جائے، لوگ نہ بیٹھیں ممکن ہے جنازہ اتارنے میں ان کی ضرورت پڑ جائے۔

حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے ارشاد فرمایا: جنازہ کو جلدی لے جاؤ، اگر وہ نیک ہے تو اچھی چیز ہے جس کو تم آگے کر رہے ہو اور اگر اس کے علاوہ ہے تو بری چیز

(۱) مسلم : باب الصلاة على الجنازة في المسجد : ۲۲۹۷

ہے جس کو تم اپنی گردن سے رکھ رہے ہو۔(۱)

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ فرماتے ہیں: جو آدمی جنازہ کے ہمراہ چلے تو وہ جنازہ کے چاروں پایوں کو کندھا دے؛ اس لئے کہ یہ سنت ہے۔(۲)

حضرت عبداللہ بن عمرؓ کے بارے میں منقول ہے کہ وہ چار پائی کے چاروں جانب اٹھاتے تھے اور دائیں جانب سے شروع کرتے، پھر اس سے الگ ہو جاتے۔(۳) حضرت ابوسعیدؓ سے مروی ہے کہ جب تم جنازہ میں ہو تو جب تک جنازہ نہ رکھا جائے مت بیٹھو۔(۴)

قبر میں دفن کرنا:

بہتر یہ کہ بغلی قبر بنائی جائے، جو گہرائی میں انسان کی قامت یا اس کے آدھے دھڑ کے برابر ہو، اگر زمین کچی ہو اور بغلی قبر بنانے کی صورت میں بیٹھ جانے کا اندیشہ ہو تو صندوقی قبر بھی بنائی جاسکتی ہے۔

حضرت سعد بن ابی وقاصؓ نے اپنے مرض الوفات میں فرمایا کہ میرے لئے بغلی قبر بنانا اور کچی اینٹیں کھڑی کردینا جیسا کہ نبی ﷺ کے ساتھ کیا گیا۔(۵)

حضرت عمرؓ نے یہ وصیت فرمائی کہ ان کی قبر کی گہرائی بقدر قامت انسانی ہو(۶) حضرت ابراہیم نخعیؒ فرماتے ہیں: قبر کو کم از کم ناف کی گہرائی تک کھودا جائے۔(۷)

---

(۱) بخاری :باب السرعة بالجنازة : ۱۳۱۵

(۲) ابن ماجه : باب ما جاء في شهود الجنائز : ۱۴۷۸ – الإسناد مقارب : إعلاء السنن : ۲۸۹/۸

(۳) مصنف ابن ابی شیبه :بأی جوانب السرير يبدأ به في الحمل : ۱۱۳۹۳ – سكت عليه المحقق محمد عوامه

(۴) ترمذی : باب القيام للجنازة : ۱۰۴۳ – حسن صحيح : امام ترمذیؒ

(۵) مسلم :باب في اللحد ونصب اللبن : ۲۲۸۴

(۶) مصنف ابن ابی شيبه : باب ما قالوا في أعماق القبر : ۱۱۷۸۳ – ۱۱۷۸۴ – حسن أو صحيح : إعلاء السنن : ۳۰۰/۸

(۷) حواله سابق

میت کو قبلہ کی جانب سے قبر میں اتارا جائے اور اتارنے والا بِسْمِ اللّٰهِ وَبِاللّٰهِ وَعَلٰى مِلَّةِ رَسُوْلِ اللّٰهِ کہے۔

حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم ایک دفعہ رات کے اوقات میں قبر میں داخل ہوئے، چراغ جلایا گیا، اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے میت کو قبلہ کی جانب سے قبر میں اتارا۔(۱)

حضرت ابن عمرؓ سے مروی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کسی میت کو جب قبر میں اتارتے تو فرماتے: بِسْمِ اللّٰهِ وَبِاللّٰهِ وَعَلٰى مِلَّةِ رَسُوْلِ اللّٰهِ۔(۲)

قبر میں میت کو قبلہ رخ لٹایا جائے، کفن کی گرہیں کھول دی جائیں اور کچی اینٹوں کی اوٹ قائم کی جائے پھر مٹی گرائی جائے۔

نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے کہ کعبۃ اللہ تمہارے زندہ و مردہ لوگوں کا قبلہ ہے۔(۳)

حضرت علی بن حسینؒ فرماتے ہیں کہ صحابہ کرام نے نبی پاک ﷺ کی قبر اطہر پر کچی اینٹوں کو نصب کیا تھا۔(۴)

ہر شخص دونوں ہاتھوں میں مٹی بھر کر قبر میں ڈالے پہلی بار "مِنْهَا خَلَقْنَاكُمْ" دوسری بار "وَفِيْهَا نُعِيْدُكُمْ" تیسری مرتبہ "وَمِنْهَا نُخْرِجُكُمْ تَارَةً أُخْرٰى" پڑھے۔(۵)

پختہ قبر بنانا، پکی اینٹوں اور لکڑیوں کے ذریعہ، اسے مضبوط کرنا مکروہ ہے، قبر کو ہان

---

(۱) ترمذی تحقیق الألبانی : باب الدفن باللیل :۱۰۵۷ – صحیح

(۲) ترمذی تحقیق الألبانی : باب ما یقول إذا أدخل المیت القبر : ۱۰۴۶ – حسن

(۳) ابو داؤد تحقیق الألبانی : باب ما جاء في التشدید في أكل مال الیتیم : ۲۸۷۷

(۴) مصنف ابن ابی شیبه : في اللبن ینصب علی القبر : ۱۱۸۵۲

(۵) مستدرک حاکم مع تعلیقات الذهبي : تفسیر سورة طه : ۳۴۳۳ – سکت علیه الحاکمؒ والذهبیؒ

نما ہو اور زیادہ بلند نہ ہو۔

حضرت جابرؓ سے مروی ہے کہ نبی ﷺ نے قبروں پر چونا گچ ڈالنے سے، ان پر بیٹھنے سے اور ان پر عمارت بنانے سے منع فرمایا ہے۔(۱)

حضرت ابراہیم نخعیؒ فرماتے ہیں کہ سلف صالحین کچی اینٹوں کو پسند فرماتے تھے اور پکی اینٹوں کو ناپسند، بانس کو پسند کرتے تھے اور لکڑیوں کو ناپسند۔(۲)

حضرت سفیان التمار فرماتے ہیں: میں نے دیکھا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی قبر اطہر کو ہان نما تھیں(۳) حضرت ابو بکرؓ و عمرؓ کی قبروں کی شکل بھی یہی تھی۔(۴)

حضرت علیؓ کو نبی پاک ﷺ نے ایک موقع پر یہ ہدایات دے کر روانہ فرمایا تھا کہ جہاں کوئی مجسمہ دیکھو تو اسے مٹا دو اور جہاں کہیں اونچی قبر دیکھو تو اس کو برابر کر دو۔(۵)

بچہ زندہ پیدا ہوا پھر مر گیا تو اس پر عام مردوں کے احکام جاری ہوں گے، اسے غسل دیا جائے گا، اس پر نماز پڑھی جائے گی اور کفن دے کر دفن کیا جائے گا، اور اگر مردہ پیدا ہوا ہے تو اس کی باقاعدہ تجہیز و تکفین نہیں کی جائے گی اور نہ ہی اس پر نماز جنازہ پڑھی جائے گی، البتہ اگر اس کے اعضاء مکمل بن چکے ہوں تو انسانی نعش کے احترام کے پیش نظر، اس کو غسل دے لینا اچھا ہے۔

---

(۱) مسلم: باب النهي عن تجصيص القبور : ۲۲۸۹

(۲) مصنف ابن أبي شيبه : في تجصيص القبر والآجر يجعل له : ۱۱۸۹۲ – سكت عليه المحقق محمد عوامه

(۳) بخاری :باب ما جاء في قبر النبي صلى الله عليه وسلم : ۱۳۹۰

(۴) مصنف ابن أبي شيبه : باب ما قالوا في القبر يسنّم :۱۱۸۵۲ – سكت عليه المحقق محمد عوامه

(۵) مسلم : باب الأمر بتسوية القبر : ۲۲۸۷

دفن کے بعد:

جب قبر بن جائے تو سرہانے سورۃ آلمٓ سے مفلحون اور پائتانے امن الرسول سے آخر تک پڑھ دیا جائے۔(۱)

دفن سے فارغ ہونے کے بعد سب لوگ میت کے لئے قبلہ رخ ہو کر ہاتھ اٹھا کر دعاء کریں کہ اللہ پاک اس کی قبر کو آرام وراحت کی جگہ بنائے، مغفرت فرمائیں، منکر ونکیر کے سوالات کا ٹھیک ٹھیک جواب دینا آسان فرمائے۔(۲)

پسماندگان سے تعزیت:

رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے کہ جس شخص نے کسی مصیبت زدہ کی تعزیت وتسلی کی اس کے لئے ایسا ہی اجر وثواب ہے جیسا کہ اس مصیبت زدہ کے لئے ہے۔(۳)

آنحضرت ﷺ خود بھی تعزیت کے لئے تشریف لے جایا کرتے تھے، تعزیت کے موقع پر حضرت حسنؓ سے یہ کلمات منقول ہیں: "اَعْظَمَ اللّٰہُ اَجْرَکُمْ وَغَفَرَ اللّٰہُ لِصَاحِبِکُمْ" (۴) "اللہ تمہارے اجر وثواب کو بڑھائے اور تمہارے آدمی کی بخشش فرمائے" زینبؓ بنت رسول اللہ ﷺ کے صاحبزادے کا انتقال ہوا تو آپ ﷺ نے ان سے یوں فرمایا تھا:

---

(۱) بیہقي شعب الإیمان : فصل في زیارة القبور: ۹۲۹۴ – طبرانی کبیر : ۱۳۴۳۸ – ایک راوی ضعیف ھیں : مجمع الزوائد : باب ما یقول عند إدخال المیت : ۴۲۴۲

(۲) أبو داؤد تحقیق الألباني : باب الاستغفار عند القبر: ۳۲۲۳ – صحیح : مجمع الزوائد : باب ما یقول عند إدخال القبر : ۴۲۴۵

(۳) ترمذی : باب من عزی مصابا : ۱۰۷۳ – یقوی بعضها بعضا : حواشي التلخیص الحبیر : ۳۱۵/۲ – ناشر دار الکتب العلمیة

(۴) مصنف عبد الرزاق : باب التعزیة : ۶۰۷۴

''اِنَّ لِلّٰہِ مَا اَخَذَ وَلَہٗ مَا اَعْطٰی وَکُلٌّ عِنْدَہٗ بِاَجَلٍ مُسَمًّی فَلْتَصْبِرْ وَلْتَحْتَسِبْ'' (۱)

''اللہ ہی کا ہے جو کچھ اس نے لیا ہے اور جو کچھ اس نے دیا ہے اور ہر ایک کا ایک وقت مقرر ہے؛ لہٰذا صبر سے کام لو اور ثواب کی امید رکھو''

حضرت معاذ بن جبلؓ کے صاحبزادے کا انتقال ہوا تو رسول اللہ ﷺ نے ان کو یہ تعزیت نامہ لکھوایا، جس کا ترجمہ یہاں نقل کیا جاتا ہے:

''(شروع) اللہ کے نام کے ساتھ جو بڑا رحم کرنے والا اور مہربان ہے، اللہ کے رسول محمد (ﷺ) کی جانب سے معاذ بن جبل کے نام، تم پر سلامتی ہو، میں پہلے تم سے اللہ کی حمد بیان کرتا ہوں، جس کے سوا کوئی معبود نہیں، حمد وثنا کے بعد (دعا کرتا ہوں کہ) اللہ تمہیں اجر عظیم عطا فرمائے اور صبر کی توفیق دے اور ہمیں اور تمہیں شکر ادا کرنا نصیب فرمائے؛ اس لئے کہ بے شک ہماری جانیں، ہمارا مال اور ہمارے اہل وعیال (سب) اللہ بزرگ وبرتر کے خوشگوار عطیے اور عاریت کے طور پر سپرد کی ہوئی امانتیں ہیں، (اس اصول کے مطابق تمہارا بیٹا بھی تمہارے پاس اللہ کی امانت تھا) اللہ تعالی نے خوشی اور عیش کے ساتھ تم کو اس سے نفع اٹھانے اور جی بہلانے کا موقع دیا اور (اب) تم سے اس کو اجر عظیم کے عوض میں واپس لے لیا ہے، اللہ کی خاص نوازش اور رحمت، وہدایت (کی تم کو

---

(۱) بخاری : باب قول النبي صلى الله عليه وسلم : يعذب الميت ببعض بكاء أهله عليه : ۱۲۸۴

بشارت ہے) اگر تم نے ثواب کی نیت کے ساتھ صبر کیا، پس تم صبر (وشکر) کے ساتھ رہو (دیکھو) تمہارا رونا دھونا تمہارے اجر کو ضائع نہ کردے کہ پھر تمہیں پشیمانی اٹھانی پڑے اور یاد رکھو کہ رونا دھونا کسی میت کو لوٹا کر نہیں لاتا اور نہ ہی غم واندوہ کو دور کرتا ہے اور جو ہونے والا ہے وہ تو ہو کر رہے گا، اور جو ہونا تھا وہ ہو چکا، والسلام''(۱)
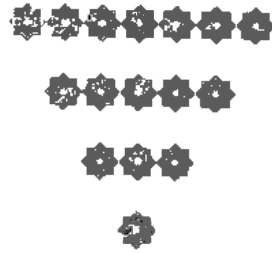
(۱) مستدرک مع تعليقات الذهبي : ذكر مناقب أحد الفقهاء الستة من الصحابة : ۵۱۹۳ – غریب حسن : امام حاکم